سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

ماہنامہ

سرگزشت

کراچی

دسمبر 2015

DEC 2015

دنیا بھر سے اور اپنے وطن سے منتخب سچی کہانیاں، جگ بیتیاں اور سفرنامے

جلد 25 ❖ شمارہ 11 ❖ دسمبر 2015ء

ماہنامہ کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور افراد علی نازش 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

حالات بہت گمبھیر ہیں۔ اس وقت عالم اسلام کو جس سازش کی آگ میں دھکیلا گیا ہے اس سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے کہ ہم اتحاد کی قوت سے کام لیں۔ کیونکہ روس امریکا کی جنگ نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔ امت مسلمہ بری طرح گھر گئی ہے۔ افغانستان، عراق، شام، لبنان، لیبیا تو کھنڈر بن ہی چکے ہیں دیگر اسلامی ممالک بھی خطرے میں ہیں۔ یہود و نصاریٰ ہمارے دوست نہ کبھی تھے اور نہ ہو سکتے ہیں اور وہ مسلسل اسی کوشش میں ہیں کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر ختم کر دو۔ امتِ محمدیؐ قیامت تک باقی رہے گی لیکن ہم نے ہوش سے کام نہ لیا تو دنیاوی طور پر ہمارا مقام بچھڑی ہوئی قوموں میں ہوگا۔ کیونکہ جو ملک تباہ ہو رہے ہیں وہ پھر سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں کئی دہائی لگا دیں گے اور تب تک یہود و نصاریٰ کئی دہائیاں آگے نکل چکے ہوں گے۔ گویا وہی مسلمان جن کی حکومت آدھی دنیا پر تھی جو سائنس، طب، تحریر و تقریر میں سب سے اعلیٰ تھے۔ وہ سب سے بچھڑے ہوئے لوگوں کا گروہ بن کر رہ جائیں گے۔ اس لیے اس سازش کو ناکام بنانا ہوگا، اتحاد کے لیے بھرپور کوشش کرنا ہو گی۔

بقول بہادر شاہ ظفر

چشمِ قاتل مری دشمن تھی ہمیشہ لیکن
جیسے اب ہو گئی قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی

معراج رسول

سرگزشت

دہلی کے ذی حیثیت، نامور، تعلیم میں اعلیٰ خاندان سے میاں بشیر کا تعلق تھا۔ والد کا نام نامی ایک عالم میں مشہور تھا۔ کہنے کو وہ مدرس سے محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر پہنچے تھے لیکن قلم کی زور آوری کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل کی تھی اور حیدر آباد میں انہیں خصوصی طور پر بلا کر تعلیمی منصب عطا کیا گیا تھا۔ باپ کے ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی جگہ بیٹے کو مل گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میاں بشیر زیادہ تر حیدر آباد میں رہتے تھے۔ میاں بشیر کی شادی دہلی ہی کے ایک رئیس خاندان میں ہوئی تھی لیکن شومئی قسمت ان بی بی سے بارہ سال تک اولاد نہ ہوئی تو گھر والوں نے ایک غریب گھرانے کی لڑکی سے دوسری شادی کرادی۔ اس کے بطن سے دہلی میں 22 مئی 1906ء کو تیسرے بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ اس کا بھی نام دادا نے تجویز کیا۔ بچہ بڑا ہوتا رہا۔ کبھی دہلی تو کبھی حیدر آباد دکن، وقت گزرتا رہا۔ ایک بہن ہوئی بشریٰ اس کے بعد ایک اور بیٹا ہوا جس کا نام سراج الدین احمد رکھا گیا۔ ابھی وہ گود میں ہی تھا کہ چھوٹی دلہن شوہر کے پاس حیدر آباد چلی آئیں۔ انہیں یہاں آئے زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ 1913ء میں میاں بشیر کے والد پر فالج کا اٹیک ہوا اور وہ دو تین دن میں چل بسے۔ میاں بشیر والد کے انتقال کی خبر سن کر دہلی روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ ریل میں ہی تھے کہ انہیں تار ملا کہ چھوٹی دلہن کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ الٹے پیروں لوٹ آئے۔ بیوی کی بے وقت موت نے میاں بشیر کو توڑ دیا تھا۔ انہوں نے حیدر آباد سے اپنا تبادلہ بالجبر کرالیا۔ یہاں آکر بچوں کو کانونیٹ اسکول میں داخلہ دلوایا گیا۔ 1916ء میں میاں جی دہلی آ گئے۔ یہاں ڈاکٹر ضیاء الحق نے مشورہ دیا کہ بچوں کو علی گڑھ بھیج دو۔ چنانچہ تینوں بھائیوں کو ایم او اسکول میں بھیج دیا گیا۔ بڑے کو ساتویں، منجھلے اور اسے پانچویں میں داخلہ ملا۔ سوائے انگلش کے یہ تینوں ہر مضمون میں کمزور تھے۔ مولانا اسلم جیراجپوری جیسے قابل استاد کی نگرانی تھی۔ وہ اسے اور بھائیوں کو شرم دلاتے کہ ذرا سوچو تم کس دادا کے پوتے ہو اور پڑھائی میں اتنے کمزور، طعنوں نے کام دکھایا۔ اس نے جی جان سے محنت شروع کر دی۔ دو سوا دو سال گزرے تھے کہ عدم تعاون تحریک شروع ہو گئی۔ والد نے بچوں کو دہلی بلوا لیا اور دہلی کے قریب اسکول میں داخل کرا دیا۔ والد دہلی کے کمشنر مسٹر ہیلی کی فرمائش پر دہلی کی تاریخ لکھ رہے تھے جو تین ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی۔ وہ ابھی دسویں میں تھا کہ والد نے اس کی شادی کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ میٹرک میں فیل ہو گیا۔ والد نے اسے عربک اسکول سے اٹھا کر مشن اسکول میں داخل کرا دیا۔ اگلے سال 1923ء میں اس نے سیکنڈ ڈویژن سے میٹرک کر لیا۔ چچا زاد ڈاکٹر اجمل کی شادی بہن بشریٰ سے ہوئی تھی اور وہ لاہور کے میڈیکل کالج میں پڑھاتے تھے۔ والد اپنے ساتھ اسے لاہور لے کر پہنچے اور ایف سی کالج میں داخل کرا دیا۔ وہیں لاہور میں اس کی ملاقات پیسا اخبار کے ایڈیٹر محبوب عالم اور تہذیب نسواں کے ممتاز علی سے ہوئی۔ وہیں تاج پطرس اور سالک سے ملے۔ حفیظ جالندھری، غلام عباس اور چراغ حسن حسرت سے روابط ہوئے۔ اسی کالج سے اس نے ایف ایس سی میڈیکل کیا۔ اب اسے ایڈنبرا بھیجنے کی تیاری ہو رہی تھی کہ دو حادثات ہو گئے' والد پر فالج کا حملہ ہوا اور بیوی کو پلوریسی جیسی خطرناک بیماری، مجبوراً وہ لاہور سے واپس دہلی چلا گیا اور بی اے آنرز کرنے لگا۔ 1929ء میں مشن کالج سے ایم اے فارسی کیا، وقت اچھا گزر رہا تھا کہ ایک کزن نے کہا لاہور سے کیا اچھے اچھے رسالے نکل رہے ہیں اور دہلی سے ایک بھی نہیں۔ یہ بات ان کے دل کو لگی۔ ساقی کے نام سے ڈیکلریشن حاصل کر لیا۔ لیکن یہ نفع نقصان میں چلتا رہا کہ 1947ء کا دردناک لمحہ آ گیا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ لاہور کے لیے نکل پڑا۔ جہاں مشہور ادیب ایم اسلم نے اپنے گھر میں ٹھہرا لیا۔ دس مہینے لاہور میں گزارنے کے بعد وہ کراچی چلا آیا۔ پاکستان آنے کے بعد پبلی کیشن کا کام شروع کیا، عصمت چغتائی کی چوٹیں اور منٹو کی دھواں شائع کی تھی، اس جرم پر عدالت میں طلبی ہو گئی۔ اس کیس میں منٹو اور عصمت پر بھی مقدمہ ہوا لیکن انگریز جج نے فیصلہ اس کے حق میں دے دیا۔ 1958ء میں جمیل الدین عالی کی کل پاکستان ادیبوں کی جماعت بنانے کا خیال آیا۔ قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب، جمیل جالبی، عباس احمد عباسی اور اسے بھی ساتھ لیا گیا۔ انجمن کا نام پاکستان رائٹرز گلڈ رکھا گیا۔ اس کا کنوینر اسے ہی بنایا گیا۔ گلڈ کی شاخیں کراچی، لاہور، ڈھاکا میں قائم ہوئیں۔ مولانا رازق الخیری ایڈیٹر عصمت اور اس نے ایک اور انجمن کی بنیاد رکھی تھی انجمن ادبی رسائل پاکستان، اس کی صدارت رازق الخیری اور سیکریٹری شپ اسے دی گئی۔ ماہنامہ ساقی بھی خوب ترقی کرتا رہا۔ ادبی حیثیت بھی مستحکم رہی کہ موت نے آ گھیرا اور کراچی کی مٹی اوڑھ کر 27 مئی 1967ء کو وہ سو گیا۔ یہ مختصر سی داستان عروج و زوال اردو کے اولین ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے شاہد احمد دہلوی کی ہے۔

......☆☆☆......

شہرِ خیال

☆سدرہ بانو ناگوری، کراچی سے لکھتی ہیں۔ ”نومبر کے شمارے میں آپ نے میرا خط شامل نہیں کیا۔ چلیے میرا خط نہ آیا تو کسی اور ساتھی کو نشست مل گئی یہ بھی اچھا ہوا، اوہو طاہرہ آپا آئی ہیں، طاہرہ آپا آپ کی دعاؤں کا شکریہ۔ آپ کی دعاؤں کو پڑھ کر خط شائع نہ ہونے کی ساری کلفت دور ہوگئی۔ ایک بات ایمانداری سے دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے گا، کیا ایک مرد کی بے وفائی کی سزا دنیا کے سارے مردوں کو دی جاسکتی ہے؟ نہیں نا، تو پھر آپ بھی اب بس کردیجیے۔ یہ میری التجا ہے۔ شاہد جہانگیر آپ اسپتال میں ہیں اور وہ بھی پشاور کے تو آپ کی عیادت کو طاہرہ گلزار بس آنے والی ہی ہیں۔ ہاں ایک بات کا خیال رکھیے گا۔ اس ہمدرد نرس کے گرویدہ نہ ہوجائیے گا۔ ہم آپ کے لیے خصوصی طور پر دعا گو ہیں۔ رانا شاہد نے رضا احمد کو جو نصیحت کی ہے وہ میں طاہرہ آپا کو بھی کرنا چاہوں گی واقعی آنے والے وقت میں حالات کافی تلخ ہوں گے۔ فلک شیر آپ نے میری بات ”وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ“ پر تبصرہ کیا۔ بے شک اس دنیا میں بے شمار رنگینیاں ہیں مگر کیا جنت میں اس سے کم رنگینیاں تھیں مگر آپ دیکھیں کہ جب ہماری اماں حوا نہیں تھیں تو ہمارے ابا آدم کیسے اُداس اُداس سے رہتے تھے۔ تو پھر آپ ہی کہیں مگر میری بات کہاں غلط ہے۔ آپ بات دل پر لے جاتے ہیں ایسا نہ کیا کریں۔ درگزر کرنے کی عادت ڈالیے۔ سلیم قیصر آپ نے میری اور بشریٰ افضل کی مستقل مزاجی کا ذکر کیا، اچھا لگا دیکھیے ہمیں آپ کی نظر لگ گئی اور میں نومبر میں غیر حاضر ہوگئی۔ فیض الحسن پکیز اپنے ذاتی معاملات کو ڈسکس مت کیجیے پھر ایک سلسلہ چل نکلے گا اور ”شہرِ دل“ کا نام دکھ نامہ رکھنا پڑے گا۔ دکھ سکھ زندگی کے ساتھ ہیں اور انہیں نبھانا پڑتا ہے۔ احمد خان توحیدی آپ لیٹ کمر لسٹ میں موجود ہیں، بہت دکھ ہوا۔ فلک شیر آپ نے درست لکھا کہ مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ ان کے بغیر زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ کاش کچھ لوگ اپنی غلطی مان کر ابھی سے اصلاح کرلیں تو بڑھاپا آرام سے کٹ جائے گا۔ طاہر الدین بیگ بڑے عرصے بعد نظر آئے تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ”انقلابی“ خوب رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے روس کے اس انقلابی کی جدوجہد کو بہت اچھے انداز میں تحریر کیا۔ ”داستانِ کرب“ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ انسان کو درندگی کا نشانہ بنانے والے اگر کل تھے تو آج بھی ہیں۔ بس جدید دور کے طرزِ زندگی کے انداز کچھ بدل سے گئے ہیں۔ انسانوں کو انسانوں سے ڈسوانے کا موسم سدا ایک ہی رہتا ہے۔ ”سفرِ امریکا“ شاندار انداز میں اختتام کو پہنچی۔ امریکی اپنے اچھے رویے سے دلوں کو جیتنے کا فن جانتے ہیں۔ اتحاد کا سبق ہمیں پڑھایا جاتا ہے اور عمل وہ کررہے ہیں اور بہترین صلہ بھی پارہے ہیں۔ ترقی کرنے کا ہنر کوئی ان سے سیکھے۔ منظر امام ہمیشہ کی طرح ”تاریخِ عالم“ لے کر آئے اور اپنی محنت اور لگن کی بدولت تعریف اور ستائش کے حقدار ٹھہرے۔ قلم نگری سے انور فرہاد نے ماضی کی نامور اداکارہ بہو سے تعارف کروایا گو کہ عشرت سلطانہ کا نام ہمارے لیے بالکل اجنبی تھا مگر قبل از مرگ انہوں نے اور اداکار صادق علی نے جس اذیت سے موت کو گلے لگایا اسے پڑھ کر آنکھیں بے اختیار بھیگ گئیں۔ تقدیر نے انہیں بڑی بے رحمی سے عرش سے فرش پر لا پٹخا تھا۔ اس اذیت کا تصور کرتے ہی دل دہل جاتا ہے۔ ”سراب“ ابھی پڑھی نہیں ویسے جب سے فتح خان کا کردار کہانی سے نکلا ہے مزہ نہیں آتا وہی شوبی کی ٹکر کا دشمن تھا یعنی سیر کا سوا سیر۔ پہلی سچ بیانی ”موقع“ پڑھی اس کہانی کا ہیپی اینڈ اچھا لگا۔ ”لمحۂ محبت“ بھی خوشی کبھی غم کی مانند لگی۔ کہیں خوشیوں سے بھرپور قہقہے تو کبھی سناٹے کی سی خاموشیاں اور آخر میں شادمانیوں سے بھرا اینڈ۔ بہت خوب صدف آصف ویلڈن۔ ”محافظ“ میں کمال نے مردانگی دکھا کر مرد ہونے کا ثبوت دے ہی دیا۔ ”درِ توبہ“ میں وقار احمد کے ساتھ شاید اس کی ماں کی دعاؤں کا اثر تھا یا اس کے باپ کی تربیت کہ خدا نے بروقت اسے گناہوں کی دلدل میں دھنسنے سے بچالیا۔“

☆اعجاز حسین سٹھار کا نامہ نور پور تھل سے۔ ”مفتی عزیز مئے، پہلے پائیدان پر تھے۔ اس اعزاز کے لیے مبارک باد قبول کیجیے۔ بہن طاہرہ گلزار صاحبہ، خط پسند کرنے کا شکریہ قبول کیجیے دیگر احباب نے یاد کیا سب کے لیے نیک تمنائیں۔ اللہ سب کو خاص طور پر خیبر پختونخواہ کے باسیوں کو قدرتی آفات سے محفوظ رکھے، آمین۔ ”داستانِ کرب“ پڑھ کر سچ مچ رونگٹے کھڑے ہوگئے یہاں انسان نے درندوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ آج کی دہشت گردی اور کم عمر بچے بچیوں کے ساتھ زیادتی بھی اس کا پرتو ہے۔ بے جا طاقت اور اختیارات

ایسے سانحات کو جنم دیتے ہیں جس سے خود تاریخ بھی شرمندہ ہو جاتی ہے۔ شخصیات سے متعلق معلومات بھرا مضمون واقعی سب سے زیادہ پسند کیا جارہا ہے۔ احمد ندیم قاسمی وادی سون ضلع خوشاب کے قصبہ ''انگہ'' میں پیدا ہوئے، اس وادی میں صرف اعوان قوم آباد ہے۔ عمران خان کا تعلق میانوالی کے نیازی خاندان سے ہے۔ ''سفرِ امریکا'' کا آخری حصہ مختصر لیکن دلچسپ اور معلومات سے بھرپور ہے جب کہ ''تاریخ عالم'' میں جان نظر نہیں آئی۔ ایک طرح کی خشکی در آئی ہے۔ ''قلم نگری'' میں ہوسے گپ شپ کے انداز میں ملاقات کرائی گئی ہے یہ انداز بھی دل کو بھایا ہے۔ بوریت نہیں ہوئی۔ ایک نشست و برخاست جیسے طریقہ سے تحریر سجائی گئی اور دل کو بھاگئی۔ یہ خوش قسمت ٹھہری کہ خود کئی اعزاز پائے اور بیٹیوں کے لیے راہ آسان کرگئی۔ ''سراب'' کامیابی سے اپنا سفر مکمل کررہا ہے۔ دیکھنا ہے کہ منزل کب قدموں تلے آتی ہے۔ سچ بیانیوں میں ''موقع'' کمال کی کہانی ہے۔ جیسی ہنرمندی سے ڈکیتی کا تانا بانا بنا گیا وہی حربہ جلیل نے پاروی پر استعمال کیا اور پہلی واردات ہی آخری ٹھہری اور اسے کامیابی سے لے اڑا۔ توعمری اور جلد بازی میں کیا گیا فیصلہ زندگی بھر کے لیے غم گسار، ہم مزاج اور وفادار ساتھی دے گیا۔ ''رائیگاں'' میں الماس کے اٹل فیصلے نے چونکا دیا۔ ایک عہد کیا جسے جان دے کر نبھا دیا۔ ''محافظ'' میں بانو ذرہ بھر بھی قصوروار نہیں ہے اگر کمال شروع سے ہی طبیعت میں توازن رکھتے تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ اتنا عرصہ بھائیوں کا حکم مانتے وہ بزدل ہوگیا تھا۔ اب جذبات میں بھونچال آیا تو شخصیت مکمل ہوگئی۔ ''لمحۂ محبت'' میں رافعہ کا رویہ نیا نہیں ہے جوانی کے جوش اور حسن کے زعم میں مزاج میں ہٹ دھرمی، ضد اور باغیانہ رویہ پیدا ہوجاتا ہے۔ جب ہوش کے ساتھ سوچ آتی ہے تو بہت کچھ کھو چکا ہوتا ہے۔ تب خلافِ مزاج فیصلے ماننا پڑتے ہیں۔ ''درِ توبہ'' ہر وقت کھلا ہے لیکن ہم ادھر دیکھنا تک گوارا نہیں کرتے۔ وقار نے ابھی کچھ نہیں کھویا تھا اسے جیسے ہی سیدھی راہ نظر آئی اس نے شارٹ کٹ چھوڑ دیے اور بخیر و عافیت منزل پر پہنچ گیا۔ ''یہ تو قبر جنت'' جیسے واقعات پڑھنے کے لیے درآمد کیے جاتے تھے۔ اب اپنے ملک میں بھی اولڈ ہاؤس بن گئے ہیں، حیرت کے ساتھ شرمندگی ہوتی ہے، کئی ٹی وی چینل والے بوڑھے مرد و عورتوں کا انٹرویو دکھاتے ہیں تو ان کی اولاد سے محبت اور پردہ پوشی دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ وہ کتنے بے بس اور غم زدہ نظر آرہے ہوتے ہیں۔''

☆ منشی محمد عزیز میگھ نے لڈن وہاڑی سے لکھا ہے۔ ''حیرت انگیز! ماشاء اللہ چشم بددور۔ یہ وہ کلمات ہیں جو 22 اکتوبر کو نومبر کا شمارہ پا کر بے ساختہ میری زبان پر آگئے۔ اللہ آپ کی یہ جفاکشی و مستعدی! تازہ شمارے میں ''شہرِ خیال'' کی صدارت ایک بار پھر آپ نے میرے نام کردی۔ اس کے لیے مجھے شکریہ کا لفظ بھی بالکل حقیر سا لگ رہا ہے (ہمیشہ اس خط کو ابتدا میں رکھا جاتا ہے جو بہترین ہو)، بہر حال بہت شکریہ۔ نومبر کے شمارے میں شامل کس مضمون کو ٹاپ پر رکھیں، یہ فیصلہ کرنا دشوار لگ رہا ہے۔ لیون ٹرانسکی پر لکھا ساجد امجد صاحب کا مضمون ہو یا سلمٰی اعوان کی ''عیار ساحرہ''۔ دو مصنفات کی مشترکہ کاوش ''داستانِ کرب'' ہو یا ''سخنور'' سبھی ایک دوسرے پر سبقت لیے ہوئے تھے۔ ''داستانِ کرب'' پڑھتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ استغفر اللہ! یہ حضرت انسان بھی کیا چیز ہے۔ شاید ایسے ہی انسانوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کو آدم بنانے سے منع کیا تھا اور ایک امام عالی مقام حضرت امام حسینؓ تھے کہ جن کے سجدے پر ساری کائنات قربان ہے۔ سبحان اللہ۔ کیا سجدہ ہے جناب امام حسین کا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح معنوں میں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے، آمین۔ محمد ایاز راہی بھی سخنور کے عنوان سے ماضی بعید کے مشہور شعراء کے حالاتِ زندگی کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ بہت خوب راہی صاحب۔ نومبر کی شخصیات میں میری کافی پسندیدہ شخصیات کا ذکرِ خیر بھی شامل تھا۔ خصوصاً شاہ لطیفؒ، وحید مراد، شفیع محمد شاہ اور بانو قدسیہ وغیرہ۔ ''شاعرِ خوش نوا'' سید زین مہدی کا بھرپور مضمون تھا۔ خوشی ہوتی ہے کہ سرگزشت پہلے سے بہت بدل گیا ہے۔ پہلے غیر ملکی کہانیوں کی بھرمار ہوتی تھی لیکن اب پاکستانی اور مسلمانوں پر تحریر زیادہ ہوتی ہے۔ سچ بیانیوں میں پہلی سچ بیانی میں جدید طرز کے ڈاکوؤں سے خوب ملوایا اور خود بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ''رائیگاں'' ایک نادان لڑکی کی داستان جو ایک ظالم کی نام نہاد محبت کے نام پر اپنی جان گنوا بیٹھی۔ ''محافظ'' میں بانو نے اپنے شوہر کو غیرت دلانے کے لیے کیا خوب چال چلی ہے لیکن اس میں قصور اس کا بھی نہیں ہے۔ شاید کوئی بھی عورت ویسا ہی کرتی جیسا بانو نے کیا۔ احسن علی رضا کی ''میرے خواب'' حسرتوں کی داستان تھی۔ ''تکمیلِ عشق'' حیرت انگیز سچ بیانی تھی۔ احمر کے مکر و فریب پر بہت غصہ آیا لیکن مشعل نے بھی اسے خوب سزا دی۔''

☆ معززا اکبر حسین لکھتی ہیں۔ ''آپ کا رسالہ سرگزشت بہت زیادہ قابلِ تعریف ہے اور اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ بلکہ آپ کے تمام ہی رسالے۔ پہلے میں سسپنس بہت شوق سے پڑھتی تھی بلکہ اب بھی پڑھتی ہوں اور جاسوسی بھی پڑھتی ہوں۔ ایک بار ٹھیلے پر سرگزشت دیکھ کر میں نے کہا اونہہ ''سر'' (کو لمبا کھینچ کر) سرگزشت میں نے نہیں لیا۔ پھر ایک بار پرانی کتابوں کے ٹھیلے پر رسالے پر دلیپ کمار کی تصویر دیکھ کر خرید لیا۔ پڑھا دلچسپ لگا۔ پھر میں نے نیا رسالہ خریدا یہ تھا جمال احسانی والے مضمون کا تھا۔ ایئر یاد نہیں۔ بس جب سے اس کی مستقل قاری ہوں۔ جب سے میں نے خریدا آپ نے کوئی نمبر نہیں نکالا۔ اب جاکے ''خطا نمبر'' نکالا۔ بہت پسند آیا (درمیان میں بہت سے نمبر آئے، آپ بھول رہی ہیں)۔ میں نے آپ کے ادارے میں فون کرکے پوچھا کہ سرگزشت کو جاری ہوئے کتنا عرصہ ہوا تو جواب ملا کہ 25 سال۔ اف کہاں سے لاؤں اور میں نے خیال کیا کہ 1990ء سے تلاش کرتی ہوں۔ میں نے ایک کارڈ بنایا اس طرح 1990ء جنوری، فروری، مارچ...... دسمبر پھر 1991ء، 1992ء اسی طرح 90ء کا تو ایک بھی نہیں ملا جو ملتے گئے ٹک لگاتی گئی۔ آپ سے گزارش ہے کہ ادارے میں تو پرانے ڈائجسٹ ہوں گے آپ مجھے دیجیے پڑھ کر ایسے لوٹاؤں کی گویا پڑھے ہی نہ گئے

ہوں (دفتر کی منتقلی میں سارا ریکارڈ ضائع ہو گیا اب ہمارے پاس بھی بہت سے پرچے نہیں ہیں)۔ آپ سے ایک گزارش اور ہے کہ لکھائی تھوڑی موٹی کریں۔ اس لیے میں ''معبرِ خیال'' نہیں پڑھتی۔ کبھی ایک آدھ نظر ڈال لی جیسے کہ ستمبر 2015ء میں خالد محمود کا تبصرہ پڑھ کر آپ کو خط لکھنے کا خیال آیا۔ جیسے ''سراب'' فلمی صفحہ، مسلمانوں کے غدار، ہمارے ملک کو دولخت کرنے میں انہی کا ہاتھ ہے۔ اسی خط کے آخر میں ''معبرِ خیال'' کے بارے میں آپ نے آخر میں جو لکھا ہے بالکل صحیح ہے ایسے ہی ہونا چاہیے۔ اگر آپ نے اس پہلے خط کا جواب دیا تو آیندہ بھی لکھوں گی۔ باقی کہانیاں اور مضامین بھی زبردست ہیں۔ ہاں آپ میرا نام دیکھ کر کسی ماہر سے یہ نہ معلوم کرائیے کہ یہ مصنف یا مصنفہ ہے (معز عام طور سے لڑکوں کا نام ہوتا ہے)۔ آخر میں ایک مرتبہ پھر گزارش ہے کہ میری شدید خواہش کا احترام ضرور کیجیے۔ دعائیں دوں گی۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی اور صحت عطا کرے، آمین۔''

☆ شائستہ بہاولپور سے لکھتی ہیں۔ ''کچھ سوالوں کے جواب چاہئیں یا مضمون بنا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ اردو اور ہندی میں کیا فرق ہے۔ یہ بولنے میں تو تقریباً ایک جیسی ہے تو اس کا رسم الخط الگ الگ کیوں ہے؟ (اردو میں فارسی اور عربی کے الفاظ ہوتے ہیں۔ ہندی میں سن سکرت جو ٹوٹ کر پراکرت بنی اور پراکرت ٹوٹ کر بھاکا اور بھاکا ہندی سن سکرت رسم الخط میں ہے اور اردو فارسی میں)۔ اردو اور ہندی کی تاریخ کیا ہے۔ کیا ہم نے ان کی ہندی کو اردو میں تبدیل کیا ہے یا انہوں نے ہماری اردو کو ہندی بنایا ہے؟ (ایک ہی وقت میں بھاکا اور اردو عوام کے سامنے آئی ورنہ مسلمان فارسی میں گفتگو کرتے تھے)۔ اردو زبان کے وجود میں آنے سے پہلے ہندوستان میں ہندو کون سی زبان بولتے تھے۔ (سن سکرت)۔ ہندی کا رسم الخط کون سی زبان میں ہے۔ سن سکرت یا ناگرگ؟ (سن سکرت نے ناگرک کو جنم دیا)۔ انڈین فلموں کی زبان بالکل خالص اردو ہے۔ شاعری بھی خالص اردو ہے۔ پھر وہ اس کو ہندی کیوں کہتے ہیں؟ (زبان اردو اس لیے ہے کہ ابتدا میں فلموں پر اردو ادیب و شاعر محنت کرتے تھے)۔ برصغیر میں اردو کے بڑے بڑے عظیم شاعر گزرے ہیں۔ مرزا غالب، داغ، فراق، ان ہزاروں شاعروں کا کلام ہندوستان میں اردو رسم الخط میں ہے یا انہوں نے ہندی رسم الخط میں Convert کرلیا ہے؟ (یہ تمام شاعر اردو کے تھے)۔ امیر خسرو کون سی زبان میں شاعری کرتے تھے؟ نیز جواہر لال نہرو کی سرگزشت یا صرف ان کے ادبی ذوق کے متعلق معلومات فراہم کریں۔ (امیر خسرو فارسی میں شاعری کرتے تھے لیکن کبھی کبھی عوامی زبان میں بھی قافیہ آرائی کرلیتے اسی وجہ سے ان کو اردو کا اولین شاعر کہا گیا ہے)۔ نومبر کے سرگزشت میں Gertude Bell کے متعلق مختصر معلومات سے تشنگی مزید بڑھ گئی ہے۔ پلیز مکمل سرگزشت دیں۔ (ان پر لکھی گئی کتابیں پڑھ لیں)۔ پندرہ سالوں سے خاموش قاری ہوں ان سوالات نے اسکی ہلچل مچائی دماغ میں کہ مجھ جیسی سست قاری لکھنے پر مجبور ہو ہی گئی ہو سکے تو اوپر دیے گئے سوالوں کے ضرور جواب دیں (برائے مہربانی ایسے سوالات اپنے نزدیکی ادیب وغیرہ سے کرلیا کریں سرگزشت کے صفحات متحمل نہیں ہو سکتے)۔''

☆ سہیل احمد کھتری، لیاری کراچی سے لکھتے ہیں۔ ''میں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب سے گزارش کرتا ہوں کہ برائے مہربانی اشفاق احمد کے بارے میں بھی کچھ لکھیں۔ بہت سے قارئین اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ ''عیار ساحرہ'' بے شک ایک اچھی تحریر تھی۔ ''داستانِ کرب'' پڑھتے ہوئے کئی بار مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ لہٰذا کئی نشستوں میں یہ داستان پوری کر پایا۔ ایاز راہی سے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ ان کی تحریریں خالصتاً تحقیقی ہوتی ہیں لہٰذا میں نہیں پڑھتا۔ ''نومبر کی شخصیات'' اچھی تحریر تھی اور اسی سلسلے کی دیگر تحریریں بھی میں نے ذوق و شوق سے پڑھیں۔ سفرنامہ بھی اچھا تھا۔ اب آتے ہیں سچ بیانیوں کی طرف سرورق کی کہانی میں نے اب تک نہیں پڑھی۔ ''رائیگاں'' اور ''محافظ'' انسانی نفسیات کی پوری طرح عکاسی کرتی ہوئی نظر آئیں۔ البتہ ''لمحۂ محبت'' سچ بیانی سے زیادہ خواتین کے ڈائجسٹ کا کوئی افسانہ لگا۔ تحریر کرنے کا انداز وہی تھا جو خواتین ڈائجسٹ رائٹرز اپناتی ہیں۔ لہٰذا حقیقت سے زیادہ افسانے کا گمان ہوا۔ ''بے توقیر جنت'' میرے حساب سے اس مہینے کی سچ بیانیوں میں اوّل نمبر پر رہی۔ نہ جانے کیوں اولاد ماں باپ پر ظلم ڈھاتے ہوئے یہ بھول جاتی ہے کہ وہ بھی ماں باپ ہیں جو وہ خود اپنے ماں باپ کے ساتھ کریں گے ان کی اولاد بھی ان کے ساتھ وہی کرے گی۔ بس یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اولاد کو اپنے ماں باپ کا فرمانبردار بنادے، آمین۔ ''میرے خواب'' اور ''تکمیلِ عشق'' بھی بس ٹھیک ہی تھیں۔ مزید کوئی تبصرہ کرنے سے معذرت۔ انشاء اللہ زندگی رہی تو اگلے مہینے پھر تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ تب تک کے لیے فی امان اللہ۔''

☆ فلک شیر ملک نے رحیم یار خان سے لکھا ہے۔ ''معبرِ خیال'' میں بہن طاہرہ گلزار نے میرا تبصرہ پسند کیا، شکریہ۔ ''انقلابی'' ایک اچھی تحریر تھی۔ اپنا مذہب اور اپنی قوم ہر کسی کو اچھی لگتی ہے۔ ''داستانِ کرب'' میں سزاؤں کے بارے میں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایسے ایسے ظالم لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ ''سخنور'' میں شاعروں کے متعلق آگہی اچھا سلسلہ ہے۔ ''نومبر کی شخصیات'' بھی معلوماتی طور پر بہتر ہے۔ مجھے تو اپنی پسندیدہ شاعرہ پروین شاکر کی دوبارہ یاد ستانے لگی۔ بے چاری زیرو پوائنٹ اسلام آباد میں ٹرک کے حادثے میں چلی گئی۔ جون ایلیا سے بھی ملاقات ہوگئی۔ ''شاعر خوش نوا'' جمیل مظہری زبردست شاعر تھے۔ ''سفر امریکا'' ختم ہوا۔ سفرنامہ مختصر ہو تو اچھا لگتا ہے۔ ''مسلمانانِ ہند'' کے حوالے سے جن حضرات نے اچھے کام کر کے ایوارڈ لیے، اچھی آگاہی تھی۔ ''تاریخِ عالم'' تہذیبوں کے متعلق ٹھیک ہی جا رہی ہے۔ ''قلم نگری'' میں عشرت سلطانہ (بھو) پڑھی مگر ایک جگہ پر پڑھتے پڑھتے آنسو نکل آئے کہ وہ اسپتال میں تھیں تو

ان کو ایک کیو تک میسر نہیں تھا۔ ''سراب'' بہت طول پکڑ گئی ہے۔ آٹھ تو سال ہونے والے ہیں، ویسے میرا خیال ہے کہ اب اس کی جگہ کاشف زبیر صاحب کوئی اور سلسلہ شروع کر لیں (بہت جلد ایک نئے سلسلے وار تحریر شروع ہو رہی ہے)۔ ''بیت بازی'' میں ہمارا شعر چھپا ہی نہیں بہرکیف سب اچھے اشعار تھے۔ ظفر علی خان گجرات کا شعر پسند آیا۔ سچ بیانیوں میں ''موقع'' میں جس واقعے کا ذکر کیا گیا اسی طرح کا واقعہ ملتان میں بھی پیش آیا تھا مگر وہ ایک ڈراما تھا۔ ''رائیگاں'' محبت اندھی ہوتی ہے۔ الماس بھی ایسی ہی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ ''محافظ'' مغرور اور حسین لڑکیوں کے لیے لمحۂ فکریہ۔ اچھی تحریر تھی۔ ''حقیقی مسیحا'' مجید احمد جائی صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کہانی کو کتنے رسالوں میں چھپواؤ گے؟ دو تین دفعہ تو آج سے پانچ چار ماہ پہلے میں پڑھ چکا ہوں (مجید احمد جائی کی اس حرکت سے ایسا لگتا ہے موصوف حکیم صاحب کی مشہوری کر رہے ہیں اس لیے ان پر پابندی لگا دی گئی ہے)۔ ''در توبہ'' ایسے بہت کم پولیس والے ہیں جو رشوت جیسی بیماری سے بچتے ہوں مگر وقار جیسے لوگ بھی ہیں جن کو توبہ نصیب ہو جاتی ہے۔ ''یہ تو قیر جنت'' بہت زبردست اور سبق آموز تحریر۔ ماں کی ممتا اور اولاد کی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ ''میرے خواب'' بھی اچھی سچ بیانی تھی۔ جبار نے پیار کی خاطر اپنا خواب ادھورا چھوڑ دیا۔ یوں محبت کی جیت ہوئی۔ ''تکمیلِ عشق'' میرے خیال سے نمبر ون رہی۔ عورت جب پیار کرتی ہے تو بھی ٹوٹ کر مگر جب اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھے تو پھر اللہ کی پناہ، جیسے اس تحریر میں مشعل نے احمر کے ساتھ کیا۔ چھبیس اکتوبر کا افسوسناک واقعہ ''ناگہانی آفت'' زلزلے نے تباہی مچا دی بہت بہت دکھ ہوا مگر فیصلہ کاتبِ تقدیر کا تھا۔ بچھڑنے والوں کو اللہ پاک جنت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل۔ معراج صاحب بقول عمران خان ''تبدیلی آئے گی نہیں آ چکی ہے'' کے مصداق پورا معاشرہ گہری کھائی میں چلا جائے گا نہیں بلکہ جا چکا ہے۔ میں نے دو آپ بیتیاں کچھ ماہ پہلے بھیجی تھیں ان کے متعلق بتائیں ایک ''ہوا کے دوش پر'' اور دوسری ''اندھی محبت'' اور اب ''پانچ بیماریاں'' کے متعلق مضمون بھیجا ہے۔ چھپ سکتا ہے یا نہیں؟ (کہانیاں اچھی ہیں لیکن صحیح انداز میں لکھی نہیں گئی ہیں۔ آپ کی دو کہانیاں جو چھپی ہیں ان پر غور کریں کہ کس طرح الفاظ تبدیل ہوئے)۔''

☆ محمد رضا انصاری کا خلوص نامہ کوٹ ادو سے۔ ''چار پانچ مہینوں کے بعد حاضر ہوا ہوں۔ سرگزشت باقاعدہ دو سال سے پڑھنا شروع کیا۔ جاسوسی اور سسپنس کا تو میں بچپن سے پرستار ہوں۔ میرے بڑے بھائی جاسوسی اور سسپنس ہر مہینے پڑھتے تھے اور میں اسکول جاتے ہوئے چھپا کر چلا جاتا تھا تاکہ اسکول سے آ کر پڑھوں۔ بھائی غصہ ہوتا تھا۔ دو تین بار مار بھی پڑی۔ ایک بار جب کسی نے مجھے پرانی کتابوں کی دکان کا بتایا تو میں پرانے جاسوسی ڈائجسٹ لے کر چھپ چھپ کر پڑھنے لگا گھر والے مارتے تھے کہ تمہیں ان رسالوں سے کیا ملتا ہے۔ آنکھیں خراب کرتے ہو اور کچھ نہیں۔ ایک بار دکان والے انکل نے مجھے سرگزشت دکھایا کہ آج کوئی اور رسالہ نہیں ہے۔ آج یہ ہی پڑھ لو۔ بس وہ دن اور آج کا دن میں نے سرگزشت کا دامن نہیں چھوڑا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر پرانے شمارے پڑھتا ہوں اور اب ہر مہینے نیا رسالہ بھی پڑھتا ہوں۔ آپ کے ادارے کے چاروں رسالوں میں پہلا نمبر سرگزشت کا ہے۔ نومبر کا سرگزشت ہمیں حیران کرنے کے لیے 23 اکتوبر ہی کو مارکیٹ میں آ چکا تھا۔ سرگزشت کو دیکھ کر حیرت انگیز خوشی ہوئی۔ نومبر کے سرگزشت کا سرورق بہترین تھا۔ کیوپڈ کی تصویر دیکھ کر حیرت ہوئی مگر پہلی سچ بیانی پڑھ کر سرورق کی سمجھ آ گئی۔ اس طرح کی کہانیاں پہلے بھی پڑھ چکے ہیں لیکن یہ کچھ منفرد سی تھی۔ دوسری سچ بیانی بھی اچھی لگی۔ ''شہرِ خیال'' میں سب ساتھیوں کے خطوط اچھے لگے۔ طاہرہ گلزار اور رومی انصاری کے تبصرے زیادہ اچھے تھے۔ ''انقلابی'' ایک اچھا مضمون تھا اور نومبر کی شخصیات سپرہٹ جا رہا ہے۔ ''تاریخ عالم'' کی پہلی قسط ہی پڑھی تھی۔ مجھے تو یہ سلسلہ کچھ خاص نہیں لگتا۔ ''عیار ساحرہ'' بھی خوب تھی اور بادشاہوں کے مجرموں کو ایذا پہنچانے والے آلات کے بارے میں پڑھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ کتنی خوفناک سزائیں تھیں۔ آج بروز منگل 27 اکتوبر کو میں نے اخبار میں پڑھا کہ گیتا کو اس کے رشتے دار مل گئے ہیں اور وہ بھارت روانہ ہو گئی ہے لیکن ہماری کلاس کے چند اسٹوڈنٹ کہتے ہیں کہ اسے اس کے رشتے دار نہیں پہچانتے اس لیے اس کا ڈی این اے ہوگا۔ کیا آپ اس بارے میں دوبارہ مضمون دینا پسند کریں گے تاکہ ہمیں پتا چل سکے کہ کیا واقعی وہ اپنے گھر پہنچ گئی ہے یا نہیں (وہ انڈیا پہنچ گئی)۔''

☆ ڈاکٹر محمد کاشف، سلطان پور صادق آباد سے مرقوم ہیں۔ ''سرگزشت اکثر پڑھتا ہوں۔ جب بھی فارغ ہوتا ہوں تو مطالعہ کرتا ہوں۔ آپ کے ادارے نے ایک کہانی ''حقیقی مسیحا'' اس دفعہ کے رسالے میں مجید احمد جائی ملتان کے نام سے شائع کی ہے۔ یہ کہانی مختلف رسالوں میں پانچ دفعہ پڑھ چکا ہوں۔ اب یہ کہانی چھٹی دفعہ آپ نے بھی لگا دی ثبوت کے طور پر نئے افق کو بھیج رہا ہوں۔ جس میں حکیم خادم حسین کھیڑا کا ذکر ہے۔ دیگر رسالے والوں نے بھی مجید جائی کو خط میں بددیانت قرار دیا ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی دو تین دفعہ یہ چھپ چکی ہے۔ بس کھیڑا کا فون نمبر نہیں ہے۔ ایسے لوگ اداروں کو خراب کر رہے ہیں۔ اسے بلیک لسٹ میں ڈالیں بلکہ سزا دیں۔ (مجید احمد جائی کو ہمیشہ کے لیے بین کر دیا گیا ہے)۔''

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ ''اس بار جب دہشت گردوں سے کے پی کے پرامن بنایا گیا تو بزدلوں نے بلوچستان کی راہ لی۔ یہ بزدل سمجھتے ہیں کہ ان چند بزدلانہ حرکتیں کر کے ہم اس ملک کو کوئی نقصان پہنچا دیں گے لیکن یہ بزدل نہیں سمجھتے کہ یہ چند شہادتیں اور کچھ مالی نقصان اس ملک کو کمزور ہرگز نہیں کر سکتے۔ یہ منہ کی کھائیں گے۔ آج یعنی 26 اکتوبر کو زلزلے نے پشاور میں بہت تباہی پھیلائی۔

تقریباً 100 تک اموات ہوئیں اور بہت سے زخمی، باقی ملک کے حصوں میں بھی زلزلہ آیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم کرے، آمین۔ سرورق پر میرے پسندیدہ ریڈر کلر میں سرگزشت جگمگا رہا تھا۔ دوسرے کونے میں روسی نژاد کی تصویر۔ درمیان میں ایک 35 یا 40 سال کی حسینہ آنکھیں بند کرکے ہنس رہی ہے۔ ایک چھوٹا انجیل نما بچہ تیر کمان لے کر پاکستان کے دشمنوں کو مارنے کے لیے لپکا ہے۔ اللہ مستقبل کے اس ننھے انجیل کو کامیاب کرے، آمین۔ (وہ انجیل کیوپڈ ہے۔ یونانی کہتے ہیں کہ اس کا تیر چلتا ہے تو محبت ہو جاتی ہے)۔ معراج انکل نے اس بار بالکل نئی اور بچی سبق آموز باتیں کیں لیکن کیا کریں کہ معاشرہ اس روش کو اپنا چکا ہے۔ اللہ ہمارے معاشرے پر رحم کرے۔ یک ٹمی میں باکمال کرکٹر عبدالحفیظ کاردار کی باکمال ہسٹری بیان کی گئی، زبردست۔ کسی مہینے میرے فیورٹ کھلاڑیوں جاوید میانداد اور عامر سہیل کے بارے میں بھی لکھیں۔ اب چلتے ہیں 'معبر خیال' میں کہ کس کس دوست نے مجھ ناچیز کو یاد کیا۔ پہلے نمبر پر غنی محمد عزیز موجود ہیں، مبارکاں۔ آپ کا خط بہت شاندار رہا اور ہم دوستوں کو مس کرکے اپنی محبت کا خوب ثبوت دیا۔ قیصر عباس خان آف بھکر، آپ کا خط بہت زیادہ پسند آیا مجھے مثبت سوچ والے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔ لاہور سے بھائی منظر علی خان کا خط بہت اچھا رہا۔ سیف اللہ جناب آتے رہیے۔ اب عائب نہیں ہونا۔ نثار احمد بھی معیاری سوچ کے ساتھ موجود تھے۔ محمد عمران جونانی یاد کرنے کا شکریہ، بہت زبردست تبصرہ رہا...... فیض الحسن کا خط بہت دکھی کر گیا۔ اللہ آپ کی والدہ کے دل پر رحم کرے۔ اللہ سے معافی مانگیں ہو سکتا ہے کہ تھوڑی غلطی آپ کی بھی ہو۔ سید انور عباس شاہ! بھائی میں ناراض نہیں ہوں یہ اتفاق ہے کہ ان دو مہینوں میں میرا خط ٹائم پر نہیں پہنچ سکا۔ بس وہی ڈاک خانے والوں کا سوتیلا پن۔ آپ کا محبت نامہ بہت پیارا لگا۔ بھائی اللہ آپ کو خوش رکھے۔ سدا خوش رہو۔ ناصر حسین رند اپنے اندازِ بیاں کے ساتھ موجود رہے۔ بہت اچھے بھائی ہم سے کوئی ناراضی ہے کیا؟ ندیم اقبال آف امریکا ہم بھی آپ کے سفرنامے کا انتظار کریں گے۔ معین الدین اختر، رحیم یار خان کا تبصرہ شاندار اور دلچسپ رہا۔ شکر ہے کہ اب طاہر الدین بیگ بہت مختصر تبصرے کے ساتھ موجود تھے (آپ بھی مختصر لکھنے کی پریکٹس کریں)۔ فلک شیر ملک اپنے تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ بہت خوب آپ چند تبصرہ نگاروں میں شامل ہو جو مجھے اپنے انداز سے بہت پسند ہیں۔ عبدالجبار رومی انصاری، مختصر لیکن خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ اللہ ان کو ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔ رانا محمد شاہد، بھائی آپ کا شاندار تبصرہ بہت پسند آیا۔ یاد رکھنے کا شکریہ۔ محمد سلیم قیصر بھائی تمہاری باجی گل کے ساتھ زندگی نے بہت ناحق کیا ہے۔ برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ درگزر ان کے ساتھ کیا جائے جو غلطی انجانے میں کریں نہ کہ جان بوجھ کے۔ محمد سلیم قیصر! ہمیشہ خوش رہو۔ بلیک لسٹ میں اتنے پیارے دوستوں کو دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ غیر حاضر دوست معراج الدین آف مردان جاوید سرکانی، رانا اعجاز حسین، سید چاند، ڈاکٹر روبینہ انصاری، قرۃ العین کہاں ہو حاضر ہو جائیں۔ اس بار تو سدرہ بانو بھی حاضر تھیں۔ دوستو یہ اچھی بات تو نہیں۔ شاہد صاحب کے سرگزشت کی چوری کا احوال پڑھ کے بہت ہنسی آئی اور خوشی بھی کہ سرگزشت کا نشہ بھی شراب سا ہے۔ بقول شاعر چھٹتی نہیں یہ کافر منہ کو لگی ہوئی، ویسے شاہد جہانگیر صاحب نرس صرف سرگزشت لے گئی تھی یا آپ کا دل بھی۔ ویسے بھی 65 سال کی عمر میں بھی آپ لاجواب ہیں۔ کہانیوں میں حسبِ عادت اپنے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر کی لاجواب تحریر ''سراب'' پڑھنا شروع کیا تو ایسی کھو گئی کہ ختم کرکے ہی دم لیا۔ بہت ہی زبردست قسط تھی۔''

☆ منظر علی خان لاہور سے لکھتے ہیں۔ ''نومبر کا شمارہ بروقت ملا۔ انقلابی کے عنوان سے ٹراٹسکی کا تذکرہ معلومات افزا تھا۔ کارل مارکس اور لینن کے نظریات طبقاتی کشمکش کے بعض حقائق کی ترجمان کرتے ہیں مگر یہ تفکر فطری نہیں ہے۔ لاملوکیت فی الاسلام، اسلام میں ملک اور ملکیت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ سب کچھ میرٹ اور عدل پر مبنی ہونا چاہیے مگر کمیونزم ایک غیر فطری سوچ ہے اور اسے سائنٹیفک کہنے والے انتہائی گمراہی کا شکار ہیں۔ سرمایہ داری، جاگیردار سرمایہ کی کمائی ''سود'' انسان اور انسانیت کی تذلیل ہے مگر کمیونزم اور سرمایہ داری کے علاوہ تیسرا رخ دینے والے بھی مذہبی شیطان ہیں۔ معذرت کے ساتھ۔ مجھے خیال آتا ہے کہ بھٹو صاحب نے بھی ہر چیز کو ٹیک اپ کرنے کا نعرہ لگایا تھا مگر بعد میں کیا ہوا۔ اس پر تبصرہ کرنا نہ میری عادت ہے نہ میرا منصب نہ روایت۔ ''عیار ساحرہ'' کے عنوان سے لارنس آف عریبیہ کی طرح کی برطانوی جاسوسہ کا تذکرہ خوب ہے۔ ''داستانِ کرب'' پڑھ کر اپنے نوعِ انسان ہونے پر شرم آتی ہے۔ شخصیات پڑھیں، معلومات میں اضافہ ہوا یہ اچھا سلسلہ ہے۔ شاعر خوش نوا جمیل مظہری بہترین مرثیہ گو شاعر تھے۔ ''سفر امریکا'' سفر ہی تجربہ اور کیفیات کا آئینہ دار ہے مگر روانویت کم ہے۔ ''تاریخ عالم'' کو مزید وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ مختصر تحریر سے تسکین نہیں ہوئی۔ ارتقا کیا ہے۔ ارتقا روحانی ہے۔ مادہ میں زندگی پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ آواگون کو درست کہنا کہاں تک درست ہے۔ ادھر تو یہ حالت ہے کہ ہر جا ہر ذرہ ہر آدمی شانِ یکتائی لیے ہوئے ہے اور منفرد ہے۔ نوے کروڑ سال پہلے آدم کا ظہور اور تخلیق کے عظیم الجثہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی ہیئت کھو بیٹھے تھے۔ آدم کا قد ساٹھ گز، چالیس گز یا چالیس فٹ جتنا بھی تھا بعد میں قد کم ہوتے گئے اور ہزار سال بعد بھی اسٹائل بدل جائے گا۔ ''توقع'' سچ بیانیوں میں پسند آئی۔ ''رائیگاں'' پڑھی۔ افسوس ہوا۔ الماس کی وفا اور شاہ میر کی بے وفائی مادی پیمانوں سے خواہ کچھ نہیں شاہ میر نے دنیا پرستی شعار کی اور ایک باوفا کو چھوڑ کر اسے سکون نہیں ملے گا۔ ''لمحہ محبت'' میں رافعہ گرچہ عمل سزا سے بچ گئی مگر اس کا غرور اسے منزل پانے کی طرف عاجزی اور انکساری سے ملا۔''

☆ انور عباس شاہ کا اظہاریہ بھکر سے۔ ''ابھی سانحہ جیکب آباد کا دکھ تازہ ہی تھا کہ ایک اور سانحہ زلزلے کی صورت میں سارے پاکستان میں رونما ہو گیا۔ گاؤں کے گاؤں اجڑ گئے۔ دکھ بہت ہوا ہے آئیں سب مل کر دعا کریں کہ خداوند کریم ایسی آفات سے ہم

سب کو محفوظ رکھے (آمین ثم آمین)۔ سرگزشت کی شان میں ایک اور اضافہ گزشتہ دنوں جب ہم ٹی وی دیکھ رہے تھے تو گیتا کے بارے میں پروگرام چل رہا تھا۔ جی ہاں وہی گیتا جس کے بارے میں ہم سرگزشت میں پہلے ہی سے پڑھ چکے تھے۔ سرگزشت میں گیتا کی واپسی کے متعلق پاکستان کی کوششوں کا اظہار کیا گیا تھا اور گیتا واپس بھارت پہنچ گئی۔ اس سلسلے میں پاکستان نے مسلمان ہونے کے ناتے انسانیت اور خلوص کا ثبوت پیش کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بھارت کو اس سے سبق سیکھنا چاہیے اور اپنی ہٹ دھرمی اور اوچھے ہتھکنڈوں سے باز آجانا چاہیے۔ ایک بات بتائیں، سرگزشت کس تاریخ تک مارکیٹ میں پہنچ جاتا ہے؟ (26-25 تک)۔ نیز یہ کہ آپ ہر ماہ یہ اشتہار دیتے ہیں کہ پرچا لیٹ ملنے کی صورت میں فلاں نمبر پر رابطہ کریں تو وہ لوگ اس سلسلے میں ہماری کیا مدد کرسکتے ہیں (ہمارے علم میں بات آجاتی ہے کہ پرچا کہاں کہاں وقت پر نہیں پہنچا)۔ منشی محمد عزیز نے خوب صورت اور جامع تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت کے حقدار ٹھہرے۔ بہت بہت مبارک ہو۔ جناب شاہد جہانگیر شاہد کے لیے ہم تہہ دل سے دعا گو ہیں کہ خداوند کریم ان کو جلد از جلد صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ ''رائیگاں'' ایک عبرت ناک تحریر تھی۔ شاہ میر نے بے رحمی اور درندگی کا مظاہرہ کیا۔ ''بے توقیر جنت'' بھی ایک دل دہلا دینے والی تحریر تھی۔ نوجوان نسل کا اپنے بزرگوں کے ساتھ یہ رویہ پڑھ کر دل کانپ اٹھا۔ غنڈہ گردی پر مبنی کہانی ''در توبہ'' ہمارے معاشرے کی عکاسی کررہی تھی۔ بااثر افراد اور پولیس کی غنڈہ گردی اب ایک عام سی بات ہے۔ غریب اور بے سہارا افراد کو دن بدن کچلا جارہا ہے اور غریب فریاد بھی نہیں کرسکتے۔ کیونکہ انہیں یقین ہے کہ ان کی کہیں نہیں سنی جائے گی۔ مشکل سے یقین کرنے والی تحریر ''داستانِ کرب'' ہم نے سکتے کی حالت میں پڑھی۔ یقین ہی نہیں آتا کہ انسان اتنا بھی ظالم ہوسکتا ہے یہ تو سراسر درندگی ہوئی اور اس پر ستم یہ کہ اتنی بے رحمانہ سزا دینے والے اس قدر درندگی کا مظاہرہ کرکے بھی اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ''نومبر کی شخصیات'' بھی ایک معلومات سے بھرپور تحریر تھی جس میں کافی اہم شخصیات شامل تھیں۔ وحید مراد کا تذکرہ ہمیں بہت بھلا لگا۔''

☆ عمران جونانی کا تبصرہ کراچی سے۔ ''سب سے پہلے تو شاہد جہانگیر بھائی کو میرا دعاؤں بھرا سلام پہنچے۔ آپ کے لیے دل سے دعا ہے کہ اوپر والا مکمل صحت دے، اس کے علاوہ تمام بیماروں کے لیے عافیت اور مرحومین کے لیے مغفرت کا سوال ہے۔ ابتداء میں کچھ فرمائشیں ذہن میں اس کے بعد آگے چلیں گے۔ ایک تو یہ کہ قوی خان، مستنصر حسین تارڑ، نثار قادری، جمیل بسمل اور ایسے ہی دوسرے لیجنڈ ٹی وی سے وابستہ لوگوں کے بارے میں کوئی مضمون لگے تو موج ہوجائے، مزید یہ کہ جس طرح پچھلے دو ماہ میں ساہیوال اور کراچی کے بارے میں مضامین لگے اسی طرح اگر نئے سال میں ہر ماہ پاکستان کے چند شہروں کا تذکرہ ہو تو اچھا سلسلہ ثابت ہوگا۔ نومبر کا شمارہ مشکل حالات میں ملا۔ سرگزشت کا سرورق ہر ماہ خوب سے خوب تر ہوتا جارہا ہے۔ رنگوں کا خوب صورت امتزاج، اڑتی زلفیں، دل میں اترتی مسکان، بس یہ جو پری زاد تیر کمانی ہاتھ میں لیے نشانہ لگا رہا ہے اس کی توند کچھ بڑی ہوگئی (یونانیوں نے کیوپڈ کا مجسمہ ایسا ہی بنایا ہے) اداریے میں آپ نے قدرے مختلف موضوع پر بات کی اس میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ بچوں پر نظر رکھنے کے ساتھ ان کے سامنے خود بھی سنبھل کر رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ ماں باپ بچوں کے سب سے پہلے رول ماڈل ہوتے ہیں۔ دلچسپ انداز میں کسی شخصیت کی زندگی ایک صفحے میں بیان کردینا مہارت کا کام ہے جو آپ ہر ماہ تسلسل کے ساتھ کرتے ہیں۔ سلمٰی اعوان ''عیار ساحرہ'' کی داستان کے ساتھ موجود ہیں۔ اتنی خوب صورت اور ذہین خاتون کا انجام عبرت نگاہ ہے۔ میں نے اس شمارے کے ابتدائی سو صفحات اسپتال میں پڑھے۔ میرے نانا کی طبیعت خراب ہے وہ ایڈمٹ تھے اور میری رات کو ڈیوٹی تھی۔ وہاں کے مخصوص سناٹے میں ''داستانِ کرب'' نے دل دہلا دیا۔ واثیہ اور کشمالہ مبارک باد کی مستحق ہیں جنہوں نے عمدگی سے ایک ایک سزا کا حال بیان کیا کہ بندے نے خود کو وہیں آس پاس محسوس کیا۔ انسان عجیب مخلوق ہے۔ اچھائی پر آئے تو معراج حاصل کرتے ہوئے فرشتوں کو پیچھے کردیتا ہے اور پستی میں اترے تو شیطان پناہ مانگے۔ ایاز راہی کے الفاظ کا چناؤ خوب ہے۔ دقیق علمی موضوع تو پوری تحقیق کے ساتھ پیش کیا۔ خاصے کی چیز ثابت ہوئی۔ صائمہ اقبال کے لیے اس مرتبہ بھی دل سے واہ واہ نکلی۔ خوب صورت سلسلہ ہے تھوڑی سی دیر میں کتنی ہی نابغۂ روزگار شخصیات سے ملاقات کروا دیتی ہیں۔ ''معیارِ خیال'' پر گفتگو نہ ہو تو تشنگی رہ جاتی ہے۔ منشی صاحب نے خوش آمدید کہا۔ شکریہ۔ اس کے علاوہ ناصر حسین، باجی گل اور روبی انصاری نے بھی واپسی پر حوصلہ افزائی کی اور تبصرہ پسند کیا، بڑی نوازش۔ اویس شیخ وعلیکم السلام، منظر خان کا خوب صورت تبصرہ تحریروں پر مشتمل ہے۔ نثار احمد امیری دل سے دعا ہے کہ آپ کے گاؤں کی کہانی منظر عام پر آئے اور اوپر والا آپ کی زندگیوں میں خوب صورت تبدیلی لائے۔ ناصر حسین نے خوب صورتی کے ساتھ شمارے پر تبصرے کا حق ادا کیا۔ ساتھیوں سے علیک سلیک کی، پرانے دوستوں کو یاد کیا بہت خوب۔ ندیم اقبال کے جنون اور خوش ذوقی نے متاثر کیا۔ معین الدین کی پُرخلوص تعریف ہمارے بھی دل کی آواز ہے۔ باجی گل طاہرہ گلزار کی اتنی محبت بھری باتیں واہ واہ مزہ آگیا۔ رانا شاہد طویل غیر حاضری کے بعد خوب صورت انداز میں نظر آئے۔ منظر خان، انور عباس، مطاہر بیگ، ملک شیر ملک، روبی انصاری اور سلیم قیصر نے بھی کھل کر تفصیل سے باتیں کیں ان سب کے خطوط بہت پسند آئے۔ ''سفر امریکا'' کا خاتمہ مناسب وقت پر ہوا۔ اگر ایک آدھ قسط مزید ہوتی تو شاید بور ہوجاتے۔ نہایت خوب صورتی سے داستان کو سمیٹا گیا۔ ایوارڈ یافتہ مسلمانانِ ہند کا مفید تذکرہ۔ اچھوتا آئیڈیا ہے۔ اس میں یوسف خان کا نام شاید رہ گیا غالباً ان کو بھی پدم شری یا بھوشن مل چکا ہے۔ ''تاریخ عالم'' میں منظر امام نے نہ صرف یہ کہ دلچسپی برقرار رکھی ہے بلکہ اس کو مسلسل بڑھاوا دیے چلے جارہے ہیں۔ منظر نگاری اتنی عمدہ ہے کہ انسان خود کو اسی دور میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ انور فرہاد کی قلم گری نے دل اداس کردیا۔ ہما اور صادق علی کی داستانیں ہم ایسے

غافل انسانوں کے لیے نوشتہ دیوار ہیں۔ اوپر والا سب کو ایسے عبرت ناک انجام سے بچائے۔ پہلی سچ بیانی ''موقع'' کو آپ نے بجا طور پر ٹائٹل کا درجہ دیا۔ سچی کہانی کے اسکیل پر پوری اترتی ہے۔ (اختصار کا فن آزمائیں، قلم میں روانی آئے گی)۔''

☆ معظم علی کا خلوص نامہ بنوں سے۔ ''یک مُٹھی سرگزشت کو جدول کی شکل میں دیا کریں۔ نئے صاحب کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ شاہد صاحب کی علالت کا پڑھ کر دکھ ہوا۔ سلیم قیصر صاحب کا خط اچھا تھا لیکن یہ باتیں کسی اخبار میں زیادہ موزوں ہوتی ہیں۔ روبی انصاری صاحب اطلاعاً عرض ہے کہ سرسید مرحوم کی کاوشیں عام مسلمان کے لیے نہیں بلکہ ''خاص'' مسلمان کے لیے تھیں۔ اشفاق احمد مرحوم کی کتاب ''زاویہ'' میں انہوں نے ایک سابقہ یہودی عالم کے حوالے سے کہا تھا کہ یہودی اسرائیل بنا کے خانہ کعبہ کے زیر اثر آجائیں گے۔ کچھ یہی حال مسلمانوں کا ہندوؤں سے قربت کا ہوا کہ ہم بھی اونچ نیچ کرنے لگے ہیں۔ سرسید نے اپنی طرف سے صرف ایلیٹ مسلمانوں کو ہی انگریزی تعلیم سے روشناس کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بھلا ہو انگریزی جمہوریت کا کہ موچی اور کسان کے بیٹے بھی لکھ پڑھ گئے (اس دور میں عام مسلمان گھرانوں میں تعلیم کا رجحان صفر تھا۔ لوگ تعلیم کو بزدلی کا محور کہتے تھے۔ مدرسوں تک تعلیم محدود تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو مسلمانوں سے تعلیم میں آگے تھے اور سرکاری نوکریوں پر قابض تھے۔ جو خوش حال تھے وہی تعلیم کو اہمیت دیتے تھے)۔ ''انقلابی'' املا اور قواعد کی غلطیوں سے پُر تھا۔ اُمید ہے ڈاکٹر صاحب نے PhD کا مقالہ اس طرح سے نہیں لکھا ہوگا۔ صفحہ 26 دوسرے کالم میں لکھا ہے ''اور نہیں تو کیا'' کے بجائے ''اور میں تو کیا''۔ صفحہ 42 پر پہلے کالم کا دوسرا پیرا منطق اور قواعد کی دھجیاں اڑا رہا ہے (جی چیک کیا ''کا'' کی جگہ ''کو'' چلا گیا ہے۔ شکریہ نشاندہی کا)۔ صفحہ 43 پر لکھا گیا ہے میڈرڈ سے یورپ کے جنوب مغربی جزیرہ نما کی انتہا تک جانے کے لیے برف گاڑی سے یورال سینٹ پیٹرز برگ، وہاں سے چکر کاٹ کے آسٹریا، سوئٹزرلینڈ، فرانس سے ہو کے کاڈز تک آیا جاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہوگا اگر میں بنوں سے گلگت وہاں سے کاشغر، چین وہاں سے کشمیر پھر تی دہلی سے ہوتا ہوا حیدرآباد دکن سے ممبئی جاؤں اور کشتی میں بیٹھ کے ٹھٹھہ پہنچوں۔ شاید اسی کو ناک الٹے طریقے سے پکڑنا کہتے ہوں گے (راستہ مصنف نے لکھا ہے اور ہوسکتا ہے اس وقت اسی شاہراہ کا استعمال ہوتا ہو جیسے ہمارے ہاں بہت سے شہروں کے لیے الٹی طرف جا کر آنا پڑتا تھا)۔ صفحہ 42 ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ ''سوئٹزرلینڈ چونکہ کمزور تھا لہٰذا اس نے غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔'' میرا نقطۂ نظر ہے کہ غیر جانبدار رہنے کے لیے قوت کا ہونا جانبدار بننے سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ اگر آپ کے پیچھے عوام نہ ہو آپ جلد یا بدیر کسی قطب کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک سوئٹزرلینڈ کا سوال ہے تو اتحادی ممالک اچھی طرح جانتے تھے کہ اس کا جھکاؤ کس کی جانب ہے۔ صفحہ 42 پر اچانک ڈاکٹر صاحب سربوں کو کھینچ لائے۔ یہ نہیں بتایا کہ جنگ عظیم اوّل کو باقاعدہ طور پر شروع کرنے کا سہرا انہی (سربوں) کو جاتا ہے، اسی وجہ سے نعرے بازی ہو رہی تھی۔ ''عیار ساحرہ'' کا نام میں نے بھی کہیں پڑھا ہے لیکن جو تفصیلات سلمٰی صاحبہ نے دی ہیں ان کا علم نہیں تھا۔ صفحہ 64 کے دوسرے کالم میں Genius کے بعد مرد لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ عقل مندی جنس کے تابع تھوڑی ہوتی ہے (مصنف نے عرب پر لکھا ہے جہاں مردوں کا معاشرہ بلکہ سخت ترین معاشرہ ہے اس لیے جینئس مرد لکھا)۔ مضمون بہرحال اچھا تھا۔ ''داستانِ کرب'' بھی ٹھیک تھا۔ شاید پاکستان کی ٹوٹی سڑکوں پر فراٹے بھرتی چنگ چی رکشوں کے مسافروں کا حال چینی بادشاہوں کو پہلے سے ہی معلوم ہو گیا تھا اس لیے ہزار زخم کو وہ چنگ چی کہتے تھے۔ راہی صاحب اب کی بار چھا گئے۔ کمال کا مضمون لکھا ہے۔ حضرت عمرؓ کے ابن زبیر اور ابنِ ہرم بن سنان سے کیے گئے سوال جواب سے ان کی فراست عیاں ہوتی ہے۔ اگرچہ اتفاقاً اس مضمون کو پڑھنے سے پہلے میں نے ایک ناول کے آخر میں پڑھا کہ فلاں صاحب جو کہ اپنے وقت میں Botanist تھے۔ بے شمار سفر کیے۔ سفرنامے اور باغات اور پودوں پر کتب تحریر کیں لیکن آج لوگ ان کی کتابیں تو بھول گئے پر ان کے نام کی آئس کریم شوق سے کھاتے ہے۔ اپنے اپنے تجربے کی بات ہے۔ یہ تو خیر جملہ ہائے معترضہ ہیں۔ مضمون میں درج شعرا میں سے مجھے زہیر بن ابی سلمٰی اور عنترہ بن شداد العبسی کی شخصیت نے متاثر کیا۔ عنترہ عزتِ نفس قائم رکھنے اور بہادری کے لیے جب کہ زہیر اپنے اشعار کی خود ہی اصلاح و ترمیم کے لیے پسند آئے۔ میری طرح دوسروں پر تنقید کرنا تو آسان ہے لیکن اپنی درستی آپ کرنا مشکل کام ہوتا ہے۔ ''نومبر کی شخصیات'' میں سے جتوئی مرحوم کا تذکرہ شاید آپ اگست کے مہینے میں کر چکے ہیں۔ درخواست ہے کہ صرف کسی مہینے میں پیدا شخصیت کا تذکرہ ہی اس مہینے میں کریں (آپ کی نشاندہی نوٹ کر کے مصنفہ کو بتا دی ہے)۔ شفیع شاہ صاحب کی آواز ان کے صداکار ہونے کی چغلی کھاتی تھی۔ ''تیسرا کنارہ'' ڈراما راحت کاظمی والا ہے یا دوسرا ہے؟ اس ڈرامے کے آخر میں نیّرہ نور صاحبہ کی خوب صورت آواز میں فیض صاحب کی ایک نظم آتی تھی جو میری پسندیدہ نظم ہے۔ شکیب جلالی اور حسن ناصر پر اگر تفصیلی مضامین دے سکیں تو مہربانی ہوگی۔ صائمہ صاحبہ نے جس غیر جانبداری سے مضمون کو برتا ہے اس پر وہ لائق تحسین ہیں۔ ''شاعر خوش نوا'' سرسری طور پر پڑھا۔ جمیل مظہری صاحب کا جو انتخاب پیش کیا گیا ہے اس سے تو وہ کوئی خاص شاعر معلوم نہیں ہوتے۔ البتہ زین مہدی صاحب کا انداز تحریر بہت بھایا۔ جس الف لیلوی طرز میں ایک کے بعد ایک واقعہ تحریر کیا ہے اس بنا پر میں انہیں اس ماہ کے بہترین لکھاری کا ایوارڈ دیتا ہوں (انتخاب کلام دینے سے تحریر طویل ہوتی ہے۔ ہم صرف سرگزشت شائع کرتے ہیں۔ جمیل مظہری کا اردو ادب میں ایک خاص مقام ہے۔ بھارتی حکومت نے انہیں پدم بھوشن ایوارڈ دیا ہے)۔ ''سفر امریکا'' کے نیچے آخری حصہ دیکھ کر اطمینان ہوا۔ درخواست ہے کہ کسی طرح ابنِ عنقا کو پنجرے میں بند کر کے ان کے نغمات قارئین کو سنوائیں، نہیں تو سفرناموں کو جانے

دیں۔ ''مسلمانِ ہند'' کے دو صفحوں میں کئی نام گنوا دیے گئے۔ یک صفحی سرگزشت لکھنے کے لیے شاہ ثاقب کا نام تجویز کرتا ہوں (بہت شکریہ، تجویز نوٹ کرلی)۔ ''تاریخ عالم'' تاریخ ماقبل پاکستان بن گئی ہے۔ معاملہ لگتا ہے منظر امام صاحب کی گرفت سے باہر نکل گیا ہے۔ کسی دوسرے لکھاری کو اس سلسلے پر مامور کیا جائے (جی ہاں، صحیح کہا یہ تاریخ ماقبل پاکستان ہی ہے)۔ جب سے انور فرہاد نے دادا جی کو دھتورا سنگھوایا ہے یعنی غائب کیا ہے تب سے ان کی فلمی داستانیں مرحومین کی برسی پر چھپنے والی یک کالمی اخباری انتقال پُرملال کی سطح پر آگئی ہیں۔ امید ہے فرہاد صاحب دھیان دیں گے۔ صفحہ 18 کی کترن میں لکھا ہے کہ ''انقلاب کے بعد اصلاح پسند...... غائب ہوگئے ہیں۔'' انقلاب کیا گیا 2004ء کے بعد آیا تھا۔ موجودہ ایرانی صدر بھی اصلاح پسند ہی ہیں۔ (کاش لکھتے وقت ''اسلامی انقلاب'' کا جملہ ذہن میں رکھتے تو یہ سوال نہ کرتے۔ ویسے ہر لکھاری کا اپنا طرزِ تحریر ہوتا ہے۔ جملوں کی بندش وہ اپنی پسند سے کرتا ہے جو اس کو دیگر مصنفین سے الگ شناخت دیتا ہے۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے اغلاط کی نشاندہی کی)۔''

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا پیغام پشاور سے۔ ''کیسے ہیں اس بزم یار ''معبر خیال'' کے باسیوں، اپنا تو حال یہ ہے کہ ایک انار سو بیمار یعنی کہ ایک ہم ہیں اور سو غم ہیں۔ ابھی ابھی اسپتال سے لوٹا ہوں۔ لکھنے پر طبیعت مائل نہیں، انشاء اللہ آیندہ ماہ کوشش کروں گا۔''

☆ اشفاق احمد رضوی عطاری ملتان سے رقمطراز ہیں۔ ''اس ماہ کا شمارہ بہو کی داستان کی وجہ سے آنسو پونچھ پونچھ کر پڑھا۔ یہ دنیا کتنی بے حس ہے۔ اتنی بڑی اداکارہ اور ایسے کرب سے گزری، سونے کے چمچے سے کھانے والی کس کسمپرسی کی موت مری، آہ......! ایک ٹی میں عبدالحفیظ کاردار کی حالاتِ زندگی بیان کی گئی ہے۔ خوشی ہوتی ہے جو اپنوں کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ وہ کس طرح اوج پر پہنچا۔ اگر اوباما نے ترقی کی تو اس کی روداد ہم معلومات میں اضافہ کے لیے پڑھیں گے لیکن کسی پاکستانی کی حالاتِ زندگی پڑھیں تو خوشی ملے گی۔ جذبہ بیدار ہوگا، اس لیے کاردار جیسے لیجنڈ کے بارے میں پڑھ کر خوشی دگنی ہوگئی۔ ''عیار ساحرہ'' پڑھ کر ہم مسلمانوں کو سبق سیکھنا چاہیے۔ جرٹروڈ بیل پر ایک طویل تحریر بہت پہلے پڑھی تھی اور مجھے اس عورت سے کراہیت محسوس ہوئی تھی۔ اس کے کالے کرتوت اور عرب قبائل کے سرداروں کے کالے کارنامے سرسری انداز میں بیان ہوئے۔ اس نے مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے، سلطنت عثمانیہ کو ختم کرنے کے لیے بغاوت پھیلانے کے لیے کس طرح اپنے جسم کو استعمال کیا اس کا ذکر نہیں تھا۔ اسی نے سلطنت عثمانیہ کو توڑ کر عراق، شام اور کئی دیگر ممالک بنوائے۔ برطانیہ سے اسے اسی کام کے لیے بھیجا گیا تھا اور اس نے بخوبی اپنا کردار نبھایا۔ سلطنت عثمانیہ کا تیاپانچہ کرکے رکھ دیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ انگریزوں نے سلطنت عثمانیہ کو توڑنے کے لیے جن جار مہروں کو بھیجا تھا وہ سب کامیاب رہے، لارنس آف عریبیہ ہو یا جرٹروڈ ان کی سازشوں سے اتنی بڑی سلطنت چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم ہوگئی۔''

☆ نازیہ نازی لاہور سے لکھتی ہیں۔ ''اس بار کا سرگزشت وقت سے پہلے مل گیا۔ موقع از جلیل بہت اچھی لگی۔ ڈاکا کی بدولت اسے ایک اچھی بیوی مل گئی۔ واہ واہ۔ درتوبہ از وقار جلیل بھی پسند آئی لیکن معاف کیجیے گا ایسے پولیس والے کہاں ہوتے ہیں۔ 99 فیصد پولیس والوں کی وجہ سے باقی کے پولیس والے خوامخواہ بدنام ہورہے ہیں۔ میرے خواب از احسن علی رضا کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہر لڑکی کا خواب اپنا گھر ہوتا ہے، ویلڈن۔ تکمیل عشق از دانیہ صدیقی بھی غضب کی کہانی ثابت ہوئی۔ لٹو محبت از صدف آصف سچ بیانیاں کم اور افسانہ زیادہ لگی۔ دراصل انداز تحریر بالکل افسانوی جیسا ہے۔ امید ہے صدف آصف اپنی اس خامی پر قابو پالیں گی۔ بے توقیر جنت از بنت مریم لاجواب بلکہ دل کو چھو لینے والی سچ بیانی ہے۔ کل ملا کر تمام سچ بیانیاں اچھی تھی۔''

☆ مظہر ایوب کی مانسہرہ سے آمد۔ ''اداریہ نے میرے دل کی بات کہی ہے۔ اگر ہم بچپن سے بچوں پر توجہ دیں تبھی معاشرہ ترقی کرسکتا ہے۔ ورنہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ بچوں کو کھلونا پستول دینا بہت بڑی غلطی ہے۔ اسی طرح آج کل ٹی وی ڈراموں میں جو مار دھاڑ دکھائی جاتی ہے اس پر بھی پابندی لگنی چاہیے۔ ابھی پورا سرگزشت پڑھا نہیں ہے اس لیے تبصرہ کے لیے معذرت۔''

☆ اقبال فصیح خان نے کراچی سے لکھا ہے۔ ''نومبر کے شمارے کی سرتاج تحریر ''سخنور'' ہے۔ دوسرے نمبر پر ''نومبر کی شخصیات''، ''شاعر خوش نوا'' بھی اچھی تحریر ہے۔ ''عیار ساحرہ'' اور ''انقلابی'' بھی پسند آئی۔ ''داستانِ کرب'' نے خوف میں مبتلا کردیا۔ توبہ ہے انسان ایذا رسانی کے لیے ایسے ایسے آلات بناتا تھا۔ مختصر سی تحریر ''ہند کے مسلمان'' بھی پسند آئی۔''

☆ حنیف ادیب (لاہور) آپ ''ڈھولن پور کی ڈھولک'' کسی دوسرے پرچے میں بھیج دیں۔
☆ عدنان حسین خان (احسن آباد) برانڈڈ سن گلاسز سرگزشت کے مزاج کا نہیں ہے۔
تاخیر سے موصول خطوط: راشد ایاز، نوشین ملک، کلیم الدین شیخ، کلیم احمد (کراچی)، نگار سلطانہ (لاہور)، عنایت علی انجم (مانسہرہ)، وسیم الدین (حیدرآباد)، عباس علی (سکھر)، کاوش عباسی (ہالا نیو) بادشاہ خان (ڈی آئی خان)، محمد کلیم (پشاور)، حسین چنگیزی (کوئٹہ)۔

جہدِ برق

ڈاکٹر ساجد امجد

سارے ولولے سارے حوصلے جب ثابت ہوں کھوکھلے تو اندر کا انسان بیدار ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ انسان بھی دانا ہو۔ مگر وہ تو فکرِ موضوعِ ذات کا شناور تھا یہی وجہ تھی کہ اس پر جتنے عذاب اترے بے حساب اترے لاجواب اترے۔ اسے قدم قدم پر زندگی کا جزیہ دینا پڑا۔ کارزارِ حیات میں سرخرو ہونے کے لیے ظلمتِ دوراں کے افسوں کو توڑنے کے لیۓ روشنی کے سلسلوں میں تیرگی کو جلانا پڑا۔ اک نئے عزم سے مقابل پیکاں ہو کر شکست کے دیو کو پچھاڑنا پڑا ۔اس نے ہرگام ہر ایک نئی تاریخ رقم کی اور دکھلایا کہ بس انسان کے اندر حوصلہ ہونا چاہیے۔ راہ میں حائل پہاڑ خود ہی سرنگوں ہو جائیں گے۔

مخالف حالات میں بھی ترقی کی راہ ڈھونڈنے والے قلم کار کا زندگی نامہ

وہ پرندے ضرور تھے کیونکہ ان کے پر تھے اور وہ اڑ بھی رہے تھے لیکن وہ پرندوں کی کس نسل سے تعلق رکھتے ہیں، یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ یہ پرندے بڑی تعداد میں آسمان سے زمین کی طرف آرہے تھے۔ جب وہ قریب آئے تو ان میں سے ایک کی لمبی چونچ میں ایک بڑی سی تختی لٹکی نظر آئی۔ اس تختی پر سنہری حروف میں ”غلام جیلانی“ لکھا ہوا نظر آیا۔ وہ اتنی گھبرا گئی تھیں کہ یہ بھی یاد نہ رہا کہ یہ ان کے بیٹے کا نام ہے۔ آنکھ کھلی تو انہیں فوراً یاد آگیا۔ اس پرندے کی چونچ میں جو تختی لٹک رہی تھی اس پر جو نام سونے کی طرح چمک رہا تھا وہ تو میرے غلام جیلانی کا تھا۔ دل کہہ رہا تھا خواب بڑا مبارک ہے۔ مسجد سے فجر کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنے شوہر محمد قاسم شاہ کے بستر کی طرف دیکھا۔ بستر خالی پڑا تھا۔ وہ اذان سے پہلے ہی مسجد کے لیے نکل گئے تھے۔ وہ بھی اٹھیں۔ وضو کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ نماز کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ نماز میں بھی اس خواب کا خیال آتا رہا۔ نماز کے بعد انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ایسا مبارک خواب دکھایا۔ نماز کے بعد وہ قرآن مجید پڑھنے بیٹھ گئیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے شوہر وظائف وغیرہ سے نمٹنے کے بعد دیر سے مسجد سے آتے ہیں۔ وہ نہایت اطمینان سے تلاوت کر رہی تھیں کیونکہ شوہر کے آنے تک ان کا جاگنا ضروری ہو گیا تھا۔ انہیں جلدی ہو رہی تھی کہ قاسم شاہ گھر آئیں اور وہ انہیں خواب سنائیں۔ انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ قاسم شاہ گھر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے قرآن شریف بند کیا اور قاسم شاہ کو خواب سنانے پہنچ گئیں۔ جو کچھ دیکھا تھا من وعن سنا ڈالا۔ وہ سر جھکائے سنتے رہے۔ بیچ بیچ میں سوالات بھی کرتے رہے۔

وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ صرف دوسری جماعت پاس تھے اس کے باوجود پٹواری بنا دیے گئے تھے۔ نہایت عابد و زاہد اور تہجد گزار تھے۔

انہوں نے پورا خواب غور سے سنا اور بیوی کو مبارک باد دی۔ ”مبارک ہو کہ تم نے یہ خواب دیکھا۔ اللہ کی ذات

سے کچھ بعید نہیں حالانکہ ظاہری آثار تو ایسے نظر نہیں آتے کہ ہماری اولاد میں سے کوئی ایسا ہو جس کا نام تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے۔ تعبیر بتاتی ہے کہ یہ بچہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دے گا کہ اس کا نام تاریخ میں محفوظ رہے گا۔''

''غلام جیلانی کی ماں، ہم ضلع اٹک کے قصبے ''بسال'' میں آباد ہیں۔ اٹک بھی کوئی بڑا شہر نہیں ہے اور ہم تو اٹک سے بھی بیس میل دور آباد ہیں۔ پینے کا پانی تک تو یہاں میسر نہیں۔ نہ کوئی کنواں ہے نہ چشمہ نہ دریا برساتی نالے کے کنارے گڑھے کھود رکھے ہیں جہاں سے تم ڈول کے ذریعہ پانی نکال کر لاتی ہو۔ ایسے پسماندہ علاقے میں پیدا ہونے والا بچہ کون سا ایسا کارنامہ انجام دے سکتا ہے کہ تاریخ اسے محفوظ کر لے۔ ویسے اللہ کی ذات بے نیاز ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔''

''میرا دل کہتا ہے کہ غلام جیلانی پڑھنے لکھنے میں نام پیدا کرے گا۔''

''میں اس کی تعلیم پر پوری توجہ دوں گا۔'' قاسم شاہ نے کہا۔

اس خواب کے طفیل اس کا بچپن ناز و نعم میں گزرنے لگا۔ والدین کو اس سے بڑی توقعات تھیں۔ بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا کہ وہ ذرا بڑا ہو تو اسے اسکول بھیجا جائے۔ گاؤں میں ایک ہی پرائمری اسکول تھا۔ وہی اس کی منزل تھی۔ اس کی کیا پورے گاؤں کے بچوں کی یہی ایک منزل تھی جسے پڑھنے کا شوق ہوتا یہاں پہنچ جاتا۔ پٹ پٹا کر دوسری تیسری کلاس پاس کر لیتا۔ کوئی بہت ہی ڈھیٹ ہوتا تو پانچویں تک پہنچ پاتا ورنہ راستے ہی میں شوق پورا کر کے کھیتوں میں پہنچ جاتا۔ ماں باپ کا ہاتھ بٹاتا۔

وہ پانچ سال کا ہوا تو قاسم شاہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بسال کے پرائمری اسکول پہنچ گئے۔ یہاں ایک ہی ماسٹر تھا جس کا نام محمد زمان تھا۔ وہ اکیلا ہی ہر جماعت کو پڑھاتا تھا۔

''ماسٹر صاحب، یہ میرا بیٹا غلام جیلانی ہے۔ اسے اسکول میں داخل کرانے لایا ہوں۔''

''اس سے پوچھ بھی لیا ہے کہ یہ پڑھنا بھی چاہتا ہے یا بھینسوں کا چارا کا شوق ہے گا۔''

''ماسٹر صاحب، اس سے کیا پوچھنا۔ یہ ابھی کیا جانے تعلیم کیا ہوتی ہے۔''

''مجھے لگتا ہے یہ کبھی جان بھی نہیں سکے گا۔ صورت ہی سے شرارتی معلوم ہوتا ہے۔''

''ہاں شرارتی تو ہے۔ کھیل کود میں زیادہ دل لگتا ہے۔ اسکول میں داخل ہو جائے گا تو کھیل کود بھی جاتا رہے گا۔''

''ٹھیک ہے، اسے چھوڑے جاؤ۔ میں اس کا نام رجسٹر میں اتار لوں گا۔''

محمد قاسم شاہ کے جاتے ہی ماسٹر صاحب نے غلام جیلانی کا کان اس زور سے کھینچا کہ وہ مچل کر رہ گیا۔

''بیٹا جی، یہاں پڑھنے آئے ہو تو پڑھنا ہی ہوگا۔ اگر یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو یہ کان ہمیشہ کے لیے اکھاڑ کر پھینک دوں گا۔'' انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس کا کان بڑی زور سے کھینچا۔

غلام جیلانی کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اسکول سے بھاگا بھی جا سکتا ہے لیکن اسی وقت اسے اپنا کان یاد آ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں توبہ کی کہ وہ اسکول سے نہیں بھاگے گا۔

اس نے پابندی سے اسکول جانا شروع کر دیا۔ اس پابندی سے ماسٹر نور محمد کا اصل روپ اس پر ظاہر ہو گیا۔ یہ ماسٹر نہایت سنگدل تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بچوں کو لاتوں، گھونسوں اور بیدوں سے بے تحاشا پیٹتا تھا اور پھر ایک دن وہ بھی ماسٹر کے ظلم کا نشانہ بن گیا۔ گھر پہنچا تو منہ پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ ماں نے دیکھا تو جواب طلبی ہوئی۔ اس نے بتایا کہ سبق یاد نہ کرنے پر ماسٹر صاحب نے تھپڑوں کی بارش کی ہے۔ اس نے ہمدردی کی توقع میں بتایا تھا لیکن ماں کا جواب یہ تھا کہ ماسٹر صاحب نے اچھا کیا۔ سبق یاد نہیں کرو گے تو یہی ہوگا۔ دراصل گاؤں کے ماحول میں یہ کوئی اجنبی بات نہیں تھی۔ گاؤں کے بچے اسی طرح پٹتے تھے۔ ماں باپ یہی سمجھتے تھے کہ پٹیں گے نہیں تو پڑھیں گے کیسے۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دوسرے دن اسکول چلا گیا لیکن پڑھنے سے دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی جماعت کا نالائق ترین لڑکا شمار ہونے لگا۔ دن میں چار پانچ بار پٹتا۔ گھر والوں سے حمایت کی توقع فضول تھی۔ اب اسے جو کچھ کرنا تھا خود کرنا تھا۔ ایک دن وہ گھر سے اسکول کے لیے نکلا اور کھیتوں میں پہنچ گیا۔ ایک جگہ بہت سے بیری کے درخت لگے ہوئے تھے۔ وہ بیر توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ اچھا مشغلہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ وقت بھی کٹ رہا تھا اور پیٹ بھی بھر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر چند لڑکوں پر پڑی۔ یہ اس کے اسکول کے لڑکے تھے جو اس کی طرف آ رہے تھے۔ وہ

خوش ہو گیا کہ وہ بھی اسی کی طرح اسکول سے بھاگ کر آئے ہوں گے۔ اس نے بھاگنے کی کوشش تک نہیں کی اور پکڑا گیا۔ دو لڑکوں نے اس کے پاؤں پکڑے دو نے ٹانگیں اور ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے اسکول تک لے گئے اور ماسٹر جی کے سامنے لے جا کر پٹخ دیا۔

ماسٹر جی نے اسے مرغا بنا کر اس کی پیٹھ پر ایک لڑکا بٹھا دیا اور خود بچوں کو پڑھانے میں مشغول ہو گئے۔

اس سزا سے چھٹکارا ملا تو اس سے سیدھا کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ گھر پہنچنے تک یہی حالت تھی لیکن اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا البتہ دل میں یہ تہیہ کر لیا کہ اس مرتبہ تو دھوکے سے پکڑا گیا اب ایسی جگہ جا کر چھپوں گا کہ ماسٹر صاحب کے بھیجے ہوئے لڑکے مجھے ڈھونڈ ہی نہ سکیں۔ وہ ایک دو دن اسکول جاتا رہا کہ ذرا کر سیدھی ہو جائے اور ایک دن پھر غائب ہو گیا۔ وہ ایک بڑی چٹان کے پیچھے اس طرح چھپ کر بیٹھا تھا کہ کسی کی نظر وہاں نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن اسکول کے لڑکوں نے اسے وہاں سے بھی ڈھونڈ نکالا۔ اسے پھر مرغا بنا کر پیٹھ پر ایک لڑکا بیٹھا دیا گیا۔

اب یہ ہر چوتھے پانچویں روز کا مشغلہ بن گیا تھا۔

یہ سلسلہ نہ جانے کب تک چلتا کہ اس کی دعا قبول ہو گئی۔ اس کے والد کے پیر و مرشد حضرت احمد میروی بسال کے سالانہ دورے پر تشریف لائے۔ بڑی تعداد میں مرید بھی ان کے ہمراہ تھے۔ یہ قافلہ گاؤں کے شمال میں ایک مقام پر اترا اور خیمے لگا لیے۔ اس گاؤں میں ان کے جتنے مرید تھے ان کی خدمت میں پہنچ کر نذریں دینے لگے۔ قاسم شاہ نے اپنے دو بیٹوں غلام ربانی اور غلام جیلانی کو اپنے پاس بلایا۔

''میرے پیر صاحب تشریف لائے ہیں اور گاؤں کے باہر ٹھہرے ہیں۔ انہیں نذر دینے اور دعائیں لینے کے لیے جانا ہے۔ کل صبح جانا ہے۔ تم دونوں بھی میرے ساتھ چلنا۔''

دوسرے دن جب گھر سے نکلنے لگے تو قاسم شاہ نے اپنے دونوں بچوں کو چاندی کا ایک ایک روپیہ دیا۔

''جب حضرت صاحب کی خدمت میں پہنچو تو اپنا اپنا روپیہ حضرت کی خدمت میں پیش کرنا۔''

محمد قاسم شاہ حضرت احمد میروی کی خدمت میں پہنچے اور دست بوسی کے بعد دونوں بچوں کو آگے کر دیا۔ ان دونوں نے باپ کی ہدایت کے مطابق ایک ایک روپیہ حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت نے نذر وصول کی اور محمد قاسم شاہ سے پوچھا۔ ''یہ بچے کیا کرتے ہیں۔''

''حضرت، میں نے انہیں سرکاری اسکول میں داخل کرا دیا ہے۔ وہاں پڑھتے ہیں۔''

یہ سنتے ہی حضرت احمد میروی کا ماتھا شکن آلود ہو گیا۔ ''انہیں آج ہی مدرسے سے اٹھا کر مسجد میں بیٹھا دو۔ اس میں ان کا بھلا ہے۔''

''جی بہتر، میں آج ہی آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔''

غلام جیلانی کا تو جیسے خواب پورا ہو گیا۔ وہ اسکول سے رہائی کی دعائیں مانگتا رہتا تھا۔ پیر صاحب نے تو اس کی مشکل ہی حل کر دی۔ گھر آتے ہی باپ نے حکم سنا دیا۔

''تم کل سے اسکول نہیں جاؤ گے۔ تمہارے لیے کوئی اور انتظام کرنا پڑے گا۔''

''جی ابا جی'' اس نے اتنی سعادت مندی سے سر جھکایا کہ اس سے پہلے اتنی جلدی کوئی حکم نہ مانا ہوگا۔

انتظام تو اتنی جلدی کیا ہوتا مگر یہ ضرور ہوا کہ وہ کھیلنے کودنے کے لیے بالکل آزاد ہو گیا۔ اس کے جیسے اور بے فکرے بھی تھے جو اس کے ساتھ کھیل کود میں شریک ہونے لگے۔ کبھی کبڈی، کبھی کشتی تو کبھی چور سپاہی کا کھیل کھیلا جاتا۔ ایک دن سب مل کر کھیتوں میں نکل گئے۔ خربوزوں کی فصل تھی سب نے مل کر خربوزوں پر دھاوا بول دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کھیتوں کا رکھوالا پیچھا کرتا ہوا گھر تک پہنچ گیا۔ اس کی شکایت پر خوب پٹائی ہوئی اور اس وعدے پر اس کی جان چھوٹی کہ آئندہ وہ خربوزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔

گھر والوں نے اسے معروف رکھنے کے لیے گھر کے کام کاج اس کے سپرد کر دیے۔ ان کاموں میں بھینس کے لیے کھیت سے چارا کاٹنے کا کام بھی تھا۔

ایک دن وہ کھیت سے بھینس کے لیے چھوٹی جوار کاٹ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ''ماہیا'' بھی گاتا جا رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے کان میں کسی نے زور سے پھونک ماری ہے۔ اس نے گھبرا کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک بھورے رنگ کا لمبا سانپ اس کی پیٹھ پر لہرا رہا تھا۔ بے اختیار اس کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی۔ پھر جیسے اس کے پیروں میں اسپرنگ لگ گئے ہوں۔ وہ خود بخود اچھلا اور دو گز دور جا کر گرا۔ اس کے اچھلنے سے سانپ بھی دور جا گرا۔ وہ اٹھا اور

بے تحاشا گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ گھر پہنچا تو اس کی سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں پورا واقعہ والد کو سنایا۔

''یہ اللہ ہی کی مدد تھی کہ تمہاری جان بچ گئی'' انہوں نے کہا اور شکرانے کے دو نفل پڑھے اور اس کا صدقہ اتار کر غریبوں میں تقسیم کیا۔

والدہ نے سنا تو انہیں پہلی مرتبہ وہ خواب یاد آیا جو انہوں نے دیکھا تھا۔

''مجھے خواب میں پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ میرا غلام جیلانی دنیا میں نام پیدا کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ پھر اللہ اس کی حفاظت کیسے نہیں کرے گا۔''

یہ شرارتیں اور نہ جانے کب تک جاری رہتیں کہ اس کے والد بہ سلسلہ ملازمت قریبی علاقے ''گڑھی'' منتقل ہو گئے۔

اس کے بڑے بھائی جو اس سے کئی سال بڑے تھے فارغ التحصیل ہو کر واپس آئے تو گڑھی کی مسجد میں درس دینا شروع کر دیا۔ قاسم شاہ کو اپنے مرشد کا کہنا یاد آیا کہ اسے سرکاری اسکول سے اٹھا کر مسجد میں بٹھاؤ۔ اسے اسکول سے تو اٹھا دیا گیا تھا لیکن ابھی تک کوئی مسجد نصیب نہیں ہوئی تھی۔ بڑے بھائی نور الحق نے مسجد میں درس دینا شروع کیا تو گویا گھر کا معاملہ ہو گیا۔ قاسم شاہ نے اسے اور اس سے بڑے بھائی غلام ربانی کو مسجد بھیجنا شروع کر دیا۔

ابھی یہاں پڑھتے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ نور الحق ایک مرتبہ پھر دیو بند چلے گئے۔ یہ سہارا اٹھا تو قاسم شاہ کو ایک مرتبہ پھر دونوں بچوں کی تعلیم کا سوال آیا۔ معلوم ہوا گڑھی سے پانچ میل دور اورنگ آباد نامی گاؤں میں حضرت گلاب شاہ ہیں جو روی کی مثنوی، سعدی کی گلستان، مولانا جامی کی یوسف زلیخا اور حافظ شیرازی کا دیوان کمال مہارت سے پڑھاتے ہیں۔ اسے اور اس کے بھائی غلام ربانی کو اورنگ آباد بھیج دیا گیا۔ یہ دونوں بھائی صبح نکلتے اور پانچ میل پیدل چل کر اورنگ آباد پہنچتے، اسی طرح پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے عصر کے وقت تک ''گڑھی'' پہنچتے۔

حضرت گلاب شاہ نہایت متقی، پرہیز گار تھے۔ غلام جیلانی پر خاص توجہ رکھتے تھے لیکن اس کا دل پڑھائی میں لگتا ہی نہیں تھا وہ ہر روز گڑھی سے یہاں تک پہنچ تو جاتا تھا لیکن پڑھائی میں ترقی بس برائے نام ہو رہی تھی۔ قاسم شاہ خود تو کچھ پڑھے لکھے تھے نہیں کہ دیکھتے۔ وہ کیا پڑھ رہا ہے لیکن غلام ربانی سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ وہ پڑھنے میں دل نہیں لگا رہا ہے۔ ایک دن وہ خود اورنگ آباد آ گئے اور حضرت گلاب شاہ سے ملاقات کی۔

''حضرت، میں غلام جیلانی کی طرف سے سخت پریشان ہوں۔ میں اسے کسی قابل دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ ہے کہ پڑھنے سے جی چراتا ہے۔''

حضرت گلاب شاہ نے پوری بات توجہ سے سنی اور پھر فرمایا۔

''میرے پاس ایک خاص ملکہ ہے جس میں غلام جیلانی کو ڈبکی دے دی ہے۔''

وہ زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ جو کہنا تھا انہوں نے کہہ دیا تھا۔ قاسم شاہ بھی سمجھ گئے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں اور بے فکر ہو کر لوٹ آئے۔

حضرت گلاب شاہ کے ایک فرزند مولانا عبد الرؤف تھے جو چناب شاہ کے لقب سے مشہور تھے۔ منطق، معقول، حدیث اور تفسیر پڑھانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ملک کے دور دراز علاقوں حتیٰ کہ بخارا تک کے طلبہ آپ سے تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔

حضرت گلاب شاہ نے ایک روز غلام جیلانی کو اپنے پاس بلایا۔

''میں نے تمہیں علم کے سمندر میں ڈبکی دے دی ہے۔ اب تم ڈوبو یا تیرو مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں تمہیں چناب شاہ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہی تمہیں سمجھائے گا۔''

غلام جیلانی کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا اور چناب شاہ کی خدمت میں پہنچ گیا اور ان سے منطق کی چند کتابیں پڑھیں۔

اس عرصے میں ایک انقلاب یہ آیا کہ اس کے بڑے بھائی ڈریالہ کے ہائی اسکول میں معلم عربی بن کر آئے۔ انہوں نے یہ عقل مندی کی کہ دونوں بھائیوں کو بھی اورنگ آباد سے اپنے ساتھ لے آئے۔

ڈریالہ ضلع جہلم کا ایک قصبہ تھا۔ دور افتادہ اور غیر آباد۔ میٹھے پانی کا صرف ایک چشمہ تھا اور وہ بھی ڈھائی ہزار فٹ بلند پہاڑ کی چوٹی پر۔

نور الحق کی سخت گیری کا مظاہرہ یہ دونوں بھائی پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ ان کی یہ درشتی اب بھی قائم تھی۔ کچھ دن تو لاڈ پیار ہوتا رہا اور پھر مار کٹائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کبھی سبق یاد نہ کرنے پر تو کبھی گھر کے کسی کام میں کوتاہی کی وجہ

سے۔ گھر کا تمام کام اس کے سپرد تھا۔ جھاڑو دینا، روٹی اور ہنڈیا پکانا اور ہر جمعہ کو چشمے پر جا کر کپڑے دھونا۔ اس کے باوجود روز پٹتا تھا۔ غلام جیلانی کا بڑا بھائی غلام ربانی بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں بڑے بھائی اس سے تنگ تھے۔

آج وہ دونوں بڑے بھائی کے ہاتھوں پٹے تھے۔ تازہ تازہ غصہ تھا۔ رات کو جب سونے کے لیے لیٹے تو غلام جیلانی نے بات چھیڑی۔ غلام ربانی اور غلام جیلانی میں عمروں کا فاصلہ کم تھا لہٰذا بے تکلفی بھی تھی۔

''بھائی! یہ بڑے بھائی نے تو ہمارا جینا حرام کر دیا ہے۔ اگر کچھ دن اور ساتھ رہے تو ہم مر ہی جائیں گے۔''

''کہہ تو تم بھی ٹھیک رہے ہو لیکن ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔''

''اس سے تو ہم اورنگ آباد میں ہی ٹھیک تھے۔''

''وہاں تو بڑے مزے تھے۔''

''کیوں نا ہم یہاں سے بھاگ کر اورنگ آباد چلے جائیں۔''

''بھاگ ہی سکتے ہیں تو ''بسال'' چلتے ہیں۔ بھائی جان مجھے بتا رہے تھے کہ ابا جان گڑھتی سے پھر بسال آ گئے ہیں۔''

''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ بسال کی یاد بھی بہت آ رہی ہے۔ کچھ پتا بھی ہے اگر ہم بسال چلے گئے تو پورے چھ سال بعد بسال کو دیکھیں گے۔''

''مگر یہاں سے بھاگیں گے کیسے؟''

''تم اگر میرا ساتھ دو تو میں ترکیب بتاؤں۔''

''یہاں سے چھ میل کے فاصلے پر ''ہرن پور'' کا ریلوے اسٹیشن ہے۔''

''وہ تو ہے۔''

''ہم شام کو یہاں سے نکلتے ہیں۔ ٹرین ہمیں ''کندیاں'' تک پہنچا دے گی۔ وہاں سے گاڑی بدلنی ہو گی۔ نئی گاڑی ہمیں بسال اسٹیشن پہنچا دے گی۔''

''تم نے اتنی آسانی سے نقشہ کھینچ دیا۔ یہاں سے نکلیں گے کیسے۔ بھائی جان نے دیکھ لیا تو خیر نہیں۔''

''شام کے وقت وہ ایک جگہ ٹیوشن پڑھانے جاتے ہیں۔ بس وہی وقت مناسب رہے گا۔ جب تک انہیں معلوم ہو گا ہم اسٹیشن پہنچ بھی چکے ہوں گے۔''

''گاڑی نہ جانے کب جاتی ہو گی۔''

''اگر دیر ہو گئی تو ہم پلیٹ فارم پر انتظار کر لیں گے۔ یہاں سے تو نکلیں۔''

''پھر کب نکلیں۔''

''کل شام ہی کو نکلتے ہیں۔''

انہوں نے منصوبہ تیار کر لیا اور سو گئے۔

دوسرے روز ہی دن میں اس نے کپڑوں اور چند کتابوں کی گٹھڑی تیار کر لی اور شام ہوتے ہی اسٹیشن جانے والی لاری پکڑ کر اسٹیشن پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ گاڑی رات دس بجے آتی ہے۔ غلام ربانی تو گٹھڑی کو تکیہ بنا کر ایک جگہ لیٹ گیا اور وہ وقت گزارنے کے لیے پلیٹ فارم پر گھومنے لگا۔ اچانک اسے کسی نے گدی سے پکڑا۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو نور احمد نے اسے پکڑ لیا تھا۔ نور احمد، نورالحق کا خاص شاگرد اور خادم تھا۔

نور احمد نے اسے دبوچ لیا۔ ''بھاگ کے کہاں جاؤ گے۔ پکڑے گئے ناں۔ اسی وقت گھر چلو۔''

اس ناگہانی آفت سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ اس نے زور زور سے چلّانا شروع کر دیا۔ ''بچاؤ، بچاؤ ہائے میں مر گیا کوئی مجھے بچاؤ۔''

شور سن کر مسافر جمع ہو گئے اور نور احمد سے جھگڑنے لگے۔ نور احمد گھبرا گیا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی غلام جیلانی زمین پر بیٹھ گیا اور یہ ظاہر کرنے لگا جیسے اسے بہت چوٹ آئی ہے اور پھر موقع دیکھتے ہی لوگوں کی ٹانگوں کی بیچ سے نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔ بھیڑ میں کسی نے دیکھا بھی نہیں کہ وہ بھاگ کر کہاں گیا۔ دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک ویگن کھڑی تھی۔ اس کے نیچے گھس گیا اور اس کے ''دھرے'' پر بیٹھ گیا۔

نور احمد نے لوگوں کو مطمئن کر دیا۔ بھیڑ چھٹ گئی اور وہ پھر غلام جیلانی کو ڈھونڈنے نکلا۔ دو مرتبہ ویگن کے قریب سے گزرا۔ نیچے جھانک کر بھی دیکھا لیکن آنکھوں پر پردے پڑ گئے تھے۔ غلام جیلانی اسے نظر ہی نہیں آیا اور وہ پلیٹ فارم کی طرف پلٹ گیا۔

غلام جیلانی کو یہ فکر لاحق تھی کہ کہیں غلام ربانی نہ پکڑا جائے۔ اس کے کپڑوں کی گٹھڑی بھی اس کے پاس تھی۔ ابھی ویگن کے نیچے سے نکلنا خطرناک تھا۔ وہ انتظار کرتا رہا۔ جب بہت دیر گزر گئی تو وہ ڈرتے ڈرتے ویگن کے نیچے سے نکلا اور ایک جگہ چھپ کر پلیٹ فارم کا جائزہ لینے لگا۔ یہ دیکھ کر اس کی تو جان ہی نکل گئی کہ نور احمد ایک بینچ پر بیٹھا ہے اور قریب ہی غلام ربانی، گٹھڑی کو تکیہ بنائے سو رہا

ہے۔ خدا نے یہاں بھی نور احمد کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے۔ وہ غلام جیلانی کو دیکھ ہی نہ سکا۔ دراصل اس کی آنکھیں تو غلام جیلانی کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ کچھ اور دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ غلام جیلانی اس تاک میں تھا کہ نور احمد وہاں سے ہٹے اور وہ غلام ربانی کو خبردار کرے۔ خدا نے یہ موقع بھی اسے جلد ہی دے دیا۔ نور احمد بینچ سے اٹھا اور بیت الخلاء کی طرف گیا۔ بس اتنا وقت کافی تھا۔ وہ بھاگتا ہوا پلیٹ فارم پر گیا اور غلام ربانی کے سر کے نیچے سے گٹھڑی گھسیٹ لی۔

''جلدی بھاگو۔ نور احمد ہمیں تلاش کر رہا ہے۔''

اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ غلام ربانی اس کے ساتھ بھاگ بھی رہا ہے یا نہیں۔ اتنی دیر میں ریل گاڑی نے بھی پلیٹ فارم پر قدم رکھا۔ وہ مخالف سمت میں دوڑتا رہا اور بالکل آخری ڈبے میں سوار ہو کر اس کے بیت الخلاء میں گھس گیا۔ غلام ربانی بھی آ گیا تو اس نے بیت الخلاء کو اندر سے بند کر لیا۔

گاڑی یہاں اتنی دیر نہیں رُکتی تھی کہ نور احمد ایک ایک ڈبے کی تلاشی لیتا۔ وہ مایوس ہو کر لوٹ گیا لیکن اسے اتنا یقین تھا کہ وہ دونوں اسی گاڑی میں سوار ہوئے ہیں۔

جب گاڑی نے رفتار پکڑ لی تو وہ دونوں بیت الخلاء سے نکل آئے۔ اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ مزے سے نور محمد کی بے وقوفی پر ہنستے رہے۔

''کندیاں'' پہنچ کر گاڑی بدلنی پڑی۔ ظہر کے بعد بسال اسٹیشن پر اترے۔ گھر پہنچے تو بھوک سے غش آ رہے تھے۔

جب کچھ کھا پی کر ہوش آیا تو پوری روئداد والدہ اور والد کو سنائی۔ والد صاحب، بڑے بھائی نور الحق کی سخت گیری سے واقف تھے اس لیے کچھ نہیں کہا ورنہ اسکول سے بھاگنے پر سزا ضرور ملتی۔

اب وہ دونوں بچے نہیں رہے تھے۔ اپنے لیے خود راستہ تلاش کر سکتے تھے۔ پہلے یہ سوچا کہ دوبارہ اورنگ آباد چلے جائیں لیکن اورنگ آباد یہاں سے دس میل دور تھا۔ وہ جب اورنگ آباد گئے تھے تو گڑھی سے گئے تھے جہاں سے فاصلہ پانچ میل تھا۔ اب وہ بسال میں تھے اور فاصلہ دس میل ہو گیا تھا۔ پھر کسی نے بتایا کہ ''غورغشتی'' میں دو عالم مولانا قطب الدین اور شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین تمام علوم دینیہ صرف و نحو سے تفسیر و حدیث تک کا درس دیتے ہیں۔ اس نے والد سے اجازت طلب کی۔ والد ان کی طلبِ علم سے خوش تو تھے لیکن اتنی دور بھیجتے ہوئے ڈرتے تھے بالآخر اس کے اصرار پر تیار بھی ہو گئے۔ اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ غورغشتی کہاں ہے۔ کسی نے بس یہ بتا دیا کہ ریل سے کیمبل پور چلے جاؤ۔ وہاں جا کر کسی سے پوچھ لینا۔ وہ اس وقت یہی سمجھا تھا کہ کیمبل پور کے نزدیک ہی کوئی جگہ ہو گی۔ اس نے اپنے سے بڑے بھائی غلام ربانی کو بھی ساتھ چلنے کے لیے رضامند کر لیا۔ ایک مرتبہ پھر دونوں بھائی سفر پر نکلے۔

بسال اسٹیشن سے ریل میں بیٹھے اور کیمبل پور پہنچ گئے۔

''بھائی ہمیں غورغشتی جانا ہے۔ یہاں سے کتنی دور ہے اور کس سمت ہے۔'' انہوں نے کیمبل پور کے پلیٹ فارم پر ایک آدمی سے پوچھا۔

''زیادہ دور نہیں۔ وہ جو سامنے پہاڑی نظر آ رہی ہے۔ اسے پار کر کے دوسری طرف پہنچ جانا اور پھر کسی سے بھی پوچھ لینا ورنہ چلتے رہنا غورغشتی پہنچ جاؤ گے۔''

اس نے طے کیا کہ پہاڑی سامنے ہی تو ہے پیدل چلتے ہیں۔ وہ پہاڑی کو سامنے رکھتے ہوئے پیدل چلنے لگے۔ ہر قدم پر پہاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ معلوم ہوا پہاڑی اتنی قریب نہیں جتنی نظر آ رہی تھی۔ وہ چلتے رہے۔ کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد وہ پہاڑی کے قریب پہنچ سکے اور اندازہ لگایا کہ چھ سات میل چل چکے ہوں گے۔ اب پہاڑی کے عبور کرنے کا مسئلہ تھا۔ پیدل چل کر برا حال ہو رہا تھا، اب پہاڑی کو عبور بھی کرنا تھا لیکن یہ خوشی دل کے ساتھ تھی کہ پہاڑی پار کرتے ہی غورغشتی آ جائے گا۔ چٹانوں، گڑھوں اور کھنڈروں کو عبور کرتے ہوئے وہ پہاڑی کے اس طرف چلے گئے لیکن یہاں تو کسی شہر کے آثار نہیں تھے۔ ایک کنواں نظر آ رہا تھا۔ اس سے پانی پیا۔ وضو کیا اور ظہر کی نماز ادا کی۔ ایک آدمی سے پوچھا۔ اس نے بڑے آرام سے غورغشتی کا پتا اس طرح بتا دیا جیسے بس سامنے ہے۔

''وہ جو سامنے درخت نظر آ رہا ہے اس کے بائیں پھر جانا۔''

''زیادہ دور تو نہیں۔''

''نہیں کوئی نہیں، شاباش ہمت کرو۔''

انہوں نے ہمت کی اور چل پڑے۔ کچھ فاصلے پر درخت مل گیا۔ وہ بائیں مڑ گئے۔ بائیں مڑنے کے بعد بھی

میلوں چل لیے لیکن غور غشتی کے آثار نظر نہیں آئے۔
''بھائی ہمیں شاید بھٹکا دیا گیا ہے۔''
''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔''
''اب تو چلنے کی ہمت بھی نہیں رہی۔''
''یار میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ غور غشتی نہیں تو کوئی اور شہر تو نظر آئے۔''
''ہم کہیں گھوم پھر کر بسال ہی نہ پہنچ جائیں۔''
''بس کچھ فاصلہ اور طے کرتے ہیں پھر سوچیں گے کرنا کیا ہے۔''
انہوں نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ کوئی ایک میل اور چلے ہوں گے کہ ایک بڑے شہر کے مینار اور چوبارے نظر آئے۔ وہ اس طرح خوشی سے چلا اٹھے جیسے امریکا دریافت کر لیا ہو۔
''شاید یہی غور غشتی ہو۔''
''نہ بھی ہوا تو کوئی شہر تو ضرور ہے۔ کم از کم تھکن اتارنے کا موقع تو مل جائے گا۔''
وہ دونوں شہر میں داخل ہوئے اور مولانا قطب الدین کی مسجد کا پتا پوچھا۔ افسوس کہ یہ بھی غور غشتی نہیں تھا۔
''یہ حضرو ہے اور مولانا قطب الدین غور غشتی میں ہوتے ہیں۔''
''بس دو قدم ہے۔ وہ سامنے والے درختوں کے پیچھے۔''
کیمبل پور سے بھی سنتے آئے تھے کہ بس دو قدم، دو قدم کا مطلب ہوتا تھا آٹھ دس میل۔ مرتے کیا نہ کرتے، چل پڑے گھر سے چلے تھے تو زادِ راہ کے طور پر کچھ روٹیاں اور پیاز ساتھ لائے تھے۔ روٹیاں اب سوکھ گئی تھیں۔ یہی باسی روٹیاں پیاز کے ساتھ کھاتے، پانی پیتے چلتے رہے۔ چلتے چلتے.... رات ہو گئی۔ تقریباً نو بجے غور غشتی آیا اور مولانا قطب الدین کی مسجد میں پہنچ گئے۔
یہ رات اسی مسجد میں گزاری کہ صبح ہو گی تو مولانا سے ملاقات کریں گے اور تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھائیں گے۔ فجر کی نماز کے بعد مولانا کا درس ہوا کرتا تھا لیکن اس دن درس کی بجائے انہوں نے اعلان کیا۔
''میں چکوال دارالعلوم کا صدر مدرس بن کر جا رہا ہوں۔ جس کو میرے ساتھ جانا ہو تیار ہو جائے۔''
بارش سے پہلے ہی بادل آگے بڑھنے لگے۔ بادل پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ کہیں نہ کہیں برسنا ضرور تھا۔

شرط یہ تھی کہ بادلوں کے نیچے رہا جائے۔
وہ بھی نالائق ضرور تھا لیکن بزرگوں کی دعاؤں نے اسے کندن بنایا ہوا تھا۔ اورنگ آباد کے گلاب شاہ نے کہا تھا۔ میرے پاس ایک خاص ملکہ ہے جس میں جیلانی کو ڈبکی دے دی ہے۔ یہ اس مٹکی کا اثر تھا یا ماں کے دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر کا وقت آ گیا تھا کہ وہ حصولِ علم کے لیے نامساعد حالات کے باوجود جنگلوں کی خاک چھان رہا تھا۔ قدرت اسے اس طرف دھکیل رہی تھی کہ تادیر اس کا نام زندہ رہے۔
اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مولانا کے ساتھ چکوال جائے گا۔ دونوں بھائی مولانا کے ساتھ ہو لیے اور عصر کے وقت چکوال پہنچ گئے۔ دارالعلوم کیا تھا۔ مسجد کے ساتھ چند حجرے بنائے ہوئے تھے جو اقامت گاہ کے طور پر کام آتے تھے۔ دو کمرے ابھی تک فارغ پڑے تھے۔ یہ دونوں بھائی ان میں سے ایک کمرے میں گھس گئے۔ زمین پر گھاس بچھا کر ایک پرانی سی دری ڈال دی۔ دو اینٹوں پر ایک بوری ڈال کر تکیہ بنا لیا۔ محلے کے ایک نیک دل بزرگ نے اپنے گھر سے لحاف بھیج دیا۔
اقامت کا انتظام مکمل ہوتے ہی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ پورے ایک سال تک چلتا رہا۔ اب ماں کے دیکھے ہوئے خواب کی تکمیل کا وقت شاید نزدیک آنے لگا تھا کہ اسی دارالعلوم کے ایک استاد نے اسے مشورہ دیا کہ یہاں وقت گزارنے کی بجائے تم لاہور کے کسی دارالعلوم میں داخل ہو کر پنجاب یونیورسٹی کا کوئی امتحان مثلاً مولوی فاضل یا منشی فاضل پاس کر لو۔ پھر کسی سرکاری اسکول میں عربی یا فارسی کے معلم بن کر عزت کی زندگی بسر کرو۔ یہ مشورہ پسند آیا اور دونوں بھائی لاہور آ گئے۔ پتا پوچھ کر دارالعلوم نعمانیہ پہنچ گئے۔ عمارت میں داخل ہوتے ہی اہل علم اور اہل لاہور کی بے حسی پر افسوس ہونے لگا۔ کالجوں کے شہر لاہور میں ایک مذہبی درسگاہ کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ صحن کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ دیواریں میلی تھیں جن پر جگہ جگہ سیاہی اور پنسل سے کچھ نہ کچھ لکھا ہوا تھا۔
انہوں نے جب اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو انہیں ایک کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ یہاں انہیں اپنا نام وغیرہ لکھوانا تھا۔ فرش پر ایک لمبی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک کونے میں اپنا سامان رکھا اور دفتر میں جا کر اپنا نام وغیرہ

لکھوایا۔ پھر سڑک پر نکل کر ماحول کا جائزہ لینے لگے۔ دارالعلوم کے چاروں طرف طوائفوں کے چوبارے تھے۔ شمال کی جانب شاہی مسجد کے بلند مینار...... سر اٹھائے کھڑے تھے لیکن اداس تھے۔ عجیب منظر تھا، مسجد دارالعلوم اور طوائفوں کے کوٹھے۔

اس دارالعلوم میں وہ محض ایک سال پڑھ سکا تھا کہ اسے اسٹرائیک کرانے کے جرم میں دارالعلوم سے نکال دیا گیا۔ اس کی سزا اس کے بھائی کو بھی ملی۔ انہوں نے سامان اٹھایا اور نیلا گنبد کے پاس دارالعلوم حمیدہ میں چلے گئے۔ یہاں بعض اساتذہ نے انہیں مشورہ دیا کہ اورینٹل کالج میں بھی داخلہ لے لیں چنانچہ غلام جیلانی نے منشی فاضل میں اور غلام ربانی نے مولوی فاضل میں داخلہ لے لیا اور تیاری شروع کردی۔ آٹھ نو ماہ کے بعد دونوں یونیورسٹی کے مذکورہ امتحان میں شامل ہو گئے۔ دو ماہ کے بعد نتیجہ نکلا اور دونوں پاس ہو کر بسال چلے گئے اور ملازمت کے لیے اشتہارات دیکھنے لگے۔ موسم گرما کی تعطیلات ختم ہوئیں تو غلام ربانی کو عزیز گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو میں ملازمت مل گئی۔ اس نے مولوی فاضل میں داخلہ لے لیا۔

اس نے ابھی مولوی فاضل کا امتحان نہیں دیا تھا کہ زمیندار اخبار میں ایک اشتہار دیکھا۔ نوشہرہ اسکول میں عربی کے معلم کی ضرورت تھی۔ اس نے درخواست دے دی کہ میں درس نظامی کا فارغ ہوں اور چند ماہ بعد مولوی فاضل کا امتحان دینے والا ہوں۔ درخواست قبول کرلی گئی اور چالیس روپے ماہوار پر اس کی تقرری ہوگئی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے کمرا بھی مل گیا۔

روزگار کا وسیلہ ہوگیا تھا لیکن ترقی کے دروازے بند نہیں ہوئے تھے۔ وہ جن خارزاروں سے گزر کر یہاں تک پہنچا تھا۔ اس کے بعد بھی پاؤں کے چھالوں کی تمنا تھی۔ منشی فاضل اور مولوی فاضل کرچکا تھا۔ اس کے بعد میٹرک کرنا آسان تھا لیکن اس کے لیے انگریزی کی ضرورت تھی کہ وہ انگریزی کی اے بی سی سے بھی واقف نہیں تھا۔ بائیس سال عمر ہوگئی تھی اور انگریزی دیکھنے تک کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

اس کا ایک شاگرد انوار الحق تھا۔ آٹھویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ نہایت ذہین اور محنتی تھا۔ ایسے لڑکوں کو ہر استاد عزیز رکھتا ہے۔ غلام جیلانی بھی اس کی ذہانت کی قدر کرتا تھا اور اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہتا تھا۔ ایک دن وہ لڑکا اس سے ملنے آیا تو غلام جیلانی نے اس سے پوچھا۔

''انوار الحق یہ بتاؤ تم انگریزی کے مضمون میں کیسے ہو۔''

''سر، یہ تو آپ میرے اساتذہ سے پوچھیں۔ ویسے مجھے یہ گمان ہے کہ میری انگریزی بہت اچھی ہے۔''

''تم مجھے انگریزی پڑھا دیا کرو گے؟''

''سر، کیوں مذاق کرتے ہیں۔''

''مذاق کی بات نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں میٹرک کرلوں، صرف انگریزی کا امتحان دینا ہوگا اور مجھے اے بی سی بھی نہیں آتی۔ تم مجھے پڑھا دیا کرو۔''

''سر میں تو خود ابھی آٹھویں میں پڑھتا ہوں۔''

''مجھے بھی اسی درجے کی انگریزی کی ضرورت ہے۔ تمہیں اے بی سی تو آتی ہوگی وہی پڑھا دو۔''

''سر، جتنی مجھے آتی ہے اتنی پڑھا دوں گا۔''

''بس اتنی کافی ہے باقی میں خود کوشش کرکے پڑھ لوں گا۔''

''سر، انگریزی کے استاد مسٹر ہیراڈائز موجود ہیں۔ آپ ان سے کیوں نہیں پڑھ لیتے۔ ان کی تو مادری زبان انگریزی ہے۔''

''بھئی وہ ایڈوانس انگریزی پڑھائیں گے۔ میری سمجھ میں کچھ آئے گا نہیں۔ بے عزتی الگ ہوگی۔''

انوار الحق ہچکچاتے ہوئے پڑھانے پر تیار ہوگیا۔ اب اسکول میں وہ اس کا شاگرد تھا اور ہاسٹل میں استاد۔

تین چار ماہ میں اس نے اپنے استاد کو وہاں تک پڑھا دیا جہاں تک اس نے خود پڑھا تھا۔ امتحانات آئے تو وہ امتحان میں بیٹھ گیا اور پاس بھی ہوگیا۔ اس کے احباب سخت حیران تھے کہ انگریزی کی ابتدائی تین کتابوں کے سوا اس نے کچھ نہیں پڑھا تھا اور وہ پھر بھی پہلی کوشش میں کامیاب ہوگیا۔

نوشہرہ میں رہتے ہوئے اسے دو سال ہوگئے تھے۔ اتنا ہی عرصہ ملازمت کو ہوگیا تھا۔ میٹرک کرلینے کے بعد اسے مزید ترقی کی بھی خواہش تھی۔ ہمت کی کمی نہ پہلے تھی نہ اب تھی۔ ایک روز کسی اخبار میں اشتہار دیکھا۔ ڈویژنل انسپکٹر جالندھر نے عربی معلمین کی اسامیوں کے لیے درخواستیں مانگی تھیں۔ اس نے بھی عرضی دے دی۔ دس بارہ دن نہیں گزرے تھے کہ جواب آگیا۔

''تمہاری تقرری بہ حیثیت معلم عربی پچپن روپے ماہوار پر صرف چھ ماہ کے لیے راہوں ضلع جالندھر میں کردی

گئی ہے۔"

چھ ماہ بعد کیا ہوگا؟ دیکھا جائے گا۔ خدا پہ توکل کرو اور چلو۔ موجودہ اسکول (نوشہرہ) سے استعفیٰ (1922ء) دیا اور جالندھر جانے والی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ جالندھر پہنچ کر گاڑی بدلی اور راہوں پہنچ گیا۔ سر پر بستر ہاتھ میں بیگ ایک ایک سے کسی سرائے یا ہوٹل کا پتا پوچھتا پھر رہا تھا۔ اسی پوچھ گچھ میں ایک ہندو اس کے پاس آیا۔ وہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں انگریزی کا استاد تھا۔ اپنے ہمراہ اپنے گھر لے گیا۔

"جب تک آپ کا کوئی بندوبست نہیں ہو جاتا میرا گھر حاضر ہے۔"

"میں مسلمان ہوں اور آپ ہندو۔ آپ کو میری وجہ سے تکلیف ہوگی۔"

"میں ذات پات کا قائل نہیں۔"

"آپ کی دھرم پتنی کو شکایت ہوگی۔"

"وہ بھی بھلی مانس میری ہی طرح ہے۔"

وہ عورت واقعی بھلی مانس تھی۔ اس کے ماتھے پر بھی بل نہ آیا۔ ایک چھوٹا سا کمرا اسے رہنے کے لیے دے دیا۔ اپنے برتنوں میں کھانا دیا۔ یہ کہتے زبان نہیں تھکتی تھی کہ مہمان تو ایشور کا روپ ہوتے ہیں۔

اسے یہاں رہتے ہوئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ مسلمانوں کی غیرت نے جوش مارا۔ وہ سب مل کر وہاں کے نمبردار اکرم خان کے پاس گئے اور یہ کہہ کر اس کی غیرت کو جوش دلایا کہ ایک مسلمان، ہندو کے گھر میں رہ رہا ہے اور ان کے برتنوں میں کھانا کھا رہا ہے۔ نمبردار آیا اور اسے اپنے گھر لے گیا۔ یہاں پردے کا مسئلہ تھا۔ اس کی وجہ سے اہلِ خانہ بھی مشکل میں تھے اور اسے بھی کوفت ہو رہی تھی۔

چند دنوں بعد وہاں کے ایک ڈاکٹر سے ملاقات ہو گئی جو شاعر تھے اور بسمل تخلص کرتے تھے۔ ادھر غلام جیلانی کو بھی شاعری کا شوق ہو گیا تھا۔ برق تخلص اختیار کر کے غزلیں کہنے لگا تھا لیکن بڑے بھائیوں کے خوف سے خود کو شاعر ظاہر نہیں کرتا تھا۔ بسمل سے ملاقات ہوئی تو دل کا چور زبان پر لے آیا۔

تم نے چہرے پر جو زلفوں کو بچھا رکھا ہے
رات کو دن سے غضب ہے کہ ملا رکھا ہے
کیا غرض تھی مجھے طوفان کدۂ ہستی سے
وعدۂ موت نے پابند بنا رکھا ہے

حسنِ مہ، حسنِ ازل، حسنِ بتاں حسنِ چمن
ایک ہی شے ہیں فقط نام جدا رکھا ہے
جس کو لیتے نہیں گمنام جفا کے بدلے
نام اس جنس کا دنیا نے وفا رکھا ہے

اس کے جواب میں ڈاکٹر بسمل نے بھی اشعار سے نوازا۔

قالب مشرق نہیں منت کش عیسیٰ دے
نغمہ ہائے غم سے ہے لبریز تارِ انقلاب
ہو اگر شوق تماشائے عروس حریت
سرمہ چشم تمنا کر غبار انقلاب

راہوں جیسی چھوٹی جگہ پر ڈاکٹر بسمل کی شاعری کو سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ چھ سال ایران میں رہ چکے تھے۔ جدید و قدیم فارسی پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ غلام جیلانی سے ان کی ملاقات ہوئی، گفتگو ہوئی، اشعار کا تبادلہ ہوا تو وہ اس کی قابلیت اور فارسی دانی کے قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

دن رات کی ملاقاتوں نے یہ اثر دکھایا کہ وہ اسے اپنے گھر لے آئے "خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو" آٹھ دس کمروں کا بہت بڑا مکان تھا لہٰذا اہل خانہ کے پردے کا مسئلہ حائل نہیں تھا۔ باذوق ہم نشیں تھے خوب گزرنے لگی۔

اسے پڑھانے کے لیے دسویں جماعت ملی تھی۔ اس جماعت میں عربی کے صرف پانچ طلبہ تھے۔ ان میں سے ایک احمدی (قادیانی) تھا۔ غلام جیلانی ان دنوں احمدیت سے متعلق لٹریچر پڑھ رہا تھا۔ نوجوانی کی عمر تھی اور اس لٹریچر نے بہت کچھ معلومات فراہم کر دی تھیں۔ بات غلط تھی۔ اسے کلاس میں یہ قضیہ نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔ وہ اس احمدی لڑکے کو تنگ کیا کرتا تھا۔ بات مذاق کی تھی لیکن اس لڑکے نے اپنے بڑوں سے شکایت کر دی۔ اس شکایت کے نتیجے میں اس کے نام جماعت احمدیہ راہوں کے سیکریٹری کی طرف سے ایک خط آیا۔

"جناب مولوی غلام جیلانی صاحب!

ہمیں یہ شکایت مسلسل موصول ہو رہی ہے کہ آپ احمدی لڑکوں کو چھیڑتے اور تنگ کرتے ہیں اس لیے ہم آپ کو چیلنج دیتے ہیں کہ آپ آج سے چھ دن بعد اتوار کو نمبردار محمد اکرم خان کی بیٹھک کے صحن میں مناظرہ عام کے لیے آئیں۔ اگر آپ نہ آئے تو ہم آپ کے خلاف سارے شہر میں اشتہار لگائیں گے۔"

یہ خط پڑھ کر اس پر خوف طاری ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اگر وہ نہ گیا تو احمدی ڈھول بجا کر اپنی فتح کا اعلان کریں گے اگر گیا تو اتنی قابلیت نہیں یقیناً شکست ہو جائے گی۔ اس طرف نہ جانے کیسے کیسے جغادری مولوی ہوں۔

اس نے احباب سے ملاقاتیں کیں، دلائل ڈھونڈتا رہا۔ پھر غیب سے ایک دلیل دماغ میں آئی۔ اتوار کا دن آیا تو ڈاکٹر بسمل اور دیگر احباب کے ہمراہ نمبردار کی بیٹھک پر پہنچ گیا۔ مناظرہ ایک میدان میں ہونا تھا۔ پورا میدان شہریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس مناظرے کی صدارت ایک سکھ کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے اعلان ہوا۔

"ہر مقرر کو پندرہ پندرہ منٹ ملیں گے اور آج مرزا صاحب کی نبوت پر قرآن کی روشنی میں بحث ہو گی۔ پہلی تقریر سُنی مولوی کی ہو گی۔ مناظرہ تین دن رہے گا اب سُنی مولوی سے التماس ہے کہ تقریر شروع کریں۔

غلام جیلانی نے قرآن کی ایک آیت پڑھی اور ثابت کیا کہ حضور اکرمؐ اور قیامت کے درمیان کوئی نبی نہیں آئے گا۔ وحی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

احمدی مولوی تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے لیکن کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکے۔ بار بار کے اصرار کے باوجود وہ کوئی جواب نہ لا سکے۔ ان پر ایسی گھبراہٹ طاری ہوئی کہ خود ان کے لوگ خلاف ہو گئے۔ بالآخر احمدی جماعت کا سیکریٹری اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

"میں اپنے ساتھیوں سمیت احمدیت سے تائب ہوتا ہوں۔ اسی وقت تیں چالیس احمدی تائب ہو گئے۔"

"اللہ اکبر" کے نعروں سے میدان گونج اٹھا۔ غلام جیلانی کو لوگوں نے کندھے پر اٹھا لیا اور جلوس کی شکل میں گلیوں میں گھمانے لگے۔ اب پورا شہر غلام جیلانی زندہ باد کے نعروں سے گونج رہا تھا۔

اس مقبولیت اور ہر دلعزیزی کے باوجود ایک واقعہ ایسا پیش آگیا کہ اسے اپنا بچاؤ کرنا پڑا۔ ملازمت کے لالے پڑ گئے۔ راہوں اسکول میں اس کے ایک رفیق کار سردار بچیت سنگھ تھے۔ ان کے ہاں بڑھاپے میں لڑکا پیدا ہوا۔ وہ اتنے خوش ہوئے کہ لڈوؤں کا تھال اٹھا کر تمام اساتذہ کے گھر گئے۔ غلام جیلانی کے تو خاص دوست تھے۔ اسے بھی لڈو کھلائے اور مبارک باد وصول کی۔ چند روز بعد وہ پھر اس کے پاس آئے۔

"میں تمام اساتذہ اور معززین شہر کو پارٹی دے رہا ہوں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے تمام دوستوں کو مل بیٹھنے کا موقع مل جائے گا۔"

"آپ سے ایک درخواست ہے۔"

"فرمائیے۔"

"آپ اس موقع کے لیے ایک نظم لکھیں۔ میری خوشی بھی ہو جائے گی اور پارٹی میں رنگ بھی آجائے گا۔"

اس نے وعدہ کر لیا۔ چند اشعار لکھے اور جب پارٹی ہوئی تو وہاں پڑھے

ہوا ہے آپ کا آباد گھر مبارک ہو
لگا ہے ان کے شجر میں ثمر مبارک ہو
کلاہِ خسروی میں ہے یہ ٹکنے کے قابل
ملا ہے آپ کو ایسا گہر مبارک ہو
جو اب کچھ تو ملے آپ کو ان سے حضرت
کہ کہہ رہے ہیں یہ دیوار و در مبارک ہو

ایک جشن تھا جو برپا ہو گیا۔ لوگوں نے داد بھی دی لیکن شہر کے مسلمانوں میں سے بعض اس کے پیچھے پڑ گئے اور طعنے دینے لگے کہ تم نے دو لڈو کھا کر ایک سکھ کی تعریف کی۔ یہ احتجاج بڑھتا ہی چلا گیا۔ ایک دن چند نوجوان جن میں اس کا ایک شاگرد جماعت دہم کا لڑکا بھی شامل تھا اس کے پاس آئے۔

"آپ نے سردار بچیت سنگھ کی تعریف میں نظم لکھی ہے۔ اب اس کا ازالہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اس کے خلاف نظم لکھیں۔"

"یہ اچھی بات نہیں کہ کسی کے خلاف نظم لکھی جائے۔"

"آپ ان کے خلاف نظم لکھیں ورنہ ہم آپ کا مقاطعہ کریں گے۔"

"اچھا ایک شعر سن لو۔ باقی نظم بعد میں کہہ دوں گا۔"

غلام جیلانی نے کہا اور یہ شعر پڑھ دیا۔

خوشی سے ہنستی ہیں گودیاں کہ پیدا ہوا
بچیت سنگھ کے گھر ایک خر مبارک ہو

وہ لڑکا اس شعر کو لے اڑا۔ تمام اسٹاف تک پہنچایا۔ خوب ہنسی اڑی اور پھر ہیڈ ماسٹر تک پہنچ گیا۔ ہیڈ ماسٹر نے اسے شام کے وقت اپنے گھر بلایا اور وہی شعر پڑھا۔

"یہ شعر آپ نے بچیت سنگھ کے خلاف لکھا ہے؟"

"میں نے تو نہیں لکھا، کون کہتا ہے۔"

ہیڈ ماسٹر نے اٹھ کر پردہ ہٹایا۔ وہ لڑکا وہاں چھپا ہوا تھا فوراً باہر نکل آیا۔

''یہ لڑکا کہتا ہے۔''

غلام جیلانی کے پاس انکار کے لیے الفاظ نہیں تھے۔

''آپ کی تقرری چھ ماہ کے لیے ہوئی تھی۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ آپ کی مدت ملازمت میں توسیع کے لیے ڈائریکٹر صاحب سے درخواست کروں گا لیکن اب نہیں۔ آپ کی مدت ملازمت ختم ہونے میں ایک ہفتہ باقی رہ گیا ہے۔ آپ تیاری کرلیں۔ آپ کا یہاں سے چلا جانا ہی بہتر ہے۔''

اس نے کوئی بحث نہیں کی۔

چند احباب نے اس کی رخصتی پر عصرانہ دیا اور اسے چھوڑنے اسٹیشن تک آئے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسے کہاں جانا ہے یہ ابھی تک اسے معلوم نہیں تھا۔ اس نے ہر سفر اللہ پر توکل کرتے ہوئے کیا تھا اور راہیں خود بخود کھلتی چلی گئی تھیں۔ اس وقت بھی وہ ایسا ہی ایک بے سمت سفر کررہا تھا۔

صبح نو بجے یہ گاڑی گجر خان کے اسٹیشن پر رکی۔ وہ پلیٹ فارم پر اتر آیا کہ کھانے پینے کا کچھ سامان خرید لے۔ نیچے اترتے ہی اس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ وہ اسے نہ پہچان سکے۔ یہ نوشہرہ کا ایک ٹیچر تھا۔ وہ بھی غلام جیلانی کو فوراً پہچان گیا۔

''غلام جیلانی تم! کہاں سے آرہے ہو اور کہاں جارہے ہو؟''

''میں آتو راہوں سے رہا ہوں۔ جانا کہاں ہے یہ معلوم نہیں۔ وہاں اسکول میں پڑھاتا تھا۔ نوکری چھوٹ گئی اب نئی نوکری ڈھونڈوں گا اور کیا۔''

''تم یہاں کیسے؟'' غلام جیلانی نے پوچھا۔

''گجر خان کے اسلامیہ ہائی اسکول میں پڑھا رہا ہوں۔''

یہ باتیں ہورہی تھیں کہ اسلامیہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی وہاں آگئے۔ غلام جیلانی کے دوست نے اپنے ہیڈ ماسٹر سے اس کا تعارف کرایا اور یہ بھی بتادیا کہ ان کی نوکری چھوٹ گئی ہے۔

''گاڑی سے سامان اتاریے۔'' ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔ ''میں آپ کی نوکری کا بندوبست کرتا ہوں۔''

وہ اسے اپنے اسکول اسلامیہ ہائی اسکول گجر خان لے گئے۔ اسے ملازمت مل گئی۔ ملازمت مل گئی رہنے اور کھانے کا ٹھکانا بھی مل گیا لیکن وہ یہاں خوش نہیں تھا۔

ایک دن اس کا راولپنڈی جانا ہوا۔ نہ جانے کیا جی میں سمائی کہ انسپکٹر آف اسکولز کے دفتر پہنچ گیا اور ملاقات کے لیے اپنے نام کی چٹ اندر بھیج دی۔ گفتگو کے دوران جب انسپکٹر کو یہ معلوم ہوا کہ وہ مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل اور میٹرک بھی ہے اور ملازمت کا خواہاں بھی تو انسپکٹر نے اسی وقت اس کی تقرری چکوال ہائی اسکول میں کردی۔

وہ ہیڈ ماسٹر اسلامیہ اسکول کو بتائے بغیر اسی شام چکوال پہنچ گیا۔

اس اسکول میں اس نے چار سال بڑے آرام سے گزارے۔ یہاں کئی احباب اسے ایسے مل گئے جن کی ہم نشینی میں اس کے علمی ذوق کو تسکین ملی۔

یہاں سے اس کا تبادلہ لالہ موسیٰ ہوگیا۔ یہ اسکول شہر سے ایک میل دور شمال کی طرف کھلی فضا میں تھا۔ اردگرد دور تک کھیت تھے جن میں تیتر، بھٹ تیتر، کبوتر اور سفید بگلے بہ کثرت آباد تھے۔ یہاں اس کے شکار کے شوق نے خوب پرورش پائی۔ اسکول بند ہوتے ہی شکار کو نکل جاتا اور دو چار پرندے مار لاتا۔

سردیوں میں اتوار کے دن چودہ میل مشرق کی طرف دریائے چناب پر چلا جاتا اور شکار سے لدا ہوا واپس آتا۔ یہاں بھی دو سال گزارنے کے بعد تبادلہ کیمبل پور ہوگیا۔ یہاں اسے یہ سہولت بھی مل گئی کہ اس کے بڑے بھائی غلام ربانی سپرنٹنڈنٹ بن کر آگئے اور وہ ان کا نائب ہوگیا۔ ہر وقت کا ساتھ اس کے لیے نقصان دہ بھی ہوگیا۔ وہ اسی طرح کہ غلام ربانی، نیاز فتح پوری کے بہت مداح تھے۔ ان کا رسالہ ''نگار'' ان کے پاس آتا تھا۔ نیاز فتح پوری کی تعریف کرتے ہوئے ان کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ اس نے بھی ان کی تحریریں پڑھنی شروع کردیں۔ نیاز صاحب مذہب کی ہر ہدایت کو معیار عقل پر پرکھتے تھے اور جو بات مثلاً معجزات وغیرہ عقل کی گرفت سے باہر ہوتی تھی اس کا نہایت مضبوط دلائل سے انکار کردیتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ان سے اتنا متاثر ہونے لگا کہ وہ بھی الحاد کی طرف گامزن ہوگیا۔ اب دوستوں کے ساتھ اس کی بحثوں کا رنگ ہی دوسرا تھا۔ رسالہ نگار میں اس کے مضامین بھی چھپنے لگے تھے۔ یہ مضامین بھی نیاز فتح پوری کے خیالات کی ترجمانی کررہے

تعزیہ

اردو میں حضرت امام حسینؓ کے روضہ کی شبیہہ کو تعزیہ کہا جاتا ہے اسے سونے، چاندی، لکڑی، بانس، کپڑے اور کاغذ وغیرہ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اسے غم اور سوگ کی علامت کے طور پر جلوس کی شکل میں نکالتے ہیں اور مقامی کربلا تک لے جاتے ہیں، امام بارگاہوں میں یہ کشادہ اور مخصوص چبوتروں پر رکھے جاتے ہیں۔ عراق میں تعزیہ کو شبیہہ کہتے ہیں۔ ہر علاقے کے تعزیہ میں اس علاقے کی خصوصیات، صنعت و کاری گری کے بڑے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً "ضریح"۔ وہ تعزیہ جو بالکل حضرت امام حسینؓ کے روضہ کی نقل ہوتی ہے ضریح کہلاتا ہے۔ نظام دکن، والئی رامپور، راجا محمود آباد اور کراچی کے بعض عزاخانوں میں یہ ضریحیں موجود ہیں۔ "بنگلہ" اس کی شکل و صورت محمل، ناقہ یا عماری سے مشابہہ ہوتی ہے۔ اس قسم کے تعزیے لکھنو اور اس کے مضافات میں بنتے ہیں۔ "موی" بانس کی تیلیوں پر مندرجہ بالا دونوں شکلوں میں کسی ایک کا ڈھانچا بنا کر اس پر موم چڑھایا جاتا ہے۔ "جو کے تعزیے" تعزیے کے ڈھانچے پر مٹی کی ہلکی تہہ جما کر گیہوں یا جو کے دانے ایک خاص انداز سے چپکائے جاتے ہیں۔ دس پندرہ دن میں ان میں سے چھوٹے چھوٹے پودے نکل آتے ہیں اور تعزیے بالکل سرسبز ہو جاتے۔ جلوس کے دوران میں ان پر پانی چھڑکتے ہوئے چلتے ہیں۔ تعزیہ کے سب سے نچلے حصے کو تخت، اوپر والے حصے کو خطیرہ اور اس سے اوپر والے کو تربت اور سب سے اوپر والے حصے کو علم کہتے ہیں۔ تعزیے 29 ذوالحجہ سے 9 محرم تک آراستہ و پیراستہ کر کے ایک خاص مقام پر رکھے جاتے ہیں۔ یہ مقامات مختلف ناموں سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ مثلاً عزاخانہ، تعزیہ خانہ، امام بارگاہ، عاشورہ خانہ، امام خانہ، چبوترہ، چوک امام صاحب۔ تعزیہ اگرچہ اہل تشیع کے نقطہ نظر کی

تھے۔ آیات و احادیث کا مذاق اڑانا اس کا مشغلہ بن گیا تھا۔ اس کے مخلص دوست اس کی اس ذہنی تبدیلی سے سخت پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح راہ راست پر آجائے۔ ایک ایسا شخص جو مذہب کے حق میں مناظرے کرتا پھر رہا تھا اب مذہب کے خلاف تقریریں کر رہا تھا۔ یہ لمحہ فکریہ تھا۔ ایک روز اس کے ایک دوست نے اسے عنایت اللہ مشرقی کی کتاب "تذکرہ" مطالعہ کے لیے دی۔ اس نے بے دلی سے یہ کتاب لے لی۔ جب سونے کے لیے چارپائی پر گیا تو بے اختیار اس کتاب کا خیال آیا۔ اسے سخت نیند آرہی تھی۔ پھر بھی وہ اس آواز کو نظر انداز نہ کر سکا، اٹھا اور ہاتھ بڑھا کر کتاب اٹھا لی۔ اس کا خیال تھا کہ ورق گردانی کر کے رکھ دے گا لیکن ایک دو فقروں نے ہی اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ پڑھتا گیا۔ تراکیب کے جلال، اسالیب کی لذت، تشریح کی جدت اور بیان کے شکوہ سے مسحور ہوتا چلا گیا۔

رات کٹ گئی تو اسے خیال آیا کہ کتاب تو ابھی آدھی بھی نہیں ہوئی مگر اس کا کام پورا ہو گیا تھا۔ دن بھر اس کتاب کے مندرجات میں کھویا رہا۔ اس کی دلیلوں کے ہتھیار کند ہو گئے تھے۔ کتاب میں لکھا ہوا ایک ایک لفظ سچ نظر آرہا تھا۔

وہ خود سے جھگڑتا رہا۔ لگتا تھا کوئی چیز اس کے اندر ٹوٹ رہی ہے۔ کوئی اس کی دلیلوں کی صفوں میں گھس آیا ہے اور شکست پر شکست دیے جا رہا ہے۔

اسکول کی چھٹی ہوئی۔ وہ سیدھا گھر گیا اور کتاب لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے شکوک کو اپنے سامنے ڈھیر ہوتے ہوئے دیکھا۔ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس سحر سے نکل آئے لیکن مشکل تھا۔

کئی دن کی مشقت کے بعد اس کتاب کی دونوں جلدیں ختم کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی سرکشی اطاعت میں اور گمراہی ایمان میں بدل گئی۔ وہ سجدے میں گر پڑا۔ گڑگڑا کر توبہ کی اور دل ہی دل میں دوبارہ اسلام لے آیا۔

اس نے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھیج کر اسکول سے ایک سال کی چھٹی لی اور اس چھٹی کو کارآمد بنانے کے لیے لاہور آیا اور ایم اے فارسی میں داخلہ لے لیا۔ داخلہ فارم بھرنے کے بعد وہ دفتر سے باہر نکلا تھا کہ اس کے ایک شناسا ڈاکٹر مولوی محمد شفیع سے ملاقات ہوگئی۔

"کیسے آنا ہوا۔" انہوں نے پوچھا۔

"ایم اے فارسی میں داخلہ لیا ہے۔"

روسے ان کے نزدیک نہایت اہم مرتبہ رکھتا ہے لیکن بعض سنیوں اور ہندوؤں میں بھی اسے احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ تعزیے رکھنے والی جگہوں پر مجالس، ماتم، سوز خانی، مرثیہ خوانی، فضائل اہل بیت، مصائب وواقعات کربلا پر تقاریر وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں تعزیے کا رواج نادر شاہ درانی کے دور میں ہوا۔ شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں بھی تعزیہ اور جلوس تعزیہ کا رواج تھا۔ دکنی ریاستوں میں عزاداری کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ مجلس، ماتم، جلوس، تعزیہ، امام بارگاہ قائم ہوئے۔ الغرض تیرہویں صدی عیسوی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک پورے ہندوستان میں تعزیہ داری عام ہو چکی تھی۔ برصغیر پاک وہند میں تعزیے کا عام رواج ہے۔ لکھنو، رامپور، جے پور وغیرہ میں تعزیے کا جلوس یوں نکلتا ہے گویا گھر سے کسی معزز آدمی کا جنازہ نکل رہا ہو۔ اس جلوس میں ہاتھی، اونٹ، گھوڑے، فوجی باجے، ماتمی جھنڈیاں، باوردی، سپاہی، ماتم دار اور تعزیہ دار برہنہ سر، ماتمی لباس پہنے۔ سروں پر خاک ڈالے آنسو بہاتے سینہ کوبی کرتے چلتے ہیں۔ ایران میں تعزیہ کا رواج نہیں، شبیہہ رائج ہے۔ عراق، فلسطین، مصر، بحرین، سعودی عرب میں علم اور ذوالجناح نکالے جاتے ہیں (سعودی عرب کے صوبہ قطیف کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں سڑکوں پر علم وذوالجناح نہیں لایا جاتا۔ امام بارگاہ جسے وہاں حسینیہ کہا جاتا ہے اس کے اندر محدود رہتا ہے۔ قطیف کے جلوس میں کئی ہزار افراد شریک ہوتے ہیں)۔ کشمیر، نیپال اور افریقا میں تعزیہ داری میں وہی انداز اختیار کیا جاتا ہے جو پاکستان میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ دسویں محرم تعزیوں کو تعزیہ دار سروں یا کندھوں پر اٹھا کر جلوس کے ساتھ کربلا کی طرف لے جاتے ہیں کربلا پہنچ کر قابل دفن تعزیوں کو دفن کر دیتے ہیں ورنہ انہیں باقی تبرکات کے ساتھ محفوظ کر کے واپس لے آتے ہیں۔

اسلامی انسائیکلوپیڈیا سے اقتباس

"کیوں فارسی میں کیوں؟"

"فارسی ادب سے مجھے لگاؤ ہے۔"

"آیئے میرے ساتھ آیئے۔ میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے دفتر لے گئے۔ "یونیورسٹی نے ابھی ایک تازہ سرکلر شائع کیا ہے۔ اس سرکلر کے مطابق اگر کوئی لڑکا بی اے اور مولوی فاضل کرنے کے بعد ایم اے عربی میں داخل ہونا چاہے تو اسے ایک سال کی رعایت دی جائے گی۔ آپ عربی میں داخلہ لیں۔ اس طرح آپ کا ایک سال بچ جائے گا۔ ویسے بھی فارسی میں ایم اے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ فارسی میں بے شمار ایم اے ہیں جب کہ عربی میں ہر سال تین چار لڑکے آتے ہیں اور فوراً نوکری مل جاتی ہے۔ ایم اے فارسی بے کار پھر رہے ہیں۔"

بات غلام جیلانی کی سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ اس نے نیا فارم بھر کر مولوی صاحب کو دے دیا۔ فارسی کا فارم ضائع کر دیا گیا اور اسے عربی میں داخلہ مل گیا۔

وہ لاہور کی ادبی فضا سے ناواقف نہیں تھا۔ لیکن جب لاہور میں رہتا ہوا تو اس ادبی نمائش گاہ کی سیر کا موقع ملا۔ اس وقت لاہور ادیبوں، شاعروں کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ جلد ہی یہ سب اس کے دوست بن گئے لیکن اسے تو علامہ اقبال سے ملاقات کا شوق تھا۔ علامہ اقبال شہرت ومقبولیت کی بلندیوں کو چھو رہے تھے لیکن اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ ان سے ملاقات کا شرف حاصل کرے۔ اس کی شفتگی کا یہ عالم تھا کہ ہر اتوار کی صبح علامہ اقبال کی کوٹھی پر پہنچ جاتا اور پھاٹک کے پاس کھڑے ہو کر علامہ کو دور سے دیکھتا رہتا لیکن اندر جانے کی ہمت نہ پڑتی۔ پھر ایک دن اس کی تڑپ نے ایک معجزہ دکھایا۔ اس کے حقیقی بڑے بھائی مولانا نورالحق کو کوئی کتاب علامہ تک پہنچانی تھی۔ غلام جیلانی نے ان سے گزارش کی کہ یہ کتاب اسے دے دی جائے وہ علامہ تک پہنچا دے گا۔

اس نے کتاب لی اور اشتیاق ملاقات میں میکلوڈ روڈ پہنچ گیا جہاں علامہ کی کوٹھی تھی۔ علامہ کے ملازم نے اسے علامہ تک پہنچا دیا۔ علامہ نے سلام کے جواب میں دایاں ہاتھ آگے بڑھایا جسے غلام جیلانی نے نیاز مندی سے تھام لیا۔

"کہاں سے آئے ہو۔"

"میں مولوی نورالحق کا بھائی ہوں۔ انہوں نے یہ کتاب میرے ہاتھ آپ کے پاس بھیجی ہے۔"

"بہت خوب! آپ کا شغل کیا ہے پڑھتے ہیں؟"

''جی ہاں۔''
''عربی جانتے ہیں؟''
''جی میں عربی میں ایم اے کررہا ہوں۔''
''بہت اچھا۔ اس کتاب کا یہ حصہ پڑھیے اور تشریح کیجیے۔'' انہوں نے کتاب کی ایک فصل اس کے سامنے رکھ دی۔

اس نے ان کے ارشاد کی تعمیل کی لیکن ان کی تنقید کا جواب نہ دے سکا۔ اتنے میں عبدالحمید سالک اور غلام رسول مہر تشریف لے آئے اور باتیں شروع ہوگئیں۔ وہ خاموش ہوکر سننے لگا۔

ان بزرگوں کی باتوں میں دخل دینا تہذیب کے خلاف بھی تھا اور اس کی عدم قابلیت بھی اس کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اقبال کے قدموں میں تھا۔

ایم اے عربی کرنے کے بعد بھی یہ شوق برقرار رہا کہ وہ فارسی میں ایم اے کرے۔ اس نے ملازمت کی وجہ سے پرائیویٹ رجسٹریشن کرایا اور امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ جہاں کوئی مشکل پیش آتی حافظ محمود شیرانی کی خدمت میں حاضر ہوجاتا۔ نہ صرف مشکل حل ہوجاتی بلکہ معلومات کا خزانہ لے کر اٹھتا۔ وہ اب لاہور میں نہیں تھا لیکن ایم اے فارسی کے سلسلے میں بار بار لاہور آنا ہوتا تھا۔ اس آمدورفت نے لاہور کے اہلِ علم حضرات سے اس کا تعلق قائم رہا۔

ایم اے عربی اور فارسی کرنے کے بعد علمی دنیا میں آگے بڑھنے کے تمام راستے مسدود نظر آئے لیکن جذبہ ابھی جوان تھا۔ تیز قدمی کے لیے ایک ہی منزل سامنے تھی کہ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی جائے۔ اس کی تقرری ہوشیار پور میں تھی یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی جھگی میں محلوں کے خواب دیکھے۔ جس دوست سے ذکر کیا اس نے بھی مذاق ہی اڑایا۔

''دماغ کا علاج کراؤ۔ لوگ اس منزل کو سر کرنے کے لیے انگلستان، جرمنی اور امریکا جاتے ہیں اور تم ہوشیار پور جیسی پسماندہ اور جاہل بستی میں رہ کر ان بلندیوں کو چھونا چاہتے ہو۔''

دوستوں کا مشورہ تو یہی تھا کہ بیٹھو، آرام کرو لیکن اس کی تو پوری زندگی عزم و ہمت کی داستان تھی۔ اس نے اس داستان کا آغاز ضلع اٹک کے ایک معمولی سے قصبے سے کیا تھا۔ کوئی دنیاوی سہارا بھی تھا۔ گھر میں بھی فاقوں کا بسیرا تھا۔ مسجدوں اور مدرسوں کی ٹھوکریں کھاتا ہوا وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ دوسروں کے لیے مثال بنا ہوا تھا اور ثابت کررہا تھا کہ کسی مادی سہارے کے بغیر بھی آدمی وہ کچھ حاصل کرسکتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ بشرطیکہ شوق اور لگن ہو۔ اس نے دوستوں کے مشورے کو بالائے طاق رکھا اور پی ایچ ڈی کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اسے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے اردو درجۂ اوّل میں پاس کرلے تو وہ پی ایچ ڈی کا مقالہ اردو میں لکھ سکتا ہے۔ یہ رعایت کسی اور یونیورسٹی میں موجود نہ تھی۔ اس نے کلکتہ یونیورسٹی سے خط کتابت شروع کردی۔ اس خط کتابت کی بدولت کلکتہ یونیورسٹی نے اجازت دے دی۔ اس نے نصاب کی کتابیں منگوائیں اور تیاری شروع کردی۔

تاریخ امتحان سے دو ہفتے پہلے رول نمبر، مقام امتحان اور تاریخ کا جدول آگیا۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر اس ٹائم ٹیبل پر ڈالی اور اپنی دانست میں امتحان سے چار دن پہلے وہ کلکتہ جانے کے لیے ریل میں سوار ہوگیا۔ گاڑی انبالہ تک پہنچی تھی کہ اسے خیال آیا کہ رول نمبر جس کے بغیر امتحان میں بیٹھنا ناممکن ہے گھر بھول آیا ہوں۔ وہ جلدی سے گھبرا کر اٹھا سوٹ کیس کھول کر دیکھا۔ رول نمبر مل گیا۔ یونہی تفریحاً وہ چارٹ پڑھا۔ چارٹ پڑھتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ امتحان پانچ جون کو ہونا تھا اور وہ دو جولائی کو جارہا تھا۔ سخت حیران تھا کہ اب کیا ہوگا۔ رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ سورج دہلی کے اسٹیشن پر طلوع ہوا۔ اترنے لگا تو جوتے غائب تھے۔ سر پر فلیٹ ہیٹ، ریشمی سوٹ زیب بدن اور جوتے غائب۔ مرتا کیا نہ کرتا اسی حالت میں ٹرین سے نیچے اترا۔ سامان دیکھ کر قلی دوڑ کر آیا۔ پہلے سوٹ کیس کی طرف نظر گئی پھر ننگے پیروں کی طرف دیکھا۔ سامان اٹھانا بھول گیا۔

''دیکھتا کیا ہے اٹھا سامان اور باہر چل۔''

قلی نے سامان اٹھایا اور اس عجیب و غریب مسافر کو لے کر سامان سمیت باہر چلا۔ اس نے چاندنی چوک جانے کے لیے تانگہ لیا اور وہاں پہنچ کر سب سے پہلے جوتے خریدے۔ پھر ایک ہوٹل میں جاکر سامان پٹخ دیا۔ اوسان بحال ہوئے تو ایک مرتبہ پھر اپنی حماقت کا خیال آیا۔ امتحان جون میں تھا اور وہ جولائی میں جارہا تھا۔ اب امتحان تو ہاتھ سے گیا لیکن اس کا ازالہ کیسے ہو؟

اردو میں ایم اے کرہی اس لیے رہا تھا کہ پی ایچ ڈی کے لیے راہ ہموار ہو۔ اب پی ایچ ڈی کا کیا ہوگا۔ اس وقت

ایک ہی خیال آیا کہ لاہور جاؤں اور ڈاکٹر محمد شفیع سے مشورہ کروں۔ یہ میری مشکل کا وہی کوئی حل نکالیں گے۔ وہ لاہور پہنچ گیا اور ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی۔ انہیں اپنی حماقت کی پوری داستان سنائی۔ وہ بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔

''آپ کو اردو میں ایم اے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''اس کے بعد ہی میں اردو میں مقالہ تحریر کر سکتا تھا۔''

''آپ اردو میں مقالہ لکھنے پر کیوں بضد ہیں۔''

''اس لیے کہ میری انگریزی زیادہ اچھی نہیں۔''

''آپ اگر کوشش کریں تو لکھ بھی سکتے ہیں۔''

''کوشش تو کر سکتا ہوں لیکن یہ کوشش ہی ہوگی۔ معیاری انگریزی کہاں سے لاؤں گا۔''

''آپ کوئی ادبی کتاب تحریر نہیں کریں گے۔ محققانہ مقالوں میں زبان و بیان سے زیادہ حقائق کو دیکھا جاتا ہے اس مواد کو پرکھا جاتا ہے جو موضوع سے بحث کرتا ہے۔''

''آپ اگر رہنمائی کا وعدہ فرمائیں تو میں ہمت کروں۔''

''میں ہر طرح آپ کا ساتھ دوں گا۔''

''پھر آپ ہی کوئی عنوان تجویز فرمائیں۔''

''کیا آپ ابن تیمیہ پر لکھ لیں گے؟'' ڈاکٹر شفیع نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''میں پوری کوشش کروں گا۔''

''تو پھر جایئے کام شروع کر دیجیے۔''

وہ ان کے دفتر سے نکل کر اپنے ایک اور استاد مولوی صدر الدین کے پاس پہنچا جو شعرائے جاہلیت کا کلام پڑھاتے تھے۔ ان سے پوچھا کہ ابن تیمیہ سے متعلق مواد کہاں سے ملے گا۔ انہوں نے بعض مقامات کی نشاندہی کی۔ اس کے بھائی مولوی نور الحق نے بھی نہ صرف مشوروں سے نوازا بلکہ دو ایک کتابیں بھی اسے دیں۔ اس مواد سے استفادہ کرنے میں دو تین ماہ لگ گئے۔ اس نے پھر لاہور کے لیے رخت سفر باندھا۔ مولانا غلام رسول مہر سے ملاقات کی۔ ان سے کچھ مواد حاصل کیا۔ یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو اسے مواد فراہم کر سکتے تھے۔ وہ ان کے دروازے کھٹکھٹاتا رہا اور مواد جمع کرتا رہا۔ خاطر خواہ مواد جمع ہو گیا تو وہ ہوشیار پور آ گیا۔ ہوشیار پور آ کر عبدالماجد دریا آبادی، نیاز فتح پوری وغیرہ سے خطوط کے ذریعے

> میر عثمان علی خان کی ریاست حیدر آباد دکن پر مشتمل تھی۔ اردو کے بہت بڑے قدر دان اور سخن تھے۔ آپ کے عہد میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ یہیں دار السلام قائم کیا۔ جہاں بہت سی کتب ترجمہ کی گئیں۔ ستمبر 1945ء میں جب بھارت نے ریاست کو اپنی حکومت میں مدغم کرنے کے لیے جارحانہ اقدام کیا تو آپ نے اور آپ کے شہریوں نے مخالفت کی نتیجتاً حکومت ہند نے تمام امداد بند کر دی جس سے اشیاء صرف کی قیمتیں گراں ہو گئیں۔ بالآخر وہ ریاست کو اسی سال ضم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور آپ کی حکومت ختم ہو گئی۔ آپ نے 81 برس کی عمر میں 1967ء میں وفات پائی۔ ایک دیوان کے مصنف ہیں۔ طبیعت میں سادگی بے تکلفی تھی۔
>
> مرسلہ: اشرف عثمان آبادی، کراچی

رابطہ کیا۔ ان حضرات کے طفیل کچھ مواد حاصل ہوا۔ کچھ کتابیں مصر اور بیروت سے بھی منگوائیں لیکن تشنگی ہنوز برقرار تھی۔

وہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں بیٹھا تھا کہ وہاں کے کتاب دار مولوی نذیر احمد اس کے پاس آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک قلمی نسخہ تھا۔ اس نے یہ نسخہ اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ آپ کی تمام مشکلات کا حل ہے۔ اس میں امام ابن تیمیہ کے ہر پہلو پر تفصیلی بحث موجود ہے۔''

اس نسخے سے استفادے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ کام مکمل ہو گیا۔ اس نے اب تک کا جمع کیا ہوا مواد سامنے رکھا اور مقالہ لکھنا شروع کر دیا۔

اس نے اپنے ایک شاگرد سے انگریزی سیکھی تھی اور شاگرد بھی کیسا جو صرف آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ کچھ اپنی ذاتی محنت سے انگریزی پڑھ لی تھی۔ انگریزی میں اس کی قابلیت فقط اتنی تھی۔ اسے یہ مقالہ انگریزی میں تحریر کرنا تھا۔ وہ لکھنے بیٹھا تو اسے خود تعجب ہوا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے ذہن کے دریچے کھل گئے ہوں۔ کئی ماہ کی محنت کے بعد اس نے مقالہ مکمل کر لیا۔

اس مقالے کو ٹائپ کرایا اور اس کی ایک جلد ڈاکٹر شفیع کے پاس بھیج دی کہ وہ اس پر ایک نظر ڈال لیں۔ ڈاکٹر شفیع نے بعض اغلاط کی طرف نشاندہی کر کے وہ مقالہ اسے

واپس کر دیا۔

اس نے ان غلطیوں کو دور کرنے میں مزید چھ ماہ لگائے اور مقالہ یونیورسٹی کے حوالے کر دیا۔

ایک دو ماہ بعد یونیورسٹی نے اسے اطلاع دی کہ مقالے کو پرکھنے کے لیے دو اساتذہ مقرر کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک ہارورڈ یونیورسٹی کا پروفیسر تھا اور دوسرا انگلستان کی کسی یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔

ان دونوں اساتذہ نے مقالے کے محاسن و نقائص پر بحث کرنے کے بعد لکھا۔ ''یہ پی ایچ ڈی کے اعزاز کے قابل ہے۔'' پنجاب یونیورسٹی نے اسے ڈگری ایوارڈ کر دی۔

اس نے اپنی محنت اور لگن سے مسجد سے یونیورسٹی تک کا سفر طے کر لیا۔

اس کے گاؤں میں کوئی بڑا اسکول نہیں تھا۔ اس کا خاندان غریب تھا اور نئی تعلیم کے مصارف برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے والدین تعلیم کے فوائد سے بے خبر تھے۔

اس نے ثابت کر دیا کہ تعلیم صرف ایک چیز مانگتی ہے اور وہ ہے محنت۔ اس کے لیے نہ اسکول کی ضرورت ہے۔ نہ سیم و زر کی۔ اگر لگن موجود ہے تو علم بھاگتا ہوا آئے گا۔

اس نے نہ صرف تعلیم کی آخری حدوں کو پار کیا بلکہ تصنیف و تالیف کا پیشہ اختیار کر کے دنیائے علم میں اپنا نام بھی پیدا کیا۔

☆......☆

تصنیف و تالیف کا مشغلہ زمانہ طالب علمی ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ مختلف اسکولوں میں تعیناتی ہونے کے بعد جیسے جیسے علمی استعداد بڑھتی گئی۔ تالیفی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ طلوع آفتاب سے نماز عصر تک بچوں کو پڑھاتا اور بعد نماز عصر قلم لے کر بیٹھ جاتا۔ یہ سلسلہ آدھی رات تک چلتا رہتا۔

اس نے اپنی پہلی تصنیف ''انفعال'' کے نام سے تحریر کی تھی۔ یہ ایک اصلاحی ڈراما تھا جو دیہات کے مسائل پر لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد دو تین چھوٹے چھوٹے رسائل اور لکھے لیکن انہیں کوئی بڑا علمی کام نہیں کہا جا سکتا تھا البتہ ان سے اتنا ضرور ہوا کہ اس کا نام علمی حلقوں میں پہچانا جانے لگا۔

''لمعات برق'' کے عنوان سے اس نے اپنے چند غیر تحقیقی مضامین کا مجموعہ شائع کیا۔ یہ کتاب بھی کوئی زیادہ شور نہ مچا سکی۔ البتہ اس سے اتنا ہوا کہ لوگوں کو ایک نئے مصنف کی آمد کا احساس ہونے لگا۔

شہرت کی بلندی اس کی منتظر تھی۔

''قرآن و کائنات'' کے عنوان سے امرتسر کے ایک رسالے ''البیان'' میں ایک مضمون بھیجا۔ یہ مضمون لوگوں کو اتنا پسند آیا کہ ''البیان'' کے دفتر میں خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ فرمائش کی جارہی تھی کہ اس سلسلے کو جاری رکھا جائے۔ مدیر نے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ اس سلسلے کو جاری رکھے۔ اس نے تعمیل کی اور آگے پیچھے چودہ مضامین لکھے۔

ان مضامین کی پسندیدگی کو دیکھتے ہوئے مدیر البیان نے ان کو کتابی شکل میں چھاپنے کا ارادہ کیا۔

غلام جیلانی نے اس کا نام ''دو قرآن'' طے کیا۔ ایک قرآن وہ جو حضور صلی علیہ وآلہ وسلم کے سینے پر اترا اور دوسرا وہ جو مناظر کائنات کی صورت میں ہمارے سامنے بکھرا پڑا ہے۔ اللہ نے دونوں کو اپنی آیات کہا ہے۔ قرآن کے ارشادات تو آیات تھے ہی اللہ نے شمس و قمر، حجر و شجر، گلی و گھر اور طیور و حوش کو بھی آیات سے تعبیر کیا۔

یہ اس کی پہلی علمی کتاب ثابت ہوئی۔ اہلِ علم نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ صاحبانِ ادب نے اس کی خوب خوب پذیرائی کی۔ علماء اور عوام کی جانب سے سیکڑوں خطوط موصول ہوئے۔ ان حضرات میں مولانا مودودی، شورش کاشمیری، مولانا عبدالماجد دریا بادی، مولانا غلام رسول مہر، سید عابد علی، احمد ندیم قاسمیؔ امتیاز علی تاج، عنایت اللہ مشرقی، حکیم احمد شجاع، محمود نظامی جیسے اکابرین شامل تھے۔

امام ابن تیمیہ کے عنوان سے اس کا مقالہ برائے پی ایچ ڈی شائع ہوا جو انگریزی میں تھا پھر اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ ہندوستان میں تحریکِ آزادی نے زور پکڑا۔ مسلم لیگ نے 1940ء میں قرارداد لاہور پاس کی۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو دبانے کے لیے جگہ جگہ فسادات شروع کر دیے۔ یہ فسادات کلکتہ سے شروع ہوئے اور لاہور تک پھیل گئے چونکہ سر سکندر حیات مسلم لیگ کے ممبر، پنجاب کے وزیراعظم اور شمالی ہند کے بااثر رہنما تھے لہٰذا ہندو پریس ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گیا۔ انہیں بدنام کرنے کے لیے طرح طرح کے الزامات لگائے جانے لگے۔ غلام جیلانی نے ان الزامات کی تردید لکھنی شروع کی۔ لکھتے لکھتے پوری ایک کتاب تحریر ہو گئی۔ اس نے اس کتاب کا نام ''حیات سکندر'' رکھا۔ وہ اس کتاب کی اشاعت کے لیے بھاگ دوڑ

کر ہی رہا تھا کہ خیال آیا کہ اسے پریس میں دینے سے پہلے خود سکندر حیات کو دکھا لے۔ معلوم ہوا وہ شملے میں ہیں۔ وہ ان سے ملاقات کے لیے شملہ چلا گیا۔

انہوں نے مسودہ دیکھا۔ چند صفحات پڑھے پھر فرمایا، آپ مسودہ چھوڑ جائیں۔ میں دیکھ کر بھیج دوں گا۔ وہ واپس آ گیا۔ وہ مسودے کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ سر سکندر حیات پر دل کا دورہ پڑا اور ان کا انتقال ہو گیا۔ اسے اب اپنے مسودے کی فکر ہوئی۔ دو چار ماہ اور گزر گئے۔ اس نے سکندر حیات کے فرزند شوکت حیات سے رابطہ کیا اور گزارش کی کہ وہ مسودہ تلاش کر دیں تا کہ کتاب شائع ہو جائے۔

مسودہ بدقت تمام واپس آ گیا۔ اب ایک اور رکاوٹ آ گئی۔ سکندر حیات کے ایک قریبی رشتے دار تشریف لائے اور یہ کہہ کر مسودہ لے گئے کہ میں اس پر ایک نظر ڈال لوں، ہفتہ بھر بعد آپ کو واپس مل جائے گا۔ ایک ہفتے بعد اس نے مسودہ مانگا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی دیکھا نہیں ہے۔ جب اسی ٹال مٹول میں کئی مہینے گزر گئے تو وہ ان صاحب کے گھر جا کر بیٹھ گیا کہ مسودہ لے کر ہی اٹھوں گا۔

انہوں نے بہت تلاش کیا اور پھر منہ لٹکا لیا۔

''کسی ایسی جگہ رکھ دیا ہے کہ اب مل نہیں رہا ہے۔ مجھے آپ کی محنت ضایع ہونے کا افسوس ہے لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔ کسی وقت مل گیا تو آپ کو ضرور پہنچا دوں گا۔''

مسودے کی گم شدگی کو سترہ سال ہو گئے تھے کہ وہ صاحب اسے ڈھونڈتے ہوئے آ گئے اور خوش خبری سنائی کہ مسودہ مل گیا۔

مسودہ ملنے کی خوشی تو بہت ہوئی لیکن اب سوال یہ تھا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اسے شائع کون کرے گا۔ اب یہی ہو سکتا تھا۔ اس نے اسے اپنی لائبریری میں اس اُمید کے ساتھ رکھ دیا کہ شاید سر سکندر کا کوئی پڑپوتا اسے شائع کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔

پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ''ڈی لٹ'' کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ ایک مرتبہ پھر اپنے محسن ڈاکٹر شفیع کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''میں ڈی لٹ کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی ایسا کام بتائیے جس پر مجھے یہ ڈگری مل سکے۔'' انہوں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد فرمایا۔

''القفطی کی کتاب ہے ''تاریخ الحکما'' اس کا ترجمہ کردو۔ القفطی کے حالاتِ زندگی لکھو نیز تحقیق کے بعد اس کی تصانیف سن وار تحریر کرو۔ یہ بڑا کام ہو جائے گا اور ہر حال میں ڈی لٹ کا حق دار ٹھہرے گا۔''

''یہ نسخہ مجھے ملے گا کہاں سے۔''

''یونیورسٹی کی لائبریری میں یہ نسخہ موجود ہے۔''

پنجاب یونیورسٹی میں اس کا ایک ہی نسخہ موجود تھا۔ اس نے وہ نسخہ حاصل کیا اور کیمبل پور چلا آیا۔

کتاب نہایت ضخیم تھی۔ بعض مقامات پر نہایت دقیق عربی لکھی گئی تھی۔ اس نے یہ مشکل بھی کسی نہ کسی طرح حل کر لی۔ محنت کا عادی وہ ہمیشہ سے تھا۔ اس کتاب کو لے کر بیٹھا تو صرف تین ماہ میں ترجمہ کر ڈالا لیکن حواشی پر تین سال لگ گئے۔ ''حکمتِ اسلام میں'' کے عنوان سے دیباچہ تحریر کیا۔ چار سو گیارہ حکماء پر مشتمل یہ کتاب تیار ہو گئی۔

انہی دنوں لاہور میں اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں مولوی عبدالحق بھی تشریف لائے۔ غلام جیلانی کو انہیں دیکھ کر خیال آیا کہ مولانا عبدالحق ہی وہ واحد شخص ہیں جو ایسی وقیع کتاب کے قدر دان ثابت ہوں گے اور انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام اس کی اشاعت کا بندوبست بھی کر دیں گے۔ اس نے مولوی صاحب سے ذکر کیا۔ توقع کے مطابق انہوں نے تعریف کی اور حکم دیا کہ مسودہ دہلی کے پتے پر بھیج دو۔ اسے میں شائع کروں گا۔

1945ء میں یہ کتاب دہلی سے چھپ گئی۔

1947ء میں جب ملک تقسیم ہوا تو بابائے اردو مولوی عبدالحق اس کے صرف تین نسخے اپنے ساتھ لا سکے۔ ایک اسے دے دیا۔ بعد میں اس کتاب کو ''حکمائے عالم'' کے نام سے کتاب منزل لاہور نے دوبارہ شائع کیا۔

غلام جیلانی طالب علمی کے زمانے ہی سے قادیانیت کے خلاف مناظرے کرتا رہا تھا۔ اس سلسلے میں چند مضامین بھی لکھے تھے لیکن باقاعدہ کتاب لکھنے کا ارمان ہمیشہ سے تھا۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے کتاب ''حرف محرمانہ'' تحریر کی جو 1953ء میں شائع ہوئی۔

اس زمانے میں ایک کتاب ''ایک اسلام'' تحریر کی جس میں اس نے انسان کو چار گروہوں میں تقسیم کیا اوّل وہ جو قرآن حکیم کو مانتے بھی ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ ان کے جنتی ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ دوم وہ جو نہ مانتے ہیں نہ عمل کرتے ہیں۔ ان کے جہنمی ہونے میں کیا شک۔ سوم وہ عیسائی اور ہندو جو قرآن کو قولاً مانتے تو نہیں

لیکن اس کی بہت سی باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ ایسے لوگ مصنف کے نزدیک مسلمان تو نہیں لیکن مسلمانوں جیسے ہیں چہارم وہ۔۔ مسلمان جو کلمہ پڑھتے ہیں لیکن بدکاری میں گلے گلے ڈوبے ہوئے ہیں۔ مصنف سوال کرتا ہے کیا یہ عملاً کافر نہیں۔

وقت آگے بڑھتا جارہا تھا۔ اس کی تصنیفات میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اب اس کا شماران مصنفین میں ہورہا تھا جن کی تحریریں دلوں پر اثر کرتی ہیں۔ اس کا میدان اسلام اور مسلمان تھا۔ وہ اپنے تجربات کا نچوڑ ان کتابوں کے حوالے کررہا تھا۔ اس نے ایک کتاب "یورپ پر اسلام کے احسانات" تحریر کی۔ اس میں اس نے تفصیلاً ان اثرات کا جائزہ لیا جو اسلام کی وجہ سے یورپ کی تہذیب، تاریخ، ثقافت اور علوم وفنون پر مرتب ہوئے تھے۔

"ہماری عظیم تہذیب" لکھی جس نے مقبولیت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اس کتاب میں اس نے اسلامی تہذیب کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحث کی تھی۔

معجم القرآن لکھی جس میں قرآن کے تمام اعلام، اشخاص اور اقوام پر 202 تحقیقی مقالات شامل تھے۔ ایک کتاب "مہمات رسول" لکھی۔ اس کتاب میں اس نے عہد رسول کے تمام غزوات اور سرایا کی تفصیل لکھی۔ "عالمِ اسلام" کے ساتھ ان سے کتاب تحریر کی جس میں تقریباً پچاس مسلم ریاستوں کا رقبہ اور آبادی اور دیگر تفاصیل تھیں۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ یورپ پر اسلام کے ہزاروں احسانات ہیں۔ ان احسانات کا ذکر اس نے اپنی کتاب "یورپ پر اسلام کے احسان" میں کردیا تھا لیکن وہ یہ بھی بڑے دکھ کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ عصر حاضر کے مسلمان الحاد مغرب سے متاثر ہورہے ہیں۔ مغربی تہذیب کی چمک دمک دیکھ کر وہ اپنی روایات سے غافل ہوتے جارہے ہیں۔ اس نے "الحاد مغرب اور مسلمان" کے عنوان سے کتاب لکھی۔ مثالوں اور دلائل سے اس طرف توجہ دلائی۔ مسلمانوں کو ان خطرات سے آگاہ کیا جن میں وہ گھرتے جارہے ہیں۔

ایک کتاب "اسلام اور عصر رواں" لکھی۔ اس میں یہ ثابت کیا کہ عصر رواں کے پیچیدہ مسائل کو اسلام ہی حل کرسکتا ہے۔

سیاسی، تاریخی اور مذہبی مضامین کا مجموعہ "مسائل نو" کے عنوان سے شائع کرایا۔

☆......☆

آغاز شباب کے ساتھ ہی اس نے شاعری کا آغاز کردیا تھا لیکن ابھی اس کا یہ شوق پس پردہ تھا۔ بڑے بھائیوں کے خوف سے وہ جو کچھ لکھتا تھا اسے ضائع کردیا کرتا تھا لیکن جب وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا اور گھر سے دور بھی رہنے لگا تو وہ جو کچھ لکھتا اسے ایک ڈائری پر اتارتا رہا۔ غزلیں بھی اور نظمیں بھی۔ وہ نثر کی طرف متوجہ رہا اس لیے شاعری کم کم ہی رہی۔ پھر بھی غزلوں اور نظموں کی ایک بڑی تعداد جمع ہوگئی۔

تم نے چہرے پہ جو زلفوں کو بچھا رکھا ہے
رات کو دن سے غضب ہے کہ ملا رکھا ہے
کیا غرض تھی مجھے طوفان کدۂ ہستی میں
وعدۂ موت نے پابند بنا رکھا ہے
حسنِ مہ حسنِ ازل حسنِ بتاں حسنِ چمن
ایک ہی شے ہیں فقط نام جدا رکھا ہے

☆

برہم ہو جہاں جس سے وہ شرر ڈھونڈ رہا ہوں
جو پھونک دے مجھ کو وہ شرر ڈھونڈ رہا ہوں
اندوہ و غم و رنج مجھے ڈھونڈ رہے ہیں
میں شام مصیبت کی سحر ڈھونڈ رہا ہوں
لے جائے مجھے عرش پہ جو صورت شبنم
وہ مہر درخشاں کی نظر ڈھونڈ رہا ہوں
ویرانۂ دل میں کبھی انجم کی فضا میں
ہر سو میں تری راہ گزر ڈھونڈ رہا ہوں
مٹ جائے مذاہب کی شرارت کا نشاں تک
اے برق وہ دنیا میں شرر ڈھونڈ رہا ہوں

علامہ اقبال سے اس کی عقیدت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ ان کی وفات پر اس نے ان کی روح کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا

گیا اقبال اب اللہ ہی جانے
نوائے جاں نواز آئے نہ آئے
ہزاروں دیدہ ور آتے رہیں گے
نگاہ پاکباز آئے نہ آئے
لکھی جائے گی تفسیرِ حقیقت
حقیقت در مجاز آئے نہ آئے
غلامانِ خدا آتے رہیں گے
خودی کا کار ساز آئے نہ آئے
ہماری بزم میں پھر پیکر ناز

یہ انداز نیاز آئے نہ آئے
گیا وہ محرم اسرار فطرت
کوئی دانائے راز آئے نہ آئے

جیسے جیسے اس کے علم اور تجربے میں اضافہ ہوتا گیا اس کی شاعری کا معیار اور رنگ تبدیل ہونے لگا۔

بقدر ذوق طلب ہم سراغ پا نہ سکے
قدم صفات کی منزل سے آگے جا نہ سکے
یہ کیفِ عشق ہے بالیدگی کا یہ عالم
کہ کائنات کی وسعت میں ہم سما نہ سکے
ستم ہے بن گئیں تابانیاں حجاب نظر
ہجوم جلوہ میں جلوہ نما کو پا نہ سکے
وہ عندلیب ہی کیا ہے جو اپنے نغموں سے
بہار آنے سے پہلے بہار لا نہ سکے
شبِ حیات میں کچھ لوگ آفتاب بہ دست
کچھ ایسے بھی ہیں کہ قندیل تک جلا نہ سکے
گری ہے قلب و نظر پر نگاہ اٹھتے ہی
وہ برقِ طور کو پھر ہوش میں ہم آ نہ سکے

☆

جلوے ہیں کائنات میں رقصاں کہاں کہاں
تو ساتھ دے گا دیدۂ حیران کہاں کہاں
ہر شے میں حسن دیکھا اسے دیکھنے کے بعد
پہنچا نظر کے ساتھ گلستاں کہاں کہاں
یونان و روس و پیرس و روما و جرمنی
عقل و خرد ہیں سر بہ گریباں کہاں کہاں
ہر ذرہ کائنات کا ہے طالب نمود
ڈھونڈوں میں آستانہ جاناں کہاں کہاں
ہر غمزہ جاں نواز ہے یہ عشوہ دل فریب
قرباں کرو گے برق دل و جاں کہاں کہاں

☆

حسن کا فیض عام تو دیکھ
ہاتھ بڑھا انعام تو دیکھ
سورج ڈوب گیا تو کیا
رنگ و بہار شام تو دیکھ
صحن چمن چننے والے
پھولوں کا انجام تو دیکھ
سرد چمن پہ مرنے والے
سرو فرازِ بام تو دیکھ
تجھ سے کے راحت کی تمنا
برق تو اپنا نام تو دیکھ

وہ جب ایم اے فارسی کر رہا تھا تو اپنی مشکلات کے حل کے لیے حافظ محمود شیرانی کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات اختر شیرانی سے بھی ہوتی تھی جن کی رومانوی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ان ملاقاتوں میں اشعار کا تبادلہ بھی ہوتا تھا۔ وہ رومانوی شاعری کا دلدادہ ہوتا چلا گیا۔ اس کی نظمیں اس رومانوی رنگ کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں۔

تمہیں کچھ اب بھی یاد ہیں
وہ جاں فزا کہانیاں
وہ بزم ہائے رنگ و بو
وہ عشق کی جولانیاں
وہ حسن کی ستم گری
وفا کی سخت جانیاں
وہ انقلاب دیکھ
راہزنوں کی ملک بانیاں
نظر کے فیض سے وہ
امیوں کی نکتہ دانیاں
وہ خونِ منجمد میں
رودِ نیل کی روانیاں
بہار پر شباب تھا
شباب بے حجاب تھا

☆

دنیائے ادب میں ''فکاہات'' ایک مستقل باب ہے جس کے تحت سنجیدہ باتوں کو طنز و مزاح کے پردے میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس نے کچھ دن اس دنیا کی بھی سیر کی۔ یہ اس کا میدان نہیں تھا لیکن وہ قلم کا دھنی تھا۔ جب یہ موقع آیا تو اس نے اس باغ میں بھی خوب پھول کھلائے۔

1939ء میں جب وہ ہوشیار پور سے تبدیل ہو کر کیمبل پور آیا تو کچھ عرصہ بعد وہاں کے ڈپٹی کمشنر نے اس سے کہا کہ ہمارا سرکاری اخبار ''ترقی اٹک' ہفت روزہ جس کا مقصد اصلاح دیہات ہے دم توڑ رہا ہے۔ اگر آپ اس کی اعزازی ادارت سنبھال لیں تو شاید سنبھل جائے۔

وہ تیار ہو گیا اور اس کا نام ایڈیٹر کے طور پر اس اخبار کی پیشانی پر چمکنے لگا۔ اداریہ لکھنا اس کی ذمہ داری تھی لیکن اس نے فکاہیہ کالم بھی لکھنا شروع کر دیا۔ ان کالموں میں وہ

روز مرہ کے مسائل کو طنزو مزاح کے پیرائے میں بیان کرتا تھا۔ یہ کالم اتنے مقبول ہوئے کہ ہفت روزہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا گرتے گرتے سنبھل گیا اور اس کی اشاعت بڑھنے لگی۔

وہ اس اخبار کا چودہ برس تک ایڈیٹر رہا۔ یہ سلسلہ اس وقت منقطع ہوا جب وہ کیمبل پور سے گورنمنٹ کالج لاہور میں اردو کا پروفیسر ہو کر آیا۔

ان چودہ برسوں میں اس کے فکاہیہ کالم قارئین سے داد وصول کرتے رہے۔ ان کالموں کا انداز کچھ یوں تھا۔

''دوسری جنگِ عظیم کے دوران چینی کا راشن کر دیا گیا تھا اور ہر شخص کو مہینے میں صرف دس چھٹانک ملتی۔ ہاں شادی اور ماتم پر پانچ سیر تک مل جاتی تھی۔ لاہور پولیس نے ایک شخص کو اس جرم میں گرفتار کر لیا کہ اس نے اپنی لڑکی کی شادی کا بہانہ کر کے پانچ سیر چینی لے لی تھی۔ کسی نے شکایت کر دی کہ اس شخص کی تو کوئی بیٹی ہی نہیں اگر چند دن اور یہی حالت رہی تو اس نوع کی درخواستیں بھی شروع ہو جائیں گی۔

اگلے ہفتے میرے دادا جان کی شادی ہونے والی ہے اس لیے دس سیر چینی عنایت فرمائیں یا میری دادی سخت بیمار ہے امید ہے کہ دو دن تک ان کی وفات ہو جائے گی اس لیے چار سیر چینی عطا کریں۔''

☆......☆

''ذات پات کا اختلاف صرف ہند میں ہے۔ یورپ کی آبادی 70 کروڑ ہے لیکن وہاں ذات صرف ایک ہے یعنی عیسائی اور یہاں ہند میں ہر دس آدمیوں کی ذات دوسروں سے جدا اور مسلمانوں کا یہ عالم ہے کہ کوئی اعوان، کوئی جلاہا، کوئی سید، کوئی نائی، کوئی موچی کوئی شیعہ کوئی سنی، کوئی بریلوی۔ کوئی دیوبندی، کوئی گجر، کوئی قریشی...... تو بہ ہی بھلی۔ اگر یہ بیماری سبزیوں اور پھلوں میں پھیل گئی تو بازاروں میں اس قسم کی صدائیں سننے میں آئیں گی۔ راجپوت کھیرا، اعوان ٹماٹر، گجر گونگلو۔''

☆......☆

وہ گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں چودہ بھرپور تعلیمی سال گزارنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں اردو کا پروفیسر ہو کر آیا۔ کیمبل پور سے پہلے گورنمنٹ کالج، اٹک میں بھی پروفیسر رہ چکا تھا لیکن لاہور آنے کی تو بات ہی اور تھی۔ یہاں اسے پڑھانے کا لطف پہلی مرتبہ آیا تھا۔ دل بستگی کے سامان بھی بہت تھے۔ کالج ختم ہونے کے بعد کہیں نہ کہیں نکل جاتا اور معلومات کے خزانے اٹھا کر لے آتا۔ تصنیفی زندگی کے لیے ماحول بھی تھا اور تصنیفات کے قدر دان بھی تھے۔ اس کی بہترین تصانیف اسی دور میں ظہور پذیر ہوئیں۔

اس کے بعد اسے ڈگری کالج باغبان پورہ کا پرنسپل بنا دیا گیا۔

وہ 1963ء میں سبکدوش ہو گیا تھا لیکن حکومت اس کی صلاحیتوں سے کسی نہ کسی طرح فائدہ اٹھاتی رہی۔ پنجاب یونیورسٹی نے ادارہ تعلیم و تحقیق کا ڈائریکٹر بنایا۔ سینٹر ٹریننگ کالج (کالج آف ایجوکیشن) کا پرنسپل بنایا جہاں وہ آخر دم تک کام کرتا رہا۔

وہ فرائض تدریس سے سبکدوش ہوا تھا لیکن لکھنا جاری تھا۔ اس نے کئی سال کی محنت کے بعد علامہ اقبال کے شہرۂ آفاق انگریزی خطبات سے متعلق ایک کتاب تیار کی اور اس کا نام ''فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو'' قرار دیا۔

اب وہ 76 سال کا ہو گیا تھا۔ آنکھیں بھی جواب دے چکی تھیں توئی بھی تھک چکے تھے۔ اس باہمت نے نہ جانے کیسے ہمت ہار دی اور اخبار میں اعلان کر دیا کہ آنے والی کتاب کو میری آخری کتاب سمجھا جائے کہ اب میں نوشت و خواند سے ریٹائر ہو رہا ہوں۔

اس اعلان سے طلبہ اور اساتذہ میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر طرف سے خطوط آنے لگے کہ ہم آپ کی کتابوں کے منتظر رہتے ہیں۔ اپنی اس قسم کو توڑیئے۔ کم کم سہی لیکن لکھیے ضرور۔ وہ لاکھ کہتا رہا کہ بھئی اب آنکھوں میں دم نہیں رہا لیکن اصرار بڑھتا رہا۔ بعض حضرات اس خیال سے عیادت کے لیے آنے لگے کہ شاید برق صاحب شدید بیمار ہیں۔ عیادت کے لیے آتے اور اصرار کر کے چلے جاتے کہ برق صاحب کچھ لکھیے۔

شاید وہ ان مشوروں پر عمل پیرا ہو بھی جاتا کہ قسمت نے اسے بے دست و پا کر دیا۔ اس پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ بستر کا ہو کر رہ گیا۔

اسے اپنا وہ اعلان یاد آیا ''میں اب نوشت و خواند سے ریٹائر ہو رہا ہوں'' پھر اسے قرآن کی ایک آیت یاد آئی جس کا ترجمہ تھا ''زمین میں اس کو قیام و دوام نصیب ہوتا ہے جو دنیا کے لیے مفید ہو'' جب میں نے خود ہی اپنے غیر مفید ہونے کا اعلان کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فالج گرا کر

مجھے مزید بے کار کردیا۔

وہ بچپن سے اب تک ایک لمحے کے لیے بھی بے کار نہیں رہا تھا اور اب وہ دوسروں کا محتاج ہو کر رہ گیا تھا۔ کبھی کبھی کوئی کتاب اٹھا کر لیٹے لیٹے پڑھ لیتا تھا اور بس۔

پرانی یادیں تھیں اور وہ تھا۔

ایک دن خیال آیا کہ وہ بھی کیا دن تھے کہ کیمبل پور سے بسال پیدل چلا جاتا تھا اور اب دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔ بھلا ہو احباب کا کہ ملنے چلے آتے ہیں۔ یہ بھی کب تک آتے رہیں گے۔ اس نے جھنجلا کر کروٹ بدلی۔ بیٹی سے کہا، ایک لاٹھی لا کردو۔ وہ حیران کہ لاٹھی کس لیے مانگتے ہیں بہرحال لاٹھی لا کردے دی۔ اس نے جب دیکھا کہ لاٹھی کے سہارے اٹھنے کی کوشش کررہے ہیں تو اس نے روکنا چاہا۔

''ابا یہ کیا کررہے ہیں۔''

''میں زندگی بھر ناممکن کو ممکن بناتا رہا ہوں۔ میں زیادہ دن بستر پر نہیں پڑا رہ سکتا۔'' یہ کہا اور لاٹھی کے ذریعے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''تم نے دیکھا۔''

وہ کچھ دیر کے لیے کھڑا رہا۔ پھر لاٹھی زمین سے اٹھا لی لیکن لڑکھڑا گیا۔ لاٹھی کا سہارا پھر لے لیا۔ پھر لاٹھی اٹھائی پھر لڑکھڑا گیا۔ اس طرح کئی مرتبہ ہوا۔ سنبھلتا لڑکھڑاتا رہا۔ پھر تھک کر بیٹھ گیا۔

دو دن تک اسی طرح کی مشق کرتا رہا اور بالآخر سہارے کے بغیر کھڑا ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ چار پانچ دن کھڑے ہونے کی مشق کرتا رہا اور پھر چلنے بھی لگا۔ پہلے چند قدم پھر چند گز اور پھر باقاعدہ چلنے لگا۔ وہ ان دنوں کالج آف ایجوکیشن کا ڈائریکٹر تھا۔ چند مہینوں کی غیر حاضری کے بعد وہ باقاعدگی سے دفتر جانے لگا۔ چلنے میں ذرا دقت ہوتی تھی لیکن چلنے لگا تھا۔ تصنیفی دنیا سے کنارہ کش ہونے کے اعلان پر اب بھی قائم تھا۔

1979ء کی ایک شام مکتبہ رشیدیہ کے ناظم اعلیٰ تشریف لائے ان کے ساتھ کراچی سے تعلق رکھنے والے خالد جامعی بھی تھے۔ ان دونوں نے بیٹھتے ہی اصرار کرنا شروع کردیا کہ وہ اپنی قسم توڑ دیں اور دوبارہ لکھنا شروع کردیں۔

''ارے صاحب، میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ اب زیادہ دیر جم کر بیٹھ نہیں سکتا۔''

''زیادہ دیر نہ بیٹھیں۔ قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے۔ تھوڑا تھوڑا بھی لکھیں گے تو آپ کے تجربات سے ہمیں استفادے کا موقع ملے گا۔''

''یہ کام وقفے وقفے کا نہیں ہوتا اور پھر حوالے کی کتابوں کے لیے بھاگ دوڑ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب وہ میرے بس کی نہیں۔''

''مجھ سے جو کتابیں ممکن ہوں گی فراہم کردیا کروں گا۔''

''بھائی یہ ذہنی کاموں ہی کا نتیجہ ہے کہ میں فالج کا شکار ہوا۔ اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

''آرام بھی کیجیے لیکن یہ قسم نہ کھائیے کہ اب کچھ لکھیں گے ہی نہیں۔''

''کس کے لیے لکھوں۔ نسل کا مذاق آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں تو اسلام اور پاکستان کے گن گاتا ہوں اور یہ نسل ان دونوں سے برگشتہ ہے۔ پھر لکھوں تو کس کے لیے لکھوں۔''

''آپ نئی نسل سے مایوس کیوں ہیں۔''

''میں اسلام کے مستقبل کے بارے میں پُرامید ہوں مگر اسلام کے نادان دوستوں سے مجھے تشویش بھی ہے۔ اسلام انسانیت کی ترقی اور انصاف کی ایک عالمگیر تحریک ہے، جس کی بنیاد روحانی ہے اور جو انسانوں کی وحدت کے تصور پر قائم ہے۔ اسلام کے نادان دوست اسے نہ صرف نوع انسانی بلکہ مسلمانوں سے بھی متصادم دیکھنے کا شوق فضول رکھتے ہیں جس سے مجھے شدید اختلاف ہے۔

میں اسلام کے ساتھ پاکستان کا بھی شیدائی ہوں اور اس کو ایک طاقتور آزاد اور خوش حال ملک دیکھنا چاہتا ہوں مگر میرے نزدیک اسلام اور پاکستان کی محبت دراصل مسلمانوں کی اور اہلِ پاکستان کی محبت کا دوسرا نام ہے۔ نئی نسل اس محبت سے عاری ہوتی جارہی ہے۔''

''آپ کی ان دونوں باتوں سے ہمیں اتفاق ہے لیکن ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اس ماحول میں آپ کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اب آپ کو صرف لکھنا نہیں ہے تبلیغ کرنی ہے۔''

''بھائی! اب مجھے لکھنا نہیں لڑنا پڑے گا۔ ان قلم کاروں سے لڑنا پڑے گا جو اسلام کے نام پر سرمایہ داری اور جاگیرداری کے تحفظ پر تلے ہوئے ہیں۔ اب لڑنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔''

''آپ کی طرف سے لڑنے کے لیے ہم تیار ہیں

آپ لکھنا تو شروع کریں۔ اچھا ہم ایسے دقیق مسائل پر لکھنے کے لیے آپ سے نہیں کہتے۔ آپ اپنی سوانح لکھ دیں۔''

''یہ تو آپ نے اور بھی مشکل کام بتا دیا۔ میں نے ایسا کون سا بڑا کام کر ڈالا ہے جس کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے اپنی سوانح لکھوں اور اگر لکھ بھی دوں تو اس کا افادی پہلو کیا ہوگا۔''

''گزارش یہ ہے جیلانی صاحب کہ آپ کی ذات ایک مثال ہے۔ عموماً لوگ تعلیم حاصل نہ کرنے کے کئی عذر پیش کرتے ہیں مثلاً یہ کہ ہمارے گاؤں میں اسکول نہیں تھا۔ ہم غریب تھے۔ موقع نہیں ملا۔ والدین کو شعور نہیں تھا۔ آپ کے ساتھ یہ تمام مسائل تھے لیکن اس کے باوجود آپ نے مولوی فاضل کیا، منشی فاضل کیا، میٹرک کیا، ایم اے عربی کیا، ایم اے فارسی کیا۔ آپ کے تحقیقی مقالے کو انگلستان اور ہارورڈ یونیورسٹی کے دو ماہرین نے پرکھا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کی سفارش کی۔ جن اداروں میں آپ نے تعلیم حاصل کیں وہیں پڑھانے کا اعزاز ملا۔ 37 سے زیادہ تصنیفات آپ کے قلم سے نکلیں۔ کیا آپ کی سوانح کا یہ افادی پہلو کم ہے کہ پڑھنے والے یہ سبق حاصل کریں گے کہ محنت اور لگن ہو تو ہر مشکل عبور کی جا سکتی ہے۔''

غلام جیلانی برق اس دلیل کے سامنے کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر جیسے اس نے ہار مان لی۔

''آپ لوگ کہتے ہیں تو ہمت کروں گا۔''

باتیں اتنی دلچسپ تھیں کہ یہ لوگ شام کے وقت آئے تھے اور رات کے دو ڈھائی بج گئے۔ محفل برخاست ہوئی تو وہ اپنی داستانِ حیات لکھنے کا وعدہ کر چکا تھا۔

اس کی قسم بھی برقرار رہی کہ وہ اب جو کتاب لکھنے والا تھا وہ کسی موضوع پر کوئی تصنیف نہیں تھی بلکہ اس کی سوانح تھی بہرحال اسے اس کی آخری کتاب کہا جا سکتا تھا۔

اس نے ان لوگوں کے رخصت ہوتے ہی اپنی یادداشتیں اپنے ذہن میں جمع کرنا شروع کر دیں۔ پردۂ ذہن پر بہت سے نام ابھرے۔ اس نے ان سب کو ترتیب دیا۔ اپنی ڈائری نکالی اور اس میں درج واقعات کو سامنے رکھ کر لکھنا شروع کر دیا۔

نومبر 80ء میں لکھنا شروع کیا اور اس کی تکمیل 8 اکتوبر 81ء کو ہوئی۔

اس کی یہ سوانح بھی اس کی دیگر تصنیفات کی طرح منفرد تھی۔ خودنوشتوں میں یہ تاثر عام ہوتا ہے کہ مصنف نے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ اپنی تعریفوں کے پل باندھے ہیں لیکن اس نے ایسا کوئی تاثر قائم نہیں ہونے دیا۔ اپنی داستان سے زیادہ ان افراد کی تعریف کے باب باندھے جو زندگی کے طویل سفر میں اسے ملتے رہے اور اس کے احباب میں ان کا شمار ہوا۔ اس نے فراخدلی سے ان افراد کا ذکر کیا جن سے اس نے استفادہ کیا۔ پہلی نظر میں یہ داستان صرف اس کی نہیں بلکہ ان بہت سے لوگوں کی داستان نظر آتی ہے جنہوں نے علمی دنیا میں کوئی کارنامہ انجام دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی اپنی داستان ثانوی درجہ اختیار کر گئی اور دوسری بہت سے لوگوں کی حیثیت ابھر کر سامنے آئی۔ دوسرے لفظوں میں اس کی داستان عصرِ رواں کی داستان بن گئی اس نے کتاب کے آغاز میں بالکل سچ لکھا۔

''یہ داستان صرف میری داستان نہیں بلکہ ان ادیبوں، علماء، حکماء اور مفکرین کی داستان ہے جنہوں نے قرنِ رواں کو علم، دانش، فکر اور تہذیب کا درس دے کر اسے مزید چمک بخشی۔''

اس نے بالکل ٹھیک لکھا اور کتاب کے آخر میں لکھا کہ اسے آخر میں ہی لکھنا چاہیے تھا۔

''میں نے زندگی میں ایک بات سیکھی ہے کہ وہی علم قابلِ قدر ہے جو کائنات کو مسخر کر کے انسان کا غلام بنا دے۔ جو انسان کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر شمس و قمر کی بلندیوں تک پہنچا دے۔ کس قدر عظیم ہیں وہ اقوام جو روشنی، بجلی اور فطرت کی دیگر طاقتوں سے کام لے کر آج فضا و خلا میں اڑ رہی ہیں اور کتنی پست ہیں وہ قومیں جو جہالت کی وجہ سے عظمت کے تصور تک سے نا آشنا ہیں۔''

اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنی آخری کتاب تحریر کر دی۔

اس کے بعد اس کا گھر بیماریوں نے دیکھ لیا۔ اس کی عمر 84 سال ہو گئی تھی۔ صحت ٹھیک تھی۔ بزرگی تھی جو بیماری بنی ہوئی تھی۔

ایک مختصری علالت کے بعد اس کا قلم ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

برق روداد دل سنا نہ سکا
آج حسنِ بیاں میں ڈوب گیا

ماخذ
میری داستان حیات
ڈاکٹر غلام جیلانی برق

شمع امید جلا

سلمٰی اعوان

حوصلہ روبرو آکھڑا ہو اور سر اعترافِ شکستگی میں جھکا ہوا ہو تو بھی ہمت ہارنا بہادروں کا شیوا نہیں۔ یہی اس نازک اندام دوشیزہ نے کر دکھایا گو کہ اس نے یورپ میں جنم لیا تھا مگر تھی تو مسلمان، اسی وجہ سے وہ تامل ٹائیگر کے دہشت گردوں کا سحر توڑنے کے لیے سینہ سپر ہو گئی تھی۔

سری لنکا کے مسلمانوں کے حال زار کی ایک جھلک

پل کے ہزارویں حصے میں بھی لاریف ہادی اس بات کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا بیٹا لبریشن ٹائیگرز اف تامل جیسی جنگ جو اور دہشت گرد تنظیم کے اجلاسوں میں شرکت کرتا ہے۔ تنظیم کے بانی ویلو پلائی پر بھاکرن سے عقیدت اس کے مقاصد سے ہمدردی اور تاملوں پر سنہالیوں کی زیادتیوں کے خلاف جافنا کے مضافات میں ہونے والے چھوٹے موٹے جلسے جلوسوں میں کچی پکی تقریریں جھاڑتا ہے۔ حالیہ

خودکش حملوں میں مرنے والے چند نوجوانوں سے بھی اس کا یارانہ تھا۔

اس کی آنکھوں میں صرف حیرت ہی نہیں تھی بلکہ وہ شدید کرب سے خوفناک حد تک پھیلی ہوئی بھی تھیں۔ اس کا دل وسوسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ اتنا بے خبر تھا۔ کیا وہ اس پر یقین کرے یا نہ کرے؟ اس کا بیس سالہ پانچ فٹ گیارہ انچ لمبی قامت والا بیٹا کب اور کیسے اس جال میں پھنسا۔ اور کیوں پھنسا؟ یہ سارے سوال جواب وہ خود سے کیے جارہا تھا۔

ڈاکٹر حسب اللہ نے آہستگی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس کے اندر کے اتار چڑھاؤ سے بخوبی واقف تھے۔ سمجھ رہے تھے کہ وہ کس اذیت ناک کیفیات سے گزر رہا ہے؟

یہ سری لنکا کے خوبصورت شمالی ساحلی شہر جافنا کی خوبصورت سی صبح تھی۔ پیرا ڈینیا یونیورسٹی سے ڈاکٹر حسب اللہ کل یہاں آئے تھے۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں رتنا پور گیا ہوا تھا۔ رات کو واپس آیا تو انور بھائی نے بتایا کہ صبح مسجد میں نماز کے بعد ڈاکٹر صاحب کا لیکچر ہے۔ لاریف ہادی کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ ڈاکٹر حسب اللہ مسلمانوں کی سری لنکن تنظیم کے بانی اراکین میں سے ایک تھے۔ پارے کی طرح متحرک یہ شخصیت سری لنکا کے مسلمانوں کے لیے اُمید اور حوصلے کا پیغام تھی۔

جافنا کی پچاس فیصد مسلمان آبادی کاروباری لحاظ سے خاصی مضبوط تھی۔ ڈاکٹر حسب اللہ کا دو تین ماہ بعد یہاں کا چکر ضرور لگتا تھا۔ مقامی مسلمان ان کی آمد کے منتظر رہتے۔ سری لنکا کے شمالی علاقوں میں تامل ٹائیگرز کی سرگرمیاں بہت بڑھ چکی تھیں۔ مسلمان کمیونٹی ان سرگرمیوں سے خاصی پریشان بھی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب!'' لاریف ہادی کی آواز جیسے غم سے بوجھل تھی۔

''کہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی۔ میرا بیٹا، یقین نہیں آتا۔'' آواز جیسے ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔

''گھبراؤ نہیں! حوصلے سے کام لو۔ صورت حال کو بردباری سے سنبھالو۔ میری معلومات غلط نہیں اور ہاں دیکھو تختی کی ضرورت نہیں۔ جوان خون ہے بھر جائے گا۔ آرام اور دلداری سے باز پرس کرو۔''

اس وقت ان دونوں کے ساتھ مسلم رائٹس آرگنائزیشن کے انیس احمد بھی تھے۔

ہادی جب گھر جانے کے لیے کھڑا ہوا تو اسے محسوس ہوا تھا جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی تڑخ گئی ہو۔ پتا نہیں کیسے وہ مسجد سے باہر نکلا اور گھر آیا۔ بیوی نے اڑی اڑی رنگت دیکھ کر پوچھا۔

''خیریت تو ہے؟''

''ہاں بس ایسے ہی ذرا دل گھبرا رہا ہے۔''

آنگن کے کونے میں پڑے کچے گولڈن ناریل کا ڈھیر لگا پڑا تھا۔ اس نے تیز دھار کے گنڈاسے سے اس کا اوپر والا حصہ کاٹا اور کمرے میں آگئی جہاں ہادی لیٹا ہوا تھا۔

بیوی کے ہاتھوں میں پکڑا گولڈن ناریل اور اس کے چہرے پر چھائے تفکر نے اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔ دھیرے دھیرے گھونٹ گھونٹ ڈاب پیتے ہوئے اس نے اپنے اندر کی تلخی کو کم کرنا چاہا پر اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کہیں آگ لگی ہے۔ پھر دفعتاً اس نے بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے پاس بٹھالیا اور بولا۔ ''لاطف کہاں ہے؟''

''گھر میں تو نہیں، کہیں باہر گیا ہے۔''

''ابھی نو بجے ہیں اور باہر بھی چلا گیا ہے۔ تمہیں بتا کر نہیں گیا۔''

بیوی کو ہادی کے یوں بات کرنے پر قدرے حیرت سی ہوئی۔ یہ کوئی نئی بات تو تھی نہیں، وہ تو ہمیشہ سے صبح سویرے باہر نکل جاتا تھا۔ کبھی رات گئے گھر آتا۔ وہ گریجویشن سائنس فائنل کا اسٹوڈنٹ تھا۔

ایک لمحے کے لیے ہادی کا جی چاہا کہ وہ بیوی کو اپنی پریشانی اور تفکر سے آگاہ کردے۔ اپنا دکھ اور کرب اس سے شیئر کرے، مگر وہ رک گیا۔ اس نے دل میں اپنے آپ سے کہا۔ ''اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ عورت ذات یونہی خوف زدہ ہوجائے گی۔''

ہادی کا فشنگ کا کاروبار تھا۔ جافنا میں اس کی اچھی ساکھ تھی۔ اپنی دو لانچیں اور دو فیریاں تھیں۔ اس کے کارندے مچھلی Kankesantura سے آگے ہندوستان کے ساحلی شہروں تک لے جاتے تھے۔

سائیکل رکشا پر بیٹھ کر وہ اپنے دفتر آگیا۔ جو

موررو ڈ پر تھا۔ جونہی وہ سائیکل رکشا سے اترا، دفتر کے چھوٹے سے دروازے کے سامنے لاطف کھڑا تھا۔ بیٹے کو دیکھتے ہی اس پر غصہ، رنج اور یاسیت کے ملے جلے جذبات کا حملہ سا ہوا، پر خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے بیٹے کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ لاطف باپ کے پیچھے پیچھے کمرے میں آگیا۔ بید کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کسی قدر حیرت سے باپ کو دیکھا جو پریشان نظر آرہا تھا۔

ہادی نے گہری نظروں سے بیٹے کو دیکھا اور مدھم آواز میں کہا۔ ''لاطف میں نے زندگی اور کاروباری معاملات میں ہمیشہ سچ بولنے اور سچ برتنے کو ترجیح دی۔ جھوٹ، غلط بیانی اور منافقت کبھی میرے کسی معاملے کی بنیاد نہیں رہے۔ وہ اصول جو میرے رہے اور ہیں انہی پر میں تمہیں بھی گامزن دیکھنا چاہتا ہوں۔ آج میں جو تم سے پوچھوں گا تم مجھے سچ سچ بتاؤ گے۔''

لاطف حیران تھا، اس کے باپ نے کبھی لمبی چوڑی باتیں تمہیدی انداز میں نہیں کی تھیں، وہ ہمیشہ سے مختصر بات کرنے کا عادی تھا۔ اس کا دل دھڑکا اور اس نے خود سے کہا ''یہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' پھر وہ حوصلے سے بولا۔

''آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں۔ آپ کو بھی پتا ہے کہ میں صاف اور کھری بات کرنے کا عادی ہوں۔''

''تامل ٹائیگرز سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

ہادی نے اپنی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

لاطف کا رنگ بدلا۔ شاید وہ ذہنی طور پر اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔

''تعلق'' اس نے زیر لب کہا اور پھر کسی قدر جرأت مندانہ انداز میں بولا۔ ''میں بس ان کے اجلاسوں میں کبھی کبھار شریک ہو جاتا ہوں۔ جس کاز کے لیے وہ جدوجہد کر رہے ہیں میں اسے درست سمجھتا ہوں۔''

ہادی کا چہرہ بیٹے کی بات پر تپ اٹھا۔ وہ غصے سے چیخا۔ ''شرم آنی چاہیے تمہیں ان کے کاز سے ہمدردی کرتے ہوئے۔ بے گناہ معصوم لوگوں کو قتل کرتے ہیں، بھرے مجمعوں میں بم پھینکتے اور انسانوں کا قتل و غارت کرتے ہیں۔ انسانی جانیں ان کے نزدیک کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہم نہیں۔'' پل بھر کے لیے وہ رکا۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی جب اس نے بات دوبارہ شروع کی۔ ہمارے جافنا کے مسٹر ایلفرڈ دوریاپہ کا کیا قصور تھا صرف یہ کہ وہ سنہالیوں تاملوں، مسلمانوں اور عیسائیوں سبھوں کا ہمدرد تھا انہیں مل جل کر امن و آشتی سے رہنے کی تلقین کرنے والا ایک مہذب اور شریف النفس انسان تھا جو انہیں ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

''مگر وہ آزادی چاہتے ہیں۔'' لاطف نے باپ کی بات کاٹ دی۔

بھونچکا سا ہو کر اس نے بیٹے کی اس بات کو سنا۔ اس کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ یہ اس کا بیٹا کیسی لایعنی بات کر رہا تھا۔

''دیکھو اگر کہیں زیادتیاں ہوئی ہیں تو جو طریقہ ان لوگوں نے اپنایا ہے وہ صریحاً غلط ہے۔ احتجاج کرو۔ اپنی آواز اوپر پہنچاؤ۔ مگر یہ سب تو نہ کرو جو کر رہے ہو۔ دراصل شرپسندوں کی یہ قوم انڈیا کے ہاتھوں کھلونا بن گئی ہے۔ انڈیا جس کا بڑا مقصد سری لنکا کے شمالی حصے کو اپنے جنوبی حصے سے ملانا ہے۔ یاد رکھنا میری بات آج تم جن کے ہاتھوں ناچ رہے ہو کل یہ تم مسلمانوں کا سب سے پہلے صفایا کریں گے۔''

''آپ طیش میں مت آئیے۔ جذباتی ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ دلیل سے بات کریں۔ احتجاج اور ہتھیار کبھی بھی بغیر وجہ کے نہیں اٹھائے جاتے۔ ان کے پس منظر میں معاشروں کے اندر پلنے والی محرومیاں، ناانصافیاں، ایک طبقے کا دوسرے طبقے پر فوقیت، غلبہ اور احساس برتری جیسے جذبات و احساسات کا کارفرما ہونا ہوتا ہے۔ زیادتی اور برتری کی پہلی اینٹ 1954ء میں اس دن رکھ دی گئی تھی جب پارلیمنٹ میں سنہالیوں کی اکثریت نے سنہالی زبان کو سرکاری زبان قرار دے دیا تھا۔

تامل لوگ کتنے غریب ہیں۔ کتنے دھتکارے ہوئے ہیں۔ سری لنکا کی کسی ایک حکومت کا نام لے دیں جس نے انہیں ان کے حقوق دیئے ہوں۔ اقتدار کو تو سنہالیوں نے اپنی جدی جاگیر بنالیا ہے۔ اب وہ کھڑے ہوگئے ہیں۔ انہوں نے ہتھیار اٹھالیے ہیں۔ علیحدگی اور خود مختاری کی باتیں کرنے لگے ہیں تو

انہیں مصیبت پڑ گئی ہے۔ اب بھگتیں۔"
ہادی کا جی تو چاہا تھا ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے رخسار پر مارے اور کہے "تاملوں اور ان کے حقوق کے لیے جذبات کی اتنی اگل اچھل۔ کبھی اپنی کمیونٹی کا بھی سوچتے ہو۔" بکمال ضبط سے خود سے غصے پر قابو پاتے ہوئے دھیمی اور رسان بھری آواز میں بولا۔ "لاطف تم ابھی ناسمجھ ہو۔ انڈیا والوں کی چالوں اور ریشہ دوانیوں کو نہیں جانتے۔"
وہ کھڑا ہو گیا اور باہر کی طرف جانے کے لیے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے اک ذرا رکا اور بولا۔ "اب میں اتنا بھی بچہ اور ناسمجھ نہیں۔"
کمرا خالی تھا اور ہادی کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے وجود میں سے کسی نے زندگی کی ساری حرارت کشید کرلی ہے۔ جیسے وہ پتھر کا ہو گیا ہو، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلاؤں میں گھورتا ہوا۔ دیر تک وہ اس کیفیت میں رہا پھر اپنے بیٹے کے بے شمار روپ اس کی آنکھوں کے سامنے ابھرے۔ اس کا بڑا بیٹا جس کے وجود سے اس کی بے شمار توقعات وابستہ تھیں۔ بہت سارے خواب جن کی تعبیریں اس کی زندگی کا ماحصل تھیں۔
بازی کیسے الٹ گئی؟ بیٹے نے ریل کی پٹڑی کے کانٹے کی طرح راستہ کیسے بدل لیا؟ اس کی تربیت میں کہاں کمی رہی؟
جے بے ویرا سنگھ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ویرا سنگھ کو تامل تھا مگر بڑا صلح پسند اور امن و آشتی سے محبت کرنے والا انسان۔ اس کا بیٹا بھی تحریک کا رکن بن گیا تھا۔ بڑا جوشیلا جوان تھا۔ مرکزی حکومت کے وزیر صنعت کا "مینار" میں بڑا اہم دورہ تھا۔ بم دھماکے کے لیے اس کو چنا گیا۔ سازش بروقت ناکام ہوگئی۔ ویرا سنگھ کا بیٹا پکڑا گیا۔ سائنائیڈ کا کیپسول جو اس کے گلے میں بندھا ہوا تھا اس نے فی الفور وہ کھا کر زندگی کا رشتہ اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیا۔
ایک لمبی آہ اس کے سینے سے نکلی۔ جذبات سے لبریز یہ بالی عمر جس میں ہوش کے بجائے جوش غالب ہوتا ہے، اسے جس طرف چاہے موڑ لیا جائے۔
پھر وہ اٹھا، اپنے بے دم سے وجود کو گھسیٹتا اور دفتر سے ملحقہ چھوٹے سے کمرے میں جہاں وہ بالعموم دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر لیٹتا تھا داخل ہوا۔ جونہی وہ چٹائی پر بیٹھا۔ اس کا ضبط جواب دے گیا۔ اس کے اندر کا دکھ آنسوؤں کی صورت باہر آنے لگا۔ وہ روتا رہا۔ اپنے چہرے کو اس پانی میں نہلاتا رہا پھر لیٹ گیا۔ پتا نہیں کب اسے اونگھ سی آ گئی۔
جب وہ اس کیفیت سے نکلا، ظہر کا وقت تھا۔ اس نے نماز پڑھی۔ آج اس کے سجدوں میں جو تڑپ تھی اس نے اس کی آنکھوں کو بار بار بھگویا۔ دعا کے لیے جب ہاتھ اٹھائے تو اشک بار آنکھیں بند تھیں اور وہ خدا سے مخاطب تھا۔ بہت دیر تک وہ ہتھیلیاں پھیلائے جامد و ساکت حالت میں بیٹھا رہا۔
پھر جیسے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک ننھی منی سی کرن جھلملائی۔ مایوسی کی وہ انتہا جس پر وہ اس وقت پہنچا ہوا تھا...... دل گرفتگی جس میں وہ الجھا ہوا تھا قدرے کم ہوئیں۔ جیسے کسی گھٹن زدہ ماحول میں تازہ ہوا کا جھونکا میسر آ جائے کچھ ایسی ہی اس کی کیفیت تھی۔ وہ اٹھا اور گھر آیا۔ بیوی نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر پوچھا؟
"کچھ بتاؤ تو سہی، میں صبح سے دیکھ رہی ہوں پریشان نظر آ رہے ہو۔"
بغیر کچھ کہے وہ چٹائی پر بیٹھا پھر بولا۔ "تم کھانا لاؤ۔"
اس نے ابلے چاولوں کی قاب رکھی۔ مٹی کی چھوٹی سی ہنڈیا میں پول سمبل (کوکونٹ کی بھجیا) تھی۔ دوسری ہنڈیا میں ناریل کے دودھ میں پکائی گئی مچھلی اور سبزی کی کڑھی تھی۔ دونوں ڈشیں اس نے ہادی کے سامنے سجا دیں۔ پانی کا جگ اور گلاس رکھا اور خود بھی پاس بیٹھ گئی۔
ہادی چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔ جب کھا چکا اور شکر الحمدللہ کے الفاظ ادا کیے تو بیوی نے ایک بار پھر کہا۔ "کوئی کام کاج کی پریشانی ہے کیا؟ تمہاری کیا بری عادت ہے کہ تم کچھ کہتے نہیں۔"
ہادی نے خاموش نظروں سے اسے دیکھا اور چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔ "تمہیں اگر کسی بات کی سمجھ نہیں تو بحث مت کیا کرو۔ کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔"
بیوی نے برتن سمیٹے اور خاموشی سے اٹھ گئی۔
ہادی کا چھوٹا بھائی پندرہ سال سے امریکا کی

ریاست نیویارک میں مقیم تھا۔ سات آٹھ سالوں سے اس کے مالی حالات بہت اچھے ہوگئے تھے۔ پہلے چند سال تو دھکے ہی کھاتا رہا تھا۔ پر اب چند پیٹرول پمپوں اور ایک بڑے اسٹور کا مالک ہوگیا تھا۔ ہادی کی اُمید کی کرن اس کا یہ چھوٹا بھائی ہی تھا جس کے پاس وہ بیٹے کو فی الفور بھیج دینا چاہتا تھا۔

لیٹنے کی بجائے اس نے اسی وقت بھائی کو تفصیلی خط لکھ کر اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ اپنا سارا درد کاغذ کے صفحوں پر اتار دینے سے وہ ہلکا ہوگیا تھا۔

خط بند کرنے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا۔ بیوی سے کہا کہ وہ پوزرین جارہا ہے۔ کل واپسی ہوگی۔

بیوی صبح سے ہی اس کی متغیر صورت پر پریشان سی ضرور تھی پر وہ کچھ بھید کھول نہیں رہا تھا۔ دوسرے شہروں میں جانا تو یوں بھی اس کا معمول تھا۔ جافنا کی نسبت پوزرین بڑا شہر تھا۔ ڈاک کا انتظام یہاں زیادہ بہتر تھا۔ یوں تو اس کا دل اس خط کو کولمبو جاکر پوسٹ کرنے کا چاہ رہا تھا تاکہ جتنی جلدی ہوسکے اسے پتا چلے کہ اس کا بھائی اسے اس مشکل سے نکالنے کے لیے فی الفور کون سا قدم اٹھانے کو ترجیح دے گا۔

بس میں کیا بیٹھا جیسے خیالوں کے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ وہ وقت جب اس کا بھائی ماہ روف بیس سال کی عمر میں امریکا گیا، اس وقت ان کے مالی حالات بہت ابتر تھے۔ ترکی سے جرمنی وہاں سے انگلینڈ وہاں سے امریکا ڈیڑھ سال کے عرصے نے اس کے پیروں میں جیسے پہیے لگا دیئے تھے۔ جگہ جگہ کا پانی پیتے اور محنت مزدوریاں کرتے کرتے وہ ایک ایسے ملک میں داخل ہوا جس نے شروع میں اسے رگیدا اور پھر آسائشوں کے دروازے اس پر کھول دیئے۔ ماہ روف بہت سعادت مند لڑکا ثابت ہوا۔ جب وہ دھکے کھاتا تھا تب بھی وہ بھائی کو کچھ نہ کچھ بھیجتا رہتا۔ اس کی اس مدد نے لاریف ہادی کو بہت سہارا دیا۔ اس کا کاروبار دھیرے دھیرے بہتر ہوتا چلا گیا۔

ماہ روف نے شادی بھی سری لنکن لڑکی سے کی جو کولمبو میں کھاتی پیتی مسلم کمیونٹی سے تھی۔ خدا نے بچے بھی دیئے، ایک لڑکی اور دو لڑکے۔ چند سال قبل وہ مع بیوی بچوں کے آیا تھا۔ امریکا میں رہتے ہوئے بھی وہ سب اپنے مذہبی طور طریقوں کی پابندی کرنے میں پیش پیش تھے۔ دس سالہ زہرت نماز کی پابند تھی۔ لڑکے بھی اسی انداز میں تربیت یافتہ تھے اور یہ چیزیں ہادی کے لیے بہت طمانیت بخش تھیں۔

شام ڈھل رہی تھی جب وہ پوزرین پہنچا۔ خط پوسٹ کیا۔ ماہ روف کی طرف سے جب تک اس کے خط کا جواب نہ آگیا اس وقت تک ہادی نے کسی سے اس بابت کوئی بات نہ کی۔ جونہی خط اسے ملا جس میں ماہ روف نے لاطف کو فی الفور بھجوانے کا لکھا تھا۔ ساری ہدایات درج تھیں۔ کولمبو جاؤ، فلاں فلاں سے ملو فلاں کو میرا حوالہ دو۔ کون کون سے کاغذات درکار ہیں۔ کہاں کہاں سے ملیں گے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس دن ہادی نے پہلی بار بیوی کے سامنے زبان کھولی پر صرف اس حد تک کہ وہ لاطف کو امریکا بھیج رہا ہے۔

''پر کیوں؟'' بیوی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ جیسے پھٹ پڑی۔ امریکا تو وہ جائے جس کے پاس یہاں کام نہ ہو۔ تمہارے تو اپنے کاروبار کو بیٹے کی شرکت اور ساتھ کی ضرورت ہے۔ تم کیوں اپنے ہاتھ کاٹ کر ٹنڈا ہونا چاہتے ہو۔ لاکھ تمہارے ملازم وفادار اور ایمان دار ہیں پر اپنے خون کی بات ہی اور ہے۔ جو نگرانی وہ کرسکتا ہے کوئی دوسرا کیسے اس معیار پر اترے گا۔

ہادی اسے کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سب معاملات راز دارانہ انداز میں آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ یہ تنظیم اتنی خطرناک تھی کہ کسی بھی ساتھی کے ادھر اُدھر ہونے کی صورت میں انتہا پر جاسکتی تھی۔ تنظیم میں اس کی حیثیت کیا تھی یہ وہ نہیں جانتا تھا۔

بیوی لاکھ سر پٹختی رہی، اس نے منہ پر قفل لگائے رکھا۔ لاطف سے جب بات ہوئی۔ پہلے تو اس نے مخالفت کی۔ جوان خون میں جو سرکشی اور جوشیلا پن تھا اس کی تسکین تنظیم میں شمولیت سے بہت عمدہ طریقے سے ہونے لگی تھی۔ ہادی نے سمجھ داری سے صورت حال کو سنبھالا۔ امریکا کے بارے میں ممکنہ حد تک سبز باغ اسے دکھائے پھر اسے ساتھ لے کر کولمبو جانے کے لیے گاڑی میں سوار ہوگیا۔ نوے کی دہائی میں سری لنکا کے مقامی باشندوں کا امریکا جانے کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

کولمبو کی مسلم کمیونٹی نے بھی ہادی کی پوری مدد کی اور یوں پندرہ دن کی بھاگ دوڑ کے بعد جس شام اس نے بیٹے کو جہاز میں سوار کرایا اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔

جہاز میں بیٹھے لاطف کے احساسات عجیب سے تھے۔ بیک وقت وہ دو متضاد کیفیات کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کی زندگی کے گزشتہ دو سال جس سنسنی خیزی، ہنگامہ پروری اور تھرل سے دوچار ہوئے تھے اس نے اسے زندگی گزارنے کا ایک نیا مفہوم دیا تھا۔

پہلی بار اس کا کلاس فیلو اور گہرا دوست اجیت جو نسلاً تامل تھا اسے کینڈی روڈ پر ایک بڑی عمارت کے تہ خانے میں ہونے والے اجلاس میں لے کر گیا۔ جتنی بھی تقریریں ہوئیں وہ سب ظلم و استبداد کے خلاف تھیں۔ سرمایہ داروں اور وزیروں، امیروں کے خلاف تھیں جو غریب کو زندگی گزارنے نہیں دیتے اور اسے کیڑے مکوڑے کی طرح پیس کر رکھ دیتے ہیں۔ بظاہر تو کچھ ایسا نہیں تھا۔ اسے وہاں جانا اچھا لگا پھر وہ اکثر ان کی میٹنگوں میں شریک ہونے لگا۔ ان کے کاز اور سرگرمیوں کو سراہنے لگا مگر کسی کے سامنے نہیں اپنے دل میں، اپنے اندر۔

تنظیم کے بارے میں سنہالی بدھ اور مسلمان اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ آغاز میں تنظیم تاملوں کے حقوق کی بات کرتی تھی۔ مقبولیت کے ساتھ ساتھ تشدد کے راستے اپنانے لگی۔ تامل ریاست کا مطالبہ ہونے لگا۔ ”را“ سے تعلق جوڑ لیا۔ اور مدراس کے تامل ناڈوں سے مل کر ایک دہشت پسند تنظیم بن بیٹھی۔

پہلی بار جب وہ ان کے ہیڈ کوارٹر ”مولائی ٹیوو“ Mullaitvu گیا۔ کسی کو شک بھی نہ ہوا۔ ہادی تو یوں بھی ان دنوں انورادھاپور گیا ہوا تھا۔

سری لنکا کے شمال اور شمال مشرقی ساحلوں کے ساتھ ساتھ جافنا سے لے کر Killinochchi, Nallur اور Trincomalee تک گھنے جنگلوں میں ان کی زیرِ زمین پناہ گاہیں، اسلحہ خانے اور تربیت گاہیں تھیں۔ اجیت نے اسے بتایا تھا کہ یہاں ایئرپورٹ بھی ہیں۔ حد درجہ پُراسراری جاسوسی کہانی کی طرح پھیلا ہوا اس کا لمبا چوڑا نیٹ ورک۔ اجیت کے ساتھ وہ عام جگہوں پر ہی گیا۔ تاہم فضا میں ایک دہشت کا احساس پایا جاتا تھا۔

کلنوچی چی میں نوجوانوں کو خودکش حملوں کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ مولائی ٹیوو میں سیر کرتے ہوئے اجیت اسے ایک خاص کمرے میں لے گیا۔ یہاں عورتیں بھی تھیں۔ یہیں لاطف نے اس خوبصورت اور پُرکشش لڑکی کی تصویریں دیکھیں جس نے ابھی چند دن پہلے مدراس میں وزیراعلیٰ کی آمد پر بم دھماکا کیا تھا۔ لاطف کی میل ملاقات صرف سطحی لوگوں سے ہی ہوئی تھی۔ پارٹی کے خاص لوگوں کے بارے میں اجیت بھی نہیں جانتا تھا اور نہ وہ یہ جانتا تھا کہ انجانے میں وہ دنیا کو تباہی کی طرف دھکیلنے کا سبب بننے والوں کا مہرہ بننے کی سعی کر رہا ہے۔

لاطف کچھ خوف زدہ بھی تھا مگر اندر سے وہ ایسی زندگی کو سراہ بھی رہا تھا۔ ہر جنگ جو کے گلے میں سائنائیڈ کا کیپسول بندھا ہوتا ہے۔ کسی بھی ہنگامی صورتِ حال میں یہ کیپسول اس کی حفاظت کا آخری سہارا ہے۔ جسے فی الفور کھا کر وہ مر سکتا تھا۔ گرفتار ہونے کی بجائے موت ان جوانوں کی ترجیح ہوتی۔ یہ سب اجیت نے اسے بتایا تھا۔

اس پُراسرار اور خوفناک دنیا سے واپسی پر لاطف چند دن گم صم رہا پھر وہ ان کے اجلاسوں میں جانے لگا۔ پر ابھی باقاعدہ رکن بننے میں اس کی آزمائشوں کا سلسلہ شروع ہونے ہی والا تھا جب قسمت نے اسے جہاز میں بٹھا دیا اور اب وہ ایک ایسی دنیا کی طرف رواں دواں تھا جس کے قصے اور داستانیں وہ ہر دوسرے روز سنتا تھا۔

جہاز نیویارک کے جان ایف کینیڈی ائرپورٹ پر لینڈنگ کے لیے پر تول رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشے سے چپکی اس کی آنکھیں نیچے رنگ اور روشنیوں کا ایک سیلاب دیکھ رہی تھیں۔ بہت سے مرحلوں سے گزر کر وہ باہر آیا جہاں اس کے چچا اور چچی اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ چچا نے اسے اپنے سینے سے لگایا اور اپنی سنہالی زبان میں اس کے سفر کے خیریت سے گزرنے کے بارے میں پوچھا۔ ہراساں سے لاطف نے مادری زبان کے ساتھ ہی اپنی بشاشت لوٹتی محسوس کی۔ چچی نے پیار کیا اور اس کے والدین اور بہن بھائیوں کا پوچھا۔

چند لمحوں بعد گاڑی گھر کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ رات دن کی طرح جوان اور روشن تھی۔ اس کے چچا کا گھر ''برانکس'' میں تھا۔ یہ ایک پندرہ منزلہ بلڈنگ کا چوتھا فلور تھا۔ بڑا خوبصورت اور سجا ہوا۔ چچا کے بچے سو رہے تھے۔ چچی نے کھانے پینے کا پوچھا پر اس نے بتایا کہ جہاز میں اتنا کچھ کھالیا ہے کہ اب قطعاً گنجائش نہیں اور جب وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں گیا تو تھوڑی دیر تک وہ قدرت کے اس عجیب وغریب فیصلے پر حیران ہوتا رہا پھر نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔

چچا کے بچوں سے ناشتے پر ملاقات ہوئی۔ اتوار تھا سبھی گھر میں تھے۔ لڑکے تو خوب ہنسوڑ اور کھلنے ملنے والے بچے تھے۔ اسے دیکھ اور مل کر خوش بھی بہت ہوئے، پر زہرت چچا کی اکلوتی تیرہ سالہ بیٹی پینٹ قیس پر اسکارف پہنے ہوئے تھی۔ خوش طبع ضرور تھی پر تھوڑا اسا لیے دیئے والی بھی محسوس ہوئی۔

اگلے چند دن اس نے نیویارک سٹی کی سیر کی۔ کبھی چچا کے بیٹوں کے ساتھ اور کبھی اکیلے۔ نیویارک کے سب علاقوں میں اسے مین ہٹن سب سے زیادہ اچھا لگا۔ یہاں آسمان کو چھوتی ہوئی عمارات، سینما، تھیٹر، بینک، دفتر اور کمرشل پلازوں کی بھر مار نظر آئی۔ پندرہ بیس دن اس نے یہی کام کیا۔ چچا نے بھی اسے کھلی چھٹی دی کہ وہ ماحول کے ساتھ رچ بس جائے اور ہوم سکنس کا شکار نہ ہو۔ پھر وہ اپنے چچا کے پیٹرول پمپ اور گیس اسٹیشن پر کام کرنے لگا۔ کسٹمرز کو ڈیل کرنے میں اس کی سمجھ داری، محنت اور ذمے داری نے چچا کو متاثر کیا۔ شام کی کلاسز میں اس نے پڑھائی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ رات گئے وہ گھر جاتا۔ اپنا کھانا گرم کرتا، کھاتا اور سو جاتا۔

ایک دن شام کی کلاس نہیں تھی۔ وہ جلد گھر آ گیا۔ لیونگ روم میں بڑے صوفے پر زہرت نیم دراز کچھ پڑھنے میں محو تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے زہرت کو نظر بھر کر کسی قدر تنقیدی انداز میں دیکھا۔ عام سری لنکن لڑکیوں کے برعکس اس کے نقوش بہت دلکش تھے۔ چنبیلی جیسا رنگ بڑی ملاحت لیے ہوئے تھا۔ اس کے بال سیاہ اور لمبے تھے جو اس وقت اس کے سینے پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ پڑھنے میں اتنی محو تھی کہ اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کوئی اسے یوں دیکھ رہا ہے۔ زیادہ دیر تک کھڑے رہنا اسے خود بھی اچھا نہیں لگا۔ اس نے ہلکی سی چاپ پیدا کی جس پر زہرت نے چونک کر نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''آج آپ جلدی آ گئے؟'' زہرت نے رسالہ قریبی تپائی پر رکھتے ہوئے اپنی الٹی پلٹی نشست سیدھی کی۔

''دراصل آج کلاسز نہیں ہوئیں۔ پر سب لوگ کہاں ہیں؟'' اس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''ممی اور ڈیڈی ہنی سی کے ساتھ مسز راجر کے گھر گئے ہیں۔ وہ شاید اپنا گھر سیل کرنا چاہتی ہیں۔ آپ کھانا تو کھائیں گے نا میں ذرا مغرب کی نماز پڑھ لوں۔'' زہرت کی خوبصورت آنکھیں کلاک کو دیکھ رہی تھیں اور زبان اس سے مخاطب تھی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ قریبی ریک پر پڑے رسالوں میں سے ہاتھ بڑھا کر اس نے ایک رسالہ اٹھالیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

اسے تو یہ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اس مادر پدر آزاد معاشرے میں اس کا چچا کیوں اتنا رجعت پسند ہے۔ چچا چچی اور یہ زہرت اس ماحول میں کتنے اجنبی سے لگتے ہیں۔

وہ اپنے ماحول سے خاصا مختلف بچہ تھا۔ بچپن ہی سے کسی حد تک من مانی کرنے والا، کچھ باغی سا۔ بادی جب بھی اس پر نماز کے لیے سختی کرتا وہ چٹائی پر کھڑا ہو جاتا۔ اٹھک بیٹھک بھی کرتا، پر اگر موڈ نہ ہوتا تو کچھ نہ پڑھتا۔ کبھی کبھار باپ کے پوچھنے پر غلط بیانی بھی کر جاتا۔ ماں کے سامنے تو وہ بول بھی پڑتا۔

''آخر آپ لٹھ لے کر ایک ہی بات کے پیچھے کیوں پڑ جاتے ہیں؟ پڑھ لوں گا نماز اور رکھ لوں گا روزے۔ ایک ہی کام رہ گیا ہے آپ لوگوں کا۔'' ماں جواباً کوسنے بھی دیتی۔

زہرت نے کھانا میز پر لگا کر اسے آواز دے ڈالی اور جب وہ کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھا تو میز پر سجے ڈونگے میں سالن دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ سرشار سے لہجے میں بولا۔ ''ارے یہ ڈوسا کس نے پکایا ہے؟''

''مما اور میں نے۔'' زہرت نے مختصراً کہا۔
اس کی ماں اپنے علاقے کی یہ خاص ڈش بہت چاہت سے بنایا کرتی تھی۔ جب بھی یہ پکتا وہ تڑپ تڑپ کر کھاتا۔
''زہرت یہ بہت عمدگی سے پکایا ہے۔ میری ماں سے بھی اچھا۔'' وہ کھاتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔
وہ کام کرتا رہا، پڑھتا رہا پھر اس نے کمپیوٹر انجینئرنگ ... کے لیے صبح کی کلاسز جوائن کر لیں اور شام کو کام کرنے لگا۔ اپنے مستقبل، اپنی تعلیم اور اپنے کیریئر کے لیے بہت کریزی تھا اور سیر سپاٹوں اور لڑکوں کے ساتھ دوستیاں کرنے میں بھی ماہر تھا۔ پر اس کے ساتھ وہ بہت ذہین اور سوجھ بوجھ والا لڑکا تھا۔ نہ کبھی چچا کو شکایت کا موقع دیا اور نہ ہی کوئی ایسی صورت پیدا کی جو اس کے لیے پریشانی اور مصیبت کا باعث بنتی۔ ایشیائی لوگوں کے ساتھ نت نئے دن جو کچھ ہوتا وہ اس کی آنکھیں کھولنے کو کافی تھا۔
چھ سال وہ اپنے چچا کے ساتھ رہا۔ اپنی ذہانت، ذمے دارانہ رویے، کام اور پڑھائی کے ساتھ لگن جیسی اچھی خوبیوں کے باعث وہ اپنے چچا اور چچی کو متاثر کرنے اور ان کی خصوصی محبت حاصل کرنے میں بہت کامیاب رہا اور جب اس نے انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر لی اور اچھی کمپنیوں میں اپلائی کر دیا اور شکاگو کی ایک بڑی کمپنی میں انٹرویو بھی دے آیا تو اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اسے ایشیائی ہونے کے باوجود اس بہترین پوسٹ کے لیے سلیکٹ کر لیں گے، پر کمپنی کا جو بورڈ انٹرویو کے لیے بیٹھا تھا انہوں نے اس کے سانولے وجود میں ایک زرخیز اور تخلیقی ذہن کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جب خوشی سے بھرپور لہجے میں اس نے یہ خبر اپنے چچا کو سنائی تو جہاں اسے اس کی ذات پر فخر محسوس ہوا وہیں تھوڑا سا اس کے چلے جانے کی صورت میں رنج بھی ہوا۔
زہرت کے لیے وہ ایسے ہی ہیرا سے لڑکے کا خواہش مند تھا۔ شروع میں اس کا خیال تھا کہ وہ شاید زہرت میں دلچسپی لے پر وہ تو ہمیشہ کام سے کام رکھتا۔
اپنے بھائی سے وہ یہ بات کر بیٹھا تھا۔ بھائی نے لاطف کو لمبا چوڑا خط بھی لکھا تھا کہ بھلا اس کے لیے زہرت سے اچھی کون سی لڑکی ہو سکتی ہے؟ خط پڑھ کر اس نے چند لمحوں کے لیے سوچا اور پھر اسے ڈسٹ بن میں ڈال کر اپنے آپ سے کہا۔
''کمال ہے ذرا دیکھو تو ان کی سوچوں کو۔ ٹھیک ہے زہرت اچھی لڑکی ہے مگر اتنی مذہبی لڑکی سے میرا گزارہ بہت مشکل ہے۔''
اس نے باپ کو خط لکھ دیا کہ وہ فی الحال شادی جیسے کسی موضوع پر کوئی بات یا سوچ بچار کے لیے تیار نہیں۔ اسے ابھی آگے بڑھنا ہے۔ وہ اپنی ذاتی کمپنی بنانے میں کوشاں ہے اور اپنی محنت کے بل بوتے پر اسے یقین ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوگا۔
ہادی دل سے چاہتا تھا کہ بیٹا کسی طرح اس رشتے پر راضی ہو جائے۔ وہ بھائی کا احسان مند تھا، پر لاطف کی دوٹوک تحریر اور فون پر دوٹوک گفتگو نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ اس پر راضی نہیں۔ یوں اپنے طور پر وہ کبھی کبھی اسے ضرور لکھ دیتا۔
زہرت جب سری لنکا گئی تو تایا تائی سے بھی ملی۔ ہادی اس کے انداز و اطوار دیکھ کر دنگ ہی تو رہ گیا۔ پہلے ایک دوبار جب آئی تو بچی تھی لیکن اب جوان ہو چکی تھی۔ کس قدر شائستہ اور مہذب، ادب آداب والی شائستہ سی لڑکی۔ ہادی کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ جب وہ گھر آیا تو اس نے بیٹے کو لمبا چوڑا خط بھی لکھ دیا کہ ایسی لڑکیاں نصیب والوں کو ملتی ہیں۔ زہرت کا ساتھ اس کی زندگی کو جنت بنا سکتا ہے۔
لاطف یہ خط پڑھ کر بہت ہنسا۔ سگریٹ سلگا کر اس نے کش لیا اور اپنے والد کو تصور میں لا کر بولا۔ ''میرے پیارے ڈیڈی آپ کس جنت جہنم کے چکر میں پڑ گئے ہیں؟ جنت لے کر کیا کرنی ہے، میرے جیسے آدمی کے لیے دوزخ ہی ٹھیک ہے۔''
چند دنوں بعد ایک دن اس کے چچا کا فون آیا۔
''بھئی لاطف تم نیویارک کا چکر لگا لو۔ زہرت سری لنکا سے آئی ہے، تمہارے امی ابو نے کچھ چیزیں بھیجی ہیں تمہارے لیے۔ ہمیں مل بھی جاؤ اور انہیں لے بھی جاؤ۔''
وہ جس دن نیویارک آیا، آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ زہرت گھر پر نہیں تھی۔ چچا بھی نہیں تھے۔ چچی نے محبت سے استقبال کیا اور اس کے بہت کم آنے کا گلہ کیا۔ ''اب تو

یوں لگتا ہے جیسے تم نے شکا گو کو لاس اینجلز بنا لیا ہے۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں آئے نہیں۔''

''ارے چچی مصروفیت، کام...... کام...... میں اب اپنا کام بھی تو سیٹ کر رہا ہوں۔ ہاں یہ زہرت کدھر ہے؟''

''یونیورسٹی میں کوئی سیمینار تھا۔ بس آتی ہی ہو گی۔''

کوئی گھنٹے بعد اس نے زہرت کو اندر آتے دیکھا۔ پر ٹی وی لاؤنج میں جہاں وہ بیٹھا تھا وہاں آنے کی بجائے وہ اوپر چلی گئی۔ باہر پھوار پڑ رہی تھی۔ عین ممکن ہے بھیگ گئی ہو اور چینج چاہتی ہو۔ اس نے سوچا۔ اور واقعی یہی بات تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سرخ اور سیاہ پھولوں والی میکسی پہنے اندر آئی۔ میکسی پر ہلکے شوخ پھولوں کی طرح اس کا چہرہ بھی کھلا ہوا تھا۔ کس قدر بشاشت تھی اس کے لہجے میں جب اس نے ماں کو چائے کی ٹرالی گھسیٹتے دیکھا۔

''ارے واہ کتنی طلب تھی اس وقت چائے کی۔''

لاطف اس کی لمبی چوٹی کو کمر پر جھولتے دیکھ رہا تھا۔ سیاہ اسکارف کی ناٹ اس کے گلے میں تھی۔ اب وہ لاطف کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تو آپ اپنی چیزیں لینے آئے ہیں۔ ویسے تو آنے کی قسم کھائی ہے۔''

لاطف ہنسا اور بولا۔ ''یہ تمہیں سری لنکا جانے کی کیا ہڑک اٹھی۔'' اسے اپنے باپ کے اصرار بھرے خطوط یاد آئے تھے۔

''کمال ہے، ہڑک کیوں نہ اٹھے وطن ہے ہمارا۔ سارے رشتے تو وہیں سے جڑے ہوئے ہیں۔ دراصل جینی بھی جاہ رہی تھی۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے۔ سیاحت اس کی ہابی ہے۔''

جینی ان لوگوں کے ہمسائے میں رہتی تھی۔ سیر سپاٹوں کی دلدادہ۔ نئی دنیائیں دیکھنے کی شوقین۔ لاطف اسے تب سے جانتا تھا جب وہ یہاں رہتا تھا۔

میں نے تو بہتیرا زور مارا تھا کہ مت جاؤ۔ سیاحوں کے لیے ابھی حالات سازگار نہیں۔ پر تم تو جانتے ہی ہو وہ کیسی نڈر اور جیالی لڑکی ہے۔ تنگ کر بولی تھی۔

''لو مجھے ڈراتی ہو۔ ایک سری لنکا ہی میں کیا۔ دنیا بھر میں دہشت گردی کی لہر رقص کر رہی ہے اب اس ڈر سے کہیں جانا چھوڑ دیں۔''

''کیا حالات ہیں اب؟''

''کمزور ملکوں کے حالات کا کیا کہنا؟ بڑے ہمسائے ملک نگل لینا چاہتے ہیں انہیں۔ اب کوئی پوچھے انڈیا سے کہ ذرا سی چنگاری تھی اسے ہوا بھی نہ دو ہوا بھی دی اور تیل بھی چھڑکا۔ بھڑکایا اور اب فوجیں اسے بجھانے کو اتار دیں۔ عالمی منظر نامے کے رنگا رنگ تماشے۔''

> سیاچن بلتی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں جنگلی گلاب۔ بلتستان پاکستان کا حصہ ہے اور زبان بلتی ہے۔ سیاچن کا شمار پاکستان کے بڑے گلیشیرز میں ہوتا ہے۔ یہ علاقہ تقریباً سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ گرمیوں کے موسم میں بھی یہاں کی سردی ناقابلِ برداشت ہے۔ اسے سب سے پہلے ڈاکٹر سیف لانگ نے دریافت کیا۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق سیاچن گلیشیر پاکستان کا حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1957ء میں امپیریل کالج برطانیہ کی کوہ پیما ٹیم نے حکومت پاکستان کی اجازت سے پہلی مرتبہ اس علاقے میں کوہ پیمائی کی۔ سیاچن گلیشیر کی لمبائی قریباً 75 کلومیٹر سے زائد اور چوڑائی قریباً 5 کلو میٹر ہے۔ یہاں سے کے ٹو کو بھی راستہ جاتا ہے۔ یہاں اتنی سردی ہوتی ہے کہ بغیر دستانوں کے اگر ہاتھ کسی چیز سے لگ جائے تو سنو بائٹ ہو جاتا ہے اور ہاتھ کاٹنا پڑتا ہے۔ 1975ء سے قبل سیاچن کی کوئی سیاسی و فوجی اہمیت نہ تھی۔ شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے کافی عرصے بعد ایک دن پاکستانی کوہ پیما محمد حفیظ نے اس علاقے میں بھارتی فوجیوں کو کیمپ لگائے دیکھا تو واپس آ کر حکومت پاکستان کو اطلاع کر دی۔ پاکستان آرمی نے ابتدائی کارروائی کرتے ہوئے پانچ میں سے تین بھارتی چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ دنیا کا بلند ترین محاذ جنگ ہے جہاں انسان کو نہ صرف انسان سے بلکہ بے رحم موسم سے بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔
>
> (شیخوپورہ سے محمد شایان سعید کا تحفہ)

"ویسے ایک بات!"

زہرت نے چائے کا کپ ماں کے ہاتھوں سے پکڑا، چھوٹا سا سپ لیا اور بات کو جاری رکھا۔ "سری لنکن اگر کہتے ہیں کہ A Land Like No Other تو یہ غلط نہیں۔ چھوٹے تھے تو ایک دفعہ گئے تب اتنا شعور نہیں تھا پر اب تو حسن فطرت دیکھ کر دنگ رہ گئی ہوں۔ سچی بات ہے سری لنکا کا قدیم تہذیبی ورثہ دیکھ کر مجھے تو فخر محسوس ہوا۔ جینی تو میوزیم میں زیورات کا سیل دیکھ کر گنگ رہ گئی تھی۔"

"پر کچھ انسانوں کا بھی بتاؤ کہ وہ کیسے لگے؟"

لاطف ہنسا، اس کے لہجے میں شوخی تھی اور کسی قدر طنز بھی۔

"اوپر والے کی تخلیق پر میں کون ہوتی ہوں رائے دینے والی۔ ویسے وہ اگر صورتاً اچھے نہیں لیکن سیرتاً تو کمال کے ہیں۔ ایسے محبت کرنے والے کہیں دیکھے ہیں تم نے۔"

"کہاں کہاں گئیں، کون کون سی جگہیں دیکھیں؟"

"کینڈی، سیگریا، نویرا علیا، آدم پیک۔ انورادھاپور، جافنا اور راستوں میں پڑنے والے سب چھوٹے بڑے شہر۔"

"مائی گاڈ تم آدم پیک گئیں!" لاطف کے لہجے میں حددرجہ حیرت تھی۔

تبھی زہرت لاطف کو کھانے کے لیے اٹھنے کے لیے کہتے ہوئے بولی۔

"مما ڈیڈی کے ساتھ بہت ملکوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ نماز کے لیے ڈیڈی کے ساتھ اٹھنے کے بعد ہم دونوں تو پھر کبھی نہیں سوتے تھے، گھومنے پھرنے ہی نکلتے سچی بات ہے ایسی نشیلی صبحیں دیکھنے کو ملتیں کہ لطف آجاتا۔ لیکن سری لنکا کی صبحوں کا جواب نہیں۔"

"خیر یہ بات بھی درست نہیں۔ اسکنڈے نیوین ممالک کی صبح شامیں اپنے اندر حسن کے خزانے رکھتی ہیں۔ یہ چونکہ ہمارا وطن ہے اس لیے اس کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی بھی ہے جو اس کی ہر چیز کو خوبصورت بنادیتی ہے۔"

"پر چند باتوں نے مجھے اس بار شدید متاثر کیا ہے۔ سچی بات ہے میں تو اس پر سنجیدگی سے کام کرنے کو پلان کررہی ہوں۔

سری لنکن مسلمانوں کی روشن خیالی، وسعت نگاہی، ذہنی افق کی بلندی اور مذہبی روح کو سمجھنے کے لیے ان کی اعلیٰ تعلیم کا اہتمام ازحد ضروری ہے۔ سر رزاق فرید کی تنظیم کے بنائے ادارے اب کم ہیں۔ نئے اور جدید اداروں کی شدید ضرورت ہے۔ دوردراز گاؤں کی لڑکیوں کے لیے ان کے قریبی شہروں میں اچھے اسکول کھولنے کی ضرورت ہے۔ تامل ہندو جو حلقہ اسلام میں داخل ہورہے ہیں ان کی تعلیم و تربیت کا موزوں بندوبست کرنے کی ضرورت ہے۔ ملک میں موجود تینوں فرقے ہندو، عیسائی اور بدھ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بہت کریزی ہیں۔ اس میدان میں سری لنکن مسلمان پیچھے ہیں۔ میں تو انشاءاللہ اب اس پر کام کرنے والی ہوں۔"

"مسلمانوں کی انتہاپسندی لبرل ازم اور سیکولر سوچ سے نارمل ہوسکتی ہے۔ ترقی کے لیے سیکولر ہیومنسٹ ہونا بےحد ضروری ہے۔" لاطف نے کہا۔

"سیکولر کیوں؟ مسلمان اپنے مذہب کی روح کو سمجھیں۔"

بحث شاید طول پکڑ جاتی جب زہرت کی ماں نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا کہ بس بہت باتیں ہوگئیں...... اب کھانا کھاؤ۔"

لاطف کھانے میں مصروف تھا جب زہرت نے یہ کہا۔ "مجھے تو اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے اور میرا مذہب میری پہچان ہے۔"

لاطف کے چہرے کے زاویے بگڑے تھے۔ کھانے کے عمل نے اس ناگواری کو چھپالیا تھا۔ ورنہ تو اس کے تاثرات بہت نمایاں ہوتے۔ تاہم پھر بھی وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"مسلمان تو دنیا بھر میں رسوائے زمانہ ہیں۔ شرم آتی ہے خود کو مسلمان کہنے پر۔ دہشت گردی میں بڑا نام پیدا کررہے ہیں۔"

زہرت تلملائی۔ اور پھٹ سے بولی۔ "تمہاری محبوب تنظیم لبریشن ٹائیگر زاف تامل ایلام نے تو خیر سے سبھوں کو مات دے دی ہے، ایسی جیالی نکلی پہلے القاعدہ کی ہمراز بنی۔ اس سے یارانہ گانٹھا۔ کچھ سبق

پڑھے کچھ چالیں سیکھیں۔ پھر ایسے تخلیقی جنگی معرکے مارے کہ اسے بھی پیچھے چھوڑ گئی۔ خودکش حملوں کی نئی تکنیک ایجاد کر ڈالی۔ دنیا بھر سے اپنی انفرادیت منوا لی۔"

چوٹ تو گہری تھی۔ تاہم وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تاریخ کی درستگی بہت ضروری ہے۔ خودکش حملے تاملوں کی ایجاد نہیں خیر سے زاروں کے ستائے ہوئے ماٹھے غریب روسیوں کے جذبات کا اظہار تھے۔"

شاید دونوں میں تلخی پھر بڑھ جاتی۔ زہرت کی ماں نے کہا۔ "تم لوگ کن باتوں میں الجھ گئے ہو۔ کھانے کو زہر کر رہے ہو۔" ہلکی پھلکی سی ڈانٹ کے ساتھ کہتے ہوئے موضوع بدلوا دیا۔

لاطف کو شاید یہ اعتراف کرنے میں اپنی سبکی محسوس ہوئی تھی کہ اس کا اب تامل ٹائیگرز سے کیا واسطہ اور ناطہ۔ انٹرنیٹ سے کبھی کبھار کی حاصل کردہ معلومات اس کے لیے کچھ اتنی دل خوش کن نہ تھیں۔ تنظیم کے بانی رکن ویلو پلائی پر بھاکرن کے بارے میں جانکاری کا رخ بھی کچھ اتنا اچھا نہ تھا۔ وہ مذہبی گھرانے کا پروردہ تامل ہندو لڑکا جس کا باپ اسے بڑا افسر دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ بڑا پڑھا کو تھا تو دوسری طرف تخلیقی و تخریبی ذہن کا مالک بھی تھا۔ اس کا نیٹ ورک۔ دنیا بھر میں اس کے رابطے، غیر قانونی منشیات، مختلف کمپنیوں میں غیر قانونی سرگرمیوں، غیر قانونی تارکین وطن کی منتقلی اور اسمگلنگ جیسے قبیح دھندے تنظیم کی آمدنی کے ذرائع تھے۔ اس نے پلٹ کر بھی اپنے اس ماضی میں جانے یا جھانکنے کی خواہش نہیں کی تھی جس کے لیے وہ اپنے باپ سے الجھا تھا۔

لاطف اگر محنتی تھا تو قسمت کا دھنی بھی تھا۔ شکاگو آنا اس کے لیے بہت بابرکت ثابت ہوا تھا۔ اپنی منزل کی طرف وہ سرعت سے بڑھ رہا تھا۔ پیسے عہدے مرتبے اور خوشحالی نے اس کی شخصیت کو نکھار دیا تھا۔

سانولا سلونا کمزور سا لڑکا جو تاڑ جیسا نظر آتا تھا اب ایک دلکش نوجوان کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ بہت سی لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی۔ شادی کی اسے قطعی جلدی نہ تھی۔ یہ کام کہیں اس کے مستقبل بعید کے کسی شیڈول میں تھا۔ زہرت کسی بھی طرح رد کیے جانے والی لڑکی نہیں تھی۔ حد درجہ دلکش اور پسندیدہ اطوار کی حامل ہونے کی بنا پر وہ ہر بار اسے بیک ورڈ کہتے ہوئے اپنے دل میں رد کرتا تھا۔ جب وہ واپس شکاگو آ رہا تھا تو اس نے زہرت کے بارے میں اپنے آپ سے کہا تھا۔ "اف میرے خدا کس قدر جنونی ہے یہ۔"

تھوڑا سا وقت اور آگے بڑھ گیا تھا۔ اس نے اور کامیابیاں حاصل کیں۔ چچا سے بس کبھی کبھار فون پر ہی بات ہوتی۔ زہرت کے بارے میں چچا سے ہی سننے میں آیا کہ اس نے ایک این جی او بنائی ہے۔ سری لنکا میں وہ تعلیم پر بہت کام کر رہی ہے۔

یہ سال 1990ء اور مہینا اکتوبر تھا۔

وہ کسی میٹنگ کے سلسلے میں نیویارک آیا ہوا تھا۔ نیویارک بارشوں کے پانیوں سے دھل دھلا کر نکھرا ہوا تھا۔ گاڑی کوئینز بولیوارڈ پر بھاگتی ہوئی جانسن ہوٹل کی طرف جا رہی تھی۔ مین ہٹن کا یہ علاقہ اسے بہت پسند تھا۔ سہ پہر سونے میں گزاری اور شام کو وہ سیر سپاٹے کے لیے نکل آیا۔

پہلے اس نے چچا کے گھر جانے کا سوچا۔ پھر اس خیال کو جھٹکتے ہوئے وہ خود سے بولا۔ "ہٹاؤ یار، وہاں جا کر بور ہونے سے بہتر ہے فورتی سیکنڈ اسٹریٹ چلوں اور شام بھی اچھی گزاروں اور کچھ خریداری بھی کروں۔ جرابوں اور چند ٹائیوں کی ضرورت ہے۔"

گھومتے گھومتے وہ ٹائمز اسکوائر آ گیا۔ درمیان کی گول سی بلڈنگ پر زیپر چل رہی تھی۔ ساری دنیا کی اہم تازہ خبریں ایک پٹی کی صورت چمک دار حروف میں سامنے آ رہی تھیں۔ اس کا تو قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا ان خبروں کو دیکھنے کا۔ پر جانے کیسے نظر اٹھ گئی اور جو اٹھی تو اٹھی رہ گئی۔ کسی سنگی بت کی طرح وہ جہاں کھڑا تھا کھڑا رہ گیا۔ ٹائمز اسکوائر، اس میں گھومتے پھرتے لوگ سب جیسے اوجھل ہو گئے۔ صرف ایک چیختی چنگھاڑتی خبر تھی جس نے اس کی آنکھوں کو، اس کے اعضا اور اس کے وجود کو ساکت کر دیا تھا۔

سری لنکا کے شمالی علاقوں کے اہم شہروں اور قصبوں سے تامل ٹائیگرز اور اس کی ذیلی تنظیم بلیک ٹائیگرز کے مسلح فوجی دستوں نے سنگینوں اور بندوقوں کی نوک پر ان علاقوں کے مسلمانوں کے گھروں پر قبضہ

کر کے انہیں باہر نکال پھینکا ہے۔ سری لنکا کے ان شہروں میں ابتر صورت کے پیشِ نظر امن و امان کی حالت سخت مخدوش ہے۔

سائیں سائیں کرتے کان، دھڑ دھڑ کرتا اس کا دل اور زیر پر رقصاں اس کی نگاہیں سب جیسے اس خبر کی صداقت سے انکاری تھے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ پر وہی خبر اب پھر سامنے تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ اس پر یقین کرے۔

پھر جیسے وہ پاگلوں کی طرح بھاگا۔ اسے یہ بھی نہ خیال آیا کہ فون پر وہ اپنے چچا سے بات کرے۔ اس نے ٹیکسی پکڑی اور برانکس کا کہہ کر نیم دراز ہو گیا۔ اس کے دل و دماغ میں جیسے آندھیوں کے جھکڑ تھے۔ جافنا، مینار، کلوچی، ویبانیا اور مولا تاوی کے مسلمانوں کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ امن پسند صلح جو قسم کے یہ لوگ جو کبھی کسی جھگڑے میں ملوث نہیں ہوئے، ہمیشہ اپنے کام سے کام اور اپنی کمیونٹی کی فلاح و بہبود میں خود کو مصروف رکھتے تھے۔

تاملوں اور سنہالیوں کے درمیان کبھی کبھار کے جھگڑوں میں ہمیشہ اس گروپ کا ساتھ دیتے جو انصاف پر ہوتا۔

اس کے چچا کا گھر لاک تھا۔ یہ لوگ کہاں گئے ہیں؟ اس نے گہرے دکھ سے سوچا۔

پیٹرول پمپ فون کرنے پر ان کے مینیجر سے پتا چلا کہ چچا کی ساری فیملی آسٹریلیا گئی ہوئی ہے۔ واپسی پر ان کا ارادہ سری لنکا ہو کر آنے کا بھی ہے۔

اس نے جافنا فون کیا۔ کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کا باپ، اس کے بھائی بہن اس کی ماں کہاں ہوں گے؟ زندہ بھی ہیں یا نہیں پھر اس نے کولمبو چچا کے سسرال فون کیا۔ چچا کے سالے کی بیوی نے بتایا۔

"ابھی تو کچھ پتا نہیں۔ سری لنکن فوج نے ایکشن تو لے لیا ہے پر ابھی حالات بہت مخدوش ہیں۔ مسلمانوں پر بڑا کڑا وقت ہے۔ ان دہشت گردوں نے تو انہیں اتنی بھی مہلت نہیں دی کہ وہ اپنا کوئی سامان بھی اٹھا سکتے۔"

وہ شکاگو واپس آ گیا۔ وہ سری لنکا جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا، ان چند دنوں میں جب وہ اپنے بزنس معاملات اور دیگر امور کو اپنی عدم موجودگی میں نمٹانے کے بندوبست میں مصروف تھا اس نے کتنی بار سوچا، کتنی بار اس تلخ احساس نے اس کو کچو کے لگائے کہ یہ وہی تامل ٹائیگرز لبریشن ہے جسے وہ حق پر سمجھتا تھا جس کے کاز سے اسے ہمدردی تھی جسے وہ ممبر بن کر اپنی خدمات سونپنا چاہتا تھا۔ وہ کیسا احمق تھا؟ کس قدر بے وقوف اور گھامڑ تھا۔

وہ بس نام کا مسلمان تھا۔ پر اس حادثے نے اسے اندر تک جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی مسلمانیت جیسے جوش کھا کر تڑپی تھی۔ اس کا باپ کتنی صحیح بات کہا کرتا تھا۔ یہ ہنود و یہود کبھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے۔

ان دنوں وہ کس اذیت سے دوچار تھا اس کا اندازہ صرف اسے ہی تھا۔ اس کی سیکولر کمیونسٹ سوچوں کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ بین الاقوامی میڈیا پر اس کی صرف ایک خبر تھی۔ کتنے گھر بے گھر ہوئے۔ کتنے معصوم اور بے گناہ مارے گئے۔ کچھ علم نہ تھا۔ اس کھلی جارحیت پر کہیں احتجاج نہیں تھا۔ جانے سے ایک دن پہلے اس نے کولمبو فون کیا۔ اس کے چچا چچی سب مع زہرت کے وہاں آ چکے تھے اور کولمبو میں اپنے گھر میں مقیم تھے۔ اس کے والدین اور بہن بھائی سب اس کے چچا کے پاس تھے۔ دو دن پہلے اس کے چچا انہیں کینڈی کے کیمپ سے لائے تھے۔ زہرت ان دنوں کیمپوں میں امدادی پارٹیوں کے ساتھ دن رات کام کر رہی تھی۔ یہ بات اس کے والد نے اسے فون پر بتائی تھی۔

اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے بات کر کے اسے قلبی سکون تو ضرور ملا تھا، پر جیسے وہ اندر سے جل رہا تھا۔ اتنا بڑا ظلم! کیوں اور کس لیے؟

رات کے تین بجے وہ بندرانائیکے انٹرنیشنل ائر پورٹ پر اترا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ دس سال بعد اس نے اپنے وطن کی سرزمین پر پاؤں رکھا تھا۔ یورپ کے ائر پورٹوں کے مقابلے میں یہ کس قدر چھوٹا اور چمکتی دمکتی شان و شوکت سے عاری تھا۔

میجسٹک سٹی میں چچا کا خریدا ہوا خوب صورت گھر جو ابھی خاموشی کے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے اندر پاؤں دھرنے کے ساتھ ہی جاگ اٹھا تھا۔ دکھ، کرب اور اذیت کے وہ مشترکہ محسوسات جن سے وہ

سب اپنی اپنی جگہ دو چار ہوئے تھے۔ مل بیٹھنے اور باتیں کرنے سے قدرے سکون پذیر ہوئے۔
"آخر ایسا کیوں ہوا؟" اس نے اپنے باپ سے سوال کیا۔
"مسلمان طبقے کا بااثر ہونا انہیں کھلتا تھا۔ انہیں وسطی حصوں میں دھکیل کر وہ پورے لنکا میں ایک اشتعال انگیز صورتِ حال پیدا کر کے مسلمانوں کو بقیہ فرقوں سے لڑانا چاہتے تھے تاکہ انہیں بالکل بے اثر کیا جاسکے۔"
ہلکے سے ناشتے کے بعد وہ سو گیا تھا۔ رات کے کھانے پر ماں نے اسے اٹھایا۔ وہ جب گہری نیند اور اس کی مدہوشی سے قدرے باہر ہوا اسے زہرت کی آواز سنائی دی تھی۔
اور ایسا پہلی بار ہوا کہ اس آواز کے سنتے ہی اسے اپنی دھڑکنوں میں ارتعاش سا محسوس ہوا۔ چند لمحے وہ ساکت لیٹا اسے سنتا رہا۔ وہ کسی کیمپ کا حال سنا رہی تھی۔
وہ اٹھا، واش روم میں جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا اور پھر باہر آیا۔ کاہی رنگی ساڑی میں وہ صوفے پر بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔
سفر کی تھکاوٹ کا ہلکا سا عکس اس کے چہرے پر تھا پر لہجے میں تیزی اور گفتگو میں زور تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ یقیناً یہ ایسی ہی مسکراہٹ تھی جیسی وہ ہمیشہ اسے دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر بکھیرا کرتی تھی۔
مگر لاطف کی نظریں آج وہ نہیں تھیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں۔ زہرت نے نقشے کے ذریعے ان تمام مقامات کی نشان دہی کی جہاں جہاں مسلمانوں کے کیمپ لگے ہوئے تھے۔ اسے تقریباً ہر کیمپ کی حالت کا علم تھا کہ کہاں کس کس چیز کی ضرورت ہے؟ اس بھاگ دوڑ میں کولمبو کی پوری مسلم کمیونٹی سرگرم عمل تھی۔
گھر کے بقیہ لوگ تو سونے کے لیے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ لاطف کی ماں نے اسے زہرت کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر وہاں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور اٹھ گئی۔
دفعتاً باتیں کرتے کرتے لاطف نے کہا۔ "زہرت میں بھی اس مشن میں تمہارے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہوں۔"

حیرت زدہ سی زہرت نے اسے دیکھا۔ "ہوش میں تو ہونا۔"
وہ مسکرایا۔ زہرت کا حیرت زدہ ہونا اسے سمجھ میں آتا تھا۔ وہ اس کے خیالات سے بخوبی آگاہ تھی۔
"بالکل ہوش میں ہوں اور بقائمی ہوش و حواس تمہارے مشن میں ایک ادنیٰ کارکن کے طور پر کام کرنے کا خواہش مند ہوں۔"
"پر لاطف میں تو اپنے مشن کو دنیا بھر میں ہر اس جگہ لے جانا چاہتی ہوں جہاں مسلمان مظلوم ہیں۔ سری لنکا میرے والدین کا وطن ہے۔ اس کے ہم پر حقوق ہیں۔ پر مجھے وطنیت کی سطح سے اوپر اٹھ کر کام کرنا ہے۔ رنگ اور نسل کی سطح سے بالاتر ہو کر۔"
"میں اور میرے سب وسائل تمہارے ساتھ وہاں تک چلیں گے جہاں تک تم ہمیں لے جانا چاہو گی، زہرت!" لاطف کا لہجہ گلوگیر سا تھا۔ "زہرت" کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بڑی بوجھل آواز میں بولا۔ "میں نے تو اپنے دل کے دروازے تم پر بند رکھے۔ حالانکہ تم میں اندر جانے اور وہاں رہنے کی ساری خوبیاں موجود تھیں، پر میں تو خود کو ہی بھلائے بیٹھا تھا۔"
اس نے زہرت کا ہاتھ اپنے بھاری ہاتھوں میں تھاما اور بولا۔ "میں معافی چاہتا ہوں زہرت۔"
زہرت کی آنکھوں میں شبنم اتر آئی تھی۔
اپنے باپ کی طرح لاطف اس کی بھی پسند تھا، پر اس نے کبھی اس پسندیدگی کا ہلکا سا اظہار کرنا بھی پسند نہ کیا۔ اس کا ہاتھ لاطف کے ہاتھوں میں تھا۔
"ہم تو اپنے دشمن آپ بن بیٹھے ہیں۔ وہ آفاقی پیغام جو ہماری اساس ہے، اس کی روح کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے سے انکاری ہیں۔ رنگوں، نسلوں، فرقوں، گروہوں میں بٹے ہوئے، اپنے مرکز سے بھٹکے ہوئے، معجزوں کی توقعات میں زندہ، عمل سے عاری لاشے ہیں۔"
"لاطف تم نے مجھے اپنا آپ دیا ہے، میں بہت خوش ہوں۔ آؤ چھوٹا سا دیا جلائیں اور اسے ان دیوں میں شامل کریں جو کہیں کہیں جل رہے ہیں۔ شاید یہ ایک قافلہ بن جائے۔"

جنگجو

کشمالہ حسن

ہوس ملک گیری کے لیے انسانی سروں کے مینار بنا کر خونخواری میں نام پیدا کرنے والے ان لوگوں کا تذکرہ جو انسانیت کی پیشانی کا دھبا کہلائے۔ جن سے نفرت کرنا ضروری ہے۔

ان افراد کا تذکرہ جن کی سرشت میں جنگ تھی

ایک اندازے کے مطابق انسان نے جب سے تہذیب کے نام پر متحد ہونا شروع کیا ہے اور اوزاروں کا استعمال کیا ہے۔ تب سے اب تک انسانوں کے درمیان ہزاروں جنگیں لڑی جا چکی ہیں۔

ان ہزاروں جنگوں میں کئی کروڑ انسان مارے جا چکے ہیں۔

یہ جنگیں مذہب کے نام پر، زمین کے نام پر، آزادی وغلامی کے نام پر اور سیاست کے نام پر ہوتی آئی ہیں۔

"امیر شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے۔ کہیں یہ حیلہ بھی مذہب اور یہ خطہ نام وطن۔"

اقتدار کی خواہش، ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی آرزو۔ ان سب عناصر نے مل کر انسانوں کو جنگوں کا ایندھن بنائے رکھا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ زر، زمین اور زن فساد کی جڑ ہیں۔ زر اور زمین تک تو شاید یہ بات درست ہو لیکن بے چاری زن مفت میں بدنام ہے۔

اگر زن کی خاطر جنگ ہوئی بھی ہوگی تو بہت معمولی سی۔ لیکن زر اور زمین نے تو قیامت برپا کر رکھی تھی اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

اب اس فہرست میں ایک اور 'ز' کا اضافہ ہو گیا ہے اور وہ ہے زبان۔ ذرا حالیہ تاریخوں میں دیکھیں تو کیا زبان اور کلچر کے نام پر جھگڑے نہیں ہو رہے؟"

بہرحال بات ہو رہی ہے بڑی اور خون ریز جنگ کی۔

کوئی بھی جنگ یوں ہی نہیں شروع ہو جاتی۔ بلکہ اس جنگ کے پیچھے کوئی نہ کوئی کردار ہوتا ہے۔ جسے آپ ماسٹر مائنڈ کہہ لیں۔

تاریخ کے ہر دور میں ایسے خونخوار لوگ آپ کو ہر جگہ مل جائیں گے۔ آئیں ان میں سے چند لوگوں کے بارے میں جانتے ہیں۔

آگسٹس سیزر (63 قبل مسیح سے 14 عیسوی تک)

یہ سلطنت روما کا بانی تھا۔ اس نے خانہ جنگیوں کا خاتمہ تو کیا لیکن کئی خونریز جنگوں کے بعد۔

سیزر کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے اوکتاوین کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ آگسٹس نے قریب چالیس برس روم پر حکومت کی۔ اس دوران میں اس نے اسپین، سوئٹزر لینڈ، گلاتیشا اور جزیرہ ہائے بالکن کے ایک بڑے حصے کی فتوحات مکمل کیں، ظاہر ہے یہ فتوحات اسے یوں ہی تحفے میں

حاصل نہیں ہو گئی تھیں۔ بلکہ اسے جنگیں لڑنی پڑی تھیں تب جا کر روم کی عظیم الشان سلطنت وجود میں آئی تھی۔

کامنسٹنٹائن اعظم

(280ء سے 337ء تک)

اس کا بھی تعلق روم سے تھا۔ یہ روم کا پہلا عیسائی شہنشاہ تھا۔

305ء میں ڈائیریکلشن کے تخت سے دست بردار ہوا

تو کامنسٹنٹائن کا باپ روما کے مغربی نصف حصے کا حکمران بن گیا۔

اگلے برس کامنٹیس چل بسا تو اپنے مغربی دستوں کے بل پر کامنسٹنٹائن شہنشاہ بن گیا۔ بہت سے سپہ سالاروں نے اس کے اس وعدہ کو نامنظور کر دیا۔ یوں خانہ جنگیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

سلسلہ 312ء میں ختم ہوا۔ جب اس نے اپنے حریف سکیسن ٹیس کو روم کے نزدیک میلوین برج کی جنگ میں شکست دی۔

کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں دونوں طرف سے ہزاروں افراد مارے گئے تھے۔

چنگیز خان

(1162ء سے 1227ء)

عظیم سنگدل فاتح چنگیز خان 1162ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک عام سا سنگدل سردار تھا۔ جس نے اپنے بیٹے کا نام ایک مفتوح حریف سردار کے نام پر تیموچن رکھا۔

جب وہ نو برس کا تھا تو اس کا باپ قتل کر دیا گیا تھا۔

اس نے ابتدائی دن بہت خراب دیکھے۔ اپنی نوجوانی میں وہ حریف قبیلے کے ایک دھاوے میں گرفتار ہوا۔ اس کی گردن کے گرد ایک چوبی حلقہ باندھ کر اسے اسیر رکھا گیا۔ بے چارگی کی اس حالت سے نکل کر ایک قدیم اور بنجر ملک کا ناخواندہ اسیر تیموچن دنیا کے انتہائی طاقت ور انسان کے طور پر سامنے آیا۔

اس نے تمام قبائل کو متحد کر کے ایک مہیب فوجی قوت بنالی اور ہمسایہ اقوام پر چڑھ دوڑا۔ اس نے پہلے شمالی مغربی چین میں "ہسی ہسیا" ریاست پر اور شمالی چین میں "ین" سلطنت پر یورش کی۔ 1219ء میں چنگیز خان خوارزم شاہ (ایران) پر چڑھ دوڑا اور پوری سلطنت تباہ کر دی۔

دیگر سنگدل فوجی روس پر حملہ آور ہو گئے۔ ادھر چنگیز خان نے افغانستان اور شمالی ہند پر دھاوا بولا۔ وہ منگولیا میں 1227ء میں فوت ہوا۔

ان جنگوں میں چنگیز خان نے لاشوں کے انبار لگا دیے تھے۔

سکندر اعظم

(356 تا 323 قبل مسیح)

مقدونیہ کے دارالخلافہ پیلا میں 356 قبل مسیح پیدا ہوا۔

اس کا باپ فلپ غیر معمولی قابلیت اور بصیرت کا انسان تھا صرف 46 برس کی عمر میں فلپ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ باپ کی موت کے وقت سکندر صرف بیس برس کا تھا لیکن اسے اقتدار سنبھالنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

سکندر نے بادشاہ بنتے ہی جنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

سکندر اپنے سالاروں کے ساتھ پہلے ایشیائے کوچک میں داخل ہوا اور وہاں موجود ایرانی فوجوں کو شکست فاش دی۔ پھر وہ شمالی شام کی طرف بڑھا۔ وہاں آسٹس کے مقام پر بھاری ایرانی فوجی جمعیت کو مات دی۔ سات ماہ کے

دورانیہ کے ایک دوسرے محاصرے کے بعد اس نے موجودہ لبنان کے علاقے میں ٹائر نامی فونیٹن قوم کے شہر کو فتح کیا۔ دو ماہ کے محاصرے کے بعد غازہ پر قبضہ کیا۔ مصر پر قبضہ کیا۔ بابل کو فتح کیا۔ کوہ ہندوکش کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا۔ مغربی ہندوستان میں اس نے اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔

یہاں اس کی فوجوں نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔ وہ تھک چکے تھے۔ مجبوراً سکندر کو واپس آنا پڑا۔

اسے تاریخ کا ایک عظیم فاتح کہا جاتا ہے لیکن یہ تو دیکھیں کہ اس عظیم فاتح نے کتنی جنگیں لڑیں اور ان جنگوں میں کتنے لوگ مارے گئے۔

نپولین بوناپارٹ

(1769ء سے 1821ء)

عظیم فرانسیسی سپہ سالار اور شہنشاہ 1769ء میں کورسیکا کے شہر باسیو میں پیدا ہوا۔ 1785ء میں اس نے سولہ برس کی عمر میں گریجویشن کی اور فرانسیسی فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ ہوگیا۔ خود کو نمایاں کرنے کا پہلا موقع 1793ء میں تولون کے محاصرہ کے موقع پر ملا۔ نپولین توپ خانے کا نگراں تھا۔ اس نے انگریزوں سے شہر کو آزاد کروایا۔

کامیابیوں کے نتیجے میں اسے بریگیڈیئر جنرل کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ 1796ء میں اسے اٹلی میں فرانسیسی فوج کی کمان سونپی گئی۔ نپولین نے شاندار فتوحات حاصل کرلیں۔

1804ء میں اس نے خود کو فرانس کا شہنشاہ قرار دیا۔ اس کے بعد اس کی زندگی میں جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ انگلستان اور اس کے حلیفوں سے طویل جنگیں شروع ہوئیں۔

آسٹریا اور روسی فوجوں کے خلاف ایک نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ 1808ء میں نپولین نے قدرے ناعاقبت اندیشانہ انداز سے خود کو جزیرہ ہائے ایبیرین کے ساتھ ایک طویل جنگ میں الجھادیا۔

اس نے دوسری حماقت روس میں داخل ہو کر کی۔ روسی فوجوں نے نپولین سے لڑنے میں اعتراز کیا اور اسے تیزی سے پیش قدمی کا موقع دیا۔ ستمبر 1802ء میں اس نے ماسکو پر قبضہ کرلیا۔ تاہم روسیوں نے شہر کو آگ لگا کر اسے تباہ کردیا۔

ماسکو میں پانچ ہفتے انتظار کرنے کے بعد نپولین نے

واپسی کا ارادہ کیا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ روسی فوج، روسی موسم سرما اور فرانسیسی فوج کو ناکافی عرصہ کے اشتراک نے پوری فرانسیسی فوج کو تباہ کر دیا۔ صرف دس فی صد فوجی زندہ واپس آئے تھے۔

اندازہ لگائیں کہ ایسے لوگوں کے جنگی جنون کا کیا عالم ہوتا ہوگا اور ان جنگوں میں کتنے لوگ مارے گئے ہوں گے۔

ایڈولف ہٹلر

(1889ء سے 1945ء)

جنگ و جدل کی خونی تاریخ ہٹلر کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ اس شخص کے جنون کی وجہ سے لاکھوں افراد موت کے منہ میں چلے گئے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ کم از کم ستر اسی لاکھ افراد ہٹلر کی اس جنون کا شکار ہوئے تھے۔ جنگ سے پہلے چند سالوں میں ہٹلر کو جرمنوں کی بڑی اکثریت کی حمایت رہی۔ کیوں کہ اس نے بے روزگاری کا خاتمہ اور معاشی خوش حالی کو استوار کیا تھا۔

پھر وہ فتوحات کی دوڑ میں شامل ہو گیا۔ جو جنگِ عظیم دوم کا سبب بنیں۔ اس کے دستوں نے مارچ 1936ء میں رہائن لینڈ پر قبضہ کیا۔ مارچ 1938ء میں آسٹریا کو جبری طور پر خود سے الحاق پر آمادہ کیا۔ ستمبر 1938ء میں چیکوسلواکیہ پر چڑھائی کر دی۔ پھر اس نے پولینڈ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ انگلستان اور فرانس نے پولینڈ کے دفاع کا فیصلہ کیا۔ جرمن نے جب پولینڈ پر حملہ کیا تو روس بھی حملے میں شامل ہو گیا۔ انگلستان اور فرانس بھی اس جنگ میں کود پڑے لیکن پولینڈ کو شکست فاش ہوئی۔

1940ء میں ہٹلر کی فوجوں نے ناروے اور ڈنمارک کو روند ڈالا اس سال ہالینڈ، بیلجیئم اور لکسمبرگ کو تباہ کیا۔ فرانس نے شکست کھائی۔ لیکن برطانیہ نے اس کی فوجوں کا دلیری سے مقابلہ کیا ہٹلر کبھی انگلستان پر قبضہ نہیں کر پایا۔

1941ء میں ہٹلر کی فوجوں نے یونان اور یوگوسلاویہ پر قبضہ کیا۔ روس کے بڑے علاقے پر فتح حاصل کرنے کے دوران میں اس نے امریکا پر بھی حملہ کر دیا۔

غرض یہ کہ اس شخص کو جنگ کا جنون ہو گیا تھا۔ اس نے تاریخ کے صفحات میں اپنا نام تو درج کروا لیا لیکن کس قیمت پر۔ کروڑوں انسانوں کی لاشوں پر۔

سائمن بولیور

(1683ء سے 1830ء)

جنگجو لوگوں کی اس مختصری فہرست میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے کسی مقصد کے لیے جنگیں لڑی ہیں۔

لیکن اس مضمون کا مقصد چونکہ یہ دکھانا ہے کہ جنگ چاہے کسی بھی مقصد اور نظریے کے تحت لڑی گئی ہوں اس میں انسانوں کی ہلاکتیں تو ہوئیں۔

سائمن بولیور بھی ایک ایسا شخص ہے جس نے ایک طویل عرصے تک جنگیں لڑیں۔ اس شخص کو پانچ جنوبی امریکی ممالک (کولمبیا، وینزویلا، ایکیبسوا ڈور، پیرو اور بولیویا) ہسپانوی راج سے آزادی کی جنگ میں اہم ترین کردار ادا کرنے کی بنا پر جنوبی امریکا کا جارج واشنگٹن کہا جاتا ہے۔

بولیور کی پیدائش وینزویلا میں ہوئی تھی۔ جوان ہونے پر اس نے ہسپانوی راج کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کی۔

1811ء میں خود مختاری کا باضابطہ اعلان کیا گیا۔

اسی برس بولیور انقلابی فوج میں بطور افسر بھرتی ہو گیا۔

اس کے بعد اس کی زندگی میں جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ 7 اگست 1819ء کو اس نے بوکیا کا کی ایک اہم جنگ جیتی۔ یہ جدوجہد کی تحریک میں فیصلہ کن موڑ تھا۔ 1821ء میں وینزویلا نے آزادی حاصل کی۔

1822ء میں ارجنٹائن کے موڑے ڈی سان مارٹن

کے ساتھ مل کر ارجنٹائن کو آزادی دلوائی۔ پھر پیرو کی آزادی کی جدوجہد میں شامل ہوگیا۔

1824ء میں بولیور کی فوجوں نے بولیویا کے لیے جنگ کی۔

بولیور نے ایک پرجوش اور مہم جویانہ زندگی گزاری لیکن اس کے آخری ایام بہت کسمپرسی کے تھے۔ 1830ء میں اپریل کے مہینے میں اس نے استعفیٰ دیا اور اسی سال جلاوطنی کے عالم میں اس کا انتقال ہوگیا۔

بہرحال بولیور بھی تاریخ کے ان لوگوں میں شامل ہے جو جنگیں لڑتے رہے۔

پوپ اربن دوم

(1042ء سے 1099ء)

آج پوپ اربن دوم سے زیادہ لوگ واقف نہیں ہیں۔

اربن دوم ہی وہ شخص تھا جس نے ''مقدس وادی'' کو مسلمانوں کے قبضے سے چھڑانے کے لیے عیسائیوں کو جنگ کے لیے اکسایا اور اس طرح صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا۔

VRBANVS · II · PP · GALVS

یہ شخص فرانس کے ایک شہر میں 1042ء میں پیدا ہوا تھا۔ وہ فرانسیسی نوابوں کے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ 1088ء میں وہ پوپ منتخب ہوا۔

لیکن جس واقعے کے حوالے سے اربن کا نام زندہ ہے وہ سن 1095ء میں 27 نومبر کو ہوا تھا۔ اس نے فرانس کے شہر کلرمونٹ میں اہل کلیسیا کا ایک بڑا جلسہ منعقد کرایا۔

اس نے اپنی تقریر میں عیسائی دنیا کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ اس نے کہا کہ تمام دنیا کے عیسائیوں کو مقدس جنگ کے لیے تیار ہوجانا چاہیے۔

مسلمانوں کے خلاف نعرے لگائے گئے۔ چند ماہ کے اندر پہلی صلیبی جنگ لڑی گئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ آٹھ بڑی صلیبی اور چند چھوٹی جنگیں لڑی گئیں۔

یہاں ان صلیبی جنگوں کی تفصیل دینا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ انسانوں کو جنگ کی آگ میں جھوک دینے والوں میں پوپ اربن دوم کا نام بھی شامل ہے۔

آشوک

(300 تا 232 قبل مسیح)

ہندوستان کی تاریخ میں سب سے اہم مہاراجا اشوک ہی تھا۔

اشوک موریہ خاندان کا تیسرا فرمانروا اور اس سلسلے کے بانی چندر گپت موریہ کا پوتا تھا۔ ویسے تاریخ میں اشوک کو ایک جنگجو نہیں بلکہ صلح جو سپہ سالار کی حیثیت حاصل ہے۔

لیکن صلح جو ہونے سے پہلے اس نے بے شمار جنگیں لڑیں اور کامیابیاں حاصل کیں۔ ان جنگوں کے نتیجے میں وہ اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع کرتا چلا گیا۔

اس نے اپنے اقتدار کے آٹھویں برس ریاست کلنگا کو ایک گھمسان کی جنگ کے بعد جیتا (یہ ریاست آج کل اڑیسہ کہلاتی ہے)۔

اس جنگ میں انسانی لاشوں کو دیکھ کر اس کی کایا پلٹ گئی۔ اس نے شرمندگی محسوس کی کہ اس کی ہوس اقتدار نے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

یہاں سے وہ بالکل بدل گیا اور بدھ مذہب اختیار کر کے جنگ و جدل سے توبہ کرلی۔ لیکن یہ سب بعد میں ہوا ابتدا میں تو اس کے جلو میں موت چلتی تھی۔

فرانسکو پیزارو

(1475 سے 1541ء)

ناخواندہ ہسپانوی مہم جو فرانسسکو پیزارو جس نے پیرو میں انکا سلطنت کو فتح کیا اسپین کے شہر ٹروجیلو میں 1475ء میں پیدا ہوا۔

پیزارو شہرت اور دولت کے لالچ میں کارنامے

انجام دیتا رہا۔ اسے ایک ہسپانوی مہم جو پاسکول ڈی اینڈ گویا سے انکا سلطنت کے بارے میں معلوم ہوا۔ اور انکا سلطنت کو فتح کرنے کا ارادہ کرلیا۔

1524-25ء میں اس نے اوّلین کوشش کی جو ناکام رہی۔ 1526ء میں اپنے دوسرے حملے میں وہ پیرو کی بندرگاہ تک جا پہنچا۔ جہاں سے وہ سونا، لوہا، اونٹ اور ہندوستانی قیدیوں کو لے کر واپس ہوا۔

اس نے جب اسپین کے بادشاہ چارلس پنجم سے پیرو کو فتح کرنے کا باقاعدہ اختیار حاصل کیا تو اس مہم کے لیے اس کے پاس صرف دوسو فوجی تھے۔ لیکن پیزارو جوڑ توڑ کا ماہر ایک مکار اور چالاک انسان بھی تھا۔

ہسپانوی جہازوں نے بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے کے بعد قتل وغارت گری کا بازار گرم کردیا۔ اس نے انکا حکمران تاہولیا کو مذاکرات کی دعوت دی۔

وہ بے چارہ اپنے پانچ ہزار ساتھیوں کے ساتھ غیر مسلح ہو کر مذاکرات کے لیے آیا اور پیزارو نے اپنے مسلح فوجیوں کو قتل عام کی اجازت دے دی۔

یہ جنگ جسے قتل عام ہی کہنا چاہیے، نصف گھنٹے جاری رہی۔ جس میں پانچ ہزار غیر مسلح انکا مارے گئے اور، تاہولیا گرفتار ہوگیا۔

انکا حکمران نے اپنی آزادی کی اُمید میں پیزارو کو بے پایاں سونے اور چاندی کی صورت میں تاوان ادا کیا جس کی قیمت اندازاً 28 ملین ڈالر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود پیزارو نے اسے قتل کردیا۔

اسپین کے حکمران نے اس کی بہت آؤ بھگت کی۔ اسے فاتح قرار دیا۔ ویسے بھی پیزارو کا چھ ملین سے زیادہ آبادی والی سلطنت کو فقط 180 سپاہیوں کی مدد سے فتح کرلینا تاریخ کے حیران کن واقعات میں سے ایک ہے۔

یہ ساری کامیابیاں اپنی جگہ لیکن پیزارو کے ہاتھوں اتنے انسانوں کے قتل عام کو کس کھاتے میں ڈالا جائے گا؟

پرنیڈ وکورٹیز

(1485ء سے 1547ء تک)

یہ شخص بھی تاریخ کے بڑے جنگجوؤں میں سے ایک ہے۔ اس نے بھی انسانی لاشوں کے انبار لگا دیے تھے۔

میکسیکو کا فاتح پرنیڈو اسپین کے شہر میڈیلین میں 1485ء کو پیدا ہوا تھا۔ جوانی میں اس نے قانون کا مطالبہ کیا۔

1518ء میں ویلاسکیرز نے میکسیکو جانے والی فوجی مہم کے لیے کورٹیز کو روانہ کیا۔ فروری 1519ء میں کورٹیز گیارہ بحری جہازوں، ایک سو دس ملاحوں، 533 سپاہیوں، دس بھاری اور چار ہلکی توپوں کے ساتھ روانہ ہوا۔

میکسیکو میں ان دنوں ایزٹیک حکمرانوں کی حکومت تھی۔ یہ لوگ مقامی ریڈ انڈینز کے ساتھ بہت برا سلوک کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے ریڈ انڈین ان سے نفرت کرتے تھے۔

کورٹیز نے اس سچویشن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریڈ انڈینز کو اپنے ساتھ ملا کر ایزٹیک حکمرانوں پر چڑھائی کردی اور خوں ریز جنگ کے بعد فتح حاصل کرلی۔

وہ ایک اچھا منتظم اور بہادر انسان تھا۔ اس میں اور بھی خوبیاں ہوں گی لیکن جنگ کا جنون تو بہرحال تھا۔ وہ جنگ جس میں انسان مارے جاتے ہیں اور خون ریزی ہوا کرتی ہے۔

ملکہ ازبیلا اوّل

(1451ء سے 1504ء)

آج بہت سے لوگ کیسٹائن کی ملکہ ازبیلا اوّل کو اس حوالے سے جانتے ہیں کہ اس نے بحر اوقیانوس میں سفر کے لیے کرسٹوفر کولمبس کی مالی مدد کی تھی۔ لیکن اس کی شخصیت کا

مشینی ذہانت

انسانی بقا کے لیے خطرہ

مشہور زمانہ مفلوج برطانوی سائنسداں پروفیسر اسٹیفن ہاکنگ نے خبردار کیا ہے کہ انسان کی تخلیق کردہ مشینی ذہانت Artificial Intelligence کا مطلب انسانیت کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ ایک خصوصی انٹرویو میں نظریاتی طبیعیات (Theoretical Physics) کے ماہر کا کہنا تھا کہ اس قسم کی ٹیکنالوجی انتہائی تیزی کے ساتھ ترقی کر کے نوع انسانی پر غلبہ پا سکتی ہے۔ اسٹیفن ہاکنگ کے بقول یہ ایک ایسی صورت حال ہوگی جس کی منظرکشی "ٹرمینیٹر" سیریز کی فلموں میں کی جاچکی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس وقت ہمارے پاس ابتدائی شکلوں میں جو مصنوعی ذہانت موجود ہے وہ پہلے ہی بہت کارآمد ثابت ہوچکی ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ مکمل مشینی ذہانت کی تیاری کے ساتھ ہی انسانی نسل کے خاتمے کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ پروفیسر ہاکنگ نے کہا کہ ایک بار انسانوں نے مکمل مصنوعی ذہانت بنالی تو پھر یہ خود بخود اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کرے گی اور ہو لمحہ بڑھتی رفتار کے ساتھ خود کو ری ڈیزائن کرے گی۔ اسٹیفن ہاکنگ، جنہیں دنیا کا سب سے زیادہ ذہین زندہ سائنسداں مانا جاتا ہے کا کہنا تھا کہ انسان جو کہ ست حیاتیاتی ارتقاء کی وجہ سے محدود صلاحیتوں کا حامل ہے۔ مصنوعی ذہانت کا مقابلہ نہیں کر پائے گا اور اس سے شکست کھا جائے گا۔ 72 سالہ پروفیسر ہاکنگ، موٹر نیورون ڈیزیز نامی بیماری سے مکمل طور پر مفلوج ہونے کے باعث ایک خصوصی وہیل چیئر پر زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ بولنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوچکے ہیں اور ایک آلے کی مدد سے گفتگو کرتے ہیں۔ اگرچہ اسٹیفن ہاکنگ مصنوعی ذہانت کے مخالف ہیں۔ تاہم وہ جدید مواصلاتی ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانے کے زبردست حامی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ وہ دنیا کے ان چند لوگوں میں سے ایک ہیں جو ابتدائی زمانے میں انٹرنیٹ کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہوئے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ انٹرنیٹ فوائد کے ساتھ ساتھ خطرات بھی لے کر آیا ہے۔

مرسلہ: ہانی رضوی۔ لاہور

دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ ایک ظالم اور بے رحم حکمران تھی۔ اس نے ایک ایسا ادارہ قائم کیا جو شدید سزائیں دینے میں ماہر تھا۔

اس ادارے نے ازبیلا کے حکم پر تین ہزار افراد کو باندھ کر زندہ جلا دیا تھا۔ اس نے غرناطہ پر قبضہ کر کے ہزاروں مسلمانوں کو قتل کروادیا۔ انہیں مجبور کیا کہ وہ اسلام چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرلیں۔ جب مسلمان نہیں مانے تو ازبیلا نے ان کا قتل عام کروادیا۔

ہوسکتا ہے کہ اسپین کی تاریخ میں اس عورت کو اس لیے یاد کیا جاتا ہو کہ اس کی وجہ سے اسپین سے مسلمانوں کا مکمل خاتمہ ہوگیا لیکن اس کے ساتھ ہی دنیا کی تاریخ اس عورت کو وحشی اور بے رحم عورت کے طور پر جانتی ہے۔

جوزف اسٹالن

(1879ء سے 1953ء)

اب ذکر ہے ایک بہت مشہور اور بہت بے رحم انسان کا۔

وہ جارجیا کے قصبے گوری میں 1879ء میں پیدا ہوا۔ غریب ماحول میں پرورش پائی۔ خفیہ مارکس تحریک میں شامل تھا۔ پھر "بالشویک" دھڑے کا حامی بن گیا۔

چھ بار گرفتار ہوا اس کا اصل نام تو کچھ اور تھا لیکن اس نے ایک فرضی نام اسٹالن (آہنی انسان) اختیار کیا۔

1922ء سے اس نے عروج حاصل کرنا شروع کیا۔ انتہائی جماعت کا سیکریٹری بن گیا۔ لینن کسی اور کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا لیکن لینن کی وفات کے بعد اسٹالن نے اس کا وصیت نامہ غائب کروا دیا اور خود لینن کی جگہ پر

آ گیا۔

1930ء کی دہائی میں وہ سوویت یونین کا مطلق العنان آمر بن گیا تھا۔

آمر بن جانے کے بعد اس کی سفاکیت کے جوہر کھلنے لگے۔ اس نے ایک ایک کر کے اپنے تمام مخالفین حتیٰ کہ دوستوں تک کو مروا دیا۔

اسٹالن کی وضع کردہ معاشی پالیسیاں زراعت کے جبری ارتکاز پر مبنی تھیں۔ یہ پالیسی کسانوں میں انتہائی ناپسندیدہ تھی جب کہ اس کی مخالفت بھی خوب ہوئی۔ 1930ء کی دہائی کے شروع میں اسٹالن کے فرمان کے تحت لاکھوں مزدوروں کو مار دیا گیا یا وہ فاقوں سے مر گئے۔

اپنی زندگی میں اسٹالن نے لاکھوں افراد کو موت کے گھاٹ اتارا یا عقوبت گاہوں میں بھیج کر فاقوں سے مروایا۔

اس کا انتقال 1953ء میں ہوا تھا۔ اس وقت اس کی عمر 73 برس تھی۔ دنیا اسے ایک بے رحم انسان کے نام سے یاد کرتی ہے۔

جولیس سیزر

(100 قبل مسیح سے 44 قبل از مسیح تک)

تاریخ کا ایک مشہور ترین کردار جو اپنی پہلو دار شخصیت کی وجہ سے ایک اساطیری کردار بن چکا ہے۔

جولیس سیزر کو روم کا آمر حکمران کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی اس حیثیت تک پہنچنے کے لیے بے شمار جنگیں لڑیں۔

گاڈل (شمالی اٹلی) فرانس، بیلجیئم، ہالینڈ، جرمنی اور سوئٹزر لینڈ میں جنگیں لڑیں اور ایک طاقت ور آمر بن کر سامنے آیا۔

اپنی جنگوں اور خون ریزیوں سے ہٹ کر سیزر کی شخصیت کے اور بھی پہلو ہیں۔ جن سے کہانیاں بن چکی ہیں۔

وہ ایک رومان پسند انسان تھا۔ قلوپطرہ کے ساتھ اس کا رومانس مشہور زمانہ ہے۔ وہ ایک بڑا دانش ور بھی تھا۔

اس کی کتاب Deballogalico کو کلاسکی ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی تمام اصلاحات میں سے ایک جس نے سب سے زیادہ اور دیرپا اثرات مرتب کیے وہ ہے اس کا کلینڈر سسٹم جو آج بھی مروج ہے (سن عیسوی والا، جنوری، فروری، مارچ، اپریل وغیرہ)

تاریخ میں ایسے ناموں کی کمی نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے عروج حاصل کیا۔ جنگیں لڑیں، انسانوں کا خون بہایا۔

ہم نے اس فہرست میں ایسے کچھ ہی لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار ہیں۔ جن میں سے چند کے نام آپ کی دلچسپی کے لیے تحریر کر رہا ہوں۔

ولیم فاتح (1027ء سے 1087ء تک) نارمنڈی کا نواب۔ جس نے انگلستان پر حملہ کیا اور حملے کا مطلب ہے جنگ اور موت۔

لینن (1870ء سے 1924ء) یہ سیاسی رہنما روس میں اشتراکیت کے قیام کا اصل ذمے دار تھا۔ مارکس کا ایک پُرخلوص شاگرد۔

اشتراکیت کے قیام کے سلسلے میں لاکھوں جانیں گئیں اور ان کا ذمے دار لینن کو قرار دیا جاتا ہے۔

سوئی دین تی (541ء سے 604ء) یہ درست ہے کہ اس شخص نے پورے چین کو متحد کر کے ہان خاندان کی مضبوط بنیاد رکھی لیکن اس بنیاد میں کتنوں کا خون ہے اس کا حساب لگانا مشکل ہے۔

سائیرس اعظم (590 تا 529 قبل مسیح) ایرانی سلطنت کا بانی۔ یہ درست ہے کہ بادشاہ بننے سے قبل اس نے اس مقام تک پہنچنے کے لیے لڑائیاں لڑیں۔ پھر اس کے بعد وہ ایک انتہائی صلح جو اور متحمل مزاج شخص کے طور پر سامنے آیا۔

اور بھی بہت سے بے رحم کردار ہیں خود ہماری تاریخ میں احمد شاہ ابدالی، نادر شاہ درانی وغیرہ۔ کہانی میں یہی ہے کہ طاقت، حکمرانی وغیرہ یوں ہی نہیں ملتی، ایک خون کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔

کے ٹو

طارق عزیز خان

دنیا کی بلند ترین چوٹیوں میں سے ایک چوٹی جس پر ہمیں فخر ہے۔ کیونکہ گدگداتی ہے کبھی جو اس کے دامن کی ہوا تو سبز جنگل کی طرح لہک جاتے ہیں ہمارے خواب۔ اس فخر کے نشان کا ذکر بار بار آتا لیکن یہ ضروری بھی ہے کہ ہم اسے یاد کرتے رہیں کیونکہ یہ وطن عزیز کی پہچان بھی ہے۔

ایک مختصر سی معلوماتی تحریر تشنگانِ علم وفن کے لیے

پاکستان، چین اور بھارت کی سرحدوں پر واقع قراقرم کا پہاڑی سلسلہ 600 کلومیٹر لمبے اور 200 کلومیٹر چوڑے علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ دنیا کا بلند ترین پہاڑی سلسلہ ہے جہاں واقع 60 پہاڑی چوٹیوں کی بلندی 22 ہزار فٹ کے قریب ہے۔ اس سلسلے کی بلند ترین چوٹی "کے ٹو" ہے، جس کی بلندی 28251 فٹ (8611 میٹر) ہے۔ کے ٹو، خط استواء سے 35.53 ڈگری شمال اور 76.30 ڈگری مشرق کے خط پر پاکستان کے شمالی علاقے میں چین کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ یہ پاکستان کی حدود میں واقع سب سے بلند اور نیپال میں واقع ماؤنٹ ایورسٹ (بلندی 29035 فٹ) کے بعد دنیا کی دوسری بلند چوٹی ہے۔ 1856ء میں انگریز سرویر، ٹی جی مونٹ گومری (T G Montgomerie) نے کوہ قراقرم کی چھان بین کے دوران میں کے ٹو کو اس کا موجودہ نام دیا کیونکہ یہ چوٹی قراقرم سلسلے کی 35 چوٹیوں میں دوسرے نمبر پر واقع تھی۔ 1861ء میں انگریز نقشہ نویس اور سرویر، ہنری ہیورشیم گڈون آسٹن (Henry Haversham Godwin-Austen) کے نام پر کے ٹو کو "ماؤنٹ گڈون آسٹن" کا نام دیا گیا۔ تاہم یہ کے ٹو کے نام سے زیادہ مشہور ہوئی۔ قراقرم سلسلے میں بسنے والے مقامی لوگ اسے کئی دوسرے ناموں سے پکارتے ہیں جن میں شاہگوری لامبا پہاڑ، ڈیپ سانگ اور کی چونمایاں ہیں۔

یہ سب نام کے ٹو کی بلندی، خوبصورتی اور خطرناکی کو اجاگر کرتے ہیں۔ 1892ء سے 1954ء تک کے ٹو کو سر کرنے کے لیے سرانجام دی گئیں آٹھ مہمات کی ناکامی کے بعد اطالوی مہم جو اے چلی کمپیگ نونی (Achille Compagnoni) نے اپنے ساتھی لینو لیسی ڈیلی (Lino Lacedelli) کے ساتھ مل کر 31 جولائی 1954ء کے دن کے ٹو کو سر کیا۔

اے چلی کمپیگ نونی 26 ستمبر 1914ء کو شمالی اٹلی کے صوبے لومبارڈے میں پیدا ہوا۔ اٹلی کے پہاڑی علاقوں میں پلا بڑھا ہونے کی وجہ سے پہاڑوں پر چڑھنے کا جنون اس کے ساتھ جوان ہوا۔ اس نے جنگِ عظیم دوم میں اتحادی افواج کے لیے خدمات سرانجام دیں۔ جنگ کے بعد اس نے اٹلی اور سوئٹزر لینڈ کی سرحد پر واقع متعدد پہاڑی چوٹیوں کو سر کیا۔ عمودی چٹانوں پر چڑھنے کی اس کی مہارت کو دیکھتے ہوئے اسے 1954ء میں کے ٹو سر کرنے کے لیے پاکستان جانے والی اطالوی کوہ پیماؤں کی ٹیم میں شامل کرلیا گیا۔ ڈیڑھ درجن ارکان پر مشتمل اس ٹیم کی قیادت ایرڈیٹو ڈیسیو (Ardito Desio) کے پاس تھی جبکہ ٹیم کے دیگر ارکان میں لینو لیسی ڈیلی اور والٹر بوناٹی نمایاں تھے۔ اطالوی ٹیم فروری 1954ء میں پاکستان کے شہر راولپنڈی پہنچی، جہاں قیام کے دوران کمپیگ نونی کی 29 سالہ لیسی ڈیلی اور 24 سالہ بوناٹی سے دوستی پکی ہوگئی۔ وہ لوگ مارچ میں اسکردو پہنچے۔ جہاں انہوں نے مہم کی تیاریوں کے سلسلے میں دو ماہ سے زیادہ عرصہ گزارا۔ اس دوران میں ٹیم میں 100 سے زیادہ مقامی مزدور اور ایک درجن کے قریب راہنما شامل ہوئے۔ مقامی افراد میں وادی ہنزہ سے تعلق رکھنے والا 19 سالہ پاکستانی کوہ پیما عامر مہدی اور پاکستانی حکومت کے نمائندے کرنل محمد عطاءاللہ نمایاں تھے۔ اسکردو میں قیام کے دوران اطالوی ٹیم لیڈر ایرڈیٹو ڈیسیو نے بیس کیمپ سے کے ٹو کی چوٹی تک جانے کے لیے دو دو کوہ پیماؤں پر مشتمل دو ٹیمیں تشکیل دیں۔ پہلی سینئر ٹیم میں اے چلی کمپیگ نونی اور لینو لیسی ڈیلی جبکہ دوسری جونیئر ٹیم جسے مددگار ٹیم بھی کہا جاسکتا ہے، میں والٹر بوناٹی اور عامر مہدی کو شامل کیا گیا۔

ٹیم لیڈر کی قیادت میں دونوں ٹیمیں جون 1954ء کی شروعات میں کے ٹو کے بیس کیمپ کون کورڈیا میں پہنچیں۔ انہوں نے جولائی کے وسط میں پہاڑ کی چوٹی کی طرف جانے والے جنوب مشرقی ڈھلانی راستے ابروزی پر پیش قدمی شروع کی۔ کیمپ نمبر ایک سے کیمپ نمبر آٹھ تک تمام معاملات ٹھیک ٹھاک رہے یہاں تک کہ سینئر ٹیم 30 جولائی کی صبح 8100 میٹر کی بلندی پر پہنچ گئی۔ اے چلی نے مزید چڑھائی چڑھنے سے پہلے اس مقام پر چھوٹا خیمہ نصب کیا۔ تاہم اگلے دو سے تین گھنٹوں کے دوران میں اسے اندازہ ہوگیا کہ کیمپ کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں تھی۔ اس نے اپنے ساتھی کی مدد سے خیمہ اکھاڑا اور کچھ مزید چڑھائی چڑھ کر 8150 میٹر کی بلندی پر کیمپ نمبر 9 قائم کیا۔ یہ کے ٹو کی چوٹی سے پہلے پہاڑ پر ان کا آخری پڑاؤ تھا۔ اس وقت دن ڈھل رہا تھا۔ وہ لوگ کے ٹو کی خطرناک پتھریلی ڈھلان پر ایک ایسی جگہ موجود تھے، جہاں درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے تھا، ہوائیں تیز اور سرد تھیں جبکہ ان کے پاس موجود آکسیجن کا ذخیرہ بھی کم ہوتا جارہا تھا۔ اے چلی کو اُمید تھی کہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے جونیئر ٹیم ان تک پہنچ جائے گی۔ جس کے پاس آکسیجن کے زائد سلنڈر موجود تھے۔ دراصل بیس کیمپ ہی میں یہ فیصلہ ہوچکا تھا کہ آکسیجن کے زائد سلنڈرز کو چوٹی تک رسائی کے آخری مرحلے کے دوران میں استعمال کیا جائے گا۔ ادھر بوناٹی اور مہدی پر مشتمل جونیئر ٹیم 30 جولائی کی شام غروب آفتاب کے بعد 8100 میٹر کی بلندی پر پہنچی۔ بوناٹی کے خیال میں یہ کیمپ لگانے کے لیے مناسب مقام تھا، تاہم یہ دیکھ کر اس کے حواس جاتے رہے کہ کیمپ نمبر 9 اس جگہ سے کچھ اوپر قائم تھا۔

سارا دن زاید وزن اٹھائے چڑھائی چڑھتے رہنے کی وجہ سے دونوں ساتھیوں کی حالت خراب تھی۔ خاص کر مہدی پر تھکاوٹ اور ٹھنڈ کا کچھ زیادہ ہی اثر تھا اور اس میں مزید اوپر چڑھنے کی سکت نہیں تھی۔ قرب و جوار کی چٹانوں کو دیکھ کر بوناٹی سمجھ گیا کہ اے چلی نے پہلے کیمپ اسی جگہ لگایا تھا، تاہم اب وہ ان کی پہنچ سے دور تھا اور سیاہ برفیلی رات ان کے سر پر تھی۔ جونیئر ٹیم کے پاس آکسیجن کے زائد سلنڈر موجود تھے۔ اگر وہ اوپر کی بجائے نیچے جانے کا خطرہ مول لیتے تو خدشہ تھا کہ ان کے سینئر ساتھی تاریخ رقم کرنے کا موقع کھو دیتے۔ والٹر بوناٹی اور عامر مہدی نے یہ رات کیمپ نمبر 9 سے کچھ نیچے 8100 میٹر کی بلندی پر کھلی فضاء میں گزاری۔ وہ ساری رات سردی میں ٹھٹھرتے رہے۔ انہوں نے اس دوران میں سینئر ٹیم کے لیے موجود آکسیجن سلنڈر میں سے کچھ آکسیجن بھی استعمال کی۔ بوناٹی تو اس رات کی جان لیوا ٹھنڈ برداشت کرگیا لیکن عامر مہدی کے ہاتھوں کی کچھ انگلیاں اور ایک پاؤں کا پنجہ سردی سے جم کر ضائع ہوگئے۔ اگلی صبح سورج طلوع ہونے کے بعد دونوں ٹیموں کا ایک دوسرے سے رابطہ ممکن ہوا۔ جس کے بعد کسی نہ کسی طرح بوناٹی اور مہدی کیمپ نمبر 9 پہنچ گئے۔ بوناٹی نے اپنے ابلتے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اے چلی سے خیمے کی جگہ بدلنے سے متعلق بات چیت کی۔

”میں نے دیکھا کہ تم نے پہلے نیچے کیمپ لگایا تھا۔“

”ہاں ہم نے وہاں چھوٹا خیمہ گاڑا تھا لیکن اس جگہ پر ہوا کا دباؤ زیادہ تھا۔“ اے چلی نے جواب دیا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ بوناٹی چلایا۔ ”تم نے جان

پاکستان میں سلسلہ ہائے قراقرم میں واقع پانچ بلند چوٹیاں			
نام پہاڑ	بلندی	دنیا میں نمبر	کس نے کب سر کی
کےٹو (K2)	28251 فٹ (8611 میٹر)	2	31 جولائی 1954ء اے چلی کمپیگ نونی (اٹلی)
نانگا پربت	26660 فٹ (8126 میٹر)	9	3 جولائی 1953ء ہرمین بوہول (جرمنی، آسٹریا مشترکہ مہم)
گیشر برم ون	26509 فٹ (8080 میٹر)	11	5 جولائی 1958ء پیٹر شوننگ (امریکا)
براڈ پیک	26414 فٹ (8051 میٹر)	12	9 جون 1957ء فرٹز ونٹر سٹیلر (آسٹریا)
گیشر برم ٹو	26362 فٹ (8035 میٹر)	17	8 جولائی 1956ء فرٹز موروبیک (آسٹریا)

بوجھ کر جگہ بدلی تاکہ چوٹی پر جانے کا پہلا موقع پاسکو۔“

”جھوٹ۔“ اے چلی نے بوناٹی کی رائے مسترد کرتے ہوئے کہا کہ اس کی سوچ غلط تھی، سچ یہ تھا کہ اس نے بہت سوچ سمجھ کر کیمپ کی جگہ تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اے چلی نے بوناٹی سے کہا کہ اس نے کیمپ تک رسائی میں تاخیر کی جس کی وجہ سے اندھیرا اچھیل گیا اور جونیئر ٹیم کو ان سے پچاس میٹر نیچے رکنا پڑا۔ اے چلی نے بوناٹی کو موردِ الزام ٹھہرایا جس کی سستی کی وجہ سے نہ صرف مہدی کی جان خطرے میں پڑی بلکہ آکسیجن کا قیمتی ذخیرہ بھی ضائع ہوا۔

تینوں کوہ پیماؤں میں سب سے سینئر ہونے کے ناطے اے چلی کمپیگ نونی ان کا انچارج تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مہدی کی حالت اور آکسیجن کی کمی کو بنیاد بناتے ہوئے بوناٹی کو کیمپ نمبر 9 میں رکنے کا حکم دیا اور خود لیسی ڈیلی کو لے کر کے ٹو کی چوٹی کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ دونوں ساتھی پھونک پھونک کر قدم رکھتے اوپر چڑھتے رہے یہاں تک کہ 31 جولائی 1954ء کی شام 6 بجکر 10 منٹ پر وہ دونوں اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ سینئر رکن ہونے کے ناطے کے ٹو کی چوٹی پر پہلا تاریخی قدم اے چلی کومپیگ نونی نے رکھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لیسی ڈیلی کو اپنے قریب آنے میں مدد دی۔ انہوں نے چوٹی پر پہلے پاکستان اور پھر اٹلی کے پرچم لہرائے۔ ایک دوسرے کی تصاویریں کھینچیں اور واپسی کے لیے نیچے اترنے لگے۔ انہوں نے کیمپ نمبر 9 میں ٹھہرا اپنے جونیر ساتھیوں کو ساتھ لیا اور کامیابی کے شادیانے بجاتے بیس کیمپ واپس پہنچ گئے۔ اگست 1954ء میں اے چلی کمپیگ نونی اور لینو لیسی ڈیلی کی ٹیم روم پہنچی تو ان کا شایانِ شان استقبال کیا گیا۔ اطالوی حکومت نے اپنے ہیروز کے لیے اٹلی کے سب سے بڑے شہری اعزاز The Medal of honour for civil valour دینے کا اعلان کیا اور پاکستانی کوہ پیما عامر مہدی کی بھی عمر بھر کے لیے پینشن مقرر کردی۔

اس دوران اطالوی ٹیم کی کامیابی کا شور تھمنے کے بعد والٹر بوناٹی اور اے چلی کمپیگ نونی کے درمیان کیمپ نمبر 9 کے قریب پیش آنے والے حالات کو لے کر بیان بازی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ والٹر بوناٹی نے اے چلی کی طرف سے خیمے کی جگہ تبدیل کرنے کے فیصلے پر کڑی تنقید کی۔ بوناٹی کے مطابق وہ تینوں اطالویوں میں سب سے نوجوان، صحت مند اور پھرتیلا تھا۔ اگر وہ اس رات کیمپ نمبر 9 میں پہنچ جاتا تو طے شدہ اصول کے تحت تھکاوٹ، ٹھنڈ اور آکسیجن کی کمی کا شکار کوہ پیماؤں میں سے سب سے بہتر شخص کو ہی کے ٹو کی چوٹی پر چڑھنے کا پہلا موقع دیا جاتا۔ بوناٹی نے آکسیجن ضائع کرنے کے الزام کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے کہا کہ ضرورت کے مطابق آکسیجن موجود تھی اور محض اسے چوٹی تک جانے سے روکنے کے لیے جان بوجھ کر خیمے کی جگہ بدلی گئی۔ ادھر اے چلی نے بوناٹی کے الزمات کا جواب دیتے ہوئے مؤقف اختیار کیا کہ اس نے پہلے والی جگہ سے خیمے کو اس لیے تبدیل کیا کیونکہ وہ جگہ قیام کے لیے خطرناک تھی۔ اے چلی کے مطابق اسے اُمید تھی کہ بوناٹی اپنے پاکستانی ساتھی کو لے کر ان کے پاس پہنچ جائے گا، لیکن اس کی سست روی کی وجہ سے نہ صرف مہدی کی انگلیاں ضائع ہوئیں بلکہ آکسیجن کے ضیاع سے مہم کی کامیابی بھی خطرے میں پڑ گئی۔ 1964ء میں ایک اطالوی اخبار نے کیمپ نمبر 9 کے معاملے کو ایک نیا رخ دیتے ہوئے لکھا کہ بیس کیمپ کے بعد سے والٹر بوناٹی کے ارادے ظاہر کر رہے تھے کہ وہ اپنے عمر رسید ساتھیوں سے پہلے کے ٹو

سر کرنا چاہتا تھا، تاہم اسے چلی کمپیگ نونی نے جان بوجھ کر بونانی کو پیچھے رکھا کیونکہ اسے خوف تھا کہ چوٹی کے قریب پہنچ کر وہ خود کے بجائے چوٹی تک رسائی کا پہلا موقع پاکستانی کوہ پیما عامر مہدی کو دے گا۔

اسی سال ایک اطالوی صحافی نینو گگلیو (Nino Giglio) نے کمپیگ نونی اور کے ٹو مہم کے پاکستانی انچارج کرنل محمد عطاء اللہ کے حوالے سے لکھا کہ والٹر بونانی اپنے ساتھیوں کو بائی پاس کر کے چوٹی تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ ٹیم میں سے زیادہ صحت مند تھا۔ وہ چاہتا تو کچھ دیر سے ہی سہی لیکن پچاس میٹر کی بلندی پر واقع کیمپ تک رسائی حاصل کرسکتا تھا۔ تاہم اس نے عامر مہدی کی حالت کو بنیاد بناتے ہوئے جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کیے۔ یہاں تک کہ اندھیرا پھیل گیا اور اسے عامر مہدی کے ساتھ وہیں قیام کرنا پڑا۔ بونانی نے اس رات سینئر ٹیم کے لیے موجود آکسیجن کو جان بوجھ کر ضائع کیا تاکہ آکسیجن کی کمی کے بعد چاروں کوہ پیماؤں میں سب سے صحت مند اور نوجوان ہونے کے ناطے اسے چوٹی تک رسائی پر پہلا موقع ملے۔

جولائی 2004ء میں پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں کے ٹو سر کرنے کی پچاس سالہ تقریب منعقد کی گئی۔ اس تقریب میں اٹلی سے صرف لینو ایسی ڈیلی نے شرکت کی۔ ایسی ڈیلی وہ شخص تھا جس نے اب تک کے ٹو پر پیش آئے واقعات سے متعلق بہت کم لب کشائی کی تھی۔ اس نے اس سال شائع ہونے والی اپنی کتاب K2, The Price of Conquest میں کے ٹو پر پیش آنے والے واقعات کو تفصیل سے لکھا۔ ایسی ڈیلی کے مطابق بونانی اور مہدی نے سینئر ٹیم کو آکسیجن کے زائد سیلنڈر پہنچانے تھے۔ تاہم جب وہ سیلنڈر لے کر اوپر پہنچے تو کیمپ نمبر 9 والٹر بونانی کی توقع سے دور قدرے بلند جگہ پر قائم تھا۔ یہ مقام تھکن سے چور جونیئر ٹیم کی رسائی سے باہر تھا، یہی وجہ تھی کہ انہیں 8100 میٹر کی بلندی پر کھلی فضاء میں رات گزارنا پڑی۔ ایسی ڈیلی کے مطابق بونانی اور مہدی نے جان بوجھ کر آکسیجن ضائع نہیں کی تھی۔ انہوں نے سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے اپنی ضرورت کے مطابق کچھ آکسیجن استعمال کی تھی۔ اگلی صبح بونانی نے آکسیجن سیلنڈر ان کے حوالے کیے تو اس میں ان کی توقع سے کچھ کم آکسیجن تھی تاہم وہ اتنی ضرور تھی کہ انہیں چوٹی تک بخیر و عافیت پہنچا سکتی۔ ایسی ڈیلی کے مطابق کیمپ نمبر 9 کی جگہ تبدیلی ناگزیر نہیں تھی تاہم اسے چلی کمپیگ نونی نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔

اطالوی مہم جوؤں کی کامیابی کے 23 سال بعد اگست 1977ء میں کے ٹو کی چوٹی کو دوسری بار سر کیا گیا۔ یہ کارنامہ جاپانی کوہ پیما اچیرو یوشیزاوا (Ichiro Yoshizawa) اور پاکستانی کوہ پیما اشرف امان نے سرانجام دیا۔ اس سے اگلے سال ایک امریکی ٹیم کے ٹو پر پہنچی۔ کوہ پیماؤں کے نزدیک کے ٹو، ماؤنٹ ایورسٹ سے نچلا ضرور ہے لیکن اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ پُرخطر اور عمودی ہے۔ یہ دنیا کے 14 مشکل ترین پہاڑوں میں سے ایک ہے۔ کے ٹو کو سر کرنا مشکل ہی نہیں خرچیلا بھی ہے کیونکہ اس کی مہم پر جانے والے ایک ایک کوہ پیما پر کل 50 ہزار امریکی ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔ ماؤنٹ ایورسٹ کو موسم سرما میں بھی سر کیا جاچکا ہے لیکن سردیوں میں کے ٹو پر جانے کی ہمت ابھی تک کسی نے نہیں دکھائی۔ جبکہ دونوں بلند چوٹیوں پر کامیاب مہمات کی بات کریں تو جولائی 2010ء تک ماؤنٹ ایورسٹ پر جانے والے 2700 کوہ پیماؤں کے مقابلے میں کے ٹو کا چیلنج قبول کرنے والے افراد کی تعداد صرف 302 ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کے ٹو کی چوٹی تک رسائی حاصل کرنے والی پہلی کامیاب مہم کو دنیا کی عظیم ترین مہمات میں سے ایک مانا جاتا ہے۔ کے ٹو فتح کرنے والے اے چلی کومپیگ نونی کا 94 سال کی عمر میں 13 مئی 2009ء کو جبکہ اس کے ساتھی لیسی ڈیلی کا 20 نومبر 2009ء کو اٹلی میں انتقال ہوگیا۔

کے ٹو کی چوٹی تک رسائی کے راستے

1۔ West Ridge اس راستے کو 1981ء میں جاپانی کوہ پیماؤں نے استعمال کیا۔

2۔ West Face direct اس راستے کو روسی ٹیم نے 2007ء میں استعمال کیا۔

3۔ South-West Pillar پولینڈ اور سلوا کیا کی مشترکہ ٹیم نے اس راستے کو 1986ء میں استعمال کیا۔

4۔ South Face پولینڈ کی کوہ پیما ٹیم نے اس راستے سے 1986ء میں کے ٹو کو سر کیا۔

5۔ South-South-East Spur اسکاٹس ٹیم نے یہ راستہ 1983ء میں استعمال کیا۔

6۔ South-East Ridg / Abruzzi Spur اطالوی ٹیم نے 31 جولائی 1954ء کو اس راستے سے کے ٹو کو پہلی بار سر کیا۔

نانگا پربت کا عقاب

ندیم اقبال

ارضِ پاک کو خدا نے بے شمار نعمتیں عطا کر رکھی ہیں۔ قدرتی حسن سے اس طرح مالا مال کر رکھا ہے کہ اس کی نظیر کسی اور ملک میں نہیں ملتی، جو لوگ سوئٹزر لینڈ کے قدرتی حسن پر رطب اللسان رہتے ہیں انہیں سوات و مری و نتھیا گلی دیکھنا چاہیے، جو سہارا ڈیزرٹ کی خاموشی کی تعریف کیا کرتے ہیں انہیں چولستان دیکھنا چاہیے جو نیپال کے ہمالیائی حسن کے گن گاتے ہیں انہیں بلتستان کی سیر ضرور کرنا چاہیے۔ اسی خیال کے تحت ''سیرِ پاکستان'' کے سلسلے کو شروع کیا گیا تھا لیکن اس سلسلے میں اَب تک جتنی بھی تحریر شامل ہوئیں یہ تحریر ان سے ذرا مختلف ہے کیونکہ ندیم اقبال عالمی پیمانے کے عکاس ہیں۔ قدرتی حسن کی فوٹو گرافی میں ان کی شہرت بہت زیادہ ہے لیکن اب جب انہوں نے اپنی سیر کی روداد قلمبند کی تو ایک اور خوبی سامنے آئی کہ وہ منجھے ہوئے قلمکار بھی ہیں۔ نہایت پُرلطف انداز میں لفظوں سے عکاسی کرتے ہیں۔

عالمی شہرت یافتہ فوٹو گرافر کے قلم کا شاہکار ایک پُراثر رودادِ سفر

کوئی پریوں کی زمین تھی کہ پھولوں کی یا رنگین پرندوں کی جنت۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا، بس ایک خواب تھا جو میری آنکھوں میں آبسا تھا۔ میں اس خواب کو تعبیر دینا چاہتا تھا۔ اس جنت نما سرزمین کی دیدنی سے سیراب ہونا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ خطۂ ارض یورپ امریکا کا حصہ نہیں تھا۔ میرے پیارے وطن میں واقع ہے۔ اب جبکہ میں تقریباً آدھے سے زیادہ دنیا دیکھ لی ہے تو بھی اس خطۂ ارض کے سحر سے نکل نہیں پایا ہوں۔ یہ تو تب کی بات ہے جب میری آوارہ

گردی آس پاس کے شہروں تک محدود تھی اور میں نزدیک کے شہروں سے پرے، ذرا دور کے علاقوں کو بھی شرف باریابی بخشنے پر غور کررہا تھا۔ ایسے وقت میں مجھے کسی نے فیری میڈو کی حسین وادیوں کی تصاویر دکھائیں اور میں فیری میڈو کے سحر میں مبتلا ہوگیا۔

برف سے ڈھکے پہاڑوں کی بلند چوٹیاں اور اس کے نیچے پھیلے سرسبز اور شاداب جنگلات، ان میں کل کل کرتے شوریدگی سے بہتے ندی نالے اور جنگلوں میں اڑتے رنگین پرندے۔ ان مناظر نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور میں خواب دیکھنے لگا تھا کہ میں نانگا پربت کے دامن سے نکلتے رائے کوٹ گلیشیر کے ساتھ بسی، اس پریوں کی چراہ گاہ میں اپنا خیمہ لگاؤں جہاں مقامی چرواہوں کے بقول جب چاند اپنے جوبن پر آتا ہے تو نانگا پربت کی بلندیوں سے پریوں کے جھرمٹ ستاروں کے ہمراہ اترتے ہیں اور فیری میڈو کے سبزہ زاروں میں آسمان ان کا رقص دیکھتا ہے۔

میں ان ہواؤں کا منتظر تھا جو نانگا پربت کی برفانی چوٹیوں سے اتر کر فیری میڈو میں پھیلتی جاتی ہیں اور آپ کے بدن میں جذب ہوکر روح تک کو تروتازہ کرتی ہیں۔ آپ گہری تنہائی کے گھیرے میں ہوتے ہیں اور آپ کے علاوہ فقط ہواؤں کا شور، رائے کوٹ گلیشیر کی ٹوٹتی برفوں کی گڑگڑاہٹ، جھومتے پتوں کی سرسراہٹ اور ندی نالوں میں بہتے سرد پانیوں کی کل کلاہٹ روح میں اتر جانے والی موسیقی سی لگتی ہے جو آپ کو سرشار کردیتی ہے۔

فیری میڈو کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اس بارے میں اپنے محترم دوست مستنصر حسین تارڑ کا لاجواب سفرنامہ "نانگا پربت" پڑھا تھا اور کچھ سیاحتی کتابچے پڑھے تھے۔ تصویریں دیکھی تھیں یا فیری میڈو کا تذکرہ کہیں سنا نہیں تھا۔ میں نیا نیا یونیورسٹی میں لیکچرر ہوا تھا اور گلگت ہنزہ کے رہنے والے، میرے کچھ اسٹوڈنٹس تھے ان سے معلومات لینی چاہی تو سخت مایوسی ہوئی کیونکہ وہ بھی فیری میڈو کبھی نہیں گئے تھے بلکہ انہوں نے صرف نام کی حد تک اس کے بارے میں سنا تھا، میرا شبہ تھا کہ وہ بھی فیری میڈو کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور صرف یہی کہتے تھے کہ "دیامیر" میں یہ علاقہ ہے۔

ان دنوں میرے خواب اور حقیقتیں گڈمڈ ہوگئی تھیں۔ میں اکثر اپنے آپ کو فیری میڈو کے جنگلوں میں گھومتا ہوا پاتا۔ کھلی آنکھوں سے دیکھتا کہ نانگا پربت کی چوٹیوں پر نظریں جمائے بیٹھا ہوں اور کبھی خود کو سبزہ زار کے پھولوں کے درمیان بیٹھا ہوا پاتا۔ میں ان دنوں ایک خوش کن کیفیت میں گھرا تھا۔ ایک شادمانی تھی کہ نانگا پربت کے سامنے پھیلی فیری میڈو کے میدان میں میرا خیمہ لگے گا اور الصباح میں اپنے خیمے کا پردہ اٹھاؤں گا تو سامنے نانگا پربت کی برفانی فصیلیں خاموشی سے میری منتظر ہوں گی۔

پندرہ سو میل طویل کوہ ہمالیہ کے مغربی سرے پر جے نانگا پربت، کلر ماؤنٹین، قاتل پہاڑ، اسی کی جانب میری سوچ کا ہر دائرہ آٹھہرتا تھا۔ ایک خواب مستقل ارادے میں تبدیل ہوتا جارہا تھا۔

میرے دوست میری ہر روز ایک طرح کی گفتگو سے بیزار تو کبھی نہیں ہوئے، پر ساتھ جانے کے لیے تیار کوئی بھی نہیں لگتا تھا۔ جب چاندنی کی چادر میرے شہر، ڈیرہ اسماعیل خان کے ساتھ بہتے سندھ کے کناروں پر بچھی ہوئی ہوتی اور ہم دوست چاندنی سے چمکتی ریت پر لیٹے چاند کو دیکھتے تو میں کبھی دیوسائی کا تذکرہ کرتا، کبھی صد پارہ جھیل کا، کبھی ہنزہ کا اور کبھی شمشال کا تو وہ بڑی رغبت سے سنتے اور مجھے ان خطرناک راستوں کی نشاندہی بھی کرتے جو ان مقامات کو جاتے ہیں، ایک طرح کا میرے لیے اشارہ ہوتا کہ ہمیں تو معاف ہی رکھنا۔

میں خود بھی ان میں سے کسی کو اس معیار پر نہیں پاتا تھا کہ وہ اس دربدری میں میرا ساتھ دے سکتے ہیں۔ آپ کوئی فلم دیکھنے جائیں تو ساتھی کو فلم کا شوق ہونا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ آپ کا مزاج جنگلوں میں بھٹکنے کا میلان رکھتا ہو اور آپ کے دوست خوشی خوشی آپ کے ساتھ چل پڑیں۔ دو دوستوں کی کوئی ایک عادت مشترک ہوسکتی ہے مگر بہت مشکل ہے کہ ایک سی عادات دوسرے دوست میں بھی ہوں۔ میرے دوست میرے ہیجان سے واقف تھے مگر میں جانتا تھا کہ وہ اس کنویں میں میرے ساتھ چھلانگ نہیں لگائیں گے۔ میں انہیں دریا میں اترنے کا کہہ بھی نہیں سکتا تھا جبکہ میں اچھی طرح واقف تھا کہ وہ تیراکی سے نابلد ہیں۔

اب مجھے کسی ایسے ساتھی کی ضرورت تھی جو ان علاقوں سے مکمل طور پر نا آشنا ہو اور پہاڑوں میں پھرنے کا شوق بھی رکھتا ہو۔ اچانک میرا خیال اسماعیل شاہ کی جانب گیا۔ وہ سفر اور پہاڑوں کا شوقین تو تھا مگر اس حد تک کہ مری میں چند دن کا ڈیرہ ڈال لیا اور مال روڈ کی گشت کرتے ہوئے شام گزاری اور دن سوتے ہوئے یا کھاتے ہوئے

گزارا۔

چند ماہ پہلے وہ مجھے ایک شام، مری میں مال روڈ پر کشمیری چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے بیٹھا ملا تھا۔ میرے لیے اس کا اتنا شوق ہی اسے ہمالیہ پر چڑھانے کے لیے کافی تھا۔ مجھے کسی ایسے ساتھی کی ضرورت تھی جو سفر کی مشکلات پر میرا گریبان نہ پکڑے اور دوستی میں قابلِ بھروسا بھی ہو۔ شاہ جی میں یہ ساری خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں اور اس کے علاوہ وہ ہمالیہ اور قراقرم کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ گلگت بلتستان کا ذکر صرف انہوں نے سنا تھا مگر پڑھا نہیں تھا کیونکہ وہ چٹے اَن پڑھ بھی تھے۔ میری ان کے ساتھ دوستی بھی تھی اور اچھے دوستوں والا یارانہ بھی تھا۔ شاہ جی کی ان خوبیوں کا میں نے بھرپور فائدہ اٹھانے کا ارادہ کر لیا اور ان کی انہی صلاحیتوں کی بنیاد پر میں نے ایک جال بننا شروع کر دیا۔ میں شاہ جی پر نانگا پربت کی خوبصورتی کے جادو کا جال کبھی نہ پھینکتا اگر مجھے اپنے چھوٹے سے شہر میں پہاڑوں کا اور ٹریکنگ کا کوئی ایک بھی شوقین مل جاتا۔ اب میرے پاس شاہ جی کو اس سولی پر چڑھانے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ جب کہ میں خود بھی ہمالیہ کے اس خونی خطے کی ہیبت ناکی سے لاعلم تھا۔

شہر میں شاہ جی کا ٹیلرنگ کا اچھا کاروبار تھا۔ ہر کام وہ سلوموشن میں کرنے کے عادی ہیں۔ انہیں کبھی کسی چیز کی جلدی نہیں ہوتی ہے۔ اکثر شام سے پہلے وہ دکان کے تختے پر کرسی پر بیٹھے ملتے۔ کاریگر دکان میں کام کرتے رہتے اور میں اس ٹائم پر تقریباً ہر دوسرے دن، ایک دوسری کرسی پر ان کے سامنے بیٹھا گلگت اور ہنزہ کے قصے سناتا۔ ساتھ میں چائے اور سگریٹ بھی چلتی رہتی۔ شاہ جی اپنی ذہنی آسودگی کے لیے میری طرح تنہائی کے متلاشی تھے۔ وہ سات چھوٹی بچیوں کے باپ تھے۔ مجھے اکثر چھٹی والے دن، سندھ کے ریتیلے ٹاپوؤں پر ملتے۔ کبھی مچھلی کا شکار کر رہے ہوتے یا دریا کنارے شام کے بعد اکیلے، چہل قدمی کر رہے ہوتے۔

میرے کچھ دوست جانتے تھے کہ میں شاہ جی کے خلاف کیا سازش بن رہا ہوں اور وہ اکثر ہماری آپس کی گفتگو کے بیچ مسکراتے رہتے لیکن مجھے کبھی کبھی یہ یقین بھی ہو جاتا کہ شاہ جی بھی میری طرح نانگا پربت کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے اور آج اتنے سال بعد میرا یہ یقین سچ ثابت

ہوا۔ پچھلے سال میں پاکستان گیا اور شاہ جی کی بیٹھک میں ڈیرہ کے مشہور سوہن حلوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا تو شاہ جی فیری میڈو اور نانگا پربت میں کھوئے ہوئے تھے اور اس سے باہر بھی نہیں آ پا رہے تھے۔ کہہ رہے تھے "جب سے میں گلگت سے واپس آیا ہوں، اس کے بعد مری بھی نہیں گیا۔"

حالانکہ ہمیں وہاں گئے پندرہ سال ہو چکے تھے۔

ہمارے شہر ڈیرہ اسماعیل خان میں سندھ دریا شہر کے مشرقی حصے سے لگ کر بہتا ہے۔ ہر جمعہ کو نماز کے بعد درجنوں منچلوں کے گروپ دریا کنارے دھاونی منانے گرمیوں میں جاتے ہیں۔ دھاونی کا لفظ صرف ڈیرہ کی لغت میں ہے۔ دریا کنارے دری بچھا کر دوستوں کی ٹولیاں، نیکریں پہنے وہیں کھانا بھی بناتی ہے اور جب بھی جی میں آتا ہے ان میں ایک دو، دریا میں چھلانگ لگا کر تیرتے دور تک نکل جاتے ہیں۔ پھر شور مچاتے، ہلا گلا کرتے واپس آتے ہیں اور بھیگے مضبوط جسموں کے ساتھ، چولہے کے گرد بیٹھ کر، اپنے حصے کا چمچہ دیگچے میں چلانے لگتے ہیں۔ ساتھ ہی کوئی نشاستے کا حلوا تیار کر رہا ہے۔ کوئی کڑاہی گوشت بنا رہا ہے۔ ایسے درجنوں گروپس ایک لائن میں دریا کنارے دریوں پر بیٹھے مستیاں کرتے ہیں۔

قہقہے لگتے ہیں اور کہیں ننگی گالیاں بھی چلتیں ہیں، کوئی تاش کھیل رہا ہوتا ہے اور کوئی تیراکی سے نا آشنا، دریا میں تیرتے اور قہقہے لگاتے تیراکوں کو حسرت سے تکتا رہتا ہے اور حسبِ ضرورت نازیبا گالیاں بھی نچھاور کرتا رہتا ہے۔

چار پانچ گھنٹے تک شغل اور تفریح چلتی ہے۔ شام سے پہلے ایک دوست شہر روٹیاں لینے جاتا ہے اور پھر شام کے وقت تیراکی سے تھکے، بھوک سے نڈھال، کئی ایک بھنگ کے نشے میں مدہوش، کھانے پر بھوکوں کی مانند، ٹوٹ پڑتے ہیں۔ کھانے کے بعد گرم حلوے کا دور چلتا۔ پھر سائیکل رکشا جو سامان چھوڑ کر جاتا ہے، وہی واپس آ کر سامان رکشے پر لوڈ کرتا ہے۔

اس وقت تک دریا کنارے اونچے درختوں تلے تاریکی پھیلنے لگتی ہے اور تمام دوست اپنی اپنی سائیکلیں سنبھالے اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے ہیں۔ یہ سارا میلا "دھاونی" کہلاتا ہے۔

ہمارے دھاونی کے گروپ میں شاہ جی بھی شامل تھے۔ وہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر اپنی ویسپا پر آتے اور دری کے ایک کونے پر بیٹھ کر دریا میں تیرتے، شور مچاتے لوگوں کو، چہرے پر ایک مسکراہٹ سجائے، مہذب انداز میں دیکھتے رہتے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ جب دو انسان ایک ساتھ ہوں تو ان میں ایک نہ ایک عادت، کوئی خصلت، اچھی یا بری مشترک ضرور ہوتی ہے۔ مجھ میں اور شاہ جی میں قدرت کے حسین، خاموش نظارے دیکھنے اور دریا کی لہروں کی موسیقی یا پرندوں کی آوازیں سننے کا مشترکہ شوق تھا۔ وہ میرے دوستوں کے شور شرابے والی محفلوں میں اپنی خاموش شمولیت پر بھی بہت خوش نظر آتے تھے۔

وہ عمر میں مجھ سے کئی سال بڑے بھی تھے اور ایک بڑے خاندان کا بوجھ ان کے اکیلے کندھوں پر تھا۔ جب کہ میں ایک چھوٹی سی پیاری بیٹی کا باپ تھا۔ میں، میری بیوی اور میری بیٹی۔ یہ میرے گھر کا اثاثہ تھے۔ اب میرا ہدف شاہ جی تھے۔ میری روزانہ کی تقریروں، فلسفیانہ باتوں، نانگا پربت اور ہنزہ، گلگت کے الف لیلوائی قصوں نے شاہ جی کو متوجہ کر لیا تھا۔

ایک دن میری روزانہ کی تقریر سن کر کہنے لگے۔ "پنڈی سے چار پانچ گھنٹے تو لگیں گے؟"

"جہاز پر؟" میں نے جواب دیا۔

چونک کر کہنے لگے۔ "کیا سعودی عرب جتنا فاصلہ ہے؟"

"جہاز پر تو پنڈی سے آدھ گھنٹا لگتا ہے اگر موسم صاف ہو۔" میں نے ان کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھائی۔ "لیکن اکثر موسم خراب ہوتا ہے تو جہاز نہیں جاتا۔"

"پھر!" انہوں نے اپنے ہونٹوں تک جاتی پیالی واپس زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

"پھر ائر کنڈیشن بس جاتی ہے۔"

انہوں نے اطمینان سے چائے کی پیالی اٹھالی۔ "یار! چار پانچ گھنٹے تو لگ جاتے ہوں گے۔"

"وہ......شاہ جی......بیس سے بائیس گھنٹے لگتے ہیں۔" میرا جواب سن کر چائے ان کے کپڑوں پر گرتے گرتے بچی۔

وہ اب شک، فکر اور بے یقینی سے مجھے دیکھ رہے تھے، کہ یہ کیسا سفر ہے جو جہاز پر تو آدھے گھنٹے کا مگر سڑک پر بائیس گھنٹے کا۔ مجھے ایسا لگا کہ اب مجھ پر وہ باقاعدہ شک کرنے لگے ہیں۔ میں بھی ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔ میں

نے فوراً اپنی سگریٹ ایک طرف پھینکی اور پھر ان کو شاہراہ ریشم کی افسانوی داستانیں سنانا شروع کردیں کہ کس طرح دنیا بھر سے سیاح اس سڑک کو دیکھنے آتے ہیں۔

شاہ جی بہت مروت والے انسان ہیں کہ وہ چاہتے ہوئے بھی مجھے انکار نہیں کررہے تھے۔

”ہمیں گھنٹے اس لیے لگتے ہیں کہ یہ سڑک اونچے پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہے اور اس پر بس کی اسپیڈ بہت کم ہوتی ہے۔ یہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے۔ اگر آپ نے اس سڑک کو دیکھ لیا تو پورے شہر میں اس لیے مشہور ہو جائیں گے کہ آپ نے اس عظیم سڑک کا خاص سفر کیا ہے۔“ میں کچھ ایسی ہی گفتگو ان سے ہر بار کرتا تھا۔

”صرف میں مشہور کیوں ہوں گا؟ تم بھی تو ہوگے۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے شک بھرے لہجے میں بولے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ مرنے کے بعد ہی انسان مشہور ہوتا ہے۔

”یعنی! آپ اور میں، ہم دونوں ہوں گے۔“ میں نے اپنی بات ختم نہیں کی کیونکہ میں گیم کو ہاتھ سے پھسلتے دیکھ رہا تھا۔ ”ہم جائیں گے تو ہوائی جہاز سے اگر خدانخواستہ موسم خراب ہوا تو پھر کہیں سوچیں گے بس کا۔“

”یار! چھوڑو اس لمبے پہاڑ کو، یہیں کاغان، ناران چلتے ہیں۔ دریا پر مچھلی کا شکار کریں گے۔ وہ جو مشہور جھیل ہے وہاں خیمہ لگائیں گے۔ اتنی خواری کی کیا ضرورت ہے۔“ شاہ جی اپنے تئیں مجھے مشورہ دے رہے تھے لیکن وہ کچھ کچھ راضی بھی ہوتے نظر آرہے تھے۔ مروت میں انکار بھی نہیں کرسکتے تھے مگر میں محسوس کررہا تھا کہ ایک شک بھی ان کے دل میں بیٹھا ہوا ہے۔

آج میں وہاں سے اٹھا تو ذہن پر اندیشے چھائے ہوئے تھے کہ شاہ جی کہیں سفر کی صعوبتوں سے ڈگمگا نہ جائیں لیکن میں نے ان پر اپنی محنت جاری رکھی اور میری ایک ماہ سے زائد کی یہ جدوجہد رائیگاں نہیں گئی اور وہ بھولے بادشاہ نہ چاہتے ہوئے بھی تیار ہوگئے مگر ایک شرط یہ رکھی کہ نانگا پربت کے اوپر ضرور چڑھیں گے اور میں نے بھی معاملہ بگڑنے سے بچانے کے لیے ہامی بھرلی۔ ان کی تمنا کسی پہاڑ پر چڑھنے کی مدتوں سے تھی اور اب آخرکار ان کی انتخاب نگاہ نانگا پربت پر جا ٹھہری تھی۔

میں شاہ جی کو ورغلاتے ہوئے شرمندہ سا رہتا تھا کہ ایک معصوم آدمی کو دھوکا تو نہیں دے رہا؟ ان کے ذہن میں

میری پیدائش چکوال کے قریب ایک گاؤں بھوچھال کلاں میں 1946ء کو ہوئی۔ میرے والد ڈاکٹر عبدالعزیز نے ایم بی بی ایس گرینڈ میڈیکل کالج بمبئی (بھارت) سے کیا تھا کیونکہ میرے دادا بابو حیات محمد ان دنوں برٹش آرمی میں پونا چھاؤنی میں تعینات تھے۔ میرے والد میری پیدائش کے وقت بوچھال کلاں میں بطور میڈیکل آفیسر ڈسٹرکٹ بورڈ اسپتال میں تعینات تھے۔ میری پیدائش کے فوراً بعد والد صاحب کی بلکسر ڈسٹرکٹ بورڈ اسپتال میں ٹرانسفر ہوگئی میں نے ابتدائی تعلیم بلکسر ضلع چکوال سے شروع کی اور پھر پانچویں کلاس میں چکوال کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل ہوا۔ یہیں سے میں نے 1961ء میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ 1961ء میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد میں کراچی اپنے ماموں کے ساتھ ننھیال چلا گیا۔ میرے ایک ماموں لانڈھی ریڈیو کالونی میں رہا کرتے تھے۔ میں نے کراچی گھوم پھر کر دیکھا صدر کے علاقے، ایمپریس مارکیٹ سے ٹرام پر بھی سفر کیا۔ میرا ایک بھائی نیوی میں سیکنڈ لیفٹیننٹ بھرتی ہوا تھا اس کے پاس دلاور کیمپ میں بھی رہا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے دلاور کیمپ سے مولوی تمیز الدین روڈ سے ریلوے شیڈ سے ہوتا ہوا بینک اسکوائر آتا تھا۔ حبیب بینک گول بلڈنگ، گرینڈلے بینک، نیشنل بینک کے علاقے میں خوب گھوما پھرا۔ میری ویو شادور، بندر روڈ، برنس روڈ، کھارادر، کلفٹن، مسلم لیگ اسکوائر، فیڈرل بی ایریا، لانڈھی، آرٹس کلب جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا نہ ڈر نہ کوئی خوف۔ لوگوں میں پیار اور محبت تھی۔ صدر کراچی سے دو گھوڑے بگھی میں بیٹھ کر کلفٹن بھی جانے کا اتفاق ہوا اور پھر صدر کے علاقے بوہری بازار، زیب النساء اسٹریٹ، ایبے سینیا لائن اور ہائی کورٹ بلڈنگ کے صحن میں ایک شام کو دعوت بھی کھائی۔ غازی عبداللہ شاہ کے مزار پر کئی بار حاضری دی۔ اس زمانے میں مزار شریف سمندر کے کنارے پانی میں تھا۔ اب آخری بار 2001ء میں کراچی جانے کا اتفاق ہوا تو مزار شریف کو بازار میں پایا یعنی ان 50،40 برسوں میں سمندر پیچھے ہٹ گیا ہے۔ یہ آہ! کراچی روشنیوں کا شہر جسے نظر لگ گئی ہے۔

مرسلہ: ایم عارف مغل، اوسلو ناروے

صرف بائیس گھنٹے کا پُرآشوب سفر چھایا ہوا تھا مگر وہ لاعلم تھے کہ عشق کے امتحان تو گلگت پہنچنے کے بعد شروع ہوں گے۔
یہ وہ پہاڑ نہیں جو مری یا نتھیا گلی میں دیکھتے ہیں۔ یہ وہ راستے نہیں جو مری کے مال روڈ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتے ہیں۔ یہ سرسبز پہاڑ نہیں بلکہ دیوہیکل، آسمانوں سے باتیں کرتی چٹانیں ہیں جن کو دیکھنے کے لیے بھی بڑا دل گردہ چاہیے۔ یہاں وہ راستے چلتے ہیں جہاں ایک قدم ایک ہلکی سی لغزش موت کے منہ میں دھکیل سکتی ہے۔

میں نے اب ماحول ایسا بنالیا تھا کہ اگر شاہ جی اپنے جانے کا ارادہ تبدیل کرنا بھی چاہتے تو کر نہ سکتے۔ اس کے بعد میں نے ضروری سامان کی فہرست بنانا شروع کردی۔

شاہ جی کے اعزاز میں میرے قریبی دوستوں نے ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ وہ اپنے لٹکتے منہ کے ساتھ مہمان خصوصی تھے اور سخت پریشان بھی تھے کہ یہ دعوت ان کی نانگا پربت کی مہم کا حصہ بنتے پر ہے یا اس جال میں پھنسنے پر ہے جو میں ان پر ڈال چکا تھا مگر دعوت میں دوستوں نے انہیں خوش نصیب انسان قرار دیا کہ ان کو اندازہ ہی نہیں کہ وہ کس جنت بے نظیر مقامات کا نظارہ کرنے جارہے ہیں۔ وہ اس سفر کا مسافر بننے جارہے ہیں جس کے سب متمنی ہوتے ہیں مگر یہ زیارت ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ (اس دعوت کا محرک بھی میں تھا اور کون کیا بولے گا اس اسکرپٹ کا رائٹر بھی میں تھا)

شاہ جی نے دبے دبے الفاظ میں ایک دو سے پوچھا بھی کہ اگر یہ اتنی بڑی سعادت ہے تو آپ اس ثواب کا اجر کیوں نہیں حاصل کرلیتے۔ سب نے اپنی اپنی مجبوریاں حسرت بھری نگاہوں سے شاہ جی کے سامنے بیان کیں۔ اب شاہ جی نے اپنے آپ کو مکمل طور پر میرے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا کیوں کہ ایک بند گلی میں داخل ہوچکے تھے اور وہ نانگا پربت کے جال میں جکڑے جاچکے تھے۔ میری دانست میں تو وہ یہی سمجھتے تھے۔

ادھر میرے خواب اور زیادہ توانا ہوچکے تھے۔ گرمیوں کی خنک راتوں کو، اپنے گھر کے صحن میں چارپائی پر لیٹ کر، میں آسمانوں کی وسعتوں میں پھیلے، ٹمٹماتے ستارے دیکھ کر فیری میڈو کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں بناتا رہا تھا۔ ایک سرسبز، خاموش، ویران میدان۔ جس کے ساتھ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے۔ اردگرد گھنا سیاہ جنگل جس سے پتوں کی سرسراہٹیں آتی ہیں۔ کبھی پنچھی اپنی خوبصورت بولیاں بولتے ہیں۔ میں اس پہاڑی پر اکیلا بیٹھا اس برفانی شہر نانگا پربت کو تکتا ہوں جو مجھ سے صرف اتنا دور ہے کہ میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھوسکتا ہوں۔ رائے کوٹ گلیشیر سے برفوں کے ٹوٹنے کی آوازیں اس ویران اور خاموش ماحول میں ایک دہشت بھرتی ہیں۔ آسمان پر بادل گرج رہے ہیں اور نانگا پربت کی چوٹیوں سے برفانی طوفان اٹھ کر میرے اردگرد پھیل جاتے ہیں اور میں ان میں اکیلا بیٹھا گرم کافی پیتا ہوں اور میرے جسم کے ایک ایک حصے میں قرار سا آجاتا ہے۔

☆......☆

اب شاہ جی کی جانب سے مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ مگر آگے کے سارے انتظامات مجھے کرنے تھے۔ پنڈی سے آگے گلگت تک جانا، پھر وہاں سے رائے کوٹ کے پل، وہاں سے تاتو گاؤں تک کا ہولناک سفر اور پھر فیری میڈو تک چار گھنٹے کی ٹریکنگ! سفر میں کن لوازمات کی ضرورت ہوگی؟ اور پھر ان کی خریداری کہاں سے ہوگی؟ اور اس سفر میں کوئی مقامی گائیڈ کا ہونا بھی بہت ضروری تھا، اور وہ گائیڈ کہاں سے ملے گا؟ یہ سب سوالات میرے ذہن میں چپکے تھے اور ان کے جوابات کے سلسلے میں اشفاق اور شاہد بہت اہمیت اختیار کرگئے تھے۔

میں یونیورسٹی میں نیا نیا لیکچرر ہوا تھا اور اشفاق اور شاہد دونوں میرے اسٹوڈنٹ تھے۔ دونوں کا تعلق ناردرن ایریاز سے تھا۔ اشفاق ہنزہ کا باسی تھا اور شاہد، ہراموش کے پہاڑوں میں گھری ایک خوبصورت وادی بگروٹ کا رہنے والا۔ اشفاق خاموش طبع، گہرا اور کم گو انسان تھا مگر شاہد ہر وقت کسی جلدی میں، چہرے پر گھبراہٹ لیے، ہمیشہ اپنے اردگرد زیادہ دیکھتا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ اشفاق کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ مزاج یکسر مختلف ہونے کے باوجود وہ دونوں دوست تھے اور شینا زبان میں بات کرتے نظر آتے تھے۔ ان دونوں نے ''ناردرن ایریا اسٹوڈنٹس سوسائٹی'' کی داغ بیل ڈالی تھی اور ایک نے اپنے آپ کو صدر بنا لیا اور دوسرے نے سیکریٹری کی پوزیشن سنبھال رکھی تھی۔ باقی عہدے خالی تھے کیونکہ کوئی اور ممبر ہی نہیں تھا۔

میرے لیے دونوں اس دور کے خضر تھے۔ وہ بھی کہتے کہ گلگت بلتستان کی ایک ایک وادی سے وہ واقف ہیں! میں نے جب فیری میڈو کا ذکر کیا تو ان دونوں نے

پہلے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر میری طرف۔ وہ فیری میڈو کے بارے میں دراصل لاعلم تھے مگر صرف یہ جانتے تھے کہ دیامیر میں ایک پہاڑ نانگا پربت ہے جو گلگت کے راستے میں پڑتا ہے۔ مگر مجھے یہی بتاتے تھے کہ ان سب علاقوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

''کوئی مسئلہ ہی نہیں۔'' اشفاق بولا۔ ''آپ بس گلگت پہنچیں، باقی وہاں سے سارا انتظام ہو جائے گا۔''

اب یہی پروگرام بنا کہ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گلگت پہلے چلے جائیں گے اور سارے انتظامات دیکھیں گے۔ اور پھر میں اور شاہ جی کسی طرح گلگت پہنچ کر فیری میڈو کے لیے روانہ ہوں گے۔ مہم کے اس مرحلے تک پہنچنے کے لیے ہماری کئی میٹنگز ہوئی تھیں۔ کبھی وہ میرے آفس میں گھنٹوں بیٹھے ہوتے اور کبھی ہم دریا کنارے کسی ہوٹل میں بیٹھے پروگرام کی جزیات طے کر رہے ہوتے۔ کئی بار شاہ جی بھی ان میٹنگز میں شریک رہے اور پھر ان کا بھی اشفاق اور شاہد سے یارانہ ہو گیا۔ میرا ایک اور اسٹوڈنٹ، شیر باز، اپنی ڈگری حاصل کر کے گلگت میں ایک ہوٹل چلا رہا تھا اور ساتھ ہی میڈیسن کا کاروبار بھی کر رہا تھا۔ اس کو میرے آنے کی خبر ملی تو اس نے فون کر کے میری بہت سی پریشانی دور کر دیں کہ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں یہاں ہوں تو آپ کو کسی چیز کی تکلیف نہیں ہوگی۔'' اس کا فون سن کر میرے دل کو بہت ڈھارس ملی۔

میری یہ عادت رہی ہے کہ میں جب بھی کسی سفر پر نکلتا ہوں تو سامان سفر کا خاصہ اہتمام کرتا ہوں۔ ابھی تک اسی عادت کا شکار ہوں۔ سب سے پہلے ان اشیا کی فہرست تیار ہوئی جو ہماری اس کوہ پیمائی کے لیے ضروری تھیں۔ اہم چیزوں میں خیمہ، رک سیک، ٹریکنگ شوز اور برفانی دستانے۔ جب درجہ نقطہ انجماد سے بہت نیچے آ جاتا ہے تو یہ پہن لیے جاتے ہیں۔ یہ سب اشیا ہمارے چھوٹے سے شہر ڈیرہ اسماعیل خان میں دستیاب نہیں تھیں۔ طے یہ ہوا کہ پنڈی سے خریداری کریں گے۔

جب آپ ٹریک پر چلتے ہیں اور سورج آپ کے سر پر ہو تو قراقرم اور ہمالیہ کے بلند، چٹیل پہاڑ آگ برساتے ہیں اور سورج کی دہکتی ہوئی شعاعیں آپ کو خاکستر کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ وہاں پر دوران ٹریک آپ کے لیے نرم کاٹن کا لباس زیادہ موزوں رہتا ہے۔ ہم نے اسی مناسبت سے اپنے لباس تیار کروا لیے۔ شاہ جی نے خود ان کی سلائی کی۔ شوگر لیول دوران سفر نیچے آ جاتا ہے اور اس کے لیے ٹافیاں، انرجائل کے ڈبے خریدے گئے۔ ساتھ میں مچھروں سے بچاؤ کے لیے لوشن، ملیریا سے بچاؤ کی ادویات، درد اور بخار سے نجات کے لیے ادویات کا خاصہ اسٹاک میں نے اپنے ساتھ رکھا۔ ساتھ ہی چند ضروری اینٹی بائیوٹک اور زخموں کو دھونے اور مرہم پٹی کا پورا ایمرجنسی باکس بھر لیا (یہ ادویات ہمارے کام تو نہ آئیں مگر جب ہم فیری میڈو سے واپس تاتو گاؤں پہنچے تو وہاں کے مقامی لوگ ملیریا بخار میں کئی دنوں سے تپ رہے تھے اور کوئی میڈیسن وہاں دستیاب نہیں تھی۔ ہم نے وہاں ایک میڈیکل کیمپ لگایا اور ساری ادویات ان میں بانٹ دیں)

سفر کا میں ہمیشہ سے شوقین رہا ہوں۔ سفر جتنا زیادہ لمبا ہو، میں اس سے اتنا ہی زیادہ لطف اندوز ہوتا ہوں۔ میں جب کراچی میں جاب کرتا تھا تو ڈیرہ اسماعیل خان آنے کے لیے کراچی سے پنڈی، براستہ لاہور جانے والی کسی ٹرین میں کیبن لیتا تھا۔ ٹرین کی کھڑکی سے بدلتے منظر دیکھتا۔ کبھی سندھ کے ریگستان یا سرسبز شاداب کھیت، میلوں تک پھیلی تنہائی، رنگ بدلتے مناظر، پھر پنجاب کا چولستان آتا تو وہاں کی مخصوص مہک مجھے تروتازہ کرتی۔ ملتان سے لاہور کا سفر اور پھر لاہور سے پنڈی تک میلوں پھیلے رنگ برنگی کھیتوں کے درمیان دوڑتی ٹرین سے نظارہ کرتا۔ پھر پنڈی سے بس کے ذریعے پوٹھوہار سے گزر کر میانوالی اور پھر دریا سندھ کے ساتھ ساتھ ڈیرہ اسماعیل خان تک کا سفر طے کرتا۔

میں نے سفر کو ہمیشہ لمبا رکھا۔ اپنے تمام تاثرات، واقعات، لوگوں سے بات چیت میں اپنی ڈائری میں منتقل کرتا رہتا۔ سولہ گھنٹے کا سفر میں تیس گھنٹوں میں پھیلا دیتا۔ جب میں ملتان یونیورسٹی میں ماسٹر کر رہا تھا تو ہماری لائبریری کی انچارج نے میرا ہاتھ دیکھا اور کہا تھا کہ تمہاری زندگی میں سفر بہت ہے۔ میں نے کہا تھا کہ وہ تو میں پہلے ہی کر چکا ہوں مگر وہ گویا ہوئی، نہیں اس سے بھی زیادہ کرو گے! اس سفر کے شوق میں، میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چلا گیا اور ابھی تک یہ ہوس ختم نہیں ہوئی۔

دوسرے سفروں کا حال اگر زندگی اور ہمت رہی تو انشاءاللہ ضرور بتاؤں گا۔ فی الحال ہم گلگت چلتے ہیں جہاں قراقرم اور ہمالیہ ہمارے منتظر تھے۔

ہماری سب تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اشفاق کا گلگت سے فون آیا کہ خیموں کا انتظام ہو گیا ہے اور سب روٹ بھی میں نے بنا لیے ہیں۔ اس فون کے بعد میدانوں میں بیٹھنے کا ہمارا جواز ختم ہو گیا اور ہم اپنے ساز و سامان کے ساتھ پنڈی پہنچ گئے۔

پنڈی میں ساون کی جھڑی لگی تھی اور بادل پوٹھوہار سے لے کر ہمالیہ تک برس رہے تھے۔ میں نے اپنے ایک دوست کی وساطت سے پی آئی اے کی دو نشستیں پنڈی سے گلگت تک کی بک کروالیں تھیں۔

پنڈی سے گلگت تک کی فلائٹ دنیا کی واحد فلائٹ ہے جس میں فوکر پچیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتا ہوا جاتا ہے۔ گلگت میں چند بوندیں بارش کی پڑ جائیں تو وہ اس فوکر کو غرق کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں، اس لیے پروازیں اکثر ملتوی ہوتی رہتی ہیں۔

یہاں تو پچھلے دو دن سے بارش جاری تھی اور خدشات کا سانپ کنڈلی مارے میرے اندر پھنکار رہا تھا کہ فلائٹ تو اگلے کئی دن تک نہیں جا سکے گی مگر میں اپنے خدشات شاہ جی سے چھپا رہا تھا۔ دوسرے دن ہم ایئر لائن کے دفتر اپنی نشستیں کنفرم کرنے گئے تو جواب ملا کہ پچھلے دو دن سے پرواز نہیں گئی اور اگر کل جاتی بھی ہے، جس کا کوئی امکان نہیں تو پہلے ان کو بھیجا جائے گا جو پچھلے دو دن سے پھنسے بیٹھے ہیں۔

مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ ہمارا گلگت کا سفر شاہراہ ریشم پر ہی ہوگا جو ایک سیاہ ربن کی طرح قراقرم سے لپٹی ہوئی ہے۔ میں اپنے لمبے ٹریک سے پہلے بیس بائیس گھنٹے ایک ریگنتی بس میں نہیں گزار سکتا تھا۔ بکنگ پر بیٹھے صاحب نے فرمایا کہ کل پتا کریں کہ فلائٹ جاتی ہے کہ نہیں! ان کی آواز نے پھر سے مجھے حال میں کھینچ لیا۔ میں نے مایوس نظروں سے اسے دیکھا اور باہر کی سمت قدم بڑھا دیے۔

ہم بوجھل دل سے اپنے ہوٹل واپس آ گئے۔ اگلے دو دن کمرے کی کھڑکی سے باہر بارش کو برستا دیکھتے رہے۔ فون کرتے تو ایئر لائن کے دفتر سے وہی کورا جواب ملتا کہ گلگت کی فلائٹ جانے کا کوئی امکان نہیں۔ ہم شام کو صدر میں اپنی شروع ہونے یا نہ ہونے والی مہم کی شاپنگ کرتے۔ ہم نے گرم ٹوپیاں، اونی جرابیں، گرم دستانے اور کئی ایک بلا ضرورت کی چیزیں بھی خرید لیں۔ شاہ جی کا اصرار تھا کہ جب جولائی میں یہاں اتنی ٹھنڈ ہے تو نانگا پربت پر تو برف پڑ رہی ہوگی۔ اس لیے ہم نے ایسا سامان بھی لے لیا جس کی ساتھ لے جانے کی قطعی طور پر ضرورت نہیں تھی۔ ہم پنڈی صدر میں ٹریکنگ کے سامان کی ایک دکان میں کھڑے تھے۔ وہاں ہر قسم کا سامان موجود تھا۔ خیمے، سلیپنگ بیگ، میٹرس، دستانے، اونی جرابین اور مختلف قسم کے رک سیک۔ میں نے تیسرا ٹریکنگ شوز کا جوڑا خرید کر پچھلے دو جوڑے مسترد کر دیے۔ اس کی وجہ ایک تو شوق کی انتہا تھی اور دوسری میری ناتجربہ کاری۔ وہاں مجھے کچھ لڑکے ملے جو کوئی خیمہ خریدنا چاہتے تھے۔ ایک آوارہ گرد دوسرے کو آسانی سے پہچان لیتا ہے۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک پچھلے سال فیری میڈو جا چکا ہے۔ مجھے پہلا انسان ملا جو ننگا پربت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا تھا۔

میں نے کئی سوالات کیے اور اس نے مجھے بڑی تفصیل سے جوابات دیے۔ آخر میں جانے سے پہلے اس نے کہا کہ ٹارچ اور کچھ ایکسٹرا سیل لے جانا، بہت کام آئیں گے۔ دوسرا یہ بتایا کہ رائے کوٹ برج سے تاتو گاؤں تک اب پیدل راستہ نہیں رہا۔ جیپ نہایت نامناسب کرائے پر مل جاتی ہے مگر آپ آٹھ گھنٹے کے اذیت ناک اور خوفناک پیدل سفر سے بچ جاتے ہیں۔

ان کی دونوں باتیں ہمارے کام آئیں۔ ٹارچ نے ہمیں تاتو گاؤں سے فیری میڈو تک پھیلے، ویران، گھنے اور سیاہ جنگل میں نئی زندگی دی جہاں ہم اپنا راستہ بھول گئے تھے۔

☆......☆

اگلے روز ہم نے پی ٹی ڈی سی کے دفتر سے شمالی علاقوں کے مختلف نقشے لیے اور پندرہ روز تک ان نقشوں پر میرے قلم کے نشانات لگتے رہے۔ حویلیاں سے گلگت تک ہر اسٹاپ تک کا فاصلہ، اس کی ترتیب مجھے زبانی یاد ہو چکی تھی۔ ہمارے پنڈی میں یہ دن اس اُمید پر گزر رہے تھے کہ کسی طرح ہمیں گلگت کی فلائٹ ملے جو پلک جھپکتے ہمیں گلگت میں اتار دے مگر ایسا ہوتا مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک شام ہم دونوں کسی چھپر ہوٹل میں بیٹھے ڈنر کر رہے تھے۔ اداسی اور مایوسی ہمارے چہروں پر چھائی تھی۔ ہم خاموش اور خالی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے تو تھے مگر بات زیادہ نہیں کر رہے تھے۔ پچھلے چار دن سے ہم ایک ہوٹل کے کمرے میں بند تھے۔ گلگت میں ہمارا انتظار ہو رہا

تھا۔ ان دنوں موبائل فون صرف امرا کی پہچان تھی۔ انیس سو چھیانوے میں روابط اتنے آسان نہیں تھے جتنے آج کل ہیں۔ ہم کھانے کے بعد خاموشی سے چائے پی رہے تھے کہ ایک ملنگ بابا ہمارے ساتھ پڑی خالی کرسی پر آبیٹھا۔ شاہ جی نے اسے کوئی نیک شگون جانا اور فتافٹ اس کے لیے چائے کا ایک آرڈر بول دیا۔

بابا جی نے میرا بایاں ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں تھاما، پھر بایاں ہاتھ اپنے کرتے کی جیب میں ڈالا اور کوئی چیز نکال کر میری ہتھیلی پر رکھی اور پھر میری مٹھی کو بند کر دیا۔

میں نے کوئی رینگتی ہوئی چیز محسوس کی تو گھبرا گیا۔ شاہ جی یہ سارا تماشا بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی مٹھی کھولی تو ایک چھوٹا سا سانپ میری ہتھیلی پر رینگ رہا تھا۔ دہشت کے مارے میری آنکھیں باہر نکل آئیں اور آواز گلے میں پھنسی کی پھنسی رہ گئی۔ شاہ جی کے ہاتھ سے چائے اس کی گھوڑے مارکہ بوسکی کی قمیص پر چھلک چکی تھی۔

میں خوف سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کیڑے نما سانپ کو ملنگ کی طرف اچھال دیا۔ اس نے بڑے ادب سے اسے دوبارہ اٹھایا اور بڑی عقیدت سے دوبارہ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ میں اور شاہ جی دونوں ایک ساتھ بڑے برہم تھے مگر ملنگ بابا بڑے سکون سے اپنی الجھی داڑھی کو سنوارنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"یہ تمہارے لیے بڑا بابرکت ہے۔" بابا جی آخر بول پڑے۔ "یہ کاٹتا نہیں مگر اس کا لمس تمہاری بگڑی بنا دے گا۔"

"کیا سانپ بھی بابرکت ہوتا ہے؟" شاہ جی بڑے غصے میں تھے۔ "ہم چار دن سے ذلیل ہو رہے ہیں اور تم نے یہ نحوست ہمارے ہاتھ میں تھما دی۔"

بابا جی نے پھر اپنی جیب سے ایک پتھر نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔ "میں اس کی کوئی قیمت نہیں لوں گا، پر میرے جیسے تین اور بابے ہیں۔ ان کے لیے آج رات کی روٹی کا کوئی انتظام ہو جائے تو بابا دعا دے گا۔"

شاہ جی نے وہ پتھر لیا اور بلب کی مدھم روشنی میں اسے ہر زاویے سے پرکھا اور فیصلہ سنا دیا۔ "اصلی ہے اور خالص ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ پتھر ہے! کوئی سلاجیت نہیں جو خالص ہوگی۔"

مگر شاہ جی نے کچھ رقم دے کر بابے سے وہ قیمتی پتھر ایک طرح سے ہتھیا لیا۔ بعد میں ہنزہ کی ایک قیمتی پتھروں کی دکان پر اس نے وہ خالص پتھر دکھایا تو وہ دکاندار بہت خفا ہوا کہ یہ کوئی قیمتی پتھر نہیں بلکہ یہ پتھر ہی نہیں، پلاسٹک کی ٹھیکری ہے اور اس سے قیمتی پتھر تو آپ کو دریا ہنزہ میں بکھرے پڑے مل جائیں گے۔

ہم دونوں کو بڑی خفت اٹھانی پڑی۔ شاہ جی کو اپنے دوستوں نے گلگت سے خالص سلاجیت کے لیے فرمائشیں کر رکھی تھیں اور سلاجیت کی گلگت سے امپورٹ اس کے لیے نانگا پربت سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ ہم جہاں بھی گئے تو شاہ جی ہمیشہ بلند ہوتی چٹانوں کی چوٹیوں پر ان سیاہ پتھروں اور چٹانوں کو تکتے جہاں سے مقامی لوگ سلاجیت اتار کر لاتے تھے۔ پورے ٹرپ میں شاہ جی اور شیر باز کی نوک جھوک رہی تھی۔ کہیں کوئی سیاہ چٹان نظر آئی تو شیر باز شاہ جی کا کندھا پکڑ کر کہتا۔ "وہ رہی ٹنوں کے حساب سے آپ کی دوائی۔"

شاہ جی اپنی پی کیپ سر سے اتارتے، اپنی ہتھیلی کا چھجا بنا کر اپنی آنکھوں پر رکھتے، پرآشوب بلندیوں پر سلاجیت کے ذخیرے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے اور پھر ٹھنڈی آہ بھر کر مایوسی سے سر جھکائے آگے بڑھ جاتے۔

☆......☆

ساون کی بارش کسی بھی بے سرے کو سریلا کر دیتی ہے مگر اس بارش نے ہمیں خون کے آنسو رلا دیے تھے۔ پچھلے چار دن سے ہماری آنکھیں آسمان پر تنے بادلوں پر تھیں، جن کی وجہ سے ہمارا جہاز گلگت کے لیے اپنی پرواز پکڑنے سے قاصر تھا۔ دوسرے دن صبح ناشتے کے بعد میں نے شاہ جی سے کہا۔ "جانا تو ہمیں گلگت ضرور ہے مگر موسم آڑے آ گیا ہے۔"

"پھر کیا کریں؟" شاہ جی نے اپنے دل کی بات آگے بڑھائی۔ "کیوں نہ مری کو چلتے ہیں۔ کچھ دن گھومیں گے...... نانگا پربت میں کیا ایسا رکھا ہے کہ اتنے خوار ہوں۔"

"نانگا پربت تو جانا ہے، شاہ جی۔" میں نے سنجیدگی سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اگر آپ نہیں جانا چاہتے تو ابھی واپس چلے جائیں، میں نانکو کی بس سے آج گلگت جا رہا ہوں۔"

شاہ جی ایک لمحے کو میرے لہجے کی تختی پر سکتے میں آ گئے مگر صورتِ حال کی نزاکت کو جان کر بولے۔ "میں

شروع سے دیکھ رہا ہوں کہ نانگا پربت کے لیے تمہاری دیوانگی کیا ہے۔" ایک لمحہ توقف کیا اور پھر بولے۔ "ندیم بھائی! دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے۔ شاہ نے جو یاری نبھائی ہے وہ شاہ خوب جانتا ہے۔ چلو پیرودھائی اڈے کو چلتے ہیں اور آج ہی گلگت روانہ ہوں گے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھے اور اپنا سامان پیک کرنے لگے۔ ان کے خلوص اور دوستی کے جذبے کو دیکھ کر میں اپنے سخت لہجے پر شرمندہ ہوتا رہا۔

پیرودھائی کے اڈے پر، ناٹکو کے دفتر کے سامنے ٹکٹ لینے والوں کی لمبی لائن تھی۔ بیشتر وہ مسافر تھے جو ہمیں ایئر لائن کے آفس میں مل چکے تھے۔ دوپہر دو بجے بس نے روانہ ہونا تھا۔ ہمیں بڑی تگ و دو کے بعد دو ٹکٹ ملے اور پھر ہم نے اپنا سامان بس کی چھت پر پہنچا دیا جس میں رک سیک نمایاں تھے۔

بادل چھٹ چکے تھے اور سورج اپنی پوری گرم صلاحیتوں کے ساتھ چمک رہا تھا۔ حبس کے مارے ہمارا برا حال تھا۔ پسینا ماتھے سے بہہ کر ہماری آنکھوں کو نمکین کرتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ بس ائرکنڈیشنڈ ہے، ہمیں قرار آتا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں خوش تھا کہ پہلی بار اس تاریخی سلک روڈ کا مسافر بنوں گا۔ بس اگلے دن صبح گلگت پہنچتی۔ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سلک روڈ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرنے والی ہے؟ ہم اپنی دانست میں ٹکٹیں ملنے پر خوش ہو رہے تھے اور شاہ جی، اسی دوران سکنجبین کے کئی گلاس چڑھا چکے تھے۔

بس دو بجے کی بجائے چار بجے روانہ ہوئی۔ گرمی اور حبس سے ہر بندہ پریشان لگ رہا تھا۔ شاہ جی بس والوں کو گالیاں دیتے ہوئے اخبار سے پنکھا جھل رہے تھے کیونکہ ابھی ناٹکو والوں کی جانب سے ایک ایٹم بم ہم پر پھوڑا گیا تھا کہ بس کا ایئر کنڈیشنر خراب ہے اور آپ بس کے شیشے کھول دیں۔ ہمارے چیخنے چلّانے کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ ہمیں اپنی ٹکٹوں کے پیسے واپس کر دینے کی آفر کر دی گئی۔

ہم صبر کا گرم گھونٹ پی کر خاموش ہو رہے۔ بس میں ایک چیخ و پکار تھی۔ تبلیغی جماعت کے مسافر اپنی تسبیوں پر کسی ورد میں مصروف تھے۔ ایک آہ و بکا تھی جو چہار جانب جاری تھی۔ بس اڈے سے باہر نکلی تو سب نے اپنی اپنی دعائیں بار بار دہرائیں۔ یہیں سے ہماری مہم جوئی باقاعدہ طور پر شروع ہوتی ہے۔

ٹیکسلا سے ہوتے ہوئے ہم ہری پور سے گزرے۔ ہری پور میری حسین یادوں کا مرکز ہے۔ میں پندرہ سال پہلے ایف ایس سی کے امتحانوں کی تیاری کے لیے اپنی بڑی بہن کے پاس ہری پور چار ماہ کے لیے گیا تھا۔ میرے بہنوئی ڈاکٹر حنیف کی ہری پور ہاسپٹل میں پوسٹنگ تھی۔ میں نے بہار اور گرمیوں کے چند ماہ اسی شہر میں گزارے تھے اور میں اس شہر کی ایک ایک گلی کوچے کا واقف کار بن چکا تھا۔ میری والدہ اور والد (اللہ انہیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے) دونوں مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے اور مجھے اپنی صلاحیتوں کا اندازہ تھا کہ یہ دریا میں عبور نہیں کر سکتا۔ انہوں نے مجھے تعلیمی یکسوئی کے لیے بہن کے پاس بھیج دیا۔ پھر بھی یکسوئی نہ مجھے ملی اور نہ میں نے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میری آوارہ گردی مجھے ٹک کر کہاں بیٹھنے دیتی تھی۔ بہن مجھے سودا سلف کے لیے بازار بھیجتی اور میں بس پکڑ کر ایبٹ آباد نکل جاتا۔ چند گھنٹے گھوم پھر کر بغیر کسی شرمندگی کے واپس آتا تو خوب ڈانٹ پڑتی مگر سر جھکائے آرام سے سن لیتا۔ ایک بار بہنوئی کو کسی مریض کی بتیسی بنانی تھی۔ مجھے انہوں نے کہا کہ دو دن میں بنا کر دینی ہے اور میٹریل ختم ہو گیا ہے۔ کچھ پیسے دے کر انہوں نے مجھے پشاور جانے والی بس پر سوار کرا دیا کہ سامان لے کر آج ہی واپس آ جاؤں۔ جب پشاور پہنچ کر میں بس سے نیچے اترا تو ساتھ ہی ایک اور بس میرے شہر ڈیرہ اسماعیل خان کے لیے تیار کھڑی تھی۔ مجھے ماں کی اچانک یاد آئی اور میں ایک بس سے اترا اور ڈیرہ جانے والی بس پر جا بیٹھا اور اسی رات ماں کے ہاتھوں سے کھانا کھا رہا تھا۔ ماں مجھے حیرانی اور خوشی سے پنکھا بھی جھلتیں اور کھانا بھی کھلاتیں۔

چار دن بعد دوبارہ ہری پور پہنچا تو نہ میرے پاس بتیسی بنانے کا میٹریل تھا اور نہ وہ پیسے جس سے میٹریل لینا تھا۔ اس بار بہنوئی نے ڈانٹا نہیں بلکہ کافی دیر تک مجھے دیکھتے رہے اور میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ کافی دیر مجھے دیکھنے کے بعد انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اٹھ کر سونے چلے گئے۔

میرے دن رات اسی ڈگر پر گزر رہے تھے۔ کبھی ایک گھنٹا متواتر میں ٹک کر پڑھنے کے لیے نہیں بیٹھا۔ میرے دوست کا بڑا بھائی جنگلات کے محکمے میں کوئی افسر تھا اور اس کی پوسٹنگ مانسہرہ میں تھی۔ وہ دونوں دوست کچھ دنوں کے لیے بھائی کے پاس چھٹیاں گزارنے آئے اور مانسہرہ سے انہوں نے مجھے ایک خط لکھ ڈالا۔ بہنوئی دوپہر کو ہاسپٹل سے

واپس گھر پہنچے اور میری بہن کو کہا کہ آج اس کا پھر کوئی خط آیا ہے۔ یہ لڑکا پڑھے گا نہیں کیونکہ پچھلے دو ماہ میں اس کے درجنوں خط آچکے ہیں اور اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا۔

میں نے خط پڑھا، اپنے پاس جو پیسے بچے تھے ان کو گنا، ایک بیگ بنا کر بیٹھک میں رکھا۔ اور جیسے ہی دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میرے بہنوئی آرام کرنے کے لیے لیٹے۔ میں چپکے سے اٹھا، بیٹھک سے اپنا بیگ لیا، چوروں کی طرح باہر کا دروازہ کھولا اور سیدھا بس اڈے پر آیا، مانسہرہ کی بس پکڑی اور شام سے پہلے دوستوں کے ہمراہ، ان کے بھائی کے گھر سے ذرا پرے ایک پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دو خونخوار کتے ہمارے پیچھے پڑ گئے تھے۔ پڑھائی کا صرف اتنا خیال رکھا کہ کیمسٹری کی کتاب بھی ساتھ لے آیا۔

مجھے فلمیں دیکھنے، ان کی باکس آفس رپورٹ اور ان کا تجزیہ پڑھنے اور اس پر تبصرہ کرنے کا ہمیشہ سے شوق رہا۔ ان دنوں ایک فلمی ہفت روزہ اخبار، نگار، کراچی سے الیاس رشیدی صاحب نکالا کرتے تھے۔ میں جب تک اسے پڑھ نہیں لیتا، میرا وہ پورا ہفتہ بے چین گزرتا۔ ہری پور میں نگار ملتا نہیں تھا۔ میرا ایک دوست مجھے ہر ہفتے اس پر دس پیسے کا ٹکٹ لگا کر ہری پور بھیجتا تھا۔ میرے بہنوئی میری ان حرکتوں سے عاجز آچکے تھے۔ ایک بار نگار اخبار آیا اور انہوں نے مجھے نہیں دیا کہ اب میں صرف پڑھائی کی طرف توجہ دوں۔ میں اسی دن ایبٹ آباد پہنچا اور اخبار لے کر شام سے پہلے گھر پہنچ گیا۔ اخبار تو میں نے واپسی پر بس میں ہی ختم کرلیا تھا مگر یہاں میرا سامان پیک تھا۔

دوسرے دن بہنوئی نے مجھے میرے سامان سمیت پشاور جانے والی بس پر سوار کردیا اور تاکید کی کہ پشاور سے سیدھا بس پکڑ کر ڈیرہ جاؤں۔ میں نے حسب سابق پکا وعدہ کیا اور بس جب ٹیکسلا پہنچی تو میں سامان سمیت بس سے اتر آیا، وہیں سے پنڈی کی ویگن لی اور سیدھا شبستان سنیما جا کر اداکار ندیم کی فلم پاکیزہ دیکھی۔ پھر شام والا شو کسی اور فلم کا دیکھا۔ سامان میرے ساتھ ہی تھا اور دونوں بار مجھے فلم دیکھتے ہوئے، اسے سنیما مینیجر کے آفس میں رکھنا پڑا۔ پھر رات کو پنڈی سے ڈیرہ جانے والی بس لی اور جب فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں تو میں اپنے شہر کے بس اسٹینڈ سے سائیکل رکشے میں بیٹھا گھر جا رہا تھا۔

پھر امتحان شروع ہوئے اور میں نے پندرہ دن جم کر سٹڈی کی۔ رزلٹ آیا تو میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوا۔ مگر ڈاکٹر تو نہ بن سکا، پر فارماسسٹ بن گیا۔

آج اسی ہری پور سے گزرتے ہوئے وہ تمام واقعات یاد آگئے۔ جب ایبٹ آباد پہنچے تو ساتھ ہی کالی بدلیوں کی برات جھومر ڈالتی آ پہنچی۔ بس سڑک کنارے ایک ہوٹل پر رکی، عصر کی نماز پڑھی اور پھر جب ہم گرم گرم... چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ آسمان سے پانی اتنی زور سے برسا کہ دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف جل تھل مچ گئی۔ ہم جلدی جلدی بس میں سوار ہوئے تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ مانسہرہ پہنچے تو بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔

یہ بارش ہمیں خوش کر رہی تھی۔ پنڈی کی بارش والی افسردگی نہیں تھی۔ گو بارش اب رک چکی تھی مگر بھیگی فضا میں تیرتے پانیوں کے قطرے، بس کی کھلی کھڑکی سے اندر آکر میرے چہرے کو تروتازہ کرتے تھے۔

اب بادل چھٹ چکے تھے۔ دن کی زردی شام کی سیاہی میں گھل کر عجیب رنگ بکھیر رہی تھی۔ بھیگی شام کی تازہ ہوا نے پنڈی میں گزرے پچھلے چار دن کی بیزارگی، اکتاہٹ اور مایوسی کو دھو ڈالا تھا۔ میں اپنا ماضی بھول چکا تھا اور حال کے ایک ایک لمحے کو اپنی روح میں اتار رہا تھا۔ ان کو اپنے ذہن میں قید کر رہا تھا کہ جب میں اپنے گھر واپس لوٹوں اور دنیا کے بکھیڑے مجھے نوچنے لگیں تو ان لمحات کو ذہن کی قید سے آزاد کر کے اپنے سامنے لا بٹھاؤں تا کہ میری بے چین روح کو کچھ قرار ملے۔

بس بشام کی جانب رواں دواں تھی۔ سڑک کے دونوں جانب اونچے اونچے درخت کھڑے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ درختوں کے پیچھے سرسبز و شاداب کھیت بارش کے بعد ایک سہانا منظر پیش کر رہے تھے۔ بس کے اندر مکمل خاموشی تھی۔ بس کے باہر سے انجن کی غوں غوں مسلسل آرہی تھی۔ میں اپنی سیٹ کی پشت پر سر ٹکائے .... تیزی سے پیچھے کی جانب بھاگتے درختوں کو دیکھ رہا تھا اور خوش تھا کہ میں شاہراہ ریشم کا مسافر ہوں۔

شاہراہ ریشم کو قراقرم ہائی وے بھی کہتے ہیں۔ اس کا پرانا نام ریشم کے حوالے سے سلک روڈ بھی ہے۔ صدیوں سے اسی راستے چین سے ہند، ریشم کی تجارت ہوتی آرہی ہے۔ پچاس سال پہلے اس روڈ سے ایک خچر کا گزرنا بھی مشکل ہوتا تھا مگر اب تو بڑی بڑی بسیں فراٹے بھرتیں، خطرناک موڑ کاٹتیں آسانی سے گزر جاتی ہیں۔ دوستی میں

جب مقاصد ایک ہوں تو شاہراہ ریشم جیسے منصوبے جنم لیتے ہیں۔ اس سڑک کو دیکھ کر انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کن مشکلات سے گزر کر ان عظیم، دیو ہیکل پہاڑوں کو تراش کر یہ سڑک تعمیر کی گئی ہوگی۔ کہیں اس سڑک کے ساتھ ساتھ لگ کر سندھ دریا بہتا ہے اور کہیں سڑک اس سے میلوں دور کھسک جاتی ہے۔ معلوم نہیں کتنی صدیوں سے سندھو دریا اس راستے پر بہتا چلا آرہا ہے۔ کہیں یہ کسی جنگجو کی طرح چنگھاڑنے لگتا ہے اور کہیں اپنے وسیع پاٹ میں تھک کر خاموش ہو جاتا ہے۔ ایک سو چار چینی اور پاکستانی اس عجوبے کی تعمیر میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ بیشتر گلگت کے قریب مدفون ہیں اور وہاں دوستی کی ایک یادگار تعمیر کی گئی ہے۔

اب ہم بٹگرام کو پیچھے چھوڑ کر تھاہ کوٹ کی جانب دوڑتی بس میں سوار تھے۔ رات پوری طرح زمین پر اتر کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں تک چڑھتی چلی گئی تھی۔ پہاڑ سکڑ کر سڑک کے قریب چلے آئے تھے۔ دو بلند و بالا پہاڑوں کی چٹانوں کے بیچ سڑک تھی اور چاندنی کے رنگ میں رنگا سندھو دریا تھا۔ پہلے دریا سڑک کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور اب سڑک اوپر چڑھتی گئی اور دریا کافی نیچے ہو کر بہتا تھا۔ ہم بلند سے بلند ہوتے گئے۔

بلندی کی وجہ سے میرا جی متلانے لگا اور طبیعت پر بوجھل پن حاوی ہوا۔ میری اگلی سیٹ پر سیاہ کھدر کے لباس میں ملبوس، بلتی خدوخال والا ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ میری حالت دیکھ کر اس نے مجھے کچھ ٹافیاں دیں۔ حیرت انگیز طور پر میری طبیعت کا بھاری پن جاتا رہا۔ تعارف پر معلوم پڑا کہ اس کا نام ابراہیم ہے اور ٹورسٹ گائیڈ ہے۔ پوچھنے پر بتایا کہ وہ فرانسیسیوں کے ایک گروپ کو وادی شمشال لے کر جارہا ہے۔ میں نے شمشال کا نام پہلی بار ابراہیم کے منہ سے اس دن سنا تھا۔ اس وقت میرے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ دو سال بعد میں مستنصر حسین تارڑ کے ہمراہ شمشال کا خوبصورت سفر کروں گا۔

گلگت اور بلتستان کی وادیوں میں رہنے والے لوگ ہاتھ ملانے پر آپ کے دوست بن جاتے ہیں۔ بڑے متین، سنجیدہ اور اپنی شخصیت میں ایک بردباری اور ٹھہراؤ رکھتے ہیں۔ ابراہیم اس کی ایک جیتی جاگتی مثال تھا۔ وہ کنکورڈیا، فیری میڈو، اور نانگا پربت کے تینوں بیس کیمپس کے ساتھ ساتھ شمال کی دور دراز وادیوں میں بطور ٹورسٹ گائیڈ جا چکا تھا۔ مجھے ایسے کسی شخص کی تلاش ہمیشہ رہتی ہے جو نئے جہانوں کے قصے سنائے۔ وہ تو ویسے بھی فیری میڈو جا چکا تھا اور مجھے وہاں کی معلومات بھی لینی تھیں۔ میں نے اس کے ساتھ بیٹھے مسافر سے درخواست کی اور اپنی نشست اس کے ساتھ تبدیل کر کے ابراہیم کے پہلو میں آبیٹھا۔

اس نے مجھے فیری میڈو، طاؤس، بگروٹ، اشکومن، ہسپر اور بیافو گلیشیر، شگر، چپلو، شمشال کے علاوہ متعدد وادیوں کے قصے اور داستانیں سنائیں۔ میں اس سے متواتر سوالات کرتا جارہا تھا اور وہ اپنے دھیمے لہجے میں جوابات دیتا رہا جن کو میں بڑے انہماک سے سنتا رہا۔ باہر ہمالیہ کے پہاڑ رات کی تاریکی میں بلند و قامت دیو کی مانند نظر آتے تھے۔ رات کی تاریکی ان پہاڑوں کو نگلنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ بس میں سب مسافر اونگھ رہے تھے اور میں ابراہیم سے جنت نظیر وادیوں کی داستانیں سن رہا تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ میں خواب میں ہوں اور کوئی سرگوشی سے میرے کان میں مجھے پریوں کے قصے سنا رہا ہے۔

میں نے پلٹ کر شاہ جی کو دیکھا تو وہ بھی اونگھ رہے تھے۔ میں دوبارہ اپنی سیٹ پر ان کے ساتھ آگیا کہ کہیں اکیلے میں ان کا نانگا پربت کا ایڈونچر دم نہ توڑ جائے۔

بس تاریکی میں گھستی چلی جارہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ پہاڑوں سے کوئی مقناطیسی شعاعیں نکل کر میرے بدن کو جکڑے جارہی ہیں۔ میرے اندر بلند، تنہا اور اپنی جگہ ڈٹے ہوئے پہاڑوں کے اندر کی پُر اسراریت کا کھوج لگانے کا تجسس اور ہیجان بڑھتا جارہا تھا۔ فیری میڈو سے نانگا پربت اور کنکورڈیا سے کے ٹو، براڈ پیک، مشابرم اور گشابرم کے برفانی اہراموں کو دیکھنا اور آسمان میں چھید کرتی کرسٹل پیک کی سنہری چوٹیاں، ہر ٹریکر کی آرزو اور تمنا رہی ہیں۔ ہمت والے وہاں تک جا پہنچتے ہیں اور لازوال منظروں کے گواہ بنتے ہیں۔ جب تک یہ دنیا قائم ہے تو یہ مناظر بھی زندہ ہیں۔ ایک انسانی زندگی میں یہ لازوال اور لافانی رہتے ہیں۔

پاکستانی بہت خوش قسمت بھی ہیں اور بہت بدنصیب بھی۔ خوش قسمت اس لیے کہ دنیا کے عظیم پہاڑوں کے جھرمٹ چند سو میل کے دائرے میں ایک ہی جگہ موجود ہیں۔ بدقسمت اس لیے کہ نہ انہیں اپنے ان خزانوں کا علم ہے اور نہ یہ ادراک کہ کس طرح اس خزانے کو دریافت کر کے دنیا کے سامنے اس کا چرچا کرنا ہے۔ سات ہزار پانچ سو

میٹر سے لے کر سات ہزار نو سو ننانوے میٹر بلند چوٹیوں کی تعداد چالیس ہے۔ سات ہزار ایک سو سے سات ہزار پانچ سو میٹر بلند پہاڑ ایک سو پینتالیس ہیں۔ چھ ہزار پانچ سو سے سات ہزار میٹر بلندی تک کے پہاڑ ایک سو نوّے کے قریب ہیں۔ یہ سب پہاڑ اندازاً ایک سو مربع میل کے علاقے میں پھیلے ہیں۔ ان چوٹیوں کے دامن میں کئی ایک دلکش وادیاں ہیں جیسے فیری میڈو۔

اپنے دشوار گزار راستوں کی وجہ سے پاکستانی لاعلم رہتے ہیں مگر یورپ، امریکا، جاپان اور دوسرے خوشحال ممالک کے سیاح یہ وادیاں دیکھنے بڑے اشتیاق سے پاکستان کا رخ کرتے ہیں۔ آپ ذرا تقابل کریں کہ افریقا کا سب سے اونچا پہاڑ ''کلی منجارو'' چھ ہزار میٹر سے بھی کم بلند ہے۔ امریکا کا بلند ترین پہاڑ مکینلی ہے جو چھ ہزار ایک سو میٹر کے قریب بلند ہے۔ یورپ کا سب سے بلند پہاڑ البروس ہے جو پانچ ہزار میٹر سے کچھ زیادہ ہے۔

یہ بلند چوٹیاں سر کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ایک پہاڑ کو سر کرنے کے لیے بڑی سخت ٹریننگ سے گزرنا پڑتا ہے۔ آپ کے پھیپھڑے مضبوط ہوں تاکہ بلندی پر کم آکسیجن آپ کو بے ہوش نہ کرسکے۔ آپ کا جسم مضبوط، پٹھے قوی اور جذبہ مستحکم ہونا چاہیے۔ ہم پاکستانیوں نے اپنے ہیرو بھی جعلی قسم کے لوگ بنا رکھے ہیں۔ جس کی میڈیا تک رسائی آسان ہو تو ہم دن رات اس کی مالا جپتے رہتے ہیں۔ مجھے شمشال کا رہنے والا رجب شاہ یاد آرہا ہے۔ وہ پہلا پاکستانی ہے جو دنیا کی پانچ بلند ترین چوٹیوں کو سر کر چکا ہے۔ جس میں ایورسٹ، کے ٹو بھی شامل ہیں۔ کینیڈا میں اس کی تصویروں کے کیلنڈر چھاپے گئے۔ یہ رنگین کیلنڈر مجھے اس وقت دکھا تھا جب شمشال کے راستے میں پڑتے اس کے گھر میں بیٹھا نمکین چائے پی رہا تھا تب رجب کی تصویروں سے سجا کیلنڈر دیکھا تھا جس میں رجب کوہ پیمائی کے لباس میں کے ٹو کی برفوں میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کینیڈا نے ایک سرکاری مہمان کے طور پر رجب کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی۔ اس کو شہریت کی پیش کش کی تھی مگر وہ پہاڑوں سے محبت کرنے والا کس طرح لوہے اور سیمنٹ سے بنی عمارتوں کے بیچ رہ سکتا تھا۔ اس نے وطن کی محبت میں صاف انکار کردیا تھا۔ بدلے میں اسے کیا ملا؟ آپ ہی بتائیں کیا کوئی پاکستانی رجب شاہ کے نام سے واقف ہے؟

دو سال بعد رجب شاہ شمشال میں ہمارا گائیڈ تھا۔ ساتھ ہی مہربان شاہ بھی تھا جو کے ٹو سر کرنے میں رجب کا ساتھی تھا۔ مہربان مجھے پیٹھ پر بیٹھا کر شمشال کے تند و تیز نالے عبور کرواتا تھا۔ اپنے ہیرو کے کندھے پر سوار ہو کر میں شمشال پہنچ سکا تھا۔

چند دن پہلے اپریل دو ہزار پندرہ میں، بی بی سی نے رجب شاہ کے انتقال کی خبر دی۔ میں نے پاکستان کا ہر اخبار اور میڈیا کھنگال ڈالا مگر مجھے رجب شاہ کا نام بھی نظر نہ آیا۔ کیا کوئی اشرف امان اور نذیر صابر کو جانتا ہے۔ یہ وہ

سپوت ہیں جنہوں نے کے ٹو کی چوٹی پر سبز ہلالی پرچم لہرایا اور پھران برفوں پر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوگئے۔

کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم بے وفا اور منکر لوگ ہیں جو ایک عذاب کی گرفت میں ہیں اور اتنے غافل کہ عذاب لانے والوں کو چوم بھی رہے ہیں۔ایک غافل، بے خبر قوم جو ایک ہجوم کی مانند کسی گہری کھائی کی جانب ناچتی گاتی بڑھ رہی ہے۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے اور ہماری بس نے تھا کوٹ میں سڑک کنارے بنے ایک وسیع چھپر ہوٹل کے کمپاونڈ میں اپنی بریکیں لگائیں۔ ہمارا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ہلکا پھلکا ناشتا صبح کیا تھا دوپہر بس کی ٹکٹوں اور دوسرے مراحل میں خرچ ہوگئی تھی۔ہوٹل کے بڑے احاطے میں درجنوں چارپایاں ایک ترتیب سے رکھی تھیں۔ہر دو چارپایوں کے بیچ لکڑی کی میز پر پانی سے بھرا ایک جگ اور کچھ گلاس دھرے تھے۔ہوٹل کا کمپاونڈ قمقموں سے جگمگا رہا تھا اور ارد گرد خاموش تاریکی پھیلی تھی بلند پہاڑ عفریتوں کی مانند دکھلائی دیتے تھے۔

اتنے میں گلگت کی جانب سے چار بسیں پنجاب یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس سے بھریں چنگھاڑتیں ہماری بس کے ساتھ آرکیں۔ ہم نے سوچا کہ نماز پڑھ کر آرام سے کھانا کھائیں گے۔ہوٹل کے ساتھ بنی ایک چھوٹی سی مسجد میں سفری نماز پڑھ کر واپس آئے تو کوئی چارپائی خالی نہیں تھی۔ایک شوروغل تھا۔معلوم نہیں پڑتا تھا کہ کون بیرا ہے اور کون مسافر؟ کوئی روز محشر تھا کہ سب کو اپنی پڑی تھی۔ہر کوئی کچن کی طرف،یا تو بھاگ کر داخل ہو رہا تھا یا پھر وہاں سے کوئی سالن کی پلیٹ یا روٹی لیے نکل رہا تھا۔ہم کو ایک چارپائی میں جگہ مل گئی تھی اور کسی ویٹر کے انتظار میں ہم ہر آنے جانے والے کو دیکھ رہے تھے۔

شاہ جی نے ایک مسافر کو بیرا سمجھ کر بھنے گوشت کا آرڈر دے دیا۔ایک جھگڑا ہونے والا تھا کہ میں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ خراب ہونے سے بچا لیا۔ابراہیم بھی ہمارے ہمراہ تھا اور وہ بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔وہ ہم دونوں کو لے کر کچن میں آیا۔یہاں سب اختیارات ہر بندے نے اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔مجھے ایک پلیٹ مل گئی اور خود دیگچے سے سالن پلیٹ میں ڈالا۔شاہ جی پیاز چھیل کر سلاد بنا رہے تھے اور سب سے مشکل کام ابراہیم کا تھا کہ اس نے تندور سے روٹیاں باہر نکلنے سے پہلے جھپٹنی تھیں۔سب نے اپنا اپنا کام بخوبی انجام دیا تو ہمارے پیٹ کی آگ بجھی۔

چائے پینے کے بعد میں ٹہلتا ہوا گلگت کی جانب سڑک پر اکیلا چلتا دور نکل آیا۔پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر گھروں سے ٹمٹماتی روشنیاں جلتی بجھتی نظر آتی تھیں۔پہاڑ اور سڑک کے بیچ چند کھیت تھے اور کہیں نشیب میں سندھ کے پانیوں کی گونج تھی جو مجھ تک آتی تھی۔خاموشی اور تاریکی میں تھاکوٹ کے پہاڑ ایک دیو کی مانند آسمانوں کو چھوتے میرے دل میں ایک خوف بھر رہے تھے۔ہوٹل کا شور وہاں تک نہیں آرہا تھا۔میں نے سگریٹ سلگائی اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔میرا ماحول بننے ہی والا تھا کہ بس کے ہارن کی آواز چنگھاڑتی تیرتی ہوئی آئی اور میری سماعت کے پردے پھاڑ گئی۔بس چلنے کو تیار ہو چکی تھی اگر میں ذرا سی بھی تاخیر کرتا تو بات گلے میں آجاتی اس لیے میں بھاگم بھاگ بس میں سوار ہوگیا۔

تھاکوٹ سے نکلے تو دو قریب ہوتے ہوئے پہاڑوں میں پھنسے۔ بشام کی طرف رخ تھا۔اب ہم باقاعدہ اونگھ رہے تھے۔انجن کی آواز کبھی حاوی ہو جاتی اور کبھی قریب آتے سندھ کے پانیوں کے شور میں دب جاتی۔

اللہ اللہ کر کے بشام سے ہم نکلے۔دل کو کچھ ڈھارس ہوئی لیکن ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔'' یہ بات بھول بیٹھے تھے کہ اس دشوار سڑک سے نکل چکے تھے اور میری تھاکوٹ ہی میری نیند کے بیچ حائل تھی۔شاہ جی کے خراٹے بھی میری نیند میں خلل ڈال رہے تھے۔میں نے اپنی آنکھیں بند کر کے سرنشست کی پشت پر رکھ دیا۔میرا دماغ نینداور خیالات کے بیچ کہیں جھول رہا تھا، کہ اچانک ایک گڑگڑاہٹ کی آواز آئی اور بس نے کچھ ہچکولے لیے، پھر اس کو ایک دو جھٹکے لگے اور آخر میں انجن مکمل خاموش ہوگیا۔

میں نیند میں تو نہیں تھا اس لیے اپنی آنکھیں کھول دیں۔کلائی کی گھڑی پر ٹائم دیکھا تو رات کے دو بجے تھے۔بس ایک ویرانے میں کھڑی تھی۔ڈرائیور اور دو کنڈکٹروں کی آوازیں آرہی تھیں۔جو میں جان سکا وہ یہ تھا کہ بس کا انجن خراب ہو چکا ہے۔اسماعیل کی جانب دیکھا تو وہ گہری نیند میں تھا۔ابراہیم بھی آنکھیں کھول کر صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔بس چل رہی تھی تو کھڑکی کے اندر آتی ہوا سے گرمی کا احساس نہیں ہوتا تھا مگر جب بس رک گئی تو گھٹن کا احساس ہونے لگا۔باہر صرف دیو قامت پہاڑ بلکہ ان کے ہیولے نظر آتے تھے۔گرمی سے چٹانیں تپ رہی

تھیں۔ ڈرائیور اور کنڈ کٹر کچھ اوزار لے کر بس کے نیچے گھسے، متواتر ایک دوسرے کو ہدایات اور مشورے دے رہے تھے۔ آہستہ آہستہ سوتے ہوئے مسافر گرمی کی شدت کے سبب نیند سے بڑبڑاتے ہوئے جاگنے لگے۔ شاہ جی پہلے کچھ بڑبڑائے، پھر کچھ حالات کا جائزہ لیا، مختصر سی معلومات لیں اور بڑبڑاتے ہوئے نیچے اتر گئے۔

میں پہلے ہی اتر چکا تھا۔ ہر کوئی بیزار اور بے بس نظر آتا تھا۔ دوپہر کو روانہ ہوئے تھے۔ کچھ دیر پہلے کھانا کھا کر سب آرام سے سوئے مگر اب حال سے بے حال تھے۔ باہر کوئی بیٹھنے، ستانے اور ٹیک لگانے کی بھی جگہ نہیں تھی۔

اندر کی نسبت باہر حبس اور گرمی زیادہ تھی۔ بس ایک ویرانے میں کھڑی تھی۔ ارد گرد وہی بلند و بالا چٹانیں تھیں۔ کوئی درخت یا کوئی پودا بھی نہیں تھا۔ ہوا بند تھی۔ سڑک، پتھر، چٹانیں، غرض ہر چیز پورے دن کی حدت کو جذب کرنے کے بعد اب اسی کو باہر نکال رہی تھیں۔ شاہ جی نے ایک بڑے پتھر کے ساتھ ٹیک لگانے کے لیے اپنی پیٹھ ذرا سی لگائی تھی کہ میں اچھل پڑا۔ شاہ جی جیسے بندے سے ایسی اُمید نہ تھی۔ میں حیرت بھرے انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے ان کی زبان سے اتنی بھاری بھرکم گالی سنی تھی۔ انگلش کی گالی تو ایسی ہوتی ہے جیسے کان پر بیٹھے مچھر کو اڑایا جائے۔ اردو کی گالیاں نستعلیق ہوتی ہیں لیکن پنجابی کی گالیاں...... معاذ اللہ...... مردے کفن پھاڑ کر قبر سے نکل آئیں۔ اس وقت انہوں نے نادانستگی میں پنجابی کی گالی بکی تھی۔ پھر اپنی پیٹھ سہلاتے ہوئے مجھ سے بولے۔ ”تم تو کہتے تھے کہ برفیں ہوں گی، ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ پھول ہیں مگر یہاں......“ شاہ جی اس بار واقعی ناراض نظر آرہے تھے۔ کسی اور پر نہیں، بلکہ اپنی بے بسی پر۔

مشکل یہ تھی کے بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ بھی نہ تھی۔ پتھروں سے ٹیک لگاتے ہی ایسا احساس ہوجاتا جیسے وہ انگارے کی طرح دہک رہے ہیں۔ روڈ پر چادر بچھا کر آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کی کوشش کی اور لاحول پڑھتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ سڑک کی تارکول تک حدت سے پگھل رہی تھی۔ اب صرف ایک راستہ بچتا ہے کہ آپ یا تو ٹہلتے رہیں یا پاؤں پر بیٹھ کر ڈرائیور اور کنڈ کٹر کو بس کے نیچے کام کرتا دیکھتے رہیں۔ اور اکثر لوگ یہی کر رہے تھے۔ میں نے دونوں کام

> اس اسکول کو آج کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اس بچے کو پوری دنیا جانتی ہے۔ جو بڑا ہو کر دنیا کا مشہور ترین آدمی بن گیا۔ اسکول والوں نے اس بچے کو اپنے اسکول سے اس لیے نکال دیا تھا کہ وہ ان کے معیار پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔ یہ اسکول کی غلطی تھی ورنہ آج اس طالب علم کے ساتھ ساتھ اس اسکول کا نام بھی روشن ہوجاتا۔ وہ طالب علم تھا آئن اسٹائن۔

باری باری کر کے دیکھے مگر چین نہیں ملا۔ بس میں رکھے کولر کا پانی آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا۔ سب ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن چکے تھے۔ ایک دو بار شاہ جی ٹہلنے کی مشقت کے دوران گھورتے ہوئے میرے قریب سے بھی گزرے، جیسے دل ہی دل میں کہہ رہے ہوں، یہ سب تیری ہی وجہ سے ہے۔ گویا سب کے سب ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ تمام مسافر بیزار، لاچار، بیمار، نا اُمید اور مایوس نظر آرہے تھے کیونکہ ہماری اس سزا کو شروع ہوئے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ ہمارے سارے مشاغل ختم ہو چکے تھے اور اب ہر کوئی خلاؤں میں تکے جا رہا تھا۔ جیسے میں چٹانوں کی بلندیاں ناپ رہا ہوں۔

شاہ جی ایک پتھر کو کافی دیر سے گھورے جارہے تھے۔ ایک صاحب بس کے پیچھے لکھی ہوئی تحریر پر نظریں جمائے کافی دیر سے کھڑے تھے، ایک صاحب نادانستگی میں خالی الذہنی کے عالم میں بس کے پچھلے ٹائر کو صاف کیے جارہے تھے۔ کوئی بھی اپنے حواس میں نہیں لگتا تھا۔ صرف ابراہیم جو مشکلات کا عادی تھا وہی پُرسکون انداز سے، ہاتھ باندھے ٹہل رہا تھا۔ اب یا تو یہ اُمید رہ گئی تھی کہ پنڈی سے آٹھ گھنٹے کی مسافت کے بعد کوئی اور بس آئے یا یہ کسی طرح ٹھیک ہوجائے جسے ڈرائیور اور کنڈ کٹر ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کچھ دیر بعد بلند چٹانوں کے اوپر صبح کا نور پھیلنا شروع ہوا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر صبح کا تارا نکلا۔ دودھیا سی روشنی اوپر سے پھوٹی۔ ایک سو گز دور، شفاف پانیوں کا بہتا نالہ دریائے سندھ میں گر رہا تھا۔ پانی میں زندگی تھی۔ ہم نے وضو کیے، ایک کو امام بنا کر سب نے ایک ساتھ کہا اللہ اکبر۔

صبح کی نماز میں ایسے لگ رہا تھا کہ اللہ میرے سامنے

ہے اور میں اسے دیکھ کر سجدہ کرتا ہوں۔ دعا مانگی تو اللہ نے کہا قبول ہے۔ یقیناً سب نے میری والی دعا ہی مانگی ہوگی کہ بس کی خرابی دور ہو جائے۔

ٹھیک کہتے ہیں کہ جتنا آپ نیچر کے قریب ہوتے ہیں، اللہ کو زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ میں بھی اسی کیفیت میں تھا۔

دعا مانگنے کے بعد اٹھے تو بس کا انجن بھی جاگ اٹھا اور گر گر کی آوازیں نکالتے ہوئے ہمیں بلانے لگا کہ چلو، جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے۔

جیسے ہی بس روانہ ہوئی تو سب تھکن سے چور تھے اور بیٹھتے ہی نیند میں ڈوبتے چلے گئے۔ میری نیند اب کوسوں دور چلی گئی تھی۔ کھڑکی سے سر ٹکائے میں اب سندھ اور سلک روڈ کی آنکھ مچولی دیکھنے لگا۔ کبھی بس دریا کے بائیں کنارے ہوتی اور کبھی کوئی پل کراس کر کے دائیں جانب آ جاتی۔ کبھی سندھو سے سلک روڈ، روٹھ کر میدانوں میں نکل آتی اور کبھی اس کو نیچے چھوڑ کر پہاڑوں پر چڑھ جاتی۔ کہیں برفوں کا پگھلا، صاف اور شفاف پانی شور مچاتا، جھاگ اڑاتا، اچھلتا کودتا، بل کھاتا اور چکر لگاتا سندھو دریا کے گدلے پانیوں میں گر کر گدلا ہو رہا ہوتا۔

اب پہاڑوں کی بلندیاں سورج کی کرنوں سے سنہری ہو رہی تھیں۔ نیچے ابھی ہلکا سا اندھیرا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ سبک خرامی سے سنہری کرنیں چوٹیوں سے نیچے اترنے لگیں۔ آس پاس کے مناظر اب واضح ہو رہے تھے۔ ویران، خشک، چٹیل اور بنجر پہاڑ اپنا سینہ تانے آسمان کی وسعتوں میں خاموش کھڑے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس زمین کا نہیں بلکہ کسی اور سیارے پر جا اترا ہوں اور ازل سے اس سیارے کا حصہ ہوں۔

سورج آہستہ آہستہ نکل آیا اور تپش بھی دوبارہ چلی آئی۔ پتن پیچھے رہ گیا تھا اور جب ہم چلاس پہنچے تو سورج سوا نیزے پر تھا۔ جس بس کو صبح سات بجے گلگت پہنچنا تھا وہ بارہ بجے چلاس کے کسی مسافر خانے میں ہمیں ناشتا کروا رہی۔ مسافر اترے تو ان کے چہروں پر ماندگی اور کسل مندی تھی۔ بال بکھرے تھے اور ایک دوسرے سے تکرار ہے تھے۔

ابراہیم نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہوٹل سے باہر لے آیا۔ دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ ہے نانگا پربت کا دیامیر فیس۔“

میں نے پوچھا۔ ”نانگا پربت نظر نہیں آ رہی۔“

کہنے لگا۔ ”وہ ان پہاڑوں کے پیچھے ہے۔“

میرے اور نانگا پربت کے بیچ چٹیل پہاڑ تھے۔

میں نانگا پربت کے اتنا قریب ہوں، یہ خیال بھی مجھے نیا ولولہ دے رہا تھا۔ میں یہ خبر دینے کے لیے شاہ جی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ چہرے پر تفکرات کی شکنیں رکھے، چارپائی پر ایک گہری سوچ میں چپ بیٹھے تھے۔ میں نے مناسب نہ جانا کہ انہیں ڈسٹرب کروں۔ یہ وقت ان کے غور و فکر کا ہے۔ ایسے وقت میں ان کو یہ خوشی کی خبر سنانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

ناشتے میں پراٹھے، فرائی انڈے کے بعد گرم چائے ملی۔ اس ہوٹل کے اندر گیٹ سے داخل ہوں تو چاروں جانب دو منزلہ عمارت میں اوپر نیچے کمرے بنے ہیں اور بیچ میں صحن ہے۔ ہم ایک کمرے میں چارپائیوں پر ناشتا کر کے ستا رہے تھے۔

شاہ جی کی آنکھ لگ گئی تو میں دوبارہ دیامیر دیکھنے باہر نکل آیا۔ دیامیر یہاں نانگا پربت کو بھی کہتے ہیں۔ چلاس ضلع دیامیر کا صدر مقام بھی ہے۔ خشک بلند و بالا چٹانوں میں گھرا چلاس اپنی ایک تجارتی اہمیت رکھتا تھا۔ جب تک شاہراہ ریشم نہیں بنی تھی تو سڑک دوسری تھی۔ پہلے گلگت سے تجارت بذریعہ چلاس بارہ ہزار فٹ بلند بابو سر ٹاپ سے۔ ناران اور کاغان کے راستے ہوتی تھی۔ یہ راستہ بھی صرف سال میں چار ماہ کے لیے کھلتا تھا اور پھر برفوں میں کہیں گم ہو جاتا تھا۔ گلگت، اسکردو اور سارے بلتستان کی تجارت کشمیر سے ہی ہوتی تھی۔

بس روانہ ہوئی اور پھر کھلے میدانوں میں دوڑنے لگی۔ لق و دق، بنجر ویرانوں سے پرے سندھ دریا ایک سکون سے بہتا چلا جاتا تھا۔ ہمالیہ قریب آتا گیا۔

ابراہیم نے مڑ کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ”تمہارا، رائے کوٹ کا پل قریب آ رہا ہے۔“

میرے جسم میں ایک لہر سی دوڑتی چلی گئی! میرے جنوں کا آغاز، رائے کوٹ کا پل تھا۔ خشک اور بلند چٹانوں میں گھرا، ایک نالے پر بنا، کوئی بے نشان سا پل، کسی کے لیے بھی کوئی کشش نہیں رکھتا ہوگا، مگر میرے خواب یہیں سے شروع ہوتے تھے۔

یہ روداد ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کریں

تاریخ عالم

منظر امام

یہ عالم رنگ و بو لفظِ کُن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرۂ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرۂ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطۂ تحریر میں لایا گیا۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک دلچسپ تحریر کا چھٹا حصہ

میں پچھلی قسط میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ موضوع بہت وسیع اور بہت تحقیق طلب ہے۔
دنیا کے ہر ملک میں تاریخ بکھری ہوئی ہے۔ کیونکہ دنیا کے ہر ملک اور ہر خطے میں انسان آباد رہے ہیں اور انسانوں کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخ بھی سانس لیتی رہی ہے۔
ہر ملک نے عروج و زوال کی منازل طے کیں۔ تہذیبیں جنم لیتیں اور فنا ہوتی رہیں۔ لوگ آتے جاتے

رہے۔ دانش ور، مفکر، پیغمبر، سائنس دان، انجینئر، حکمران، سپہ سالار ہر قسم کے لوگ اور انسان ترقی کی منازل طے کرتا ہوا آج کے دور تک آ گیا۔

یہ تحریر سن 2015ء میں لکھی جا رہی ہے۔ یہ تو معلوم سال ہے۔ جب سے انسان نے گنتی شروع کی ہے دنوں کو ایک ترتیب میں لانے کے لیے کلینڈر کو رواج دیا ہے۔ جب کہ تاریخ اس سے بھی قبل کی ہے۔ جس کو قبل از مسیح کہا جاتا ہے۔ قبل از مسیح کی حد بھی ایک جگہ ختم ہو جاتی ہے اس سے بھی پہلے اور اس سے بھی پہلے کو قبل از تاریخ کا نام دیا گیا ہے۔

قبل از تاریخ میں کیسے کیسے دلیر اور معاملہ فہم لوگ ہوں گے، یقیناً ہوں گے کیونکہ انسان تو ہمیشہ سے اشرف المخلوقات رہا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ ان کا کوئی ریکارڈ ہمارے سامنے نہیں رہا ہے۔ بقول مرزا غالب کہ ''سب کہاں کچھ لالہ گل میں نمایاں ہو گئیں۔ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں''۔

ہم تو معلوم تاریخ کے کچھ بڑے لوگوں کو ہی جانتے ہیں۔

بہرحال اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ذرا تاریخ عالم کا مختصر جائزہ لے لیں۔ ہم نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ جہاں کسی سنجیدہ یا اہم راستے کا کوئی ذکر آئے گا ہم تھوڑی تھوڑی اس کی تفصیل بھی دیتے جائیں گے۔ تاکہ تاریخ کے مختلف ادوار اپنے اہم واقعات اور اہم کرداروں کے ساتھ سامنے آتے جائیں۔ آئیں ہم ان واقعات کا جائزہ لیتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ واقعات قبل مسیح سے ہیں۔

3500 قبل مسیح۔ سمیریوں نے فن تحریر ایجاد کیا۔ یہ قوم عراق اور اس کے گرد و نواح میں تھی اور انتہائی مہذب اور ترقی یافتہ تھی (اس زمانے کے لحاظ سے)۔

نیفر نے مصر کو متحد کیا۔ یہ ایک زبردست جنگجو قوم تھی۔ مصر ان سے پہلے مختلف قبائل اور حکمرانوں میں تقسیم تھا۔ اس قوم نے سب پر فتح پا کر سب کو ایک کیا۔ اس طرح ایک عظیم مصری سلطنت کی بنیاد استوار ہوئی۔

3000 قبل مسیح۔ مشرق وسطیٰ میں کانسی کے دور کا آغاز ہوا (اس حوالے سے برصغیر کی تاریخ کے باب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، پہلے شماروں میں)۔

ان ہی ادوار میں خوفو کا عظیم ہرم مصر میں تعمیر ہوا۔

خوفو کے حوالے سے ایک بات یہ سامنے آئی ہے کہ اس کی پیدائش اور موت کی تواریخ غیر معلوم ہیں۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ چھٹی صدی قبل مسیح میں ظاہر ہوا تھا۔ جب کہ بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ تین ہزار قبل مسیح سے ڈھائی ہزار قبل مسیح کے زمانے میں تھا۔

خوفو کا یونانی نام زوسپ تھا۔

اس کی ایک وجہ شہرت غزہ میں عظیم ہرم کی تعمیر ہے۔ جو خود اس کا مقبرہ بنا۔

اس کا دارالحکومت میمس نیس (مصر) تھا۔ خوفو طویل عرصے تک حکمران رہا۔ تاہم اس کی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔

یہ کہنا درست ہے کہ یہ عظیم ہرم انسانی تاریخ میں انسان کی بنائی ہوئی ایک غیر معمولی اور شاندار عمارت ہے۔

قدیم دور میں بھی اسے سات عجائبات عالم میں شمار کیا جاتا تھا۔ دیگر چھ عجائب عرصہ بعد زمانے کی آب و ہوا اور گرم و سرد کی نذر ہو چکے تھے لیکن یہ عظیم ہرم اس فرعون کی یادگار کے طور پر آج بھی موجود ہے۔

اس کا حجم حیران کن ہے اگرچہ ہرم کا بالائی حصہ تیس فٹ پر محیط حصہ تباہ ہو چکا ہے۔

اس ہرم کی اونچائی تاحال 450 فٹ ہے۔ یہ پینتیس منزلہ اونچی عمارت جتنی بلند ہے۔ اندازاً تیس لاکھ پتھر کی سلیں اس میں جڑی ہوئی ہیں۔ ہر سل اوسطاً ڈھائی ٹن وزنی ہے۔ اس عظیم ہرم میں اندرونی کمروں اور راہداریوں کا ایک سلسلہ ہے۔ اس لیے اس میں مختلف حجم کے پتھر استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے تعمیراتی پیچیدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ عظیم ہرم ساڑھے چار ہزار برسوں سے ایستادہ ہے اور غالباً تب بھی موجود رہے گا جب جدید معماروں کی بنائی ہوئی عمارتیں خود بخود منہدم ہونے لگیں گی۔

ایک ایٹم بم بھی اسے مکمل تباہ نہ کر پائے گا۔ مسالہ آہستہ آہستہ جھڑتا جائے گا۔ اس کے موجودہ کٹاؤ کی رفتار کے مطابق یہ دس لاکھ سال مزید موجود رہے گا۔

زرسپ (خوفو) کو ایک دیرپا عالمی شہرت ملی ہے لیکن شہرت اور چیز ہے۔ اثر انگریزی اور چیز ہے۔

2500 قبل مسیح

عکاد قوم نے سمر کو فتح کیا (سمیریوں کی سلطنت کو میسوپوٹامیہ کا نام دیا گیا ہے)

2000 قبل مسیح

اوّلین حروف تہجی متشکل ہوئے۔ حمورابی نے ضابطہ اخلاق وضع کیا۔ حمورابی اور اس کے ضابطہ اخلاق کے حوالے سے پچھلی کسی قسط میں تفصیل آچکی ہے۔

1500 قبل مسیح

افناطون کا دور۔ افناطون بھی فرعون خوفوں کی طرح ایک مشہور بادشاہ گزرا ہے۔

حضرت موسیٰ کی ہجرت (1300 قبل مسیح)

تاریخ میں غالباً عظیم عبرانی پیغمبر حضرت موسیٰ سے زیادہ کسی دوسرے شخص کی اس قدر وسیع پیمانے پر پذیرائی نہیں ہوئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی مقبولیت اور پیروکاروں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ ریمس دوم کے زمانے میں حضرت موسیٰ کی پیدائش ہوئی تھی۔ اپنی زندگی کے دوران جیسا کہ کتابوں سے واضح ہے۔ عبرانیوں کی ایک اکثریت ریمس دوم کی حکمتِ عملیوں پر نالاں تھی۔

پانچ صدیوں تک حضرت موسیٰ بھی عبرانیوں کے لیے محترم رہے۔ پھر اسلام نے بھی ان کو ایک سچا پیغمبر تسلیم کرلیا اور ان کی شہرت پھیلتی چلی گئی۔

آج بتیس صدیوں کی مدت کے بعد حضرت موسیٰ یہودیوں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے ایک جیسے محترم اور مقدس ہیں۔

ہم حضرت موسیٰ کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہمارے قرآن میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔ اس لیے ان کے بارے میں تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہم تاریخ کے ان دنوں کا ذکر کررہے ہیں جو پندرہ سو سال قبل مسیح کا تھا۔

اس دور میں مشرقِ وسطیٰ میں لوہے کا استعمال عام ہوا۔ لوہے کے اوزار اور جنگ کے سامان بنائے جانے لگے۔

ان ہی ایام میں ٹروجن کی مشہور جنگ ہوئی۔ اس جنگ کے حوالے سے بے شمار کہانیاں لکھی جاچکی ہیں اور بے شمار فلمیں بھی بن چکی ہیں۔

1000 (ایک ہزار قبل مسیح)

یہ وہ زمانہ تھا جب یروشلم میں حضرت داؤدؑ برسرِ اقتدار آئے۔ ہم نے اپنی مذہبی کتابوں میں ان کے حوالے سے بھی بہت کچھ جان لیا ہے۔

حضرت سلیمانؑ حضرت داؤدؑ ہی کے صاحبزادے تھے۔
حضرت داؤدؑ ایک پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے حکمران بھی تھے۔
یہی وہ دور ہے جب ہوسو جیسا بے بدل شاعر سامنے آیا۔
دنیا کا ہر پڑھا لکھا وہ شخص جس کو تاریخ، ادب اور فلسفے سے دلچسپی ہے ہوسو کے نام اور کاموں سے بہت اچھی طرح واقف ہے۔
لیکن کئی صدیوں تک ہوسو کی نظموں کے اصل مصنف کا مسئلہ زیر بحث رہا۔ یعنی ایلیڈ اور اوڈیسی جیسی شاہکار نظمیں کب، کہاں اور کن حالات میں لکھی گئیں۔ یا ایسا تو نہیں تھا کہ پہلے یہ دو مختصر نظمیں ہوں پھر ان کو بڑھا دیا گیا ہو یا پھر یہ کہ ایلیڈ اور اوڈیسی کسی ایک ہی شخص نے لکھی۔ یا یہ دو شاعروں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔
بہر حال چاہے کچھ بھی ہو، چھٹی صدی قبل مسیح ہی سے یہ دونوں نظمیں عظیم کلاسیکی ادب میں شمار ہونے لگی ہیں۔
یونانیوں نے اوڈیسی اور ایلیڈ کو اپنی قوم کا عظیم ادبی شہ پارہ قرار دیا ہے اور سچائی بھی یہی ہے۔
ہوسو کا یہ قول آج بھی دہرایا جاتا ہے کہ ایک مہینا بچا لینے کا مطلب یہ ہوا کہ ایک مہینا کی آمدنی ہوگئی۔
ہرسو کے اثرات کی عمر ستائیس اٹھائیس سو سے بھی زیادہ ہے۔

600 قبل مسیح

یہ مختصر جائزہ چھ سو قبل مسیح تا پانچ سو قبل مسیح کا ہے۔
چین میں لوہے کے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔
ایران میں ایک زبردست فکری تحریک زرتشت کی صورت میں سامنے آئی ہے۔
زرتشت کے بارے میں اگر چند باتیں کہہ دی جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔
آتش پرستوں کے لیے پیغمبر زرتشت کا زمانہ 628 تا 551 قبل مسیح کا ہے۔
یہ زرتشت مت کے بانی تھے۔ یہ مذہب 2500 سال سے رائج ہے۔ آج بھی اس کے ماننے والوں کی تعداد کم نہیں ہے۔
زرتشت کے بارے میں معلومات بہت کم ملتی ہیں۔
وہ موجودہ شمالی ایران کے پاس کہیں 628 قبل مسیح میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی میں انہوں نے اپنے نئے مذہب کی تبلیغ شروع کردی تھی۔
اوّل اوّل شدید مخالفت کا سامنا ہوا۔ تاہم جب وہ چالیس برس کے تھے تو شمالی ایران کے بادشاہ کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ بادشاہ ان کا دوست اور سرپرست بن گیا۔ ایرانی روایت کے مطابق زرتشت نے 77 برس عمر پائی۔
زرتشت مت (Monotiazism) اور Dualism کا ایک دلچسپ امتزاج ہے۔
زرتشت کے مطابق سچا خدا ایک ہی ہے اسے وہ آیورہ مزدہ کہتے ہیں۔ آیورہ مزدہ سچائی اور راست روی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔
زرتشت مت کے پیروکار ایک بدروح انگرومینیو پر بھی یقین رکھتے ہیں جسے جدید فارسی میں آہرمن کہا جاتا ہے۔
اسے شر اور جھوٹ کا نمائندہ کہا جاتا ہے۔ حقیقی دنیا میں آیورہ مزدہ اور آہرمن کے درمیان ایک جنگ جاری رہتی ہے۔
ہر شخص ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرفداری کے انتخاب میں آزاد ہے۔
زرتشت مت کے مطابق آخری جیت آیورہ مزدہ کی ہی ہوگی۔ اس الہیات میں حیات بعد الموت پر بھی ایقان موجود ہے۔
اخلاقی امور میں زرتشت مت راست دالں اور سچائی پر اصرار کرتا ہے۔ تجردی کی مانند تیاگ کے فلسفے کی بھی مخالفت کی گئی ہے۔
اس مذہب کے پیروکار مختلف مذہبی رسوم و عبادات ادا کرتے ہیں۔ جن میں سے بیشتر آگہی کے ساتھ ان کے مقدس تعلق پر مبنی ہیں۔
ان کی عبادت گاہوں میں آگ کا الاؤ ہمیشہ جلتا رہتا ہے۔ ان کی سب سے اہم رسم مردوں کو زمین میں دفن کرنے یا جلانے کی بجائے اونچے میناروں پر لٹکا دینا ہے۔ جہاں گدھ انہیں کھا جاتے ہیں۔
زرتشت جس علاقے میں پیدا ہوئے وہ چھٹی صدی قبل مسیح تک سائرس اعظم کی ایرانی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔
جب سکندر اعظم نے چوتھی صدی عیسوی کے آخری نصف میں ایرانی سلطنت کو فتح کیا تو زرتشت مت شدید انحطاط کا شکار ہو گیا تھا لیکن پھر ساسانی دور حکومت

(226ء سے 651ء) میں زرتشت مت نے ایران میں سرکاری مذہب کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔

ساتویں صدی عیسوی میں عربوں کے ایرانی سلطنت کے فتح کر لینے کے بعد ایرانی آبادی کے بیشتر حصے نے اسلام قبول کرلیا۔

دسویں صدی میں زرتشت مت کے بقیہ پیروکار ایران سے فرار ہوکر خلیج فارس کے ایک جزیرے چورمز چلے گئے۔ وہاں سے وہ خود یا ان کی نسلیں ہندوستان چلی گئیں۔ ہندوانہیں ان کے ایرانی تعلق کی وجہ سے پارسی کہنے لگے۔

اس دور میں بابلیوں نے یہودیوں کو مسخر کیا اور ہیکل سلیمان کو تباہ کردیا۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں مہاویر سامنے آئے۔

چونکہ مہاویر بھی تاریخ کے ایک اہم کردار تھے۔ اس لیے ان کے بارے میں جان لینا ضروری ہے۔

مہاویر کا زمانہ 599 تا 527 قبل مسیح کا ہے۔

مہاویر کا مطلب ہے عظیم سورما۔ جین مت کے پیروکار وردھامنا سے منسوب کرتے ہیں۔

یعنی مہاویر تو لقب تھا۔ نام تھا وردھامنا۔ شمال مشرقی ہندوستان (بہار) میں پیدا ہوئے۔ گوتم بدھ بھی اس کے نزدیکی علاقے میں پیدا ہوئے تھے۔

قارئین کی دلچسپی کے لیے یہ بتاتے چلیں کہ گوتم بدھ اور مہاویر کی سوانح عمریوں میں حیران کن مماثلتیں ہیں۔ جیسے وردھامنا ایک سردار کے بیٹے تھے۔ گوتم بدھ بھی ایک شہزادے تھے۔

مہاویر کی پرورش بھی بڑے ناز ونعم میں ہوئی۔ گوتم بھی اسی طرح عیش وعشرت میں پروان چڑھے۔

مہاویر نے تیس سال کی عمر میں اپنی امارت، خاندان، اپنی بیوی اور ایک بیٹی کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لی۔ گوتم نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

بارہ سال تک انتہائی تنگ دستی کی زندگی بسر کی۔ تنہائی میں غور وخوض کرتے رہے۔ مسلسل فاقہ کشی کی۔ ان کے پاس اپنی کوئی چیز نہیں تھی۔ حتیٰ کہ ایک چھوٹا سا پیالہ یا تھالی بھی نہیں تھی۔ ایک عرصہ انہوں نے ایک ہی لباس میں گزارا پھر اسے بھی پھاڑ ڈالا۔

بیالیس برس کی عمر میں مہاویر کو یقین ہوگیا کہ انہوں نے روحانی بالیدگی حاصل کرلی ہے۔ انہوں نے زندگی کے بقیہ تیس برس تبلیغ میں گزارے اور اس طرح ہندوستان میں

ملک ملک کے دلچسپ قوانین

☆ برطانیہ میں شاہی خاندان کے کسی پالتو جانور کے ساتھ آپ اپنے کسی پالتو جانور کی دوستی نہیں کرواسکتے۔

☆ اب ایک اور مزے کا قانون۔ کینٹکی میں کوئی عورت ایک ہی مرد سے تین بار سے زیادہ شادی نہیں کرسکتی۔

☆ ہندوستان کے کچھ علاقوں (گڑھوال، سکیم اور ہماچل پردیش میں) اگر کسی نے کسی سے قرض لے رکھا ہے تو وہ ضمانت کے طور پر اپنی بیوی کو قرض خواہ کے پاس رکھوا سکتا ہے جب تک قرض وصول نہ ہوجائے یعنی ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات۔

☆ یونان میں اگر مرد وعورت شادی کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اپنی شادی کا اعلان اخبار میں کرنا ہوگا اور وہ بھی یونانی زبان کے اخبار میں۔ اس کے علاوہ ٹی ہال کی دیوار پر بھی نوٹس چپکانا ہوگا۔

☆ ہانگ کانگ کا ایک قانون دیکھیں اور سر دھنیں۔ بیوی اگر اپنے شوہر کو بے وفائی کرتا ہوا پائے تو اس کو جان سے مار سکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ خالی ہاتھوں مارے گی (یعنی شوہر اتنا موقع دے دے گا؟)

☆ نیویارک میں ہارن بجانا منع ہے۔ پانچ سو ڈالرز تک کا جرمانہ ہوسکتا ہے۔

☆ برطانیہ میں وہیل مچھلی یا اسی قسم کا کوئی جانور شکار کرلیا جائے تو وہ قانون کے مطابق ملکہ کی ملکیت ہوجاتا ہے۔

☆ اٹلی میں کتوں کے مالکان کا یہ فرض ہے کہ دن میں تین بار اپنے کتے کو سیر کے لیے لے جایا کریں۔ (وہ بے چارہ تو اسی میں خرچ ہوجاتا ہوگا)۔

☆ ہونولولو ہوائی میں مغرب کے بعد بلند آواز میں گانا گانا منع ہے (ایک ہمارے فنکار حضرات ہیں جو رات بھر گلا پھاڑتے رہتے ہیں)۔

☆ وکٹوریا (آسٹریلیا) میں آپ اپنے گھر کا کوئی بلب بھی اس وقت تک نہیں بدل سکتے جب تک آپ باقاعدہ لائسنس ہولڈر الیکٹریشن نہ ہوں۔

☆ برطانیہ میں آج بھی قدیم دور کا ایک قانون رائج ہے کہ بچہ جب چودہ سال کا ہوجائے تو اسے تیر کمان کی تربیت دی جاتی ہے۔

☆ بنگلہ دیش میں وہ بچے جو پندرہ سال سے زیادہ کے ہوں اگر امتحان میں نقل کرتے پائے جائیں تو انہیں جیل بھیج دیا جاتا ہے۔

☆ فلوریڈا میں ایک بیوہ یا طلاق یافتہ خاتون کو اتوار کے دن غوطہ خوری کرنا منع ہے۔ (نہ جانے اس میں کیا مصلحت ہے اگر آپ کی سمجھ میں آتا ہو تو ہمیں بتادیں)۔

☆ سوئٹزرلینڈ میں آپ رات کے دس بجے کے بعد اپنے ٹوائلٹ کو فلش نہیں کرسکتے (لہٰذا جس کو اس قسم کی کوئی ضرورت ہو وہ دس بجے سے پہلے فارغ ہوجائے)۔

مرسلہ: منیزہ یاسمین۔ رحیم یار خان

جین مت کا آغاز ہوا۔

چند حوالوں سے مہاویر کے افکار بدھ مت اور ہندومت سے بہت مماثلت رکھتے ہیں۔ جین مت کرما پر بھی یقین رکھتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق انسان کے افعال کے اخلاقی نتائج اس کے مستقبل کے جون پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں (یعنی آواگون کا عقیدہ)۔

جین مت کے فلسفے میں ایک اہم جز ''اہنسا'' عدم تشدد بھی ہے۔ اس کے مطابق اہنسا کا اطلاق صرف انسانوں پر ہی نہیں بلکہ جانوروں پر بھی ہوتا ہے۔ جین مت کے پیروکار سبزی خور ہوتے ہیں۔ کٹر قسم کے جین ایک مکھی تک نہیں مارتے۔

اسی لیے یہ لوگ زراعت کی طرف نہیں گئے۔ کیونکہ ہل چلاتے ہوئے بہت سے کیڑے مکوڑے مر سکتے ہیں۔

اس مت میں ذات برادری کا کوئی نظام نہیں ہے۔

ہم نے جس دور کو سامنے رکھا ہے اس دور میں مہاویر سے سو سال قبل گوتم بدھ بھی سامنے آئے تھے۔ ہمارے قارئین گوتم بدھ کے حوالے سے بہت کچھ پڑھ چکے ہیں۔ اس لیے ہم تفصیل میں نہیں جا رہے۔

سائرس اعظم (590 تا 529)

اس دور میں سائرس اعظم نے بابل کو فتح کیا تھا۔

سائرس اعظم ایرانی سلطنت کا بانی تھا۔ اس نے جنوب مغربی ایران کے ایک ماتحت فرمانروا کے طور پر زندگی کا آغاز کیا اور غیر معمولی فتوحات حاصل کرتے ہوئے تین بڑی سلطنتوں کو تہہ و بالا کر دیا۔ ان میں میڈیوں، لیڈیوں اور بابلیوں کی سلطنتیں شامل تھیں۔

بعد ازاں قدیم مشرقِ وسطیٰ کے ایک بڑے حصے کو ایک ہی ریاست کی صورت میں متحد کیا جو ہندوستان سے بحیرۂ روم تک پھیلی ہوئی تھی۔

سائرس کا اصل نام کورش تھا۔ پرس کے صوبے میں 590 قبل مسیح پیدا ہوا۔ سائرس کے حوالے سے ایک کہانی بھی بیان کی جاتی ہے۔ وہ کہانی کچھ یوں ہے۔

سائرس میڈیوں کے بادشاہ ایستاجیس کا پوتا تھا۔ اس کی پیدائش سے پہلے ایستاجیس نے ایک خواب دیکھا کہ اس کا پوتا اس کی تباہی کا سبب بنے گا۔

اس نے حکم دیا کہ بچے کو پیدائش کے فوراً بعد قتل کر دیا جائے۔ جس کارندے کو یہ کام سونپا گیا اس میں ایسا کام کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے وہ بچہ ایک گڈریے کے حوالے کر دیا۔ جس نے اس کی پرورش کی۔ اور یہی بچہ بڑا ہو کر سائرس کہلایا اور اس نے بادشاہ کا تختہ الٹ دیا۔

سائرس کی داستان بہت طویل ہے لیکن ہم اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف اتنا بتا رہے ہیں کہ سائرس ایک بے پایاں فوجی اہمیت کا حامل شخص تھا تاہم یہ اس کی شخصیت کا صرف ایک پہلو تھا۔ زیادہ اہم بات اس کی خلیق اور نرم خو فرمانروائی تھی۔ مقامی مذاہب اور رسوم و رواج کے حوالے سے اس کا رویہ نہایت معتدل اور تحمل پسندانہ تھا۔ وہ وحشت اور بربریت سے نفرت کرتا تھا۔ جو اس سے پہلے کے بادشاہوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ جب سائرس نے بابل فتح کیا تو اس نے یہودیوں کو اپنے وطن واپس جانے کی اجازت دے دی۔

اگر سائرس نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ یہودی اپنے وطن کو دیکھے بغیر پانچویں صدی مسیح میں ہی وہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتے۔

500 قبل مسیح

اب ہم آجاتے ہیں پانچ سو قبل مسیح سے چار سو ایک سال قبل مسیح تک۔

اس دور میں ہی تاریخ انسانی نے دنیا کے مختلف خطوں میں بہت سے دیوقامت لوگ دیکھے۔ بے شمار واقعات رونما ہوئے۔ جن میں میراتھن کی جنگ بہت مشہور ہے۔ اس جنگ میں اعلیٰ اسلحہ سازی کا چلن عام ہوا تھا۔

اس عہد کے بڑے لوگوں میں کنفیوشش، سوقعہ کلیز، پریلکو، ہیروڈوٹس، ہپوکریٹس اور ریموقراطیس وغیرہ ہیں۔

کنفیوشش تاریخ کا ایک اہم انسان۔ آئیں ذرا اس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

کنفیوشش لو کی مختصر ریاست میں 551 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں باپ کے سائے سے محروم ہو گیا تھا۔

عظیم چینی فلسفی کنفیوشش پہلا آدمی تھا جس نے چینی عوام کے بنیادی اعتقادات کو ملا کر عقائد کا ایک نظام وضع کیا۔

اس کے فلسفے نے چینی زندگی اور تہذیب کو دو ہزار برسوں سے زائد اپنے سحر میں رکھا اور دنیا کی آبادی کے ایک بڑے حصے پر گہرے نقوش مرتب کیے۔

کنفیوشش کو عام طور پر ایک مذہب کے بانی کے طور پر جانا جاتا ہے لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ اس نے خدا

کے متعلق کوئی فلسفہ نہیں دیا اور نہ ہی حیات بعد از موت جیسے موضوعات پر بات کی۔

وہ صرف ایک اخلاقی درس دینے والا بڑا فلسفی تھا۔ اس کی دلچسپی کا مرکز شخصی اور سیاسی اخلاقیات اور کردار تھا۔

اس کے فلسفے کے مطابق دو انتہائی اہم فضیلتیں Jen اور Li ہیں۔ عظیم انسان ان ہی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

اس کے بے شمار اقوال آج بھی دہرائے جاتے ہیں۔ ''جس فعل کو تم اپنے لیے ناپسند کرو ویسا دوسروں کے ساتھ بھی نہ کرو۔''

اس دور کے حکمرانوں کے لیے کنفیوشش کے یہ افکار قابل قبول نہ تھے لیکن اس کی موت کے بعد پورے ملک اور دنیا میں پھیل گئے۔

اس عہد کا ایک اور اہم نام ''ہیروڈوٹس'' کا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک عظیم مؤرخ گزرا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ اس شخص کی وجہ سے ہم انسانی تاریخ کے بے شمار واقعات سے روشناس ہوئے ہیں۔

اب ہم آگئے ہیں 400 قبل مسیح سے 301 قبل مسیح تک

اس دور میں انسانی تاریخ کے بہت سے قد آور لوگ پیدا ہوئے۔ بے شمار ایسے واقعات ہوئے جن کی چاپ اب تک انسانی تاریخ اور افکار پر ہے۔

جیسے اس دور کے واقعات اور کردار۔

سقراط کی موت، افلاطون، ارسطو، سکندر اعظم، مانی، لاؤتسو وغیرہ۔

یہ وہ باکمال لوگ تھے جنھوں نے انسانی فکری دھارے کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا اور اتنی صدیاں گزرنے کے بعد بھی ہم ان کی ذہنی صلاحیتوں کے حصار میں ہیں۔

سقراط

سقراط چونکہ تاریخ کا ایک اہم ترین فرد ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں تھوڑی سی معلومات دیتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔

آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے سقراط نے حق گوئی کی پاداش میں زہر کا پیالہ قید خانے میں نوش کیا تھا۔

سقراط سے پہلے بھی یونان میں فلسفی موجود تھے لیکن ان کی فکر کا محور عام طور پر خارج کی اشیاء (زمین، چاند، ستارے، سمندر وغیرہ) کی ماہیت ہوتی تھی۔ سقراط نے قرار دیا کہ چونکہ انسان کی نمایاں خصوصیات سوچنا ہے اور انسان کی بنیادی اخلاقی ذمے داری اپنے آپ کو انسانیت کا بہترین نمونہ بنانا ہے۔ لہٰذا دانش اچھائی کی کلیہ اور خلاصہ ہے۔

اپنی کتاب سقراط میں منصور الحمید نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جس قسم کی حق پرستی، موت سے بے خوفی، اخلاقی تعلیم، پاکیزگی کردار اور تصور سقراط کے یہاں نظر آتا ہے وہ صرف انبیاء کے یہاں نظر آتا ہے۔

وہ شخص ایک فلسفی اور دانش ور ہی نہیں تھا بلکہ غالباً انبیاء کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جسے خدا نے ہر قوم ہر گروہ کی ہدایت کے لیے اتارا ہے۔

ایتھنز (یونان) کی گلیوں میں حق و صداقت کی تبلیغ کرنے والا یہ شخص حکمرانوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا۔ اس پر مقدمہ چلا اور موت کی سزا سنا دی گئی۔ اس نے اپنی موت سے پہلے جو تقریر کی اس کا شمار کلاسک میں ہوتا ہے۔

اس دور کا دوسرا اہم ترین انسان افلاطون ہے۔

افلاطون کا شمار مغربی فکر کے عظیم بانیوں میں ہوتا ہے۔

افلاطون ایتھنز کے ایک ممتاز گھرانے میں 427

وارث شاہ

مشائخ قادریہ، سید قطب شاہ کے بیٹے اور ہیر رانجھا کے مصنف، 1135ء یا 1140ء میں ضلع شیخوپورہ میں جنڈیالہ شیر خاں میں پیدا ہوئے۔ ذرا بڑے ہوئے تو تحصیلِ علم کی خاطر قصور گئے اور مسجد کوٹ قصور میں مولانا غلام محی الدین سے فیض حاصل کیا۔ ان کے بعد حضرت بھلے شاہ کے ساتھ مولانا غلام مرتضٰی قصوری کے شاگرد ہوئے۔ یہاں سے پاک پتن شریف میں حضرت بابا فرید گنج شکر کے مزار پر حاضری دی۔ پھر ٹھٹھہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ یہیں وارث شاہ اور بھاگ بھری کی متنازعہ داستانیں لکھیں۔ کچھ عرصے بعد پاک پتن کے قریبی گاؤں ملکہ ہانس چلے گئے۔ قصہ ہیر رانجھا بھی وہیں کی تحریر ہے۔ پھر لاہور اور قصور سے ہوتے ہوئے واپس جنڈیالہ شیر خاں چلے گئے یہیں وفات پائی۔ آپ کی قبر ایک چار پانچ فٹ اونچے احاطے میں گاؤں کے باہر ہے۔ آپ کے ساتھ آپ کے والد اور بھائی کے مقابر ہیں۔

مرسلہ: نادر شاہ، کوہاٹ

قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ نوجوانی میں اس کی ملاقات سقراط سے ہوئی جو اس کا دوست اور رہنما بن گیا۔

399 سال قبل مسیح میں ستر برس کی عمر میں سقراط پر بے دینی اور ایتھنز کے نوجوانوں کو ورغلانے کے مبہم الزامات کے تحت مقدمہ چلایا گیا اور موت کی سزا سنا دی گئی۔

سقراط کی موت نے افلاطون کے دل میں جمہوری حکومت کے لیے مستقل نفرت بھر دی۔ سقراط کی موت کے بعد اس نے ایتھنز چھوڑ دیا اور دس بارہ سال سفر میں گزارے۔

واپس آ کر اس نے ایک مدرسے کی بنیاد رکھی۔ جس کا نام اکادمی رکھا گیا۔ اس کی یہ اکادمی نو سو سال سے زائد عرصے تک قائم رہی۔

افلاطون نے زندگی کے بقیہ چالیس سال ایتھنز میں گزارے۔ وہ درس و تدریس میں مصروف رہا۔ اس کا سب سے معروف شاگرد ارسطو تھا۔

افلاطون نے قریب چھتیس کتابیں تحریر کیں۔ ان میں سے بیشتر سیاسی اور اخلاقی مسائل پر بحث کرتی ہیں۔ اس نے مابعد طبیعات اور الہیات پر بھی لکھا۔

وہ پہلا اہم فلسفی تھا اور آیندہ طویل عرصے تک اس جیسا کوئی دوسرا پیدا بھی نہیں ہوا جس نے عورت اور مرد کی برابری کی بات کی ہو۔

افلاطون نے ریاست کو بچوں کی نگہداشت کا ذمے دار قرار دیا۔ اس نے شاعری، موسیقی وغیرہ کو ممنوعہ علوم قرار دیا۔ اس نے ایک مکمل تعلیمی نظام دیا۔ اس کی کتاب ''جمہوریہ'' سوچوں کے دروازے کھولنے والی بے مثال کتاب ہے۔

غرض یہ کہ افلاطون کسی ایک شخص کا نہیں بلکہ ایک مکتبہ فکر کا نام ہے۔ جس نے پوری دنیا کو صدیوں سے اپنے حصار میں رکھا ہے۔

ارسطو کا بھی یہی دور ہے۔ وہ افلاطون کا شاگرد اور دوست تھا۔

ارسطو کا زمانہ 384 سے 322 قبل مسیح کا ہے۔

ارسطو یونان کا قدیم... عظیم ترین فلسفی اور سائنس داں تھا۔ اس نے باضابطہ منطق کے مطالعے کا آغاز کیا۔ فلسفہ کی تقریباً ہر شاخ میں خاطر خواہ کام کیا اور سائنس میں کئی اضافے کیے۔

اس کے انفرادی نظریات سے کہیں زیادہ اہم اس کی تحریروں میں موجود عقلی رویّہ ہے۔

ارسطو کی پیدائش مقدونیہ کے ایک قصبے سٹاگیرا میں 384 قبل مسیح میں ہوئی۔ سترہ برس کی عمر میں ارسطو ایتھنز جا کر افلاطون کی اکادمی میں داخل ہو گیا۔

وہ وہاں بیس برس رہا۔ افلاطون کی موت کے بعد اس نے اکادمی چھوڑ دی۔

مقدونیہ واپس آ کر وہ بادشاہ کے تیرہ سالہ بیٹے کا معلم بن گیا۔ جسے بعد میں سکندر اعظم کے نام سے جانا گیا۔ ارسطو نے متعدد برس سکندر کی تعلیم و تربیت کی۔

سکندر کی تاج پوشی کے بعد ارسطو واپس ایتھنز آیا۔ اس نے اپنا مدرسہ لائسیم کے نام سے قائم کیا۔

سکندر کی موت کے بعد مقدونیہ کے دشمن عناصر نے ایتھنز میں اقتدار حاصل کر لیا۔ ارسطو پر الحاد کا الزام لگایا گیا۔

ارسطو کے سامنے سقراط کا انجام تھا۔ وہ شہر سے فرار ہو گیا اور جلاوطنی میں اس کی موت واقع ہو گئی۔

ارسطو کی اثر انگیزی اس قدر گہری تھی کہ اسے دیوتا کی طرح سمجھا جانے لگا تھا۔

تاریخ عہد بہ عہد کا سلسلہ جاری ہے۔

ہم نے تفصیل اور جزئیات میں جانے کی بجائے خاص خاص واقعات اور کرداروں پر توجہ کی ہے اور خط وقت (Timeline) کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ یہ سلسلہ جلد نمٹ جائے۔ اس کو یکلخت درمیان میں چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

اس قسط میں 399 قبل مسیح تک آ گئی ہے۔

اس عہد کے اور بھی بہت سے لوگ ہیں جن کے بارے میں اگلی قسط میں بتایا جائے گا۔ جیسے سکندر اعظم، مانی، لاؤتسو وغیرہ۔

اس کے بعد کی قسط میں ہم پوری دنیا کا اس طرح طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے پہلی صدی عیسوی تک آ جائیں گے۔

اور اس کے بعد یہ سلسلہ آخری قسط میں 2015ء تک لا کر ختم کر دیا جائے گا۔

اپنی اس کاوش کے بارے میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں اگر قبول افتد زہے عز و شرف۔

مشرقی پاکستانی فلمیں

عقیل عباس جعفری

ہمارا وہ شکستہ بازو جہاں ہنر مندوں کی بہتات تھی مگر فلمی دنیا بہت پچھڑی ہوئی تھی پھر بھی شہ پارے تخلیق ہورہے تھے۔ اداکار و موسیقار گلوکار و ہدایت کار تاریخ مرتب کررہے تھے۔ گویا ہماری سنہری فلمی دنیا کے دور کا ایک جگمگاتا باب وہاں بھی رقم ہو رہا تھا لیکن شومئی قسمت سیاست دانوں کی چالوں نے اسے بھلانے کی پوری کوشش کردی۔ نئی پود تو بالکل نہیں جانتی کہ وہ بھی ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہے۔

سقوط مشرقی پاکستان کے حوالے سے ایک عمدہ تحریر

دسمبر کا مہینا آتا ہے تو دل بے ساختہ ڈھاکا کی یاد سے مرجھا جاتا ہے اور ایک ٹیس سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے۔ 25 مئی 1959ء کو ریلیز ہونے والی ”جاگو ہوا سویرا“ سے 16 دسمبر 1971ء تک پاکستان کی فلمی صنعت کا یہ باب 58 فلموں پر محیط ہے۔ کون ہے جسے چندا، تلاش، سنگم، کارواں، ملن، کاجل، آخری اسٹیشن، بھیا، نواب سراج الدولہ، چکوری، درشن، چھوٹے صاحب، شہید تیتو میر، پیاسا، اناڑی، کنگن اور چلو مان گئے جیسی فلمیں یاد نہیں۔

ڈھاکا کی اُردو فلمی صنعت پاکستان کی فلمی تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہے مگر بد قسمتی سے نہ صرف بنگلہ دیش بلکہ پاکستان کے فلمی مؤرخین بھی پاکستان کی فلمی تاریخ کے اس باب سے صرف نظر کرتے ہیں۔ ڈھاکا کی اُردو فلمی صنعت نے پاکستان کی فلمی صنعت کو شبنم، رحمان، ہارون اور ندیم جیسے فنکار، سرور بارہ بنکوی، اختر یوسف اور شاعر صدیقی جیسے شاعر اور روبن گھوش و بشیر احمد جیسے موسیقار عطا کیے۔

ڈھاکا کی اُردو فلمی صنعت اپنی کئی اولیات کی وجہ سے بھی یادگار قرار پائی۔ پاکستان کی پہلی آرٹ فلم ”جاگو ہوا سویرا“ کو مانا جاتا ہے۔ 25 مئی 1959ء کو ریلیز ہونے والی اس فلم کے فلم ساز نعمان تاثیر اور ہدایت کار اے آر کاردار تھے۔ اس فلم کی کہانی اور نغمات فیض احمد فیض کے زور قلم کا نتیجہ تھے

اور موسیقی تیمر برن نے ترتیب دی تھی۔ خان عطاء الرحمٰن ترپتی مترا، زرین رخشی، قاضی خالق، نسیمہ نمایاں ستارے تھے۔ یہ فلم پاکستان میں تو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکی تھی لیکن اس نے کئی بین الاقوامی اعزاز حاصل کیے تھے۔ ان اعزازات میں ماسکو انٹرنیشنل فلم فیسٹیول کا دوسرا انعام اور امریکا کی رابرٹ فلے ہارٹی فلم فاؤنڈیشن کا 1959ء کا کسی غیر ملکی زبان کی بہترین فلم کا اعزاز سرفہرست تھے۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ پاکستان میں باکس آفس پر ناکام قرار دی جانے والی اس فلم کی نمائش امریکا، سویت یونین، فرانس، بیلجیم مشرقی افریقا اور چین میں بھی ہوئی تھی جس کے لیے اسے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں سب ٹائٹلو کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔

اس فلم کے بعد ڈھاکا میں تیار ہونے والی اگلی فلم چندا تھی جو 3 اگست 1962ء کو پاکستان بھر کے سینما گھروں میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس فلم کے فلم ساز ایف دوسانی اور ہدایت کار احتشام تھے، موسیقی روبن گھوش نے ترتیب دی تھی اور فلم کے مرکزی اداکاروں میں سلطانہ زمان اور رحمان کے ساتھ ایک گم نام اداکارہ جھرنا بھی شامل تھی جس نے اس فلم میں شبنم کے نام سے کام کیا اور اگلے بیس برس تک پاکستان کی فلمی صنعت پر راج کرتی رہی جو بذاتِ خود ایک ریکارڈ ہے، چندا ڈھاکا میں تیار ہونے والی پہلی فلم تھی جس نے نہ صرف سال کی بہترین فلم کا نگار ایوارڈ حاصل کیا بلکہ اس فلم میں شبنم بھی بہترین معاون اداکارہ کا ایوارڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔

پاکستان کی پہلی مکمل رنگین فلم بھی ڈھاکا ہی میں بنی تھی۔ اس فلم کا نام تھا سنگم۔ 23 اپریل 1964ء کو عیدالاضحیٰ کے موقع پر ریلیز ہونے والی اس فلم کے ہدایت کار اور کہانی نگار ظہیر ریحان تھے۔ سنگم کی موسیقی خان عطا الرحمٰن نے ترتیب دی تھی جب کہ اس کے نغمات شاعر صدیقی نے تحریر کیے تھے۔ اس فلم کے مرکزی کردار ہارون اور روزی نے ادا کیے تھے۔ اس فلم کا ایک نغمہ "ہزار سال کا جو بڈھا مر گیا تو دھوم دھام سے اسے دفن کرو" فلم کے پرانے شائقین کی یادوں میں شاید آج بھی محفوظ ہوگا۔ جاگو ہوا سویرا کے برعکس سنگم باکس آفس پر خاصی کامیاب رہی اور اپنے اس اعزاز کے باعث کہ یہ پاکستان کی پہلی مکمل رنگین فلم تھی، پاکستان کی فلمی تاریخ میں

جاگو ہوا سویرا کا یونٹ

نے ڈائریکٹ کیا تھا جب کہ موسیقی خان عطاء الرحمٰن نے ترتیب دی تھی۔ ''بہانہ'' کی کچھ عکس بندی کراچی میں بھی ہوئی تھی اور اس فلم میں احمد رشدی، مسعود رانا اور ساتھیوں کی آواز میں کراچی کے حوالے سے لکھے گئے دو گیت بھی شامل کیے گئے تھے جن کے بول تھے، شہر کا نام ہے کراچی، کھو نہ جانا یہاں اور ڈھاکا دیکھا، پنڈی دیکھی اور دیکھا لاہور، لیکن قسمت میں تھا۔ کراچی، جس کا اور نہ چھور، ایسی کراچی سے تو ہم باز آئے، اس آخر الذکر گیت میں آئرن پروین کی آواز بھی شامل تھی جو کابوری پر عکس بند ہوئی تھی۔ سنگم کی کراچی میں یہ فلم بھی 13 اپریل 1965ء کو عیدالاضحیٰ کے موقع پر ریلیز ہوئی تھی۔

1967ء میں بھی عیدالاضحیٰ کے موقع پر ڈھاکا میں ریلیز ہونے والی فلم چکوری ایک بلاک بسٹر فلم ثابت ہوئی۔ یہ گلوکار نذیر بیگ کی بطور اداکار پہلی فلم تھی جنہیں اس فلم کے لیے ندیم کا نام دیا گیا تھا۔ 22 مارچ 1967ء کو ڈھاکا اور 19 مئی 1967ء مغربی پاکستان میں ریلیز ہونے والی اس فلم کے فلم ساز ایف دوسائی اور ہدایت کار احتشام تھے، کہانی عطاء الرحمٰن نے تحریر کی تھی، موسیقی روبن گھوش نے ترتیب دی تھی جب کہ نغمات اختر یوسف نے تحریر کیے تھے۔ چکوری میں ندیم کے مقابل مرکزی کردار اداکارہ شبانہ نے ادا کیا تھا۔ چکوری ندیم کی طرح ان کی بھی بطور ہیروئن پہلی فلم تھی۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد اس جوڑی نے کئی اور فلموں میں بھی کام کیا جن میں چھوٹے صاحب، تم میرے ہو، قلی، داغ، چاند اور چاندنی، چاند سورج اور اناڑی کے نام شامل ہیں۔ سقوط ڈھاکا کے بعد شبانہ بنگلہ فلموں کی سپر اسٹار بنیں۔ ان کی ''دسورانی'' (ڈاکو رانی) نے کامیابی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔

چکوری کے علاوہ بھی ڈھاکا میں ایسی کئی فلمیں بنیں

ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئی۔

اسی برس دسمبر کی چار تاریخ کو ایک ایسی فلم ریلیز ہوئی جو اپنی اس خصوصیت کی بنا پر کہ وہ پاکستان کی پہلی فلم تھی جس کی تمام تر عکس بندی بیرونِ ملک ہوئی تھی، فلمی تاریخ میں اپنا نام محفوظ کروا گئی۔ یہ فلم ''کارواں'' تھی جس کے فلم ساز ایم صادق اور ہدایت کار ایس ایم پرویز تھے۔ اس فلم کو نیپال کے مسحور کن مقامات پر عکس بند کیا گیا تھا۔ فلم کے مرکزی اداکاروں میں شبنم اور ہارون شامل تھے جب کہ اس کی موسیقی روبن گھوش نے ترتیب دی تھی۔

پاکستان کی پہلی سینما اسکوپ فلم بھی ڈھاکا ہی میں تیار ہوئی تھی۔ یہ فلم ''بہانہ'' تھی جسے سنگم کے ہدایت کار ظہیر ریحان

جن میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فن کاروں نے مرکزی کردار ادا کیے۔ ''تنہا'' میں شمیم آراء ''ملن'' میں دیبا ''بھیا'' میں وحید مراد ''کنگن'' میں سنگیتا ''لوان جنگل'' میں عالیہ اور ''جلتے سورج کے نیچے'' میں روزینہ کی اداکاری کو بھلا کون بھلا سکتا ہے۔

ڈھاکا میں بعض تاریخی موضوعات پر بھی فلمیں بنائی گئیں۔ ان فلموں میں فلم ساز محبوب الرحمٰن اور ہدایت کار خان عطاء الرحمٰن کی فلم نواب سراج الدولہ اور ہدایت کار ابن میزان کی فلم شہید تیتو میر کے نام سے سرفہرست ہیں ان دونوں فلموں میں مرکزی کردار انورحسن نے ادا کیے تھے۔

ڈھاکا کی اُردو فلمی صنعت کا یہ مختصر احوال فلم ''درشن'' کے تذکرے کے بغیر ادھورا رہے گا۔ 8 ستمبر 1968ء کو ریلیز ہونے والی اس فلم کے فلم ساز کلم کم اور ہدایت کار رحمٰن تھے جنہوں نے اس فلم میں شبنم کے ہمراہ مرکزی کردار بھی ادا کیا تھا۔ درشن کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب اس کے خوب صورت نغمات تھے جنہیں لکھا بھی بشیر احمد نے تھا، گایا بھی بشیر احمد نے تھا اور موسیقی بھی بشیر احمد نے ترتیب دی تھی۔ ان نغمات نے پاکستان بھر میں دھوم مچا دی۔ ان نغمات میں، یہ موسم یہ مست نظارے، دن رات خیالوں میں تجھے یاد کروں گا، گلشن میں بہاروں میں تو ہے، ہم چلے چھوڑ کر، تمہارے لیے اس دل میں، چل دیے تم جو دل توڑ کر، شامل ہیں۔

جب کہ اس فلم میں شامل مالا بیگم کا گایا ہوا نغمہ ''یہ سماں پیارا پیارا'' بھی اپنی شاعری اور موسیقی کی وجہ سے بے حد مقبول ہوا تھا۔

ڈھاکا میں جاگو ہوا سویرا کے علاوہ کئی اور تجرباتی فلمیں بھی بنیں جنہیں آج کل کی آرٹ فلموں کی پیش رو بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان فلموں میں سوئے ندیا جاگے پانی، ساگر اور ایندھن کے نام سرفہرست ہیں۔ ڈھاکا کی فلمی صنعت سے لاہور اور کراچی کی فلمی صنعت کو بھی بڑا سہارا ملا کرتا تھا۔ یہاں بننے والی فلمیں نہ صرف ڈھاکا میں اچھا خاصہ بزنس کرتی تھیں بلکہ کئی ایسی بھی تھیں جو مغربی پاکستان میں فلاپ ہوئیں مگر مشرقی پاکستان میں سپر ہٹ ثابت ہوئیں۔ ایسی فلموں میں فلم ''اک نگینہ'' کا نام سرفہرست ہے۔

بعض فلمی ڈائریکٹروں، فلمی تاریخوں اور ویب سائٹس میں ڈھاکا میں بننے والی آخری اُردو فلم جلتے سورج کے نیچے بتائی جاتی ہے۔ یہ بات اس لحاظ سے تو درست ہے کہ 10 ستمبر 1971ء کو نمائش پذیر ہونے والی اس فلم کے بعد ڈھاکا میں بننے...... والی کوئی اور فلم نمائش پذیر نہیں ہوئی لیکن یہ فلم ڈھاکا میں بننے والی آخری اُردو فلم نہیں تھی۔ اس فلم کے بعد ڈھاکا میں جو اُردو فلمیں بنیں ان میں بالا، مرزا اکل اور راہی شامل تھیں اور شبانہ مرکزی اداکارہ تھیں۔ بالا میں مرکزی کردار انور حسین اور انورا نے ادا کیے تھے۔ مرزا اکل میں حنیف اور شبانہ مرکزی فن کار تھے جب کہ راہی کی ہیروئن نسیمہ خان تھیں۔ یہ تینوں فلمیں سقوط ڈھاکا سے پہلے مکمل ہو گئی تھیں مگر پھر ان کی نمائش کی نوبت نہ آسکی۔ ان تمام فلموں کے بعد 1974ء میں ڈھاکا میں ایک اور اُردو فلم ''جانے انجانے'' بھی بنی جس میں اداکار محمد علی نے کام کیا تھا۔ مگر یہ فلم صرف بنگلہ دیش میں ریلیز ہوئی۔ پاکستانی ناظرین اس فلم کے دیدار سے محروم رہے۔

مس فٹ

انور فرہاد

پاکستانی فلم انڈسٹری کو کھائی میں دھکیلنے کا کام کسی دوسرے نے کم کم کیا ہوگا لیکن فلم نگری سے وابستہ افراد نے خوب خوب کیا' چند روپوں کے لیے اپنے مفاد کی خاطر اس صنعت کو نقصان پہنچایا گیا۔ پاکستان میں ہنر مندوں کی کبھی کمی نہیں رہی لیکن ہنر مندوں کا اس بری طرح استحصال ہوا کہ اب سمجھ میں آرہا ہے کس کس طرح ہنر مندوں کو ترسایا گیا۔ کیسی انہوں نے دشوار زندگی گزاری اس کی ایک جھلک اس سوانح سے عیاں ہے۔

ایک نامور فلمی لکھاری کے زندگی کا عکاس

آج سے ٹھیک سو سال پہلے یعنی 1915ء میں کوکلانور ضلع گورداس پور (بھارتی پنجاب) میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس کے باپ فضل کریم نے اس کا نام محمد حسین رکھا۔ بچے تو سب ہی اچھے ہوتے ہیں اور ماں باپ کو تو چاند کے ٹکڑے نظر آتے ہیں مگر فضل کریم کو تو اپنا یہ بیٹا بہت ہی اچھا، بہت ہی پیارا اور اپنے جگر کا ٹکڑا لگتا تھا۔ فضل کریم نے اسے بڑے لاڈ پیار سے پالا پوسا۔ جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اس کی باتیں، اس کی عادتیں، اس کی عمر کے دوسرے بچوں سے

زیادہ سوجھ بوجھ کی محسوس کی جانے لگیں۔

"ماشاء اللہ میرا بیٹا بہت ذہین ہے۔" فضل کریم نے بیوی سے کہا۔ "میں تو اسے لکھا پڑھا کر بہت بڑا آدمی بناؤں گا۔ وہ دفتر کا بابو بن کر ہمارا نام روشن کرے گا۔"

اور جیسے ہی محمد حسین کی عمر چار پانچ سال ہوئی۔ فضل کریم نے اسے کلانور کے ایک سرکاری اسکول میں داخل کرا دیا۔ اسکول میں اس کی ذہانت کے جوہر کھل کر سامنے آنے لگے۔ وہ ہر جماعت میں امتیازی نمبروں سے پاس ہونے لگا۔ اسکول کے اساتذہ بھی اس ہونہار طالب علم سے پیار کرنے لگے اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب محمد حسین نے میٹرک کا امتحان بھی بڑے شاندار نمبروں کے ساتھ پاس کرلیا۔ فضل کریم کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ عزیزوں اور دوست احباب نے مبارک باد دے کر کہا۔

"فضل کریم! بیٹے کو اب کسی دفتر میں بابو لگوا دو، اب وہ تمہارا ہاتھ بٹانے کے قابل ہو گیا ہے۔"

اس زمانے میں میٹرک کی تعلیم کو بھی بہت سمجھا جاتا تھا اور میٹرک پاس تو جوانوں کو دفتروں میں آسانی سے کلرک کی ملازمت مل جاتی تھی۔ جسے لوگ بہت بڑی بات سمجھتے تھے۔

"نہیں...... میں اپنے بیٹے کو ابھی اور پڑھاؤں گا۔" فضل کریم نے بڑے پُراعتماد لہجے میں مشورہ دینے والوں کو کہا۔ "ویسے بھی ابھی اس کی عمر نوکری کرنے کی نہیں۔ نہ ہی فی الحال مجھے اس کی کمائی کی ضرورت ہے۔"

اس طرح محمد حسین کو مزید تعلیم کے لیے پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ کردیا گیا اور اس ذہین اور متین طالب علم نے صرف 21 سال کی عمر میں اسی یونیورسٹی سے امتیازی نمبروں سے بی اے پاس کرلیا۔ ماں باپ اور عزیز و اقارب کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا مگر اس خوشی کے ساتھ ہی فضل کریم کو ایک جھٹکا سا بھی لگا جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا پتر شاعری کرنے لگا ہے۔

محمد حسین کو شاعری کا چسکا تو بچپن ہی سے لگ گیا تھا۔ وہ چھوٹی موٹی نظمیں کہہ کر اپنے اسکول کے ساتھیوں کو سناتا تھا اور اسکول میں ہونے والی تقاریب میں بھی اپنے اشعار سناتا تھا مگر شاید اس کے والد کو اس بات کی خبر نہیں تھی۔ اب جو گریجویشن کے بعد اس کی اس لت کی اطلاع ملی تو وہ سوچنے لگا۔

"یہ کیا ہو گیا ربا! میں نے تو سوچا تھا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وہ کوئی بڑا آدمی بنے گا مگر وہ تو...... وہ تو شاعر بن گیا ہے۔ شاعری کس کو راس آئی ہے کہ اسے آئے گی۔ بس واہ واہ کے نشے میں اپنی ساری زندگی تباہ کر لیتے ہیں یہ شاعر لوگ۔"

مگر اس نے اپنے ان جذبات و احساسات سے بیٹے کو آگاہ نہیں کیا کہ فضل کریم کے خیال میں پتر جوان ہو گیا ہے۔ اس سے اب کچھ کہنا اچھا نہیں ہوگا۔

دوسری طرف محمد حسین کی شاعری بھی اس کی عمر کے ساتھ ساتھ جوان ہو گئی تھی۔ اس کی نظمیں اور غزلیں ادبی حلقوں میں بھی سنی جانے لگی تھیں۔ ایک مشاعرے میں اس سے ایک سینئر شاعر نے کہا۔

"پتر! تم میں ایک اچھے شاعر بننے کی خوبیاں موجود ہیں اس لیے تمہیں اپنی شاعری کو نکھارنے اور سنوارنے کے لیے ضروری ہے کہ کسی مستند شاعر کو اپنا کلام دکھالیا کرو۔ اس طرح تمہارے کلام میں جو فنی کمزوریاں ہوں گی وہ دور ہو جائیں گی۔"

محمد حسین کو یہ مشورہ پسند آیا اور اس نے تلاش بسیار کے بعد کلانور کے ایک بزرگ شاعر نفیس خلیلی کا انتخاب کیا اور اپنے کلام کی اصلاح ان سے کروانے لگا۔ نفیس خلیلی صاحب مستند شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تھیٹر ڈراموں کی ہدایت کاری بھی کرتے تھے۔ یہی وہ نفیس خلیلی تھے جنہوں نے صبیحہ خانم کے پہلے ڈرامے "بت شکن" کی ہدایت کاری بھی کی تھی۔ صبیحہ خانم کی نئی زندگی کی ابتدا اسٹیج اداکاری سے ہوئی تھی۔ ان کا پہلا اسٹیج ڈراما "بت شکن" تھا۔ "بت شکن" کے مصنف عزیز میرٹھی تھے۔ انہوں نے بعد میں پاکستانی فلموں کے نامور رائٹر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

شاعروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بڑے حساس ہوتے ہیں۔ بڑے حسن پرست ہوتے ہیں۔ ان کا دل ہر خوب صورت چیز کو دیکھ کر ضرور متاثر ہوتا ہے۔ محمد حسین بھی ایسا ہی ایک شاعر تھا۔ حسن کسی روپ میں ہو، اسے دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں اور پھر یوں ہوا کہ ایک دن ایک نوجوان حسینہ نے اس نوجوان شاعر کو اپنی زلفوں کا اسیر بنالیا۔ محمد حسین کو تو یوں لگا جیسے اس نے اپنی زندگی کا مقصد حاصل کرلیا ہے۔ شاعروں، ادیبوں اور دیگر فن کاروں سے لڑکیاں بہت جلد متاثر ہو جاتی ہیں۔ انہیں دوست بنا لیتی ہیں۔ ان کے ساتھ وقت گزار کر ادب اور آرٹ سے اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کرتی ہیں۔ ایسے میں فن کار خوش گمانیوں کی جانے کتنی منزلیں طے کر لیتے ہیں۔ محمد

حسین نے بھی اس حسینہ کی قربت اور لگاوٹ کا یہی مطلب اخذ کیا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے، اس کی دیوانی ہے۔ لہٰذا ایک بار خوشگوار لمحات کے دوران اس نے اظہار مدعا کردیا۔ ”کیوں نہ ہم دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہوجائیں۔“

”کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھی نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

اب وہ کھل کر دل کی بات زبان پر لے آیا۔ ”میرا مطلب...... میرا مقصد یہ ہے کہ ہم دونوں شادی کے بندھن میں بندھ کر......“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے تو تمہیں کبھی اس نگاہ سے نہیں دیکھا۔“

”پھر وہ محبت...... وہ لگاوٹ...... وہ قربت......؟“

وہ سب کچھ تو تمہاری شاعری کی وجہ سے تھی۔ میں تمہاری نہیں تمہاری شاعری کی عاشق ہوں اور بس......“

محمد حسین کے خوابوں کا شیش محل چکنا چور ہوگیا۔ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگیا۔ اک دھن وان کی بیٹی نے نردھن سے ناتا توڑ دیا تھا۔ صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں تمہاری شاعری سے محبت کرتی ہوں، تم سے نہیں۔ اسے بڑی شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہوا کہ یہ دنیا مایا ہے، دھوکا ہے، فریب ہے۔ اس کی سوچ بدلی تو اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ اس دنیا میں، ایسے لوگوں کے ساتھ رہنا کیا؟ اس دنیا سے اور دنیا والوں سے دل لگانا کیا؟ یہ دنیا مطلب دی او یار...... میں ایک شاعر ہوں بے یار و مددگار اس لیے وہ میری محبت میں کیوں مبتلا ہوگی؟ وہ تو اسی کی ہوگی۔ اسی کے گھر جائے گی جو محلوں کا باسی ہوگا۔ اسی لیے تو اس نے چاندی کی دیوار نہ توڑی نردھن کا دل توڑ دیا۔ نوجوان اور حساس شاعر جتنا سوچتا گیا اتنا ٹوٹتا گیا۔ بکھرتا گیا۔

شاعر جب بکھرتا ہے تو اس کی شاعری نکھرتی ہے مگر یہاں تو معاملہ ہی اور تھا۔ اس کی شاعری ہی تو اس کی دشمن بن گئی تھی۔ وہ جسے چاہتا تھا وہ اس کی شاعری پر مرتی تھی۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے شاعری سے رشتہ توڑا پھر دنیا اور دنیاداری سے منہ موڑا۔ دو دو چار چار دن گھر کا رخ نہیں کرتا۔ سڑکوں پر آوارہ پھرتا رہتا۔ آبادی سے دور کسی ویرانے میں پڑا رہتا۔ نہ کھانے کا ہوش نہ سونے کی فکر۔ داڑھی بڑھ گئی۔ سر کے بال بھی بڑھتے بڑھتے شانوں کے پیچھے تک چلے گئے۔

گھر والے اس کی اس دیوانگی سے حیران پریشان تھے۔ خاص طور پر چاہنے والے باپ کی حالت بہت دگرگوں تھی۔ وہ روتا تھا، گریہ و فریاد کرتا تھا۔ ربا! یہ کیا ہو گیا۔ یہ گھر جو میرے پتر کی وجہ سے میرا گلشن تھا، اس میں کیسی بادِ سموم چلنے لگی۔ میں تو اسے ابھی اور پڑھانا چاہتا تھا۔ اسے ایم اے پاس کرانا چاہتا تھا۔ اسے کسی بھی بڑے عہدے پر فائز کرانا چاہتا تھا مگر میرا یہ خواب کیوں بکھر گیا؟ شاید اس کی منحوس شاعری ہی اسے لے ڈوبی۔ یہ شاعری کسے راس آئی ہے جو اسے راس آتی۔ افسوس کہ مجھے اس کی اس بیماری کا علم اس وقت ہوا جب وہ لاعلاج ہو چکی تھی۔

فضل کریم نے بہت سے لوگوں کو اس کے پیچھے لگایا کہ اسے کسی طرح بہلا پھسلا کر گھر لے آؤ میں اس کی شادی کرکے اس کے پیروں میں ذمہ داریوں کی بیڑی ڈال دوں گا۔ جب بندہ حد سے گزر جاتا ہے تو عورت ہی اسے راہ راست پر لاتی ہے۔ اس غریب کو کیا خبر تھی کہ ایک عورت ہی اس کے پتر کی بربادی کا ذریعہ بنی ہے۔

لوگوں نے اس عشق کے مارے کو واپس لانے کی بڑی کوشش کی۔ بہت سمجھایا بجھایا کہ گھر چلو اور انسانوں کی زندگی بسر کرو مگر اس کا یہ منفی اثر ہوا کہ ایک دن وہ اس بستی ہی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ جوگیوں اور سنیاسیوں کی طرح بھیس بدل کر بستیوں سے بہت دور چلا گیا۔ ایک جنگل میں جاکر ڈیرہ ڈال لیا۔ جنگل کو اپنے لیے منگل بنانے والا یہ نیا ملنگ سیاہ پوش تھا۔ کالی ساٹن کے کرتے اور دھوتی میں ملبوس یہ ملنگ دوسرے سادھو سنیاسیوں سے قدرے مختلف تھا۔ وہ لوگوں کو اپنی عمر سے بہت زیادہ نظر آنے لگا۔ اگرچہ اس وقت اس کی عمر 25 سال سے زیادہ نہیں تھی مگر اپنے حلیے کی وجہ سے وہ خاصا عمر رسیدہ دکھائی دیتا تھا اس لیے وہ بابا کہلوانے لگا۔ چونکہ وہ علم و حکمت کی باتیں کرتا تھا اور سیاہ پوش تھا اس لیے وہ جلد ہی بابا عالم سیاہ پوش کے نام سے مشہور ہوگیا۔

آج کا دور ہو یا آج سے سو سال پہلے کا زمانہ ہر دور میں ایسے لوگ ہوتے ہیں پیروں فقیروں اور مزاروں کو مشکل کشا سمجھتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تلاش میں وہ جنگل بیابان تک پہنچ جاتے ہیں جہاں اللہ کے کچھ نیک بندے اپنے رب سے زیادہ سے زیادہ لو لگانے کے لیے دنیا اور دنیا داری سے دامن بچا کر ڈیرہ جما لیتے ہیں مگر یہاں بھی ناسمجھ اور کمزور عقیدے کے لوگ ان کی

تنہائیوں میں مخل ہوتے ہیں۔ بابا عالم سیاہ پوش کو بھی جنگل میں ایسے ہی لوگوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ غریب تو دنیا اور دنیا والوں سے بیزار ہو کر یہاں آیا تھا کہ اب وہ اپنا رشتہ دنیا بنانے والے سے ہی استوار رکھے گا لیکن لوگ یہاں بھی جب اس سے آ کر چمٹنے لگے اور رونے اور فریاد کرنے لگے۔

''بابا! میری مشکلیں آسان کر دیجیے۔''

''بابا! میری مراد پوری کر دیجیے۔''

''بابا! میرا یہ کام کروا دیجیے، وہ کام کروا دیجیے۔''

تو اس نے وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہدایت کا راستہ دکھانا شروع کر دیا۔

''دوستو! بھائیو! سجنو! میں ایک انسان ہوں اور تمام انسانوں کی طرح اللہ کا ایک بندہ ہوں۔ تم لوگوں ہی کی طرح میں بھی مشکل میں مبتلا ہوں اور اپنی مشکل حل کروانے کے لیے ہی اپنے رب کو راضی کرنے کی نیت سے اس جنگل میں ڈیرہ ڈالا ہے۔ میں جو خود اپنی مشکل آسان نہیں کر سکتا، تم لوگوں کی مشکلیں کیسے آسان کر سکتا ہوں؟ اس لیے میرے سجنو! جو کچھ تمہیں مانگنا ہے اس رب سے مانگو جو رب العالمین ہے، جو قادر مطلق ہے، جو سب کی مشکلیں آسان کرتا ہے۔ جس کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہلتا۔ وہ ہم سب کا مالک ہے۔ مختار ہے۔ ہم سب اس کے محتاج ہیں۔ غلام ہیں۔ ہمیں اپنی ہر بات، ہر خواہش، ہر تمنا، ہر مراد ہر مدد اسی سے مانگنی چاہیے جو لوگ اس سے نہیں مانگتے کسی اور سے مانگتے ہیں غیر اللہ سے مانگتے ہیں وہ سخت غلطی کرتے ہیں، زبردست گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس گناہ کو شرک کہتے ہیں۔ اللہ سب گناہوں کو معاف کر دیتا ہے مگر اس گناہ کو معاف نہیں کرتا۔ اس لیے میرے دوستو میرے بھائیو شرک سے بچو۔''

''مگر بابا جی! لوگ تو بزرگوں اور پیروں فقیروں کے مزاروں میں بھی جا کر مرادیں مانگتے ہیں۔''

''یہ بزرگ، پیر فقیر اور اللہ والے بھی تو اللہ ہی سے مانگتے تھے۔ انہیں اللہ نے یہ پیری فقیری اور بزرگی اس لیے دی کہ انہوں نے زندگی بھر اللہ کے حکم کی پیروی کی، اس کے رسول پاک صلعم کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔ میرے سجنو! آپ کو کچھ مانگنے کے لیے، اپنی مشکلیں آسان کرانے کے لیے، آپ جہاں بھی رہتے ہیں وہیں صدق دل سے اللہ کو یاد کریں، اسے پکاریں اس سے مدد مانگیں وہی آپ کی مشکلیں آسان کرے گا۔ آپ کی مدد کرے گا۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔''

فضل کریم کو خبر ملی کہ ان کا پتر محمد حسن بابا بن کر فلاں جنگل میں موجود ہے اور پیروں فقیروں کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ تم جاؤ اور اسے منا کر گھر لاؤ یا کسی عزیز رشتے دار کو بھیجو مگر فضل کریم نے اس مشورے پر عمل نہیں کیا کیونکہ پہلے کا تلخ تجربہ اس کے سامنے تھا۔ اس نے کسی کی بات نہیں مانی اور بھاگ کر جنگل میں روپوش ہو گیا۔

بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے پتر کا علاج کوئی اسپیشلسٹ ہی کر سکتا ہے اور وہ ایک دن کلانور کے ایک مرشدِ کامل کے پاس پہنچ گیا۔ انہیں اپنی دکھ بھری کہانی سنائی اور درخواست کی۔

''یا حضرت! آپ مجھے بتائیے کہ میں کس طرح اس مفرور کو گھر واپس لاؤں۔''

بزرگ کچھ دیر تک آنکھیں بند کر کے سوچتے رہے پھر بولے۔ ''آپ اس اطمینان کے ساتھ گھر جائیے کہ وہ جلد ہی واپس آ جائے گا۔ اللہ پر بھروسا رکھیے۔ اس کی ذات بڑی رحیم و کریم ہے۔''

فضل کریم گھر واپس آ گئے مگر وہ اس بات پر بہت مایوس ہوئے کہ مرشدِ کامل نے نہ کوئی تعویذ دیا۔ نہ صدقہ و قربانی کا حکم دیا نہ ہی کوئی دعا درود پڑھنے کی تلقین کی۔ بہرحال وہ ان کے کہنے کے مطابق اللہ سے لو لگائے رہے۔

دوسری طرف بزرگ کسی کو کچھ بتائے بغیر خاموشی کے ساتھ اس جنگل میں جا پہنچے جہاں فضل کریم کا پتر ایک سیاہ پوش بابا کے روپ میں موجود تھا۔ جب مرشد کامل وہاں پہنچے تو اپنی مشکلیں حل کروانے والوں کا ایک ٹولہ اس کے قریب موجود تھا اور وہ حسب معمول انہیں درس دے رہا تھا۔ اللہ اور صرف اللہ سے رجوع کرنے اور مدد مانگنے کی تلقین کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب سب لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے تو بابا عالم سیاہ پوش نے مرشدِ کامل کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''آپ بھی جائیے اور......'' چونکے۔ اس لیے کہ ان کے چہرے پر ایک نور سا تھا اس لیے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ''آپ کون ہیں؟ اور کہاں سے آئے ہیں؟''

''پتر! تم یہاں جو کچھ کر رہے ہو، بھٹکے ہوئے اور گمراہ لوگوں کو جو ہدایت کی راہ دکھا رہے ہو۔'' مرشد کامل نے محمد حسین کے سوالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''بے شک

یہ بہت اچھا کام ہے، نیک کام ہے مگر اس سے بھی زیادہ اچھا اور زیادہ نیک کام ماں باپ کے دکھی دلوں کے دکھ دور کرنا ہے۔ انہیں سکھ پہنچانا ہے۔ انہیں خوش کرنا ہے۔ تمہاری جدائی میں ان کا برا حال ہو گیا ہے۔ وہ رات دن تمہاری عدم موجودگی کی وجہ سے تڑپتے رہتے ہیں۔ روتے رہتے ہیں۔ کیا تم جیسا علم و دانش کی باتیں کرنے والا یہ نہیں جانتا کہ ماں باپ کی خدمت اطاعت اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا، سب سے بڑی عبادت ہے۔ جو بندہ یہ عبادت نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ اس کی کوئی عبادت قبول نہیں کرتا؟''

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ مرشدِ کامل کے دل سے نکلی ہوئی ان باتوں کا بھی مغرور بیٹے کے دل پر اثر ہوا۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو اس کی داڑھی بھگونے لگے۔

مرشد کامل اٹھتے ہوئے بولے۔ ''میرا جو فرض تھا وہ میں نے پورا کیا۔ اب تمہارا جو فرض ہے وہ تم پورا کرو گے۔'' اس کے بعد وہ رکے نہیں تھے۔

دوسرے دن فضل کریم نے مرشدِ کامل کو آکر بتایا۔ ''یا حضرت! میرا پتر گھر واپس آگیا ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

''میرا نہیں مولا کریم کا شکر ادا کرو۔ میں نے کہا تھا نا۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔ اس کی ذات سے مایوس نہ ہو۔''

محمد حسین گھر آیا تو گھر کی خوشیاں لوٹ آئیں۔ والدین کو خوش و خرم دیکھ کر وہ بھی خوش ہو گیا۔ دنیا اور دنیاداری سے ایک بار پھر دل لگا لیا۔ پیری فقیری چھوڑ دی سیاہ پوشی ترک کر دی اور وہ کافر (شعر گوئی) جو چھٹی ہوئی تھی اس کے منہ سے پھر آ لگی اور وہ ایک بار پھر پہلے کی طرح شعر و شاعری کی دنیا میں گم ہو گیا۔ یہ سب کچھ ہو گیا مگر اس دور کی عرفیت اس کا پیچھا نہ چھوڑ سکی۔ اس کی پہچان بابا عالم سیاہ پوش کی حیثیت سے قائم رہی۔ لوگ اب اسے اسی نام سے پکارنے لگے۔

اب اس کی شاعری اور چمک گئی تھی۔ اس کے چاہنے والوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہونے لگا تھا۔ اسی زمانے میں اس نے اپنی مشہور نظم ''کلجگ'' لکھی۔ رام اور سیتا چھ پیسے میں تخلیق کی۔ یہ نظم بھی بہت مشہور ہوئی۔ یہ نظمیں اس کی کتاب ''مخزنِ اخلاق'' میں موجود ہیں۔ ان نظموں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ کئی اخباروں میں چھپیں اور کئی زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے۔ اسے شاعری سے روکنے والے باپ نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا کہ اسی طرح وہ زندہ رہنا چاہے تو یہی سہی۔

عجیب بات تھی کہ محمد حسین کے چہرے پر نہ لمبی داڑھی تھی نہ سر پر دراز زلفیں، نہ تن پر لباس سیاہ، اس کے باوجود اس کی شہرت اور مقبولیت کا ڈنکا بابا عالم سیاہ پوش ہی کے نام سے بج رہا تھا۔ اب اس کا نام اور اس کی شاعری گورداس پور کی حدود سے نکل کر ہندوستان میں دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ اس کی اسی شہرت کا نتیجہ تھا کہ 1945ء میں بمبئی کے ایک مشاعرے میں اسے مدعو کیا گیا۔ جہاں اس نوجوان شاعر کو سینئر شاعروں کی بھی پذیرائی حاصل ہوئی اور سامعین نے بھی جی بھر کر داد دی۔

یہ وہ دور تھا جب فلم والے اچھے شاعروں کی تلاش میں رہتے تھے۔ جب بھی اور جہاں بھی انہیں کوئی اچھا شاعر ملتا۔ اس سے فیض اٹھاتے تھے۔ اس کی شاعری سے فلم کی موسیقی کو ایک نیا رنگ دیتے تھے۔ مشاعرہ لوٹنے والے بابا عالم سیاہ پوش کے پاس بھی ایک ہدایت کار ایس ڈی پٹیل پہنچ گئے اور ان سے درخواست کی۔ ''آپ ہماری فلم 'جھنور' کے لیے کچھ گیت لکھ دیں۔''

''میں اور فلمی گیت......!'' انہوں نے گھبرا کر کہا۔ ''مجھے فلمی گیت نگاری کا کوئی تجربہ نہیں میں معذرت خواہ ہوں۔ یہ کام نہیں کر سکوں گا۔''

''نفیس خلیلی صاحب نے تو بڑے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ آپ فلم کے لیے بھی لکھ لیں گے۔''

''کون نفیس خلیلی صاحب؟''

''آپ کے استاد جن سے کبھی آپ اصلاح لیتے تھے اور جو اسٹیج کے ہدایت کار بھی ہیں۔''

''کیا وہ آج کل بمبئی میں ہیں؟''

''جی ہاں! انہی کے کہنے پر تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔''

''اگر انہوں نے آپ کو بھیجا ہے تو پھر کیسے انکار کر سکتا ہوں۔''

اس طرح بمبئی کی فلم 'جھنور' کے لیے بابا عالم سیاہ پوش نے پہلی بار دو گیت لکھ کر فلمی نغمہ نگاری کا آغاز کیا۔ یہ دو گیت یہ تھے۔

☆ کسی کو حالِ دل ہم سنانے آگئے ہیں

☆ دو نگاہیں ملتے ملتے

یہ فلم 1947ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کے ہیرو

بلونت سنگھ اور ہیروئن شمیم تھیں۔ جنہوں نے بعد میں انور کمال پاشا سے شادی کرلی تھی۔

بمبئی شہر نوجوان باباجی کو اس قدر پسند آیا تھا کہ وہ پھر واپس گورداسپور نہیں گئے۔ وہیں ڈیرے ڈال لیے۔ 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد بھی وہیں رہے۔

ان کی دوسری فلم ''گھرانا'' تھی جو 1949ء میں ریلیز ہوئی اس کے موسیقار محمد شفیع تھے۔ بابا عالم سیاہ پوش نے اس فلم کے لیے ایک مزاحیہ دوگانا (ڈوئیٹ سانگ) لکھا تھا جسے پریم لتا اور شوکت دہلوی نے گایا تھا جب کہ موسیقار نوشاد تھے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ موسیقار نوشاد اور گلوکارہ پریم لتا نے بعد میں شادی کرلی تھی۔ یہ مزاحیہ دوگانا کچھ یوں تھا۔

تیرا بڑھاپا میری عمریا بالی
مجھے چھیڑا تو دوں گی تجھے گالی

بابا عالم سیاہ پوش کی آخری انڈین فلم ''ہماری کہانی'' تھی۔ جو بدقسمتی سے نمائش پذیر نہ ہوسکی۔ اس فلم کی موسیقی ہمنت کیدار نے کمپوز کی تھی۔ بابا عالم سیاہ پوش نے اس فلم کے لیے دو گیت لکھے جن کو لتا منگیشکر کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ یہ لتا جی کا ابتدائی دور تھا اور ابھی وہ زیادہ مشہور نہیں ہوئی تھیں۔ پھر بھی باباجی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے لکھے ہوئے دو گیت لتا منگیشکر نے گائے۔ ''ہماری کہانی'' کے لیے باباجی نے یہ دو گیت لکھے تھے۔

☆ نینوں میں مستی چھائی۔ ہر شے پر مستی چھائی

☆ پریتم سے جا کے کہہ دو او چندا تو پریت نبھائے جا

یہ دونوں گیت بڑے خوب صورت تھے۔ HMV گراموفون کمپنی نے ان دونوں گیتوں کے ریکارڈز بھی جاری کردیے تھے مگر چونکہ یہ فلم ریلیز نہ ہوسکی اس لیے عوام میں یہ گیت مقبول نہ ہوسکے۔

بابا عالم سیاہ پوش کو اپنی ادبی شاعری میں جس طرح مقبولیت اور شہرت ملی تھی اسی طرح فلمی نغمہ نگاری میں انہیں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اس لیے دلبرداشتہ ہوکر انہوں نے فلمی دنیا سے ناتا توڑلیا۔ اپنے لیے اس فیلڈ کو نامناسب سمجھ کر فلمی گیت نگاری ترک کردی اور صحافت سے رشتہ جوڑلیا۔ اخباروں اور رسالوں کے لیے باقاعدگی سے لکھنے لگے۔ پھر بمبئی سے بھی ان کا دل اکتا گیا اور وہ 1949ء میں اس شہر کو خیرباد کہہ کر لاہور آگئے اور اپنے دوست ملک وحید کے مکان میں عارضی طور پر رہنے لگے تھے۔ یہ دو کمروں پر مشتمل مکان آسٹریلیا بلڈنگ میں واقع تھا۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟ تو یہ مسئلہ باباجی کو بھی لاہور آنے کے بعد درپیش ہوا۔ اکیلے تو تھے نہیں، بال بچوں کا ساتھ تھا۔ والد محترم نے تو اس ذمہ داری کی بیڑی اسی وقت ان کے پیروں میں ڈال دی تھی جب وہ بن باس کاٹ کر گھر واپس آئے تھے۔

لاہور آنے کے بعد انہیں سب سے پہلے روزگار کی تلاش ہوئی۔ یہ شہر بمبئی کی طرح نہیں تھا۔ نہ صحافت اتنی اچھی حالت میں تھی نہ فلم انڈسٹری ابھی تک اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی تھی۔ پاکستان بنتے وقت فسادات میں فلمی صنعت بھی تباہ ہوگئی تھی۔ باباجی اور کوئی کام جانتے بھی نہیں تھے۔ وہ جہاں رہتے تھے اس کے اردگرد کے دکانداروں سے ادھار لے لے کر گزارہ کررہے تھے لیکن یہ سوچ اور فکر انہیں کھائے جارہی تھی کہ یہ ادھار والا معاملہ آخر کب تک چلے گا؟

اسی پریشانی کے عالم میں ان کی ملاقات فلمی مصنف مستری غلام محمد سے ہوگئی۔ جو ان دنوں اداکار و فلمساز نذیر کے فلم ساز ادارے انیس پکچرز کے لیے ایک پنجابی فلم ''پھیرے'' لکھ رہے تھے۔ بابا عالم سیاہ پوش نے مستری صاحب کو اپنی بے روزگاری اور خستہ حالی کی روداد سنائی تو انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''نذیر صاحب کو اپنی پنجابی فلم ''پھیرے'' کے لیے ایک مکالمہ نگار کی ضرورت ہے۔ تم نذیر صاحب سے مل لو۔ شاید تمہارا کام بن جائے۔''

''مگر میں تو نذیر صاحب کو جانتا نہیں ہوں نہ ہی وہ مجھے پہچانتے ہیں۔ جب کہ ایک بات یہ بھی ہے کہ میں نے آج تک کسی پنجابی فلم کے مکالمے نہیں لکھے۔ ایسی حالت میں وہ میرا انتخاب کس طرح کریں گے؟''

مستری غلام محمد نے باباجی کی مایوسی کو دور کرتے ہوئے انہیں یہ کہہ کر حوصلہ دیا۔ ''ہمت سے کام لو اور حوصلہ کرکے تم کل نو اور دس بجے کے درمیان مسلم ٹاؤن میں واقع پنچولی اسٹوڈیو پہنچو میں تمہارے آنے سے پہلے نذیر صاحب کو تمہارے بارے میں بتادوں گا۔ تمہارا بھرپور تعارف کرا دوں گا۔''

بابا عالم سیاہ پوش اگلے روز اپنے دوست ملک وحید سے پنچولی اسٹوڈیو کا پتا پوچھ کر اسٹوڈیو پہنچ گئے۔ اسٹوڈیو کے صحن میں نذیر صاحب مستری غلام محمد کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ مستری صاحب نے باباجی کو دیکھ کر چوکیدار سے

کہا کہ "اسے اندر آنے دو یہ ہمارا آدمی ہے۔"
بابا جی جب اندر آئے اور قریب آ کر دونوں کو سلام کیا تو مستری صاحب نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔
"نذیر صاحب! یہ بابا عالم سیاہ پوش ہیں جن کے بارے میں، میں آپ کو بتا رہا تھا۔ آپ آزمائش کے طور پر "پھیرے" کا ایک سین ان سے لکھوا کر دیکھیں مجھے یقین ہے کہ یہ اس امتحان میں پورے اتریں گے۔"
نذیر صاحب نے سر سے پاؤں تک بابا جی کو غور سے دیکھا اور بڑی رعونت کے ساتھ کہا۔ "اوئے توں پنجابی فلم دے مکالمے لکھ لیں گا؟"
بابا جی کو نذیر کا یہ طرز تخاطب اچھا نہیں لگا لیکن وہ مجبور تھے انہوں نے بڑے ادب سے کہا۔ "ہاں جی لکھ لوں گا۔"
نذیر صاحب انہیں اسٹوڈیو کے کینٹین میں لے گئے اور وہاں بیٹھ کر "پھیرے" کا ایک مشکل ترین منظر سنا کر کہا۔ "اس سین کے مکالمے لکھ کر پرسوں میرے پاس آجاؤ۔ اگر مجھے تمہارے لکھے ہوئے مکالمے پسند آئے تو میں پوری فلم کے مکالمے تم سے لکھواؤں گا۔"
بابا عالم سیاہ پوش نے جو انہوں نے نذیر صاحب کے بتائے ہوئے سین کی تفصیل لکھی تھی ایک بار غور سے پڑھا۔ یہ سین کچھ یوں تھا۔
"سورن لتا کا باپ مر جاتا ہے۔ اس کا بھائی علاؤ الدین، ہیرو (نذیر) کی برات واپس لوٹا دیتا ہے۔ پھر وہ ایم اسماعیل ساہوکار سے رقم لے کر اپنی بہن (سورن لتا) کا سودا کر دیتا ہے۔ ایم اسماعیل کی برات آئی ہوئی ہے مگر ہیروئن سورن لتا سہاگ کا جوڑا پہننے سے انکار کر دیتی ہے۔ علاؤ الدین اسے دلہن بنا کر ڈولی میں بیٹھنے پر مجبور کرتا ہے۔ سورن لتا بھی بیٹھنے سے انکار کر دیتی ہے۔"
یہ بہن اور بھائی کے درمیان ایک جذباتی منظر تھا۔
بابا عالم سیاہ پوش نے اس منظر کو پڑھنے کے بعد نذیر صاحب سے کہا۔ "پرسوں کیوں؟ آج کیوں نہیں؟ پرسوں تو بہت دور ہے۔"
نذیر صاحب نے انہیں کچھ عجیب نظروں سے دیکھا جس میں کچھ تحقیر اور تمسخر کا انداز بھی تھا۔
"اگر آپ کو میرا لکھا ہوا پسند آ گیا۔" بابا جی نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ "تو اسی وقت ایگریمنٹ ہو جائے گا۔ دوسری صورت میں جیسے میں یہاں آیا تھا ویسے ہی خاموشی کے ساتھ واپس چلا جاؤں گا۔"
نذیر صاحب نے بابا عالم سیاہ پوش کو غور سے دیکھا جو اپنے نام کی طرح انہیں مضحکہ خیز نظر آیا انہوں نے اس جوان بابا کو مخاطب کر کے کہا۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ اس فلم کا مشکل ترین منظر ہے۔ میں نے یہ سین پنجابی زبان کے ماہر اور تسلیم شدہ استادوں کو لکھنے کے لیے دیا تھا مگر ان میں سے کوئی مجھے مطمئن نہ کر سکا۔ جب کہ تم کہتے ہو کہ میں ابھی لکھ دیتا ہوں۔"
نذیر صاحب بھی بمبئی سے آئے تھے اور پاکستان میں یہ ان کی پہلی فلم تھی۔ اس لیے یہاں ان کی فلم والوں سے کم جان پہچان تھی۔
"آپ بڑے بڑے استادوں کے حوالے دے کر مجھے خوف زدہ نہ کریں۔" بابا جی بولے۔ "آپ کو کیا خبر میرے دل میں کیسا گھاؤ ہے اور میں اپنے زخموں کو کرید کر کس طرح اپنے جذبات بیدار کرتا ہوں۔ آپ میرا امتحان تو لیں۔"
نذیر صاحب نے کینٹین بوائے کو بلا کر کہا۔ "دو کپ چائے لاؤ۔"
نذیر صاحب چائے کا انتظار کرنے لگے جب کہ بابا جی متذکرہ سین کے مکالمے لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے پانچ منٹ کے اندر مطلوبہ مکالمے مکمل کر لیے۔ جب بابا جی سین لکھ رہے تھے تو ان کی آنکھوں سے آنسو کاغذ پر ٹپک رہے تھے۔ انہوں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے نذیر صاحب سے کہا۔
"سین سنانے سے پہلے میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے میرے لکھے ہوئے مکالموں کو مسترد کرنا ہے مگر میں دعویٰ کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ دنیا کی کوئی طاقت میرے لکھے ہوئے مکالموں کو رد نہیں کر سکتی۔"
نذیر صاحب نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "باتیں بعد میں بتانا، پہلے لکھے ہوئے مکالمے سناؤ۔"
بابا عالم سیاہ پوش نے پہلا ہی فقرہ پڑھا تھا کہ نذیر صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔ نذیر صاحب قد کاٹھ کے حساب سے چھ فٹ لمبے آدمی تھے لیکن اس وقت ان کے ہاتھ میں تھامی ہوئی چائے کی پیالی کانپنے لگی۔ انہوں نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور گلوگیر آواز میں بابا جی سے بولے۔ "بابا جی آگے نہ پڑھیے۔"
اس کے بعد وہ بابا جی کو اپنے ساتھ لے کر اپنی کوٹھی

گئے اور سورن لتا سے بولے۔ ''دیکھو سورن! خدا نے رحمت کا فرشتہ بھیج دیا ہے۔ مکالمہ نگار اسے کہتے ہیں۔ بابا جی لکھتے نہیں جادو جگاتے ہیں۔''

دونوں نے گھر کے برآمدے میں بیٹھ کر پورے مکالمے سنے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس کے بعد نذیر صاحب نے بابا جی کو اپنے ادارے میں مستقل ملازم رکھنے کی پیش کش کی جسے انہوں نے قبول کرلی۔ وہ انیس پکچرز میں ڈھائی سو روپے ماہوار پر ملازم ہوگئے۔

''پھیرے'' کی کہانی اگرچہ مستری غلام محمد نے لکھی تھی مگر مصنف کے طور پر انہوں نے اپنی بیٹی رانی کا نام دیا تھا۔ مکالمے اور چند گیت بابا عالم سیاہ پوش نے لکھے تھے۔ موسیقی جی اے چشتی کی تھی۔ اسکرین پلے سورن لتا نے لکھا تھا۔ ہیرو ہیروئن نذیر اور سورن لتا تھے۔ ایم اسماعیل، زینت، مایا دیوی، نذر، علاؤ الدین نے دیگر اہم رول کیے تھے۔ بابا عالم سیاہ پوش نے بھی ایک خاص کردار کیا تھا۔ نذیر اس فلم کے ہدایت کار تھے مگر انہوں نے اپنا نام نگراں ہدایت کار کے طور پر دیا تھا۔ ہدایت کار کے طور پر مجید کا نام تھا۔ یہ اداکارہ سورن لتا کی پہلی پنجابی فلم تھی۔ اگرچہ ان کا تعلق پنجاب کے شہر راولپنڈی سے تھا لیکن انہوں نے اس سے پہلے کسی پنجابی فلم میں کام نہیں کیا تھا۔ اس لیے بابا عالم سیاہ پوش کو یہ ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی کہ وہ سورن لتا کو پنجابی زبان کا درست تلفظ اور مکالموں کی ادائیگی کے بارے میں بتائیں۔ ''پھیرے'' 28 جولائی 1949ء کو لاہور میں ریلیز ہوئی اور سلور جوبلی ہٹ ہوئی۔

یہ زمانہ پاکستانی فلموں اور فلم انڈسٹری کی ریوائیول کا بالکل ابتدائی دور تھا۔ لاہور کی پرانی فلمی صنعت 1946-47ء کے فسادات میں بالکل تباہ ہوگئی تھی۔ 1948ء سے اسے دوبارہ زندگی دینے کی ابتدا کی گئی تھی۔ اس بے سروسامانی کے دور میں ''پھیرے'' جیسی کامیاب فلم کا بننا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس فلم کے سنسر شو کے بعد فلم سنسر بورڈ کے صدر امیر نور احمد اور سنسر بورڈ کے ممبر علامہ علاؤ الدین صدیقی نے نذیر صاحب کو داد دیتے ہوئے کہا۔

''آپ نے بہت اچھی معیاری اور خوب صورت فلم بنائی ہے۔ اس لیے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان میں اچھی فلمیں بن سکتی ہیں اور بھارتی فلموں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔''

انہوں نے ''پھیرے'' کے مکالموں کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''بابا عالم سیاہ پوش نے اتنے اچھے مکالمے لکھ کر ثابت کردیا ہے کہ پنجابی زبان میں بہترین ادب پیش کیا جاسکتا ہے۔''

''پھیرے'' نذیر صاحب کی ایک پرانی بھارتی فلم ''گاؤں کی گوری'' کی ری میک تھی جو 1945ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ ''گاؤں کی گوری'' کی طرح ''پھیرے'' بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی۔ اس کامیابی میں اس کی موسیقی کا بھی بڑا حصہ تھا۔ اس نے بھی بڑی دھوم مچائی تھی۔ تقریباً فلم کے تمام گیت ہٹ ہوئے تھے۔ نذیر صاحب نے جانے کس مصلحت کے تحت گراموفون ریکارڈز پر بطور نغمہ نگار جی اے چشتی کا نام دیا تھا جو اس فلم کے موسیقار تھے۔ حالانکہ یہ گیت باضابطہ گیت نگاروں نے لکھے تھے۔ ان میں چند گیت بابا عالم سیاہ پوش کے بھی تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ فلم کے ٹائٹل اور بک لیٹ پر بابا عالم سیاہ پوش کا نام بطور نغمہ نگار بھی شامل ہے۔

اس فلم میں کامیڈین نذر کا تکیہ کلام ''پھاں پچ'' بہت مشہور ہوا تھا۔

''پھیرے'' کی کامیابی کے بعد جو ایک چھوٹے بجٹ کی فلم تھی، نذیر صاحب نے اپنی دوسری پنجابی فلم ''لارے'' شروع کی جس میں پہلی فلم سے کچھ زیادہ ہی خرچ کیا۔ نذیر صاحب نے ''لارے'' کی کہانی خود لکھی۔ مکالمے اور گیت بابا عالم سیاہ پوش سے تحریر کروائے۔ موسیقی جی اے چشتی سے کمپوز کرائی فلم کی کاسٹ پروڈکشن ٹیم وہی پھیرے والی تھی۔ ہدایت کار مجید اور نگراں ہدایت کار نذیر تھے۔ 17 فروری 1950ء کو ''لارے'' لاہور کے۔ ایجنٹ سنیما میں نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ مگر یہ فلم پھیرے کی طرح کامیاب ہونے کی بجائے فلاپ ہوگئی۔ نذیر صاحب نے اس فلم میں بھی بابا عالم سیاہ پوش کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ گراموفون ریکارڈز پر ان کے نام کی بجائے جی اے چشتی کا نام دیا۔ اگرچہ فلم کے ٹائٹل میں انہوں نے بابا عالم سیاہ پوش کا نام بطور نغمہ نگار دیا تھا۔

''لارے'' کو ''پھیرے'' جیسی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ اس لیے نذیر صاحب بہت اپ سیٹ ہوگئے اور یہ سوچنے لگے۔ پنجابی فلم بنانا ان کے بس کی بات نہیں۔ اس سوچ کے بعد انہوں نے پنجابی فلم بنانے کا ارادہ ترک کردیا اور اس کے ساتھ ہی بابا عالم سیاہ پوش کو بھی اپنے ادارے سے فارغ کرادیا۔ بابا عالم سیاہ پوش نذیر صاحب کے فلمساز

ادارہ انیس پکچرز سے 9 مہینے ہی وابستہ رہے تھے کہ دونوں کا ساتھ چھوٹ گیا۔

اس لگی بندھی نوکری سے علیحدگی کے بعد بابا جی پر ایک بار پھر برا وقت آ گیا۔ وہ مالی پریشانیوں میں ایک بار پھر گھر گئے۔ اسی دوران انہیں فلمساز و ہدایت کار مسعود پرویز کی فلم ''بیلی'' کے لیے ایک گیت لکھنے کا موقع ملا جس کے موسیقار رشید عطرے تھے اور گلوکارہ منور سلطانہ اور پکھراج پپو کی آوازوں میں اسے ریکارڈ کیا گیا تھا۔ اس گیت کے بول تھے۔

او راہی ہمراہی میرے راہ تکوں میں تیرا

واضح رہے کہ ''بیلی'' مسعود پرویز کی ذاتی فلم تھی۔ بطور ہدایت کار یہ ان کی پہلی فلم تھی۔ اس فلم کے رائٹر مشہور افسانہ نگار سعادت حسین منٹو تھے۔

بابا عالم سیاہ پوش کی بے روزگاری کا علاج ایک، دو گانوں کے معاوضہ سے کیا ہوتا وہ سخت پریشان تھے کہ گزارہ کیسے ہوگا؟ گھر میں ہوتے تو بیوی اس احساس کو اور فزوں تر کر دیتی اور وہ اسے سمجھانے کے لیے تسلی تشفی دیتے۔ کہتے کہ اللہ پر بھروسا رکھو وہ ضرور ہماری مدد فرمائے گا۔

ایک دن اداکار فضل شاہ ان کے گھر گئے اور ان سے کہا۔ ''سید شبیر حسین شاہ اور ملکۂ پکھراج آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں نے آپ کی فلم ''پھیرے'' دیکھی ہے۔ وہ ایک پنجابی فلم بنانا چاہتے ہیں اور اس کے مکالمے اور گیت آپ سے لکھوانا چاہتے ہیں۔ اس اندھیرے میں یہ روشنی نظر آئی تو بابا جی آبدیدہ ہو گئے۔ ملکۂ پکھراج سے ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے اپنی کہانی کا خلاصہ بابا جی کو سنایا اور کہا کہ اس پر آپ کہانی اور مکالمے لکھیے۔

گھر گئے تو نئی فلم ملنے کی خوش خبری بیوی کو سنائی اور کہا۔ ''دیکھو میں کہتا تھا ناں اللہ بڑا کارساز ہے وہ ہماری پریشانی دور کر دے گا۔''

بابا عالم سیاہ پوش نے کہانی اور اس کے مکالمے لکھنے شروع کر دیے۔ دوسری طرف فلم کی ہدایت کاری، موسیقی اور کاسٹ کے بارے میں غور و فکر شروع کر دیا گیا۔ ان ہی دنوں ہدایت کار بابو ایم صادق بمبئی سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ وہ بمبئی میں ملکہ پکھراج کے لیے دو فلمیں ''کاجل'' 1948ء اور ''چار دن'' 1950ء بنا چکے تھے۔ ملکہ پکھراج چاہتی تھیں کہ ان کی نئی فلم ''دشمی'' کی ہدایت کاری کی ذمہ

داری بھی بابو صادق کو ہی سونپ دیں۔ وہ ملکہ پکھراج کا بہت احترام کرتے تھے۔ انہوں نے ''شمی'' کی کہانی سنی تو انہیں اچھی لگی مگر اس کی ڈائریکشن دینے سے معذرت کر لی کیونکہ وہ بمبئی واپس جانے والے تھے۔ ان کے انکار کے بعد ملکہ پکھراج نے منشی دل کو ہدایت کاری کی ذمہ داری سونپ دی۔ ملکہ صاحبہ نے منشی دل کی فلم ''دو بھائی'' دیکھی تھی جو انہیں پسند آئی تھی۔ یہ فلم 1947ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

''شمی'' کی موسیقی ترتیب دینے کے لیے خواجہ خورشید انور سے رابطہ کیا گیا جنہوں نے اس فلم کی کہانی سننے کے بعد اس کی موسیقی دینے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ دو ہیجڑوں کی کہانی تھی۔ اس کے بعد موسیقی کے لیے ماسٹر عنایت حسین کا انتخاب کیا گیا۔

''شمی'' کے مصنف اور مکالمہ نگار بابا عالم سیاہ پوش تھے جنہوں نے اس فلم کے تین گانے بھی لکھے تھے۔ یہ فلم اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں مکس کر کے بنائی گئی تھی۔

باباجی کے لکھے ہوئے گیت یہ تھے۔

☆ میرا نرم کلیجہ ڈولے
یہ کوئی نہ جانے کیوں دل ڈولے ہولے ہولے
(زینت بیگم، ملکہ پکھراج، پکھراج پپو اور ساتھی)

☆ ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ
بے جوانی نچ کڑیے پچھتاویں گی (نسیم اختر، منور سلطانہ، زینت بیگم)

☆ لے لے ساتھ وہیر ے بے
آج جا ساڈے بے
نال جی، ساڈا جی (دوگانا)

''شمی'' 22 ستمبر 1950ء کو لاہور کے پیلس سینما میں نمائش کے لیے پیش کی گئی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ اس ناکامی کا ذمہ دار دیوان سرداری لال کو قرار دیا گیا۔ جو پنچولی اسٹوڈیو کے مالک تھے۔ ہوا یوں تھا کہ سنسر بورڈ نے اس فلم کے چند مناظر حذف کرنے کا حکم دیا تھا۔ سید شبیر حسین شاہ وہ مناظر کاٹ دینا چاہتے تھے لیکن دیوان سرداری لال نے ان سے کہا۔

''شاہ جی! میری ساری عمر فلم لائن میں گزری ہے۔ سنسر بورڈ والے ہمیشہ یہی کہتے ہیں۔ فلاں سین کاٹ دو۔ میں نے آج تک اپنی کسی فلم کا سین نہیں کاٹا۔ میں نے آپ کی فلم دیکھی ہے اگر آپ نے وہ سین کاٹ دیئے تو فلم کا تسلسل ٹوٹ جائے گا۔ آپ فلم کو اسی حالت میں ریلیز کر دیں۔ سیاہ سفید کا میں ذمہ دار ہوں۔''

شاہ جی دیوان سرداری لال کی باتوں میں آ گئے۔ وہ سیدھے سادے آدمی تھے۔ اگرچہ ملکہ پکھراج نے انہیں سنسر بورڈ کی خلاف ورزی سے روکا تھا۔ فلم حذف شدہ مناظر کے ساتھ ریلیز ہو گئی۔ دوسرے دن دیوان سرداری لال سنسر بورڈ کے کچھ ممبران کو لے کر پیلس سینما پہنچ گئے اور انہیں بڑی رازداری کے ساتھ بتایا کہ دیکھیے سید شبیر حسین شاہ سنسر شدہ مناظر کے ساتھ فلم چلا کر سنسر بورڈ کی توہین کر رہے ہیں۔ سنسر بورڈ کے ممبران نے فلم دیکھنے کے بعد فلم کا سنسر سرٹیفکیٹ منسوخ کر دیا اور پورے ملک میں شمی کی نمائش روک دی گئی۔ اس طرح یہ فلم صرف تین دن چلنے کے بعد بند کر دی گئی۔ سید شبیر حسین شاہ نے اپنے اثر و رسوخ سے بڑی بھاگ دوڑ کرنے کے بعد کوئی چودہ دن بعد فلم کا منسوخ شدہ سرٹیفکیٹ بحال کروا لیا لیکن دوبارہ نمائش کے بعد اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اگرچہ اس فلم میں کئی خوبیاں تھیں۔ بابا عالم سیاہ پوش نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں بڑے خوب صورت مکالمے لکھے تھے۔ اسحاق موٹا کا تکیہ کلام ''بے بے دکھ ٹک گیا ری'' کو بہت پسند کیا گیا۔ اداکارہ شمی سنتوش کمار کی ہیروئن تھیں ان کا اصلی فلمی کیریئر اسی فلم سے شروع ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ بے بی شمشاد کے نام سے ''شاہدہ'' اور ''بے قرار'' میں اداکاری کر چکی تھیں۔

''شمی'' کی ناکامی سے اس کے بنانے والوں کو نقصان پہنچا تھا مگر بابا عالم سیاہ پوش کی گاڑی چل پڑی تھی۔ ان کی لکھی ہوئی کہانی، مکالمے اور گیت فلم والوں کو ان کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرنے لگے اور یکے بعد دیگرے انہیں فلمیں ملنے لگیں۔

''شمی'' کے بعد فلمساز عارف شاہ نے انہیں اپنی اردو فلم ''جدائی'' کے مکالمے لکھنے کی دعوت دی۔ امین ملک اس فلم کے ہدایت کار تھے۔ موسیقار حسن لطیف نے اس کی موسیقی ترتیب دی تھی اور اس کے گیت بھی لکھے تھے۔ شاہینہ اور کے چوہدری نے مرکزی کردار کیے تھے۔ ہدایت کار امین ملک نے بھی ایک اہم رول پلے کیا تھا۔ یہ فلم 2 جون 1950ء میں ریلیز کی گئی تھی۔

ہدایت کار انور کمال پاشا نے ''دو آنسو'' کی کامیابی کے بعد پنجابی فلم ''گبرو'' شروع کی تو اس کے مکالمے بابا عالم سیاہ پوش سے لکھوائے۔ اس کی کہانی پاشا صاحب نے

خود لکھی تھی۔ موسیقی جی اے چشتی نے ترتیب دی تھی اور فلم کا ٹائٹل رول اداکار اجمل نے کیا تھا جب کہ ہیرو سنتوش کمار اور ہیروئن شمیم تھیں۔ یہ فلم 29 دسمبر 1950ء کو نمائش کے لیے پیش کی گئی جو کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اس فلم میں کامیڈین آصف جاہ کا تکیہ کلام ''چھنا کی پہلوان'' بہت مشہور ہوا تھا۔

''گبرو'' کے بعد انور کمال پاشا نے اپنی اگلی فلم ''دلبر'' شروع کی تو اس کے مکالمے بھی بابا جی ہی سے لکھوائے۔ اس فلم کی کہانی بھی انور کمال پاشا نے خود ہی تحریر کی تھی اور جی اے چشتی ہی سے موسیقی کمپوز کروائی تھی۔ ''گبرو'' میں پاشا صاحب اداکارہ شمیم کے مقابل ہیرو کی حیثیت سے پیش ہوئے تھے اور یہی اس فلم کی ناکامی کا سبب بنا تھا۔ پاشا صاحب نے ہدایت کاری، مکالمہ نگاری اور اسکرین پلے رائٹنگ میں اپنا لوہا منوایا تھا۔ شاید وہ اداکاری کے شعبہ میں بھی کچھ کر دکھانا چاہتے تھے مگر اس میں بری طرح ناکام ہو گئے۔ ان کی بیگم شمیم نے ان سے کہا۔ ''آپ حقیقی زندگی میں میرے کامیاب ہیرو تو ہو سکتے ہیں فلموں میں کامیاب ہیرو نہیں بن سکتے۔ اداکاری آپ کے بس کی بات نہیں۔''

لہٰذا انہوں نے آئندہ اداکاری سے توبہ کرلی۔ بطور اداکار یہ ان کی پہلی اور آخری فلم تھی جو 17 اگست 1951ء کو ریلیز کی گئی تھی۔

پنجابی فلم ''لارے'' کی ناکامی کے بعد اداکار ہدایت کار و فلمساز نذیر نے یکے بعد دیگرے کئی اردو فلمیں ''سچائی، انوکھی داستان اور بھیگی پلکیں بنائیں مگر کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ انہوں نے ''لارے'' کے بعد پنجابی فلمیں نہ بنانے کا اعلان کر دیا تھا لیکن جب ان کی اور فلمیں بھی کامیاب نہ ہو سکیں تو انہوں نے دوبارہ پنجابی فلم ہی بنانے کا پروگرام بنا لیا۔ اس موقع پر انہیں بابا عالم سیاہ پوش یاد آئے۔ انہوں نے بابا جی کو بلایا اور کہا۔ ''ایک اچھی سی پنجابی فلم کی کہانی لکھ کر لائیے۔''

''مگر آپ نے تو پنجابی فلم نہ بنانے کا ارادہ کرلیا تھا۔''

''ہاں، کیا تھا مگر اردو فلمیں بنا کر کون سا تیر مار لیا؟ لہٰذا ایک بار پھر پنجابی فلم بنا کر دیکھتا ہوں۔''

چند دنوں کے بعد بابا جی نے ایک کہانی لکھ کر نذیر صاحب کو سنائی جو انہیں پسند آئی۔ یہ دریا کے کنارے آباد مچھیروں کی کہانی تھی اور اس کا نام ''شہری بابو'' رکھا تھا۔

''اب آپ اس کے مکالمے بھی لکھ کر لے آئیے۔'' نذیر صاحب نے فرمایا۔

مکالمے لکھنے کے بعد بابا عالم سیاہ پوش نے ان سے کہا۔ ''ایک مشورہ آپ کو دینا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ہاں کہیے۔''

''اس فلم کی کہانی کا تقاضا ہے کہ آپ اس میں ہیرو کا کردار نہ کریں بلکہ کسی نوجوان اداکار کا انتخاب کریں۔''

نذیر صاحب نے اس مشورے کو رد نہیں کیا اور اس پر عمل کرتے ہوئے سنتوش کمار کو شہری بابو کے ٹائٹل رول کے لیے منتخب کرلیا جب کہ ہیروئن سورن لتا اور ولن علاؤ الدین کو لیا۔ اس فلم کی موسیقی رشید عطرے نے ترتیب دی۔ بابا عالم سیاہ پوش نے اس فلم کی کہانی اور مکالمے لکھنے کے علاوہ ایک تھیم سانگ بھی لکھا جسے عنایت حسین بھٹی نے گایا اور جو ان ہی پر فلمایا گیا۔ بھٹی صاحب نے اس فلم میں سائیں بھاگاں والے کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ تھیم سانگ تھا۔

بھاگاں والیو نام جپو مولا نام

یہ تھیم سانگ نہ صرف عنایت حسین بھٹی کی شہرت کا سبب بنا بلکہ اس نے ''شہری بابو'' کی کامیابی میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس فلم کے دیگر گانے بھی بے حد پسند کیے گئے اور اسے سپرہٹ میوزیکل فلم قرار دیا گیا۔ اس فلم میں زبیدہ خانم نے گیت بھی گائے تھے اور ایک کورس گانے کی عکسبندی میں حصہ بھی لیا تھا۔ گلوکارہ زبیدہ خانم اور وارث لدھیانوی نے اسی فلم سے اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا تھا۔

بابا عالم سیاہ پوش نے ''شہری بابو'' کے مکالمے بڑے سادہ اور عام فہم انداز میں لکھے تھے جسے ناظرین اور مبصرین نے پسندیدگی کی سند عطا کی۔ اس فلم میں نذر کا تکیہ کلام ''فٹ ماں صدقے پیو واری'' بہت مشہور ہوا تھا۔ یہ فلم 13 جون 1953ء کو ریلیز ہوئی۔ باکس آفس پر اس فلم کی کامیابی کی وجہ سے نذیر صاحب کو ایک بار پھر سنبھلنے کا موقع مل گیا تھا۔

اسی سال بابا جی کو اردو فلم ''برکھا'' کی مکالمہ نگاری کا موقع ملا۔ یہ فلم فلمساز خادم حسین خواجہ اور ہدایت کار شیخ حسن (بابائے سندھی فلم) کی تھی۔ یہ شیخ حسن کی پاکستان میں پہلی فلم تھی۔ خواجہ رضوان اور عرش لکھنوی بھی اس فلم کے شریک مکالمہ نگار تھے۔ فلم کی کہانی شیخ حسن اور مشیر کاظمی نے تحریر کی تھی۔ گیت مشیر کاظمی نے لکھے تھے۔ موسیقی طفیل فاروقی نے ترتیب دی تھی جو پاکستان میں ان کی بھی پہلی فلم

تھی۔ صبیحہ خانم نے ہیروئن اور سعود نے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ فلم بھی 13 جون 1953ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔ یعنی بابا عالم سیاہ پوش کی دونوں فلمیں پنجابی فلم ''شہری بابو'' اور اردو فلم ''برکھا'' ایک ہی دن ریلیز ہوئیں۔ ''برکھا'' نے بھی کامیابی کا جھومرا اپنے ماتھے پر سجایا۔

فلمساز شیخ محمد لطیف اور ہدایت کار لقمان نے بابا عالم سیاہ پوش سے ایک پنجابی فلم کی کہانی لکھوائی۔ یہ ایک سادہ سی دیہاتی ماحول کی کہانی تھی جس کا ٹائیٹل ''پتن'' رکھا گیا۔ بابا عالم سیاہ پوش کے ساتھ احمد راہی نے بھی ''پتن'' کے مکالمے تحریر کیے تھے۔ یہ ہدایت کار لقمان کی پہلی پنجابی فلم تھی۔ اسی طرح مسرت نذیر کی بھی بطور ہیروئن پہلی فلم تھی جب کہ ہیرو سنتوش کمار اور ولن علاؤ الدین تھے۔ جی اے چشتی نے موسیقی کمپوز کی تھی۔ زبیدہ خانم نے اس فلم میں گلوکاری کے ساتھ اداکاری بھی کی تھی۔ وہ ہیروئن مسرت نذیر کی سہیلی کے کردار میں پیش ہوئی تھیں۔ یہ کامیاب فلم 24 مئی 1955ء میں لاہور کے پیلس سنیما میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم میں علاؤ الدین کا تکیہ کلام ''ہیں تے ہیں'' بہت مشہور ہوا تھا۔

فلمساز جے سی آنند اور ہدایت کار نذیر نے اسی سال بابا عالم سیاہ پوش سے مشہور لوک رومانوی داستان ہیر رانجھا کو فلمی کہانی کے روپ میں لکھوایا۔ جو ''ہیر'' کے نام سے پنجابی زبان میں بنائی گئی۔ اس کے مکالمے بھی بابا جی نے لکھے اور دو گیت بھی۔ سورن لتا نے ''ہیر'' کا ٹائیٹل رول کیا جب کہ عنایت حسین بھٹی کو رانجھا کے روپ میں پیش کیا گیا۔ کیدو کا اہم کردار اداکار اجمل نے ادا کیا۔ صفدر حسین نے ''ہیر'' کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ یہ ان کی بطور موسیقار پہلی فلم تھی۔

''ہیر'' کے گیتوں کے حوالے سے دلچسپ بات یہ ہے کہ فلم کے ٹائیٹل پر حزیں قادری کا نام بطور نغمہ نگار دیا گیا۔ فلم کے بک لیٹ میں حزیں قادری اور وارث لدھیانوی کا نام لکھا گیا جب کہ فلم کے گراموفون ریکارڈز پر بابا عالم سیاہ پوش (بی اے سیاہ پوش) لکھا گیا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس دور میں اس طرح کی حرکتیں کس مصلحت کے تحت کی جاتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ''ہیر'' کا ایک گیت احمد راہی، ایک وارث لدھیانوی، دو بابا عالم سیاہ پوش اور باقی تمام گیت حزیں قادری نے لکھے تھے۔ فلم کے بک لیٹ اور گراموفون ریکارڈز میں تو گیتوں کے اصل تخلیق کار کا نام دیا جاسکتا تھا۔

''ہیر'' 28 اکتوبر 1955ء کو نمائش کے لیے پیش کی گئی اور سپر ہٹ ثابت ہوئی۔

اس فلم کی کامیابی نے بابا عالم سیاہ پوش کو کہانی نویس اور مکالمہ نگار کی حیثیت سے شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

''ہیر'' کی زبردست کامیابی کے بعد بابا عالم سیاہ پوش نے ایک اور سپر ڈپر ہٹ فلم کی کہانی اور مکالمے لکھے۔ یہ فلم تھی ''دلا بھٹی'' جس کے فلمساز آغا جی اے گل اور ہدایت کار انور کمال پاشا تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب پاشا صاحب نے جو اس فلم کے ہدایت کار اور اسکرین پلے رائٹر تھے اس فلم کے رش پرنٹ دیکھے تو بہت مایوس ہوئے۔ انہوں نے سوچا یہ فلم کامیاب نہیں ہوگی۔ وہ کسی ناکام فلم کے ہدایت کار کہلوانا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے فلمساز آغا جی اے گل سے کہا کہ وہ فلم کے ٹائیٹل میں ان کا نام ہدایت کار کے طور پر نہ دیں بلکہ نگراں ہدایت کار کے طور پر دیں۔ لہٰذا ہدایت کار کے طور پر ایس ایم ڈار کا نام دے دیا گیا جو ایور نیو پکچرز میں ان دنوں پبلسٹی انچارج تھے۔

پاشا صاحب کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ ''دلا بھٹی'' نہ صرف کامیاب ہوئی بلکہ اس نے کامیابی کا نیا ریکارڈ قائم کیا۔ اس نے اپنے فلمساز آغا جی اے گل کو اتنا کما کر دیا کہ انہوں نے اس کی آمدنی سے لاہور میں جدید طرز کا ایک نیا نگار خانہ ایورنیو اسٹوڈیو تعمیر کیا۔

یہ فلم 6 جنوری 1956ء کو لاہور میں ریلیز ہوئی اور اس نے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ صبیحہ اور سدھیر نے اس فلم میں مرکزی رومانوی کردار ادا کیا تھا۔ موسیقی جی اے چشتی نے ترتیب دی تھی۔ نغمہ نگار طفیل ہوشیار پوری تھے۔ جب کہ دو مزاحیہ گیت بابا عالم سیاہ پوش نے تحریر کیے تھے۔

انور کمال پاشا نے اسی سال ایک کاسٹیوم فلم ''سرفروش'' بنائی جو اردو زبان میں تھی۔ اس نے سپر ہٹ کامیابی حاصل کی تھی۔ بابا عالم سیاہ پوش سے موسیقار رشید عطرے نے ایک مزاحیہ دوگانا لکھوایا تھا جو زبیدہ خانم اور عنایت حسین بھٹی کی آوازوں میں ریکارڈ کیا گیا تھا جب کہ اس کی پکچرائزیشن آصف جاہ اور شاہدہ پر ہوئی تھی۔ یہ بابا جی کا لکھا ہوا آخری اردو گیت تھا۔ اس کے بعد انہوں نے صرف پنجابی فلموں کے مکالمے اور گیت لکھے۔ ''سرفروش'' 15

جون 1956ء کو ریلیز ہوئی۔ جس کا ایک منظر بہت مقبول ہوا جو آج تک یاد کیا جاتا ہے۔ سنتوش کمار جو چور ہے۔ چوری کی نیت سے صبیحہ خانم کے گھر جاتا ہے۔ اسی وقت فجر کی نماز کی اذان ہو جاتی ہے اور چور نیت باندھ کر نماز ادا کرنے لگ جاتا ہے۔ جب نماز پڑھ چکتا ہے تو صبیحہ اس سے کہتی ہے۔

''ارے تم تو چوری کرنے آئے تھے نماز کیوں پڑھنے لگے؟''

سنتوش کمار جواب دیتا ہے۔ ''چوری میرا پیشہ ہے اور نماز مجھ پر فرض ہے جس کی میں ادائیگی کرتا ہوں۔''

اس فلم کا ایک گانا ''اک چور اک لٹیرا۔ دل لے گیا ہے میرا'' بھی بہت مقبول ہوا تھا۔

اسی سال بابا عالم سیاہ پوش نے فلم ساز و ہدایت کار انور کمال پاشا کی پنجابی فلم ''چن ماہی'' کے مکالمے اور ایک گیت لکھا۔ کہانی شیخ اقبال نے تحریر کی تھی۔ نغمہ نگار طفیل ہوشیار پوری اور موسیقار رشید عطرے تھے۔ بطور ہیروئن بہار کی یہ پہلی فلم تھی۔ جب کہ اسلم پرویز ہیرو تھے۔ یہ فلم 23 نومبر 1956ء کو نمائش پذیر ہوئی اور اس نے سپر ہٹ کامیابی حاصل کی۔

اگلے سال بابا عالم سیاہ پوش کی صرف دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''باپ کا گناہ'' اور ''زلفاں'' تھیں۔ ''باپ کا گناہ'' فلمساز انور کمال پاشا کی اردو فلم تھی۔ جس کے ہدایت کار جعفر ملک تھے۔ بطور ہدایت کار یہ ان کی پہلی فلم تھی۔ یہ انور کمال پاشا کی سپر ہٹ فلم ''دو آنسو'' کی ری میک تھی۔ ''دو آنسو'' 1950ء میں ریلیز ہوئی تھی اور انور کمال پاشا کے والد محترم حکیم احمد شجاع کے ناول ''باپ کا گناہ'' سے ماخوذ تھی۔ ری میک میں اس کا نام ''باپ کا گناہ'' ہی رکھا گیا تھا۔ شاطر غزنوی نے بابا عالم سیاہ پوش کے ساتھ مل کر اس کے مکالمے لکھے تھے۔ فلم کے گیت سیف الدین سیف اور ساغر صدیقی نے تحریر کیے تھے۔ موسیقی رشید عطرے اور تصدق حسین نے ترتیب دی تھی۔ مسرت نذیر، نیر سلطانہ، درپن اور غلام محمد نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ یہ فلم 9 جولائی 1957ء میں ریلیز ہوئی مگر ''دو آنسو'' کی طرح کامیاب نہ ہو سکی۔ ناکام ہو گئی۔ ''باپ کا گناہ'' بابا عالم سیاہ پوش کی آخری اردو فلم تھی۔

پنجابی فلم ''زلفاں'' ہدایت کار آغا حسینی کی فلم تھی۔ اس کے فلمساز اور نگراں ہدایت کار انور کمال پاشا تھے۔ اس کی کہانی شیخ اقبال نے لکھی تھی۔ بابا جی نے اس کے مکالمے اور ایک کامیڈی سانگ لکھے تھے۔ یہ آغا حسینی کی بطور ہدایت کار پہلی فلم تھی۔ جس میں بہار اور اسلم پرویز نے مرکزی کردار کیے تھے۔ یہ فلم 13 ستمبر 1957ء کو نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔

1958ء میں بابا جی کی چار پنجابی فلمیں ریلیز ہوئیں۔ پہلی فلم ''شیخ چلی'' تھی جو کامیڈین آصف جاہ کی بطور مصنف اور ہدایت کار پہلی فلم تھی۔ بابا جی نے اس فلم کے لیے ایک گیت لکھا تھا اس ڈوئیٹ کو زبیدہ خانم اور فضل حسین نے گایا تھا اور یہ آصف جاہ اور آشا پوسلے پر فلمایا گیا۔ 10 جنوری 1958ء کو یہ فلم ریلیز ہوئی تھی۔ دوسری فلم ''جٹی'' تھی جس کی کہانی اور مکالمے بابا عالم سیاہ پوش نے لکھے تھے۔ اس کے فلمساز ملک مبارک احمد اور ہدایت کار ایم جے رانا تھے۔ ٹائٹل رول مسرت نذیر نے کیا تھا۔ ہیرو سدھیر تھے۔ فلم کے نام کو بعد میں بدل کر ''چٹی'' رکھ دیا گیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ فلم کے ایک سین میں خاکروبوں کا مذاق اڑایا گیا تھا جس پر انہوں نے ہڑتال کر دی تھی۔ یہ فلم 20 جون 1958ء کو ریلیز ہوئی اور سپر ہٹ ثابت ہوئی۔

بابا جی کی تیسری فلم ''مکھڑا'' تھی۔ اس پنجابی فلم کے فلمساز اداکار سنتوش کمار تھے۔ کہانی ملک حفیظ کی تھی اور ہدایت کار جعفر ملک تھے۔ اس کے مکالمے بابا جی نے لکھے تھے۔ صبیحہ خانم اس فلم کی ہیروئن اور علاؤ الدین ولن تھے۔ کامیڈین نذر کے لیے بابا جی نے جو تکیہ کلام ''استرا پھیر دیاں گا'' اور ''مچھاں صاف کر دیاں گا'' لکھا تھا۔ اسے تماشائیوں نے بہت پسند کیا تھا۔ یہ فلم 29 جون 1958ء میں ریلیز ہوئی اور سپر ہٹ ثابت ہوئی۔

بابا عالم سیاہ پوش کے حوالے سے اس سال کی آخری فلم ''گھر جوائی'' تھی جس کی کہانی اور مکالمے انہوں نے تحریر کیے تھے۔ اس فلم کے فلمساز انور کمال پاشا اور ہدایت کار ایم اکرم تھے اور یہ ایک کامیڈی فلم تھی۔ ایم اکرم کی بطور ہدایت کار یہ پہلی فلم تھی۔ ''گھر جوائی'' کا ٹائٹل رول آصف جاہ نے ادا کیا تھا۔ ان کی بیوی کا کردار آشا پوسلے اور سسر کا رول اے شاہ شکار پوری نے کیا تھا۔ بابا جی نے اس فلم کے لیے دو گیت بھی لکھے تھے۔

اگلے سال بابا جی کی صرف ایک فلم ''ناجی'' ریلیز ہوئی جو صبیحہ خانم اور ان کے والد محمد علی ماہیا نے پروڈیوز کی تھی۔ اس کی کہانی سلطان کھوسٹ نے لکھی تھی۔ مکالمے بابا

عالم سیاہ پوش نے لکھے تھے۔ انہوں نے اس فلم کے لیے ایک گیت بھی لکھا اس فلم کے لیے بابا جی کے تکیہ کلام بہت پسند کیے گئے۔ نذر کا تکیہ کلام ''اوے تھپڑ چل'' الیاس کاشمیری کا تکیہ کلام ''اوشاوا بھئی شاوا'' اور غلام محمد کا تکیہ کلام ''گاڈ از گریٹ'' کی مقبولیت نے فلم کی کامیابی میں بڑا کردار ادا کیا۔ بطور ہدایت کار یہ قدیر غوری کی پہلی فلم تھی۔ اس سے پہلے وہ منشی دل کے نائب ہدایت کار کے طور پر کام کرتے تھے۔ مقدر حسین ''ناجی'' کے موسیقار اور وارث لدھیانوی نغمہ نگار تھے۔ 10 اپریل 1959ء میں ''ناجی'' ریلیز ہوئی اور کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ 3 اگست کو ہدایت کار دلشاد ملک کی اردو فلم ''سورج مکھی'' ریلیز ہوئی۔ بابا جی نے اس فلم کا منظر نامہ تحریر کیا تھا۔

بابا عالم سیاہ پوش ''ناجی'' کے بعد تقریباً تین سال تک فلموں سے غائب رہے۔ مگر فلمساز ایم نسیم اور ہدایت کار امین ملک آخر کار انہیں فلمی دنیا میں واپس لے آئے۔ انہوں نے اپنی فلم ''چوڑیاں'' کے مکالمے اور گیت ان سے لکھوائے۔ یہ پہلی فلم تھی جس کے تمام گیت بابا جی سے لکھوائے گئے تھے ورنہ وہ ایک دو گیت بھی اس صورت میں لکھتے تھے جب دوسرے گیت نگار اس سچویشن پر گیت لکھنے سے معذرت کر لیتے تھے۔ موسیقار طفیل فاروقی نے ''چوڑیاں'' کے 9 گیت ان سے لکھوائے۔ اس فلم کے ہیرو اکمل اور ہیروئن لیلیٰ تھیں۔ اس فلم میں بابا جی کے لکھے ہوئے تکیہ کلام اے شاہ شکاری کا ''ڈم ڈم مشین والا'' اور آصف جاہ کا ''پاپا کو چین والا'' بہت مشہور ہوئے تھے۔

''چوڑیاں'' 19 جولائی 1963ء کو ریلیز ہوئی اور کامیاب ہوئی۔

اسی سال بابا عالم سیاہ پوش نے شباب کیرانوی کے لیے ایک اصلاحی پنجابی فلم ''تیس مار خان'' کے مکالمے اور گیت لکھے۔ کہانی اور اسکرین پلے خود شباب صاحب نے لکھے تھے۔ حیدر چوہدری اس فلم کے ہدایت کار تھے جو بطور ہدایت کار ان کی پہلی فلم تھی جب کہ نگران ہدایت کار شباب کیرانوی تھے۔ اس فلم کا ٹائٹل رول علاؤالدین نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ ادا کیا تھا۔ ان کے ساتھ ایک نئی لڑکی شیریں کو پیش کیا گیا تھا۔ جو اس فلم کی کامیابی کا اہم ذریعہ ثابت ہوئی تھی کیونکہ اس کی حیثیت کسی سیکس بم سے کم نہیں تھی۔ اس پر فلمایا ہوا بابا جی کا لکھا ہوا گیت

نمواں دا جوڑا اساں باگے وچوں توڑا

جو نذیر بیگم کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ فلم کا ہائی لائٹ تھا۔ اس گیت کی خوبی یہ تھی کہ اسے دیکھتے سنتے ہوئے تماشائیوں کو دل سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ صرف اس ایک گیت کو دیکھنے کے لیے اکثر تماشائی بار بار یہ فلم دیکھتے تھے۔ شیریں کے اوپر یہ گانا ایسا چسپاں ہوا کہ اس نے اسے اپنی اس پہلی فلم ہی سے مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچا دیا اور اسے پنجابی فلموں کی نامور ہیروئن تسلیم کرا لیا گیا۔

بابا عالم سیاہ پوش نے پنجابی کا لوک گیت

باجرے دا سی ٹی تے موڑیا

کو پیش نظر رکھ کر ''نمواں دا جوڑا اساں باگے وچوں توڑا'' لکھا تھا جو ان کی توقع سے بڑھ کر کامیاب ہوا۔ اس فلم کے دیگر گانوں کے علاوہ نسیم بیگم کی آواز میں گایا ہوا گیت

او میری جھانجھر چھن چھن چھنکے
جھنکارا جاوے گلی گلی

بے حد مقبول ہوا۔

اس فلم کی موسیقی منظور اشرف نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے گانوں کی مقبولیت نے موسیقاروں کی اس جوڑی کو بھی بہت فائدہ پہنچایا۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اس دور میں فلم کی کامیابی اس کے مکالمے کا بہت دخل ہوتا تھا اسی لیے بابا جی تکیہ کلام پر بہت زور دیتے تھے۔ انہوں نے اس فلم کے لیے علاؤالدین کا تکیہ کلام ''ممی اُڑاُڑ'' آصف جاہ کا تکیہ کلام ''علم دیاں گلاں علم دین جاندا۔'' ساون کا تکیہ کلام ''ایہہ گل اے'' اور چن چن کا تکیہ کلام ''ہیں تے ہیں'' لکھا جو کافی مقبول ہوئے۔ یہ فلم 30 اگست 1963ء میں ریلیز ہوئی اور سپرہٹ ثابت ہوئی۔

1964ء میں بابا جی کی چھ فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ان میں ''ولایت پاس'' اس سال کی پہلی فلم تھی 28 اگست 1964ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ انہوں نے اس فلم کے مکالمے لکھے جب کہ اس کی کہانی اور گیت وارث لدھیانوی نے تحریر کیے اور ہدایت کار مظفر طاہر تھے۔ ''ولایت پاس'' کا ٹائٹل رول آصف جاہ نے کیا تھا۔ اکمل اور شیریں نے مرکزی رومانوی کردار کیے تھے۔ اس فلم میں اے شاہ شکار پوری کا تکیہ کلام ''ہے نام دا گل اے'' اداکارہ ناصرہ کا تکیہ کلام ''رونا اس گل دا اے'' بہت مشہور ہوئے۔

''ماما جی'' اس سال کی وہ دوسری فلم تھی جس کے انہوں نے مکالمے اور ایک گیت لکھے تھے۔ کہانی ایم جے

رانا نے لکھی تھی۔ ہدایت کاری کے فرائض امین ملک نے انجام دیئے تھے۔ موسیقی جی اے چشتی اور گیت حزیں قادری کے تھے۔ ''ماما جی'' کا ٹائٹل رول طالش نے ادا کیا تھا۔ یہ فلم 15 فروری کو ریلیز ہوئی تھی اور کامیاب ٹھہری تھی۔

تیسری فلم کا نام ''پانی'' تھا جس کے ہدایت کار جعفر ملک تھے اور یہ فلم بھی سپر ہٹ ہوئی تھی۔ اس کا موضوع بڑا ہی متاثر کن تھا۔ کہانی ارشد کاظمی نے لکھی تھی جب کہ مکالمے بابا عالم سیاہ پوش نے تحریر کیے تھے جس کی نظر ثانی فیاض شیخ نے کی تھی۔ موسیقی جی اے چشتی نے ترتیب دی تھی جب کہ گیت تنویر نقوی اور مسلم اویسی نے لکھے تھے۔ بابا جی نے اس فلم کے ایک گیت کا مکھڑا بھی لکھا تھا جس کے تین انترے مسلم اویسی نے لکھے تھے۔ ساون کا تکیہ کلام ''سی اے گل تھو'' اور آصف جاہ کا تکیہ کلام ''فرمان فٹ'' نے مقبولیت حاصل کی تھی۔ اکمل اور شیریں اس کے ہیرو ہیروئن تھے۔ یہ فلم 17 اپریل 1964ء کو نمائش پذیر ہوئی اور باکس آفس پر اس نے سپر ہٹ بزنس کیا تھا۔

بابا عالم سیاہ پوش کی دو فلمیں ''لاڈلی'' اور ''بھر جائی'' ایک ساتھ ریلیز ہوئی تھیں۔ پنجابی فلم ''لاڈلی'' جس کے فلم ساز اور مصنف شباب کیرانوی اور ہدایت کار حیدر چوہدری تھے۔ بابا جی نے اس فلم کے مکالمے اور چار گیت لکھے تھے۔ یہ ایک میوزیکل کامیڈی فلم تھی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے تقریباً سارے ہی آرٹسٹوں کے لیے بابا جی سے تکیہ کلام لکھوائے گئے تھے جو مشہور ہوئے۔ آصف جاہ کا تکیہ کلام تھا ''ہاں مترا'' اداکارہ سیما کا ''ویری گڈ'' ظہور شاہ کا ''ہن میں تینوں کیہ کواں'' اداکارہ چن چن کا ''نانی کی لئی دا'' اور ساون کا تکیہ کلام ''چاچی ہا کھاں میں تینوں آکھاں کہ ناں آکھاں'' کو تماشائیوں نے پسند کیا تھا۔ یہ فلم 29 مئی 1964ء کو ریلیز ہوئی۔

اسی تاریخ کو ہدایت کار حیدر چوہدری کی گھریلو پنجابی فلم ''بھر جائی'' بھی نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس کے مکالمے اور گیت بابا عالم سیاہ پوش نے تحریر کیے تھے جب کہ کہانی ارشد کاظمی کی تھی۔ ٹائٹل رول اداکارہ بہار نے کیا تھا جب کہ فلم کے ہیرو اکمل اور ہیروئن شیریں تھیں۔ بابا جی کے مکالموں کے علاوہ ان کے گیت بھی بڑے متاثر کن تھے۔

اس فلم کی تکمیل کے دوران بابا جی کی جوان بیٹی فوت ہو گئی تھی جس کا انہیں بے حد صدمہ ہوا تھا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اس فلم کی کہانی میں بھی ایسی ہی ایک سچوئیشن تھی۔ اس سچوئیشن پر بابا جی نے جو گیت لکھا اس نے سننے والوں کو تڑپا دیا، جو کچھ یوں تھا۔

پینگ لٹ گھلارا کھا کے تالیاں دے تھمن بھج گئے

جسے مسعود رانا کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ کیریکٹر اداکار فضل حق کا یہ مکالمہ ''میں اپنی بھین دا گھر برباد ہندا نہیں دیکھ سکدا'' یہ فلم بھی سپر ہٹ ثابت ہوئی۔

''ملنگ'' مصنف و فلمساز شباب کیرانوی کی فلم تھی جو 20 نومبر 1964ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ جس کے ہدایت کار اے حمید تھے۔ یہ ایک اصلاحی فلم تھی جس کے مکالمے اور 5 گیت بابا عالم سیاہ پوش نے لکھے تھے۔ ایک گانا بشیر کھوکھر نے لکھا تھا۔ علاؤ الدین نے ٹائٹل رول کیا تھا۔ اس فلم کے لکھے گئے تکیہ کلام بھی مشہور ہوئے تھے۔ سلطان کھوسٹ کا تکیہ کلام ''قلندر تو ہی باہر تو ہی اندر'' علاؤ الدین کا ''چک کر بدلیا خا'' اداکارہ زینت کا ''دفع دور'' آشا پوسلے کا ''وے تینوں گولی وجے'' اور فلم کے ولن ساون کا تکیہ کلام ''کوئی ایسی تکڑم لڑا'' مشہور ہوئے تھے۔

اس سال بابا عالم سیاہ پوش کی آخری فلم ''جمیلہ'' تھی۔ یہ مصنف و ہدایت کار شباب کیرانوی کی سوشل فلم تھی۔ اس فلم میں بابا جی بطور اداکار پیش ہوئے تھے۔ یاد رہے کہ انہوں نے نذیر صاحب کی فلم ''پھیرے'' میں بھی اداکاری کی تھی مگر یہ 1949ء کی بات تھی۔ بطور اداکار بابا جی کی یہ آخری فلم تھی۔ اس فلم کی کاسٹ میں دیگر اداکار صابرہ سلطانہ، حبیب، نسرین، زینت، اسد بخاری، نبیلہ، اجمل، ایم اسماعیل، ظہور شاہ اور منور ظریف تھے۔

بابا عالم سیاہ پوش فلموں کے حوالے سے آل راؤنڈر تھے۔ فلم والوں نے ان سے کہانیاں بھی لکھوائیں اور مکالمے بھی۔ گیت بھی لکھوائے اور تکیہ کلام بھی۔ جب ضرورت پڑی اداکاری بھی کروالی۔ عام طور پر ان سے گیت اسی صورت میں لکھوائے جاتے تھے جب کسی مشکل سچوئیشن پر دوسرے گیت نگار نہیں لکھ پاتے تھے۔ ایسے میں ان کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ مکالمے وہ بہت جاندار اور سین کی مناسبت سے پُراثر لکھتے تھے اسی طرح آرٹسٹوں کے لیے تکیہ کلام لکھنے میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ ان کا دور پاکستانی فلمی صنعت کا ابتدائی دور تھا جب بلیک اینڈ وائٹ فلمیں بنتی تھیں۔ جدید ٹیکنالوجی کی کوئی سہولت حاصل نہیں تھی۔ لوک یا عام روایتی کہانیوں پر فلمیں بنائی جاتی تھیں۔

تماشائیوں کو ایٹرکٹ کرنے کے لیے آرٹسٹوں کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آصف جاہ اور نذر کی اوور ایکٹنگ بھی فلم بینوں کی تفریح بن جاتی تھیں۔ ایسے حالات میں تکیہ کلاموں سے بھی تفریح کا موثر کام لیا گیا۔ پہلے پہل فلموں میں ایک دو ہی تکیہ کلام ہوتے تھے لیکن ان کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ان کی تعداد بڑھائی جاتی رہی یہاں تک کہ ہر آرٹسٹ سے ایک تکیہ کلام بلوایا جانے لگا اور بابا جی اس فیلڈ میں بھی چیمپئن ثابت ہوئے۔

1965ء میں بابا عالم سیاہ پوش کی صرف ایک فلم ''ہیر سیال'' ریلیز ہوئی۔ اس لاجواب پنجابی فلم کے مصنف پیر سید وارث شاہ تھے۔ جب کہ اس کے مکالمے بابا عالم سیاہ پوش نے تحریر کیے تھے۔ فلمساز و ہدایت کار جعفر بخاری تھے۔ موسیقی بخشی وزیر کی تھی گیت وارث لدھیانوی، تنویر نقوی اور ظہیر کاشمیری نے لکھے تھے۔ کیدو کا کردار ایم اسماعیل نے ادا کیا تھا۔ ان کا تکیہ کلام تھا ''ذرا تیل و یکھ تیل دی دھار و یکھ'' جو بہت پسند کیا گیا تھا۔ اس فلم میں فردوس نے ہیر کا اور اکمل نے رانجھا کا کردار ادا کیا تھا۔ 3 ستمبر 1965ء میں ''ہیر سیال'' ریلیز کی گئی اور شاندار کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

1966ء میں بابا عالم سیاہ پوش کی دو فلمیں ''سورما'' اور ''تابعدار'' ریلیز ہوئیں۔ ''سورما'' کے مکالمے اور گیت بابا جی نے لکھے تھے۔ موسیقار طفیل فاروقی تھے۔ اس فلم کے تمام گانے بابا جی سے لکھوائے تھے جن کی تعداد چھ تھی۔ فلم کا ٹائٹل رول اکمل نے ادا کیا تھا جب کہ ان کی ہیروئن فردوس تھیں اس فلم کے مصنف مستری غلام محمد اور ہدایت کار رشید اختر تھے۔ یہ فلم 8 جولائی 1966ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

مصنف و ہدایت کار ارشد کاظمی کی فلم تابعدار کے لیے بابا جی نے سارے گیت لکھے تھے۔ جن کی دھن رحمٰن ورما نے ترتیب دی تھی۔ اسکرین پلے بشیر نیاز اور مکالمے سعید ساحلی نے تحریر کیے تھے۔ ٹائٹل رول رنگیلا نے ادا کیا تھا۔ یہ فلم 9 دسمبر 1966ء کو نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔

1967ء میں بابا جی کی پانچ فلمیں ریلیز ہوئیں۔ پہلی فلم ہدایت کار اے حمید کی ''چن جی'' تھی جس کی کہانی اور اسکرین پلے شباب کیرانوی نے لکھے تھے۔ جب کہ مکالمے اور گیت بابا عالم سیاہ پوش نے تحریر کیے تھے۔ فردوس اور اسد بخاری مرکزی کرداروں میں پیش ہوئے تھے۔ بابا جی نے فلم کے لیے آٹھ گانے لکھے تھے۔ جو بڑے عمدہ تھے

مگر فلم کی ناکامی نے ان گیتوں کو بھی پس منظر میں دھکیل دیا تھا۔ ناقص کہانی اور ہدایت کاری کی وجہ سے ناکام ہونے والی یہ فلم 5 مئی 1967ء کو ریلیز ہوئی تھی۔

دوسری فلم آغا جی اے گل اور ہدایت کار ایم جے رانا کی ''راوی پار'' تھی۔ اس کی کہانی شیخ اقبال نے جب کہ مکالمے اور تمام 9 گانے بابا عالم سیاہ پوش نے لکھے تھے۔

اس فلم کی تکمیل کے دوران ایک دن بابا جی ایورنیو اسٹوڈیو میں آغا جی اے گل کے دفتر پہنچ گئے اور ان سے کہا۔

''آغا جی! مجھے پچاس روپے کی سخت ضرورت ہے۔''

آغا جی نے انہیں جھڑک دیا۔ ''یہ تمہاری کیا حرکت ہے۔ تم روز پیسے مانگنے آجاتے ہو۔ جاؤ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

اسی دوران فلم کے ہدایت کار ایم جے رانا دفتر میں داخل ہوئے۔ آغا صاحب نے ان سے پوچھا۔

''رانا صاحب فلم کے گیتوں کا کیا بنا؟''

''ابھی تک تو کچھ نہیں بنا۔ دیکھتے ہیں کسی شاعر سے لکھواتے ہیں۔''

بابا جی کو معلوم تھا کہ فلم کے ایک سین پر جس گیت کی ضرورت تھی اس پر کئی شاعروں سے طبع آزمائی کروائی گئی تھی مگر کوئی معیار پر پورا نہیں اترا تھا۔ دونوں کی باتیں سن کر بابا جی بولے۔ ''رانا صاحب! میں آپ کو استھائی سناؤں؟''

''سناؤ۔''

بابا جی نے فوراً وہ استھائی سنا دی۔ ''واہ بابا جی! کیا بات کہہ دی ہے آپ نے۔'' رانا صاحب نے تعریف کی۔

آغا جی اے گل بول پڑے۔ ''بس یہ گیت اور باقی سارے گیت بھی آپ ہی لکھیں گے۔'' اس کے بعد انہوں نے اکاؤنٹنٹ کو بلوا کر کہا۔ ''بابا جی کو سو روپے کا چیک دے دو۔''

فلم کے موسیقار جی اے چشتی جو اس فلم کے گانے کسی اور سے لکھوانا چاہتے تھے انہیں فلم کے سارے گیت بابا جی ہی سے لکھوانے پڑے۔ اس فلم میں نیلو اور حبیب نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ یہ فلم 9 جون 1967ء کو ریلیز ہوئی۔

فلمساز و ہدایت کار بشیر ملک کی سبق آموز فلم ''میرا ویر'' کے مکالمے اور اس کے پانچ گیت بابا جی نے لکھے تھے۔ اس رومانوی فلم کی کہانی شیخ اقبال نے لکھی تھی۔ یہ اداکار اکمل کی آخری فلموں میں سے ایک تھی جو ان کی

وفات کے بعد ریلیز ہوئی۔ بابا جی نے جو پانچ گیت لکھے تھے سب ہی پسند کیے گئے۔

''جیدا دل فٹہو جائے جیدی گل مک جائے جنوں چوٹ لگے او جانے۔''

سپرہٹ ثابت ہوا اور بابا جی کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ یہ گیت اسٹریٹ سانگ بن گیا۔ یہ گیت نسیم بیگم کی آواز میں ریکارڈ ہوا تھا۔

فلمساز ایس ایم صدیق اور ہدایت کار ایم جے رانا کی کامیاب پنجابی فلم ''جانی دشمن'' جس کی کہانی مستری غلام محمد نے لکھی تھی اس کے مکالمے اور گیت بابا عالم سیاہ پوش سے لکھوائے گئے۔ اس فلم کے لیے ملکہ ترنم نور جہاں کا گایا ہوا گیت سپرہٹ ہوا۔ یہ گیت تھا

''میں چھج پتا سے وٹڈاں اج قیدی کرلیا ماہی نوں
میں اُچیاں کرلاں کندھاں''

باقی سات گیت بھی پسند کیے گئے کیونکہ بابا جی شاعری دل کی گہرائیوں سے کرتے تھے، چاہے وہ فلمی ہو یا ادبی۔ ''جانی دشمن'' 29 ستمبر 1967ء کو ریلیز ہوئی اور کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

اس سال کی آخری فلم ''میلہ'' تھی جس کے فلمساز آغا غلام محمد اور ہدایت کار و عکاس رشید چوہدری تھے۔ کہانی مستری غلام محمد کی تھی۔ بابا عالم سیاہ پوش نے مکالمے اور فلم کے پانچ گیت لکھے تھے۔ یہ فلم 20 اگست 1967ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

اگلے سال 1968ء میں بابا جی کی دو فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں ایک ''بدلہ'' اور دوسری ''پنج دریا'' تھی۔ دونوں فلموں کے لیے لکھے بابا جی کے گانوں نے پورے ملک میں دھوم مچا دی۔ ''بدلہ'' فلمساز زینت اور ہدایت کار حیدر چوہدری کی فلم تھی۔ اس کی کہانی اور مکالمے تنویر کاظمی نے لکھے تھے۔ ماسٹر عبداللہ اور طفیل فاروقی کی دھنوں پر بابا جی نے فلم کے تمام 6 گیت لکھے تھے جو سب ہی سپرہٹ ہوئے۔ ''بدلہ'' 31 مئی 1968ء میں ریلیز ہوئی اور اس نے باکس آفس پر کامیابی کے جھنڈے لہرائے۔

اسی سال فلمساز کیو زمان اور ہدایت کار جعفر ملک کی پہلی ایسٹ مین کلر فلم ''پنج دریا'' ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے مکالمے اور گیت بابا عالم سیاہ پوش نے لکھے تھے۔ موسیقار وزیر علی کی کمپوزیشن میں بابا جی نے فلم کے 8 گیت لکھے تھے جو سب کے سب پسند کیے گئے مگر ملکہ ترنم نور جہاں کی آواز میں گایا ہوا نغمہ

''میرے مجرے بھلاں دے گجرے کنڈیاں دے وس پے گئے''

نے سپرہٹ کامیابی حاصل کی۔ یہ گیت فردوس پر فلمایا گیا تھا۔ یہ فلم 22 دسمبر 1968ء میں عیدالفطر کے دن ریلیز ہوئی تھی اور بہت کامیاب ثابت ہوئی تھی۔

1969ء میں بابا جی کی چار فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''ناجو، دلدار، شیر جوان اور دمی رانی''۔ پہلی فلم ''ناجو'' فلمساز و ہدایت کار قدیر غوری کی فلم تھی۔ بابا عالم سیاہ پوش نے اس کے مکالمے لکھے تھے جب کہ کہانی شیخ اقبال کی تھی۔ دوسری فلم ''دلدار'' فلمساز فیاض اے گل اور ہدایت کار امین ملک کی تھی۔ بابا جی نے اس کے مکالمے اور اس کے تمام 7 گانے لکھے تھے۔ تیسری فلم ''شیر جوان'' ہدایت کار محبوب لودھی کی تھی۔ وارث لدھیانوی اور بابا جی نے مل کر اس کے مکالمے لکھے تھے۔ ''دمی رانی'' عالیہ کی والدہ ممتاز بانو کی فلم تھی جس کے مکالمے بابا جی اور سکے دار نے مل کر لکھے

معرکہ نمارق

حضرت عمرؓ کے ابتدائی عہد خلافت میں عراق میں نمارق کے مقام پر جنگ لڑی گئی۔ حضرت مثنیٰؓ خود مدد لینے کے لیے مدینہ آئے تھے۔ ان دنوں صدیق اکبرؓ بیمار تھے۔ انہوں نے مدد کے لیے وصیت کی۔ جسے حضرت عمرؓ نے پورا کرتے ہوئے حضرت ابوعبیدؓ بن مسعودؓ کی قیادت میں لشکر روانہ کیا۔ عراق میں آتش پرستوں نے نمارق کا احراف سے گھیراؤ کیا اور یہیں جنگ کرنے کا قصد کیا۔ ان کی قیادت رستم کے ہاتھ میں تھی۔ تاہم اس نے مختلف سردار مقرر کر رکھے تھے۔ نمارق کے مقام پر جابان سردار تھا۔ حضرت ابوعبیدؓ نے اس پر حملہ کیا۔ خونریز جنگ ہوئی۔ جابان اپنی فوج کے ساتھ فرار ہو گیا۔ اسلامی لشکر کے ایک سپاہی نے گرفتار کیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ جابان ہے۔ دو غلاموں کی پیش کش پر اس نے اسے رہا کر دیا۔ بعد میں ایک اور صحابہ نے اسے گرفتار کیا۔ مگر مسلمان کے وعدے پتھر پر لکیر ہوتے ہیں۔ اس بنا پر اسے رہا کرتے ہوئے میدان جنگ سے چلے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

مرسلہ: صالح محمد، جھنگ

اندر کی آنکھ سے دیکھنے والے

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہدایت کار کسی عام آدمی کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتا ہے کہ اس کے اندر کتنا بڑا فنکار چھپا ہوا ہے۔ یہ دراصل وہ اپنے اندر کی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں کہ کس کے اندر کیا چھپا ہوا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت ہوا جب بھارت کے نامور ہدایت کار ہنگل صاحب نے اپنے ایک اسٹیج ڈرامہ ''ڈمرو'' کے لیے ایک 23 سالہ نوجوان کا انتخاب اس ڈراما کے ساٹھ سالہ کردار کی ادائیگی کے لیے کیا۔ اس کردار کے مدِمقابل کام کرنے والی ایک ایسی عورت کا کردار تھا جس کی عمر پچاس سال تھی جو زیادہ بچوں کی وجہ سے سٹھیا سی گئی تھی۔ جب اس لڑکے کو اس سٹھیائی ہوئی عورت کا کردار کرنے والی اداکارہ شوکت خانم نے پہلی بار دیکھا تو گھبرا کر ہدایت کار سے کہا۔ ''ہنگل صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ اتنے اہم اور اولڈ کیریکٹر کے لیے اتنے ینگ اور ناتجربہ کار لڑکے سے کام کرا رہے ہیں؟''

یہ 1957ء کی بات ہے اور پوچھنے والی اسٹیج اداکارہ شوکت خانم کے عروج کا دور تھا۔ یہ شوکت خانم کوئی اور نہیں ادبی اور فلمی دنیا کے نامور شاعر اور نغمہ نگار کیفی اعظمی کی بیگم اور آج کی ورسٹائل اداکارہ شبانہ اعظمی کی والدہ محترمہ تھیں۔

''ڈمرو'' کے ڈائریکٹر ہنگل صاحب نے شوکت خانم کی بات سنی تو مسکرائے۔

''شوکت جی! میرا خیال ہے کہ یہ ینگ لڑکا، ساٹھ سالہ شخص کا۔ کردار بڑی خوبی سے ادا کرے گا۔''

''میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ اس کے بارے میں ایسا کیوں سوچ رہے ہیں! آخر یہ ہے کون؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے۔ مگر مجھے یہ معلوم ہوگیا ہے کہ اسے ڈراموں سے بہت دلچسپی ہے۔ وہ بڑی

تھے۔

1970ء میں بابا عالم سیاہ پوش کی تین فلمیں ''چور تالے چتر، ڈیرا سجناں دا اور لارالپا ریلیز ہوئیں''۔ ''چور تالے چتر'' کے لیے انہوں نے صرف دو گیت لکھے تھے۔ یہ فلمساز و ہدایت کار ریاض احمد راجو کی فلم تھی جس کی موسیقی رحمٰن ورما نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم یکم مئی 1970ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ ''ڈیرا سجناں دا'' ہدایت کار منشی دل کی فلم تھی۔ بابا جی نے اس کا صرف ایک گیت لکھا تھا۔ اس سال کی ان کی آخری فلم ''لارالپا'' ہدایت کار ایس ایم ڈار کی فلم تھی۔ اس فلم کے لیے انہوں نے مکالمے اور پانچ گیت لکھے تھے اس کے موسیقار ماسٹر رفیق علی تھے۔

بابا عالم سیاہ پوش کی 1971ء میں دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ پہلی فلم فلمساز زینت وظہور اور ہدایت کار وزیر علی کی ''حد بندی'' تھی۔ بابا جی نے اس کے دو گیت لکھے تھے۔ یہ فلم 26 مارچ 1971ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ دوسری فلم ہدایت کار جعفر ملک کی ''سہرا'' تھی۔ بابا جی نے اس کے مکالمے اور دو گیت لکھے تھے۔

نمائش کے حساب سے بابا عالم سیاہ پوش کی آخری فلم ''مان جوانی'' تھی جو ان کی وفات کے تقریباً چار سال بعد 1976ء میں ریلیز ہوئی اس فلم کے انہوں نے صرف مکالمے لکھے تھے۔ اس فلم کے مصنف ذکی بی اے تھے اور ہدایت کار اور فلمساز ایچ خالد تھے۔

بابا عالم سیاہ پوش کی تین فلمیں ایسی ہیں جو مختلف وجوہ کی بنا پر ریلیز نہ ہوسکیں۔ ان میں پہلی فلم فلمساز و ہدایت کار بشیر ملک کی ''پنڈ دا چوہدری'' تھی جس کے مکالمے انہوں نے تحریر کیے تھے جب کہ اس کی کہانی اسماعیل عالم نے لکھی تھی جو بابا جی کے داماد تھے۔

دوسری غیر ریلیز شدہ فلم ''پینڈو'' تھی۔ اس فلم کے مصنف اور مکالمہ نگار بابا عالم سیاہ پوش تھے۔ ''پینڈو'' کا ٹائٹل رول عنایت حسین بھٹی نے کیا تھا۔

تیسری نامکمل فلم ''شاہی جوانیاں مانیں'' تھی۔ جس کے لیے بابا جی نے تین گانے لکھے تھے۔

بابا عالم سیاہ پوش نے جہاں فلموں کے لیے یادگار نغمے لکھے وہاں سیاسی اور معاشرتی موضوعات پر بھی بڑی بھرپور نظمیں لکھیں۔ ان کی ابتدا ہی چونکہ ادبی شاعری سے ہوئی تھی اس لیے آخری عمر تک جب بھی موقع ملا انہوں نے ملک و معاشرہ کے لیے ولولہ انگیز نظمیں لکھیں۔ ممتاز دولتانہ

پابندی سے میرے ڈرامے دیکھنے آتا رہا ہے۔ اس کا پابندی سے آنا مجھے بھا گیا اور میں نے اس کردار کے لیے اسے منتخب کرلیا۔"

شوکت نے منہ سے کچھ نہیں کہا بس کندھے اچکا کر رہ گئیں۔ مگر جب اس ڈرامے کی ریہرسل شروع ہوئی تو وہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہیں کہ اتنی عمر کے آدمی کا رول وہ کس خوبی سے ادا کر رہا تھا اور جب ڈراما اسٹیج ہوا تو لوگ اس وقت کی منجھی ہوئی اداکارہ شوکت خانم کو بھول گئے۔ سب کی زبان پر ہری ہرجری کا نام تھا۔ اس نئے اور نوآموز اداکار کے فنی محاسن کا تذکرہ تھا۔ ہنگل صاحب نے اس کا میک اپ بھی اس قدر صحیح کروایا تھا کہ وہ کہیں سے 23 سال کا نوجوان لگتا ہی نہیں تھا۔ شوکت خانم کو یہ بات تسلیم کرنی پڑی کہ اچھے اور سچے ڈائریکٹر کی دور بین نگاہیں اوپر ہی نہیں اندر بھی جھانک کر دیکھ لیتی ہیں کہ کس میں کیا پوشیدہ ہے۔

"ڈمرو" کے بعد تو بھی رائٹر اور ڈائریکٹر اس لڑکے کے دیوانے ہو گئے۔ ہر ڈرامے میں اسے کاسٹ کیا جانے لگا۔ اسکرپٹ رائٹر شوامتر عادل اس کی صلاحیتوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسے ڈراموں سے نکال کر فلموں میں لے گئے اور بہت سے فلمی ہدایت کاروں سے اس کا تعارف کرایا۔ اگرچہ اس کا فلمی کیریئر بی کلاس فلموں سے شروع ہوا مگر اس کی خداداد صلاحیتوں نے اسے جلد ہی بڑے بینر کی فلموں تک پہنچادیا۔ اگر آپ نے پرانی بھارتی فلمیں دیکھی ہیں تو آپ نے بھی اس کی فلمیں دیکھی ہوں گی۔ فلموں میں آنے کے بعد وہ ہری ہرجری والا نہیں رہا۔ سنجیو کمار کی حیثیت سے بھارتی فلموں کا صفِ اوّل کا اداکار تسلیم کیا گیا۔

مرسلہ: انور فرہاد، کراچی

جن دنوں پنجاب کے وزیراعلیٰ تھے۔ ان دنوں آٹے کا شدید بحران پیدا ہوا۔ بابا عالم سیاہ پوش نے آٹے کے اس بحران پر ایک پُرجوش نظم لکھی جو اخبارات میں شائع ہوئی تو وزیراعلیٰ صاحب پریشان ہو گئے۔ انہوں نے کشمیر پر بھی ایک نظم لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ اس کے علاوہ کچا گھڑا، رانجھن، بھکھو دا ہاڑا، ساڈا ممبرے باڑا، شہید دی ماں، بجرے زخم، ساڈا راج اور ہجرت در ہجرت ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ ان کے بیٹے امتیاز عالم سیاہ پوش نے ان کے فلمی گیتوں اور نظموں کو اکٹھا کر کے ایک کتاب "ہنریاں راتاں" کے نام سے شائع کی تھی۔ جس کا دیباچہ انور کمال پاشا نے لکھا جب کہ پیش لفظ شباب کیرانوی نے تحریر کیا تھا۔ یہ کتاب دوبارہ نہیں چھپی اس لیے نایاب ہے۔

بابا عالم سیاہ پوش کی شخصیت کا یہ پہلو انتہائی قابلِ تحسین ہے کہ کیسے بھی حالات کا سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے زندہ دلی نہیں چھوڑی۔ وہ رجائیت پسند تھے اس لیے انہیں مایوسیوں کے اندھیروں میں بھی اُمید کی کرن نظر آتی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ عمر بھر دال روٹی کی فکر سے آزاد نہ ہو سکے۔ فلم والوں کے لیے اس قدر فعال ہونے کے باوجود فلم والوں نے کبھی ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ فلمسازوں کی روایتی چیرہ دستیوں کے شکار رہے۔ ان کی اس عادت سے کہ وہ فلم میں کام کرنے والوں کو کبھی بروقت یا یکمشت معاوضہ نہیں دیتے تھے۔ توڑ توڑ کر اور بار بار مانگنے پر بھیک کی طرح دیتے تھے۔ آغا جی اے گل جیسا بڑا فلمساز اور بڑے نگار خانے کا مالک بھی انتہائی ضرورت پر پچاس روپے مانگنے پر انہیں جھڑک دیتا تھا اور کہتا تھا یہ تمہاری کیا حرکت ہے تم روز پیسے مانگنے آجاتے ہو۔

اسی طرح ایک بار فلمساز اداکارہ زینت بیگم سے بابا جی نے جا کر کہا۔ "مجھے کچھ پیسے چاہیے میرے گھر میں میرے بیوی بچے بھوکے ہیں۔ مجھے ان کے لیے کھانے کا کچھ سامان لے کر جانا ہے۔"

میڈم زینت نے کہا۔ "بابا جی آج تو میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ آپ دو تین دن بعد آئیں۔"

"میڈم! مجھے پیسوں کی آج اور ابھی ضرورت ہے۔ میں دو تین دن بعد کیا لینے آؤں گا۔ میرے بیوی بچے اس وقت بھوک سے تڑپ رہے ہیں اور آپ کہتی ہیں دو تین دن بعد آئیں۔"

دیکھا آپ نے یہ رویہ تھا ہمارے فلمسازوں کا جو لاکھوں کی فلمیں بناتے تھے مگر پسِ پردہ کام کرنے والوں کے لیے ان کا لکا سا جواب ہوتا تھا۔

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب میڈم زینت اپنی پنجابی فلم "بدلہ" بنا رہی تھیں جس نے سپرہٹ کامیابی حاصل کی تھی۔ باباجی کے جواب پر وہ بولیں۔

"میں نے احمد راہی کو اپنی فلم کے لیے گیت کے کچھ سچویشن دیئے ہیں۔ ان کے لیے میں نے کچھ پیسے رکھے ہوئے ہیں۔ بس وہی پیسے فی الحال میرے پاس ہیں۔"

باباجی زینت بیگم کی بات سن کر سخت مایوس ہوئے۔ انہوں نے غمگین لہجے میں کہا۔ "جیہوے توڑ دے نے دل برباد ہون گے اج کسے نوں روایا کل آپ رون گے"

انہوں نے اپنے دل کی بات شعری پیرائے میں کہی تھی۔ جسے سن کر میڈم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں مگر باباجی کے حالِ زار پر نہیں بلکہ اس شعر پر۔ جھٹ بول پڑیں۔ یہ تو بڑا زبردست مکھڑا ہے۔ میں یہی گیت اپنی فلم "بدلہ" کے لیے رکھ لوں گی اور میری فلم کے باقی گانے بھی آپ ہی لکھیں گے۔ میں احمد راہی سے معذرت کرلوں گی۔"

اس کے بعد انہوں نے احمد راہی کے لیے رکھے ہوئے پیسے باباجی کو دے دیئے۔

یہ تھا فلم والوں کا رویہ کہ وہ اپنے فائدے کے لیے سب کچھ کرتے تھے۔ جن لوگوں کی محنت اور مشقت سے فلم بناتے اور اپنی تجوریاں بھرتے تھے۔ ان کے لیے ان کے دلوں میں کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

باباعالم سیاہ پوش شاعر تو بہت اچھے تھے مگر بہت بدحال تھے۔ زندگی بھر اپنی بے بسی پر کڑھتے رہے۔ انہیں ان حالات میں کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ میرے اباجی میری شعروشاعری کو جو منحوس سمجھتے تھے اور اس سے مجھے دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے وہ ان کا کوئی غلط اقدام نہیں تھا۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ لکھا پڑھا کر کوئی بڑا آدمی، کوئی کامیاب آدمی بنانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں اور میرے بال بچے خوش حال زندگی بسر کریں مگر میری ہی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ میں نے شاعری کو ہی اوڑھنا بچھونا بنالیا جس کا خمیازہ آج بھگت رہا ہوں۔

کوئی ماں باپ اپنی اولاد کے لیے برا نہیں چاہتے۔ ان کی بھلائی اور بہتری کے لیے سرگرداں ہوتے ہیں۔ وہ لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جو والدین کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں ورنہ باباعالم سیاہ پوش کی طرح پچھتاوا ان کا مقدر بنتا ہے۔

یکم مارچ 1972ء کو شباب کیرانوی کے فرزند نذر شباب کا ولیمہ تھا۔ باباعالم سیاہ پوش بھی اس دعوت میں شریک تھے۔ ولیمے کی دعوت سے اٹھے تو ان کے دوست اور سمدھی انور کمال پاشانے ان سے کہا۔

"باباجی! اتنی جلدی گھر جا کر کیا کریں گے، میرے گھر چلیے وہاں کچھ دیر گپ شپ کریں گے۔" واضح رہے کہ انور کمال پاشا کے صاحبزادے محمد کمال پاشا بھی باباعالم سیاہ پوش کے داماد تھے۔

"چلیے۔" باباجی بولے۔ دونوں کوئی بارہ بجے رات تک خوش گپیاں کرتے رہے۔ وہاں سے گھر لوٹے تو ابھی سونے کی تیاری ہی کررہے تھے کہ انہیں دل میں تکلیف محسوس ہوئی اور گر پڑے۔ انہیں فوراً اسپتال پہنچانے کے لیے ایمبولینس بلوائی گئی مگر موت کے فرشتے نے اس کی مہلت ہی نہیں دی اور باباعالم سیاہ پوش نے اپنے گھر پر ہی اپنے بیوی بچوں کے درمیان اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کردی اور پنجابی فلموں کا ایک بے مثل مکالمہ نگار، کہانی نویس اور نغمہ نگار اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

جن خوبیوں کا فلم والوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ سپرہٹ فلموں کی کہانیاں لکھوا کر اپنی تجوریاں بھریں، دل میں گھر کر جانے والے مکالمے تحریر کروا کر فلموں کو کامیاب بنایا۔ شریر اور چلبلے تکیہ کلام لکھوا کر آرٹسٹوں کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ ناقابلِ فراموش گیت لکھوا کر اور ان پر پرفارم کروا کر اداکاروں اور اداکاراؤں کو شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچایا۔

ان ساری کارکردگیوں کے باوجود اس غریب کو کیا ملا؟ باباجی کا ٹلو؟ ناکامی، محرومی، مایوسی اس کی زندگی بھر کی کمائی تھی۔ نہ خود چین کی زندگی بسر کرسکا نہ بال بچوں کو آرام و آسائش بہم پہنچاسکا۔ اس کے بعد آنے والے فلم رائٹرز میں سے وہی لوگ سروائیو کر سکے جن کے پاس فلم والوں کے کاٹے کا تریاق تھا۔ جو ان کی روایتی چیرہ دستیوں سے نبرد آزما ہونے کا گر جانتے تھے جب کہ بے چارہ باباعالم سیاہ پوش تو محض ایک بھولا بھالا شاعر اور اناڑی کھلاڑی تھا۔ فلم انڈسٹری میں مس فٹ تھا۔

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے اس بارہویں مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جا رہا ہے

☆ قائداعظم

یوں دی ہمیں آزادی کہ دنیا ہوئی حیران
اے قائد اعظم تیرا احسان ہے احسان

یہ ایک ایسے شخص کا تذکرہ ہے، جو تاریخ کا دھارا بدلنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ اس کی شب و روز کی محنت، یقین اور لگن ہی کا نتیجہ تھا، جس کے وسیلے سے دنیا کے نقشے پر ایک نئی ریاست وجود میں آئی۔ وہ بلاشبہ بیسویں صدی کے چوٹی کے سیاست دانوں میں سے ایک تھا۔

محمد علی جناح کا ذکر ہو، تو الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ باوقار شخصیت۔ عالم فاضل انسان۔ اصول پسندی میں اپنی مثال آپ۔ برصغیر کے مسلمانوں کو غلامی کی زنجیر سے نجات دلانا ان کا بڑا کارنامہ۔ اس دانا کے افکار نے پوری مسلم دنیا کو متاثر کیا۔ غیروں نے بھی اُن کے قصیدے پڑھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں سے برتا جانے والا حالیہ رویہ اس بات کا عکاس ہے کہ ان کی فکر درست تھی۔

محمد علی جناح 25 دسمبر 1876ء کو کراچی کے ایک تاجر پونجا جناح کے ہاں پیدا ہوئے۔ جن درس گاہوں سے علم حاصل کیا، ان میں سندھ مدرسۃ الاسلام نمایاں ہے۔ 16 برس کی عمر میں برطانیہ چلے گئے۔ لنکنز ان سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ اس درس گاہ میں داخلے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہاں پتھر کی سل پر دنیا کے جن عظیم قانون دانوں کے نام کندہ تھے، ان میں رسول کریم ﷺ کا نام سرفہرست تھا۔ برطانیہ میں قیام کے زمانے میں سیاست کا ابتدائی تجربہ کیا۔ ان کی دوررس نگاہیں دیکھ سکتی تھیں کہ آج نہیں تو کل انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔

وطن لوٹ کر وکالت کے پیشے میں قدم رکھا۔ نام بنانے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ 1896ء میں آپ کانگریس میں شامل ہوگئے۔ انھیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا جاتا تھا۔ مگر ان کی روشن خیالی اور گاندھی جی کی رجعت پسندی کے درمیان تصادم کے باعث آپ کو دوسری راہ چننی پڑی۔

مسلم لیگ 1906ء میں قائم ہو چکی تھی۔ حقائق و

حالات انھیں اس جماعت کے قریب لے آئے۔ 1916ء میں انھیں مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔ 1929ء میں انھوں نے نہرو رپورٹ کے جواب میں تاریخ ساز چودہ نکات پیش کیے جنھیں چند مورخین تحریکِ پاکستان کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

کچھ عرصے وہ سیاست سے دور بھی رہے مگر پھر فرائض کی پکار سنی، ہندوستان لوٹ آئے۔ ان کی پاٹ دار آواز نے مسلمانِ ہند میں نئی روح پھونک دی۔ 1940ء کی قراردادِ پاکستان کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ ریاست کی جدوجہد شروع کی۔ 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے مسلم اکثریتی علاقوں میں کامیابی حاصل کی تو اس کا سبب قائد اعظم کی بے مثال قیادت ہی تھی جس نے انگریزوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ پاکستان قائد اعظم کی مخلص کوششوں کا ثمر تھا۔ اسی وجہ سے انھیں ملت کا پاسباں قرار دیا جاتا ہے۔ بابائے قوم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

وہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے۔ بیماری کے باوجود لاکھوں پناہ گزینوں کی آبادکاری، ملک کی داخلی و خارجی پالیسی، تحفظ اور معاشی ترقی کے لیے انھوں نے دن رات ایک کر دیے۔ اپنی گرتی صحت کی پروا نہیں کی۔ پاکستانی عوام نے انھیں قائد اعظم اور بابائے قوم قرار دیا۔ 11 ستمبر 1948ء کو اس نابغۂ روزگار شخص کا کراچی میں انتقال ہوا۔ ان کا خوبصورت مزار کراچی کی پہچان ہے۔

☆ حسین شہید سہروردی

اگر برصغیر کے سو با اثر سیاست دانوں کی فہرست بنائی جائے، تو ان کا نام اس میں شامل ہونا لگ بھگ طے ہے۔ مسلم سیاست دانوں میں ان کا مقام نمایاں۔ گو پاکستان کا پانچواں وزیر اعظم بننا بھی ایک بڑا اعزاز ہے، مگر حسین شہید سہروردی اس سے قبل بھی کئی کارہائے نمایاں انجام دے چکے تھے۔ تقسیم سے قبل انھوں نے بنگال جیسے علاقے کے وزیرِ اعلیٰ کا منصب سنبھالا۔

بنگال کا شہر مدنا پور ان کی جائے پیدائش ہے۔ انھوں نے 8 ستمبر 1893ء کو ایک علمی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ذہین فطین آدمی تھے۔ ادب سے گہرا شغف تھا۔ کتنے ہی اشعار زبانی یاد تھے۔ آکسفورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ عملی سیاست میں قدم رکھا، تو جلد توجہ اور امیدوں کا مرکز بن گئے۔ مختصر سے عرصے میں کلکتہ کا میئر ہو جانا آسان نہیں تھا۔ ان کی ذہانت دیکھتے ہوئے قائد اعظم نے انھیں مسلم لیگ میں

شمولیت کی دعوت دی اور بنگال کی قیادت انھیں سونپ دی۔ تحریکِ پاکستان کے دوران وہ مسلم لیگ بنگال کے جنرل سیکریٹری رہے۔ 16 اگست 1946ء کا راست اقدام ان کی وجہ شہرت بنا۔

بنگال میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات ان کی حکومت کے لیے کٹھن دور تھا۔ اس دوران انھوں نے مسلمانوں کی حفاظت کی ہر ممکن کوشش کی جس کی وجہ سے انھیں دیگر طبقات کی ناراضی مول لینی پڑی۔ فسادات کے زمانے میں وہ گاندھی جی کے ساتھ نظر آئے، جس پر چند اعتراضات بھی ہوئے۔

تقسیم کے بعد مسلم لیگ کے اس رہنما کے خلاف ایک گروہ سرگرم ہو گیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا، جب انھیں مسلم لیگ سے نکال دیا گیا۔ 1949ء میں سہروردی نے جناح عوامی لیگ کی بنیاد ڈالی، جو بعد میں عوامی لیگ کے نام سے معروف ہوئی۔ 50 کی دہائی کے اوائل میں انھوں نے قائد حزبِ اختلاف کا اہم منصب سنبھالا اور اسے خوب نبھایا۔ 1956ء میں جب آئین منظور ہوا، تو وہ ان چند افراد میں شامل تھے جنھوں نے اس پر دستخط نہیں کیے۔ 12 ستمبر 1956ء کو ملک کے وزیر اعظم مقرر کیے گئے، تاہم جلد ہی یہ عہدہ چھین لیا گیا۔

1958ء میں جب مارشل لا نافذ ہوا تو سہروردی نے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ حکومت نے انھیں نااہل قرار دینے کی کوشش کی، انھوں نے عدالت میں اپنے پُرزور اور مدلل انداز میں دفاع کیا۔ ایک جانب قانونی تو دوسری طرف وہ سیاسی محاذ سنبھالے ہوئے تھے۔ آمریت کے خلاف تحریک شروع کرنے کے لیے مشرقی اور مغربی پاکستان کے طوفانی دورے کیے۔ عوام تو ان کے ساتھ تھے مگر کچھ سیاست دانوں نے موقع پرستی کا ثبوت دیا اور اس سیاسی جنگ میں حصہ نہیں لیا۔

1963ء میں انھیں دل کا دورہ پڑا۔ انھیں علاج کی غرض سے یورپ لے جایا گیا۔ وہ بیروت کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے کہ 5 دسمبر 1963ء کی رات ان کی حالت اچانک بگڑ

گئی۔ اس سے قبل کہ انھیں کوئی طبی امداد پہنچائی جاتی، وہ انتقال کر گئے۔ سہروردی کی میت وطن واپس لائی گئی۔ 8 دسمبر 1963ء کو انھیں ڈھاکا میں مولوی فضل الحق کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

ان کے اہل خانہ نے ان کی موت کو قتل قرار دیتے ہوئے اس کا الزام نوکر شاہی پر عاید کیا، مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ بعد اس ضمن میں کتابیں بھی لکھی گئیں۔

☆ بینظیر بھٹو

معتقد انھیں دخترِ مشرق کہتے ہیں۔ آپ ان کی طرزِ سیاست سے اختلاف کر سکتے ہیں، ان کی پارٹی پر ہزاروں الزامات لگا سکتے ہیں، مگر اس امر سے مفر نہیں کہ انھوں نے اپنے ذہین اور دلیر باپ کی وراثت کو سنبھالا اور اس کی آبیاری کے لیے اپنی جان کی قربانی سے بھی گریز نہیں کیا۔

جس پہلی خاتون نے پاکستان میں وزیر اعظم کا منصب سنبھالا، وہ بینظیر بھٹو تھیں۔ 1988ء میں پہلی بار انھوں نے یہ عہدہ سنبھالا، گو فقط بیس ماہ اقتدار میں رہیں مگر یہ طے ہو گیا کہ بھٹو کی پارٹی ایک معروضی حقیقت بن چکی ہے جس کی قیادت ایک فطین اور نفیس خاتون کے ہاتھوں میں ہے۔

بینظیر بھٹو 21 جون 1953ء کو سندھ کے بھٹو خاندان میں پیدا ہوئیں، جو زرخیز سیاسی پس منظر رکھتا تھا۔ ابتدائی تعلیم لیڈی جینگکو نرسری اسکول اور کونونٹ آف جیسز اینڈ میری اسکول کراچی سے حاصل کیں۔ راولپنڈی پریزنٹیشن کونونٹ میں بھی زیر تعلیم رہیں۔ پندرہ برس کی عمر میں اولیول کا امتحان پاس کیا۔ 1969ء میں ہارورڈ یونیورسٹی کا حصہ بن گئیں، جہاں سے 1973ء میں پولیٹیکل سائنس میں گریجویشن کیا۔ وہیں سے ایم اے کی سند حاصل کی۔ اس زمانے میں وہ طلبا سیاست میں خاصی سرگرم رہیں۔

1977ء میں وطن لوٹیں۔ خواہش تو یہی تھی کہ اپنے والد کے مانند خارجہ امور کے شعبے سے کیریر شروع کریں، لیکن یہاں ایک طوفان ان کا منتظر تھا۔ حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ بھٹو صاحب گرفتار ہوئے، ان پر مقدمہ چلا، آخر کار اپریل 1979ء میں انھیں پھانسی دے دی گئی۔

بینظیر بھٹو اور اہل خانہ کے لیے وہ دن انتہائی کٹھن تھے۔ نظر بندیاں، جیل یاترا، جمہوریت کی بحالی کے لیے شروع ہونے والی ایم آر ڈی کی تحریک کو بری طرح کچلا گیا۔ محترمہ جلاوطن بھی رہیں۔ مارشل لا ختم ہونے کے بعد پاکستان لوٹیں تو ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ ان کی مقبولیت حکومت کے لیے دردِ سر بن گئی۔ اسی زمانے میں آصف علی زرداری سے ان کی شادی ہوئی۔ ضیا الحق کی موت کے بعد غلام اسحاق کی سربراہی میں انتخابات ہوئے، پیپلز پارٹی نے کامیابی حاصل کی۔ محترمہ نے وزیر اعظم کا حلف اٹھایا۔ (کچھ محققین انھیں مسلم دنیا کی پہلی وزیر اعظم قرار دیتے ہیں) اگست 1990ء میں ان کی حکومت کرپشن کے الزامات کی وجہ سے ختم کر دی گئی۔

1993ء میں یہ پارٹی پھر ابھر کر آئی۔ بینظیر پھر وزیر اعظم بن گئیں۔ مگر ایک بار پھر بدعنوانی کے الزامات کی وجہ سے ان کی حکومت کو برطرف کر دیا گیا۔ اصل الزام آصف علی زرداری کو دیا جاتا ہے۔ پھر ان کی خارجہ پالیسی بھی اس کا سبب ٹھہری۔ انھوں نے خودساختہ جلاوطنی اختیار کر لی۔ 2007ء میں پرویز مشرف اور پی پی کے درمیان ہونے والوں رابطوں کے نتیجے میں آصف علی زرداری رہا ہوئے۔ محترمہ پاکستان آئیں مگر وہ انتہاپسندوں کے نشانے پر تھیں۔ ان کی آمد کے موقع پر 18 اکتوبر کو دو خودکش دھماکے ہوئے، جن میں دو سو کے قریب لوگ اپنی جان سے گئے۔

انتخابی مہم کے دوران 27 دسمبر کو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں انھیں قتل کر دیا گیا۔ ان کی شہادت کے ساتھ ہی پاکستان کے چاروں صوبوں کو جوڑنے والی زنجیر ٹوٹ گئی۔

ان کی جدوجہد سے انکار نہیں مگر ان کے دورِ حکومت میں ہونے والی کرپشن بھی ایک حقیقت ہے۔ پھر انھوں نے چند بار ایسا رخ اختیار کیا، جو محبِ وطن پاکستانیوں کو ناگوار گزریں۔

☆ نواز شریف

پاکستان کے موجودہ وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف پاکستانی سیاست میں کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ ایک تجربے کار اور ٹھنڈے مزاج کے سیاست دان ہیں۔ وہ مسلم لیگ ن کے صدر ہیں۔ یہ ان کی سیاسی بصیرت کا نتیجہ تھا کہ یہ

جماعت تین بار وفاق میں حکومت بنانے میں کامیاب رہی۔ پنجاب میں تو وہ عشروں سے حکمران ہیں۔ وہ 25 دسمبر 1949ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ میاں محمد شریف کے بڑے بیٹے ہیں۔ اتفاق گروپ آف انڈسٹریز کے شریک مالک رہے۔ سیاست کے مانند انھوں نے کاروباری دنیا میں بھی خود کو مستحکم کیا۔ کرکٹ کے دلدادہ ہیں۔ ایک زمانے میں شوبز میں بھی دل چسپی تھی۔

ابتدائی تعلیم انھوں نے لاہور سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے لا کی ڈگری حاصل کی۔ سیاسی سفر کا آغاز ضیا دور میں کیا۔

آمریت کی چھتری تلے پنجاب کی سیاست میں قدم رکھا۔ کچھ عرصہ پنجاب کی صوبائی کونسل کا حصہ رہنے کے بعد 1981ء میں صوبائی کابینہ میں بطور وزیر شامل ہوئے۔ آنے والے دنوں میں خاصے سرگرم رہے۔ صوبے میں کھیلوں کے وزیر بھی رہے۔ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات میں کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ 9 اپریل 1985ء کو پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ وہ مارشل لا افسران کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ مئی 1988ء میں جنرل ضیاء نے جونیجو حکومت کو تو برطرف کر دیا، تاہم میاں نواز شریف نگران وزیر اعلیٰ رہے۔ عام رائے ہے کہ 1988ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کو شکست دینے کے لیے اسٹیبلشمنٹ کی چھتری تلے جو اتحاد بنا، اس سے میاں صاحب کی پارٹی کو خاصا فائدہ ہوا۔ مقتدر حلقوں کے اشارہ پر اسلامی جمہوری اتحاد تشکیل دیا گیا تھا۔ گو وفاق میں پی پی کی حکومت بنی، مگر وہ پنجاب میں فتح حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

1990ء میں انھوں نے بطور منتخب وزیر اعظم حلف اٹھایا۔ ان کی توجہ اقتصادی ترقی کی جانب تھی، وہ بڑی قوت کے ساتھ آئے تھے، مگر پانچ سالہ مدت پوری نہیں کر سکے اور غلام اسحاق خان نے ان کی حکومت کو برطرف کر دیا۔ اگرچہ عدالت کے حکم نے انھیں پھر بحال کر دیا، مگر ایک ڈیڈ لاک پیدا ہو گیا تھا، جس کے باعث جولائی 1993ء انھیں اور صدر پاکستان دونوں ہی کو استعفیٰ دینا پڑا۔ دوسری بار وہ ہیوی مینڈیٹ لے کر اقتدار میں آئے۔ وہ با رسوخ وزیر اعظم تصور کیے جاتے تھے مگر ان کی دیگر اداروں سے نبھ نہیں سکی۔ کارگل جنگ کے بعد حکومت بین الاقوامی سطح پر شدید دباؤ کا شکار نظر آئی۔ اس وقت کے فوج کے سربراہ پرویز مشرف کو ہٹانے کی کوشش سول حکومت کو لے ڈوبی۔ مارشل لا لگنے کے بعد وہ گرفتار ہوئے، طیارہ سازش کیس کے نام سے مقدمہ چلا اور کچھ عرصے بعد جلاوطن کر دیے گئے۔

جلاوطنی کا زمانہ انھوں نے سعودی عرب میں گزارا۔ 2006ء میں میثاق جمہوریت کے ذریعے وہ اور ان کی حریف پی پی ایک ہی پلیٹ فورم پر اکٹھے ہو گئے۔ 23 اگست 2007ء کو عدالت نے شریف خاندان کی درخواست پر فیصلہ سناتے ہوئے ان کی وطن واپسی پر حکومتی اعتراض رد کر دیا۔ یہ فیصلہ پرویز مشرف حکومت کے لیے دھچکا تھا۔

ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد نواز شریف اپنے خاندان کے ہمراہ سعودی عرب سے لوٹ آئے۔ ان کی کوششوں سے پارٹی پھر منظم ہونے لگی۔ محترمہ کی شہادت کے بعد وہ آصف علی زرداری کے ساتھ کھڑے نظر آئے۔ ان کی حکومت نے ہر مشکل مرحلے پر پی پی کا ساتھ دیا، ماسوائے وکلا تحریک اور چیف جسٹس کی بحالی کے معاملے میں۔ اس پر ان کا موقف یکسر مختلف تھا۔

انتخابات 2013ء میں ان کی پارٹی نے ایک بار پھر بھرپور کامیابی حاصل کی اور اقتدار سنبھالا۔ البتہ مسائل میں کمی نہیں آئی۔ پی ٹی آئی کی جانب سے اٹھائے جانے والے دھاندلی کے الزامات ن لیگ کے لیے دردِ سر بنے ہوئے ہیں۔

☆ افتخار چوہدری

2005ء تا 2013ء عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس رہنے والے افتخار محمد چوہدری نے نہ صرف عدالتی نظام بلکہ پاکستانی تاریخ پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔ ان سے اختلاف رکھنے والے بھی اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی جدوجہد اور کوششوں نے عدلیہ کا وقار بحال کیا اور اُسے ملک کا مضبوط ترین ادارہ بنایا۔

ان کا اصل کارنامہ 9 مارچ 2007ء کو حکومتی دباؤ کے سامنے جھکنے کے بجائے باوردی صدر کے سامنے ڈٹ جانا تھا۔

انھوں نے استعفیٰ دینے سے انکار کیا تو حکومت نے انھیں معطل کر دیا۔ قانونی اعتبار سے اس کے لیے غیر فعال کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا، جب عدالت عالیہ کے منصف اعظم کو اختیارات کے ناجائز استعمال پر معطل کیا گیا، تاہم تجزیہ کاروں کے مطابق اس کا اصل سبب افتخار چوہدری کے کورٹ میں چلنے والے وہ مقدمات تھے جن کے فیصلے حکومت اور اس کے حواریوں کے لیے ناپسندیدہ نتائج لا سکتے تھے۔

یہ معاملہ عدالت میں گیا۔ سول سوسائٹی اٹھ کھڑی ہوئی۔ یوں وکلا تحریک کا آغاز ہوا جسے چیف جسٹس بحالی تحریک بھی کہا جاتا ہے۔ 20 جولائی 2007ء کو رانا بھگوان داس کی سربراہی میں عدالت نے تاریخ ساز فیصلے دیتے ہوئے افتخار محمد چوہدری کو بحال کر دیا۔ 3 نومبر 2007ء کو ایمرجنسی نافذ کر دی گئی۔ افتخار چودھری سمیت کئی ججز کو معطل کر دیا گیا۔ اس کے خلاف وکلا اور دیگر سیاسی جماعتوں نے جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس تحریک میں کئی نشیب و فراز آئے، تاہم مارچ 2009ء میں حالات میں ڈرامائی تبدیلی آئی۔ 21 مارچ 2009ء کو چیف جسٹس کے عہدے پر بحال ہو گئے۔ وہ 11 دسمبر 2013ء کو سبک دوش ہوئے۔

12 دسمبر 1948ء کو کوئٹہ میں پیدا ہونے والے افتخار چوہدری نے اپنے کیریر کے آخر میں کئی اہم فیصلے کیے۔ ان کے سوموٹو ایکشنز کو عوام اور میڈیا کی جانب سے خاصی پزیرائی ملی۔ انھوں نے متعدد حساس مقدمات نمٹائے۔ ان کے بے باک اور دلیر اقدامات سے عدلیہ ریاست کے دباؤ سے آزاد ہوئی۔ البتہ چند قانون داں اور تجزیہ کاران کے فیصلے کو تنقید کا بھی نشانہ بناتے ہیں۔ ارسلان افتخار کیس اور 2013ء کے انتخابات میں دھاندلی اس کی چند مثالیں ہیں۔

☆ جہانگیر خان

وہ بجلی سا پھرتیلا تھا۔ نظر عقاب سی، انکار اس کا ہتھیار، دشمن پر کسی چیتے کی طرح جھپٹتا، اس کا جوش جنوں دیکھ کر فتح اس کی سمت چل پڑتی، کامیابی قدم چومتی۔

پاکستان مسائل میں گھرا، قرضوں کے بوجھ تلے دبا تیسری دنیا کا ترقی پذیر ملک ہے مگر اس کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو حیرت ہوتی کہ اس نے کیسے کیسے گوہر نایاب پیدا کیے۔ ایسے ہیرے تراشے، جن کی چمک دمک نے ساری دنیا کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ بالخصوص اسپورٹس کے میدان میں تو پاکستان اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے جن دلیر جوانوں نے دنیا بھر میں فتح کے جھنڈے گاڑے، ان میں جہانگیر خان سب سے نمایاں ہے۔

ان کی شخصیت میں صلاحیت اور وجاہت بڑے متوازن انداز میں یکجا ہو گئی تھی۔ مگر ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ اوائل عمری میں وہ بڑے دھان پان سے ہوا کرتے تھے۔ 10 دسمبر 1963ء کو کراچی میں آنکھ کھولنے والے جہانگیر خان کو دنیا کا عظیم ترین اسکواش کھلاڑی تصور کیا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں تو یوں لگتا تھا کہ نمبرون کی پوزیشن انھوں نے اپنے نام کر لی ہے۔ اتنی فتوحات حاصل کیں کہ گنتی رکھنا مشکل ہو گیا۔

ان کے اجداد کا تعلق پشاور سے تھا۔ ان کے والد روشن خان کا شمار اسکواش کے نمایاں کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے 1957ء میں برٹش اوپن کا اعزاز اپنے نام کیا۔ باپ ہی بیٹے کے لیے تحریک بنا۔ بچپن میں جہانگیر خان کو بیماریوں نے گھیرے رکھا۔ انھیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ بچہ اسکواش جیسا مشکل کھیل کھیلنے کے قابل ہے۔ مگر "اے جذبۂ دل گر میں چاہوں، ہر چیز مقابل آجائے" کے مصداق جہانگیر خان کے جذبے نے منزل کی سمت دو قدم بڑھائے اور منزل اس کی سمت چلی آئی۔

ایک بار اسکواش کورٹ میں قدم رکھنے کے بعد مڑ کر نہیں دیکھا۔ 1979ء میں اچھی کارکردگی کے باوجود سیلیکٹرز نے انھیں آسٹریلیا میں منعقدہ ورلڈ چیمپین شپ کے لیے منتخب نہیں کیا، تو سبب ان کی فٹنس ٹھہری۔ مایوس ہونے کے بجائے 15 سالہ لڑکے نے World Amateur

Individual Championship میں قدم رکھ دیا اور وہاں سے فاتح بن کر لوٹا۔ اسی برس انھیں ایک بھاری صدمہ سہنا پڑا، جب آسٹریلیا میں ہونے والے ایک مقابلے میں ان کے بھائی طورسم خان جو اسکواش کے بہت عمدہ کھلاڑی تھے، حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ اس واقعے نے جہانگیر کو خاصا متاثر کیا۔ ایسے میں یہ اسکواش کورٹ تھا، جس نے سہارا دیا۔ 1981ء میں جب جہانگیر فقط 17 برس کے تھے، انھوں نے ورلڈ اوپن کا ٹائٹل اپنے نام کرلیا۔ آنے والے برسوں میں انھوں نے یہ اہم ترین اعزاز مزید پانچ بار جیتا۔ برٹش اوپن میں تو انھیں دیوتا کا درجہ حاصل تھا۔ انھوں نے یہ ٹائٹل دس بار اپنے نام کیا۔ یہ ایک ریکارڈ ہے۔ 1981ء تا 1986ء جہانگیر خان ناقابلِ شکست رہے۔ انھوں نے لگاتار 555 مقابلوں میں فتح حاصل کی۔ یہ فقط اسکواش نہیں، بلکہ تمام کھیلوں میں ایک ریکارڈ ہے۔ 1993ء میں وہ ریٹائر ہوئے۔ 2002ء تا 2008ء وہ ورلڈ اسکواش فیڈریشن کے صدر رہے۔

☆ سرفراز نواز

1979ء میں پاکستانی ٹیم نے مشتاق محمد کی قیادت میں آسٹریلیا کا دورہ کیا۔ اوّلین ٹیسٹ مقابلہ میلبورن میں ہوا۔ پہلی اننگز میں پاکستان نے 28 رنز کی برتری حاصل کی، دوسری اننگز میں نو وکٹوں کے نقصان پر 353 رنز بنا کر اننگز ختم کر دی۔ یوں آسٹریلیا کو میچ جیتنے کے لیے 380 رنز درکار تھے۔ یہ بڑا ٹارگیٹ تھا، پاکستان فتح کے لیے پُراُمید تھا مگر ایلن بورڈر اور کم ہیوز کی چوتھی وکٹ کے لیے 177 رنز کی شراکت نے میچ کا پانسہ پلٹ دیا۔ ایک لمحہ ایسا تھا، جب آسٹریلیا کو جیتنے کے لیے صرف 75 رنز درکار تھے اور اُس کے سات کھلاڑی باقی تھے۔ اور تب ایک عجیب واقعہ ہوا... گیند سرفراز نواز کے ہاتھ میں آئی۔ قسمت کی دیوی نے پر پھیلائے۔ انھوں نے فقط ایک رن کے عوض آسٹریلیا کے سات کھلاڑیوں کو پویلین بھیج کر تاریخ رقم کر دی۔ اس میچ میں انھوں نے 86 رنز کے عوض آسٹریلیا کے نو کھلاڑیوں کو آؤٹ کیا تھا۔

یہ تو وہ روپ ہے، جس میں وہ بطور ایک فاسٹ بولر نظر آتے ہیں۔ بعد کے برسوں میں تو یہ ان کے کاٹ دار بیانات تھے، سٹے بازی کے الزامات تھے جنھوں نے میڈیا کو ان کی جانب متوجہ رکھا۔ ہر شکست کے بعد ٹی وی کیمروں کا رخ اُن کی طرف ہوتا۔ کچھ لوگ استہزائیہ انداز میں کہتے ہیں کہ وہ تو میچ ختم ہونے سے پہلے ہی سٹے بازی کا الزام لگا دیتے ہیں مگر یہ حقیقت بھی تسلیم کیجیے کہ ایک عرصے تک یہ ناسور پاکستانی کرکٹ کو چاٹتا رہا ہے۔

یہ منفرد فاسٹ بولر یکم دسمبر 1948ء کو لاہور میں پیدا ہوا۔ کراچی کے نیشنل اسٹیڈیم سے 6 مارچ 1969ء کو انھوں نے انگلستان کے خلاف اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ اپنے ٹیسٹ کیریر میں 55 میچوں میں 177 وکٹیں حاصل کیں۔ وہ 45 ایک روزہ میچوں میں بھی جلوہ گر ہوئے جہاں 63 وکٹیں اپنے نام کیں۔ انھوں نے اپنے زمانے کی معروف اداکارہ رانی سے شادی کی تھی۔ اب بھی ان کے کاٹ دار بیانات میں کوئی خاص کمی نہیں آئی ہے۔

☆ سنتوش کمار

انھیں لولی وڈ کا پہلا سپر اسٹار قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کے ڈائیلاگ زبان زد خاص و عام ہوئے۔ ان پر فلمائے گئے گیت لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئے۔ ایک زمانہ ان کا دیوانہ تھا۔

یہ 25 دسمبر 1925ء کو پیدا ہونے والے سید موسیٰ رضا کا ذکر ہے، جنھیں دنیا سنتوش کمار کے نام سے جانتی ہے۔ ان کا تعلق ایک تعلیم یافتہ اور باعزت گھرانے سے تھا۔ بڑے ذہین فطین انسان تھے۔ حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی سے اعلیٰ ڈگری لی، مگر سرکاری ملازمت اختیار کرنے کے بجائے اداکاری کے شعبے میں قدم رکھ دیا۔ بٹوارے سے چند ماہ قبل ان کی پہلی فلم ''آہنسا'' ریلیز ہوئی۔ پھر وہ پاکستان آگئے۔ یہاں وہ 1950ء میں ریلیز ہونے والی پنجابی فلم ''بیلی'' میں جلوہ گر ہوئے۔ اگلی بار وہ ''دو آنسو'' میں نظر آئے۔ کچھ لوگ اسے سلور جوبلی کرنے والی پہلی اردو فلم قرار دیتے ہیں۔ جلد ہی ناقدین نے اعلان کر دیا کہ وہ پاکستانی فلم انڈسٹری کا اصل چہرہ ہیں۔ انھوں نے ایک کے بعد ایک ہٹ فلم دی۔ پاکستان کا پہلا نگار ایوارڈ بھی فلم ''وعدہ'' کے لیے سنتوش کے حصے میں آیا۔ ''سرفروش'' ان کے مداحوں میں

اضافے کا سبب بنی۔ "انتظار" میں میڈم نور جہاں ان کی ہیروئین تھی۔ اس فلم نے بھی ان مٹ نقوش چھوڑے۔ 1965ء میں ریلیز ہونے والی پہلی رنگین فلم "نائلہ" کے ہیرو بھی سنتوش ہی تھے۔

جب بھی ثقافتی وفد بیرونِ ملک جاتا، سنتوش کمار ضرور اس میں شامل ہوتے کہ ان سا مہذب اور تعلیم یافتہ شخص کوئی اور نہیں تھا۔ صبیحہ خانم اور ان کی جوڑی بہت مقبول ہوئی۔ وہ غلام، رات کی بات، قاتل، انتقام، حمیدہ، سرفروش، وعدہ، سردار، سات لاکھ، حسرت، مکھڑا میں ساتھ نظر آئے۔ دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ بالآخر شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ صبیحہ ان کی دوسری بیوی تھیں۔

سن 1950ء سے 1982ء تک وہ چوراسی فلموں میں جلوہ گر ہوئے۔ وہ اپنے دور کے ایک اور معروف ہیرو درپن اور فلم ڈائریکٹر ایس سلیمان کے بھائی تھے۔ پاکستان فلم انڈسٹری کا یہ منفرد فن کار 11 جون 1982ء کو انتقال کر گیا۔

☆ عزیز میاں

مجھے تو اس جہاں میں بس اک تجھی سے عشق ہے
یا میرا امتحان لے یا میرا اعتبار کر

قوالی برصغیر کی ایک مقبول صنف ہے۔ محفل سماع سلسلہ تصوف کا جزو ہے۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے پاکستان میں جن فنکاروں نے اس صنف کو اوج بخشا، ان میں ایک نام 17 اپریل 1942ء کو دہلی میں پیدا ہونے والے عزیز میاں کا بھی ہے، جن کا منفرد انداز، اشعار کا برمحل استعمال ان کی شناخت بنا۔

انھیں بلامبالغہ رجحان ساز قرار دیا جاسکتا ہے۔ بڑے عالم فاضل آدمی تھے۔ عزیز میاں نے پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے اردو اور عربی میں ایم اے کیا۔ ان کی قوالی کی فلسفیانہ جہت ان کی پہچان تھی۔ ہم عصر شعرا کے کلام کو قوالی میں برتنا ان کا کمال تھا۔ خود بھی خوب شعر کہتے۔ آواز بارعب اور طاقتور تھی، مگر اصل مقبولیت کی وجہ بھی الفاظ کی بھرمار، خیال کو دہرانا، اشعار کا موزوں اور برمحل استعمال، جو سامعین پر گہرے نقوش چھوڑتے۔ کورس گائیکی ان کی قوالی کا اہم حصہ تھی۔ ان کی قوالی پر روحانی رنگ غالب تھا مگر انھوں نے رومانوی اشعار کو بھی تصوف کا جامہ پہنایا، جیسے "میں شرابی" اور "تیری صورت" جو ان کی پہچان بن گئیں۔

ان کا اصل نام عبدالعزیز تھا۔ میاں ان کا تکیہ کلام، جو وہ اکثر استعمال کرتے تھے۔ یہی بعد میں ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ انھوں نے اپنے فنی دور کا آغاز "عزیز میاں میرٹھی" کی حیثیت سے کیا۔ میرٹھی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ بٹوارے کے بعد کچھ عرصے وہ میرٹھ میں مقیم تھے اور وہیں سے پاکستان آئے تھے۔ اوائل میں انھوں نے فوجی جوانوں کے سامنے اتنے پروگراموں میں پرفارم کیا کہ ان کا نام فوجی قوال پڑ گیا۔

ان کے ہاں خودی عروج پر تھی۔ براہِ راست خدا سے مخاطب ہوتے۔ سوالات کرتے۔ شکوہ کرتے۔ اس ضمن میں وہ اقبال اور دیگر صوفی شعرا کا کلام برتتے تھے۔ مقبولیت اپنی جگہ، مگر ان کی طرز قوالی کو دیگر قوالوں نے تنقید کا نشانہ بنایا۔ کچھ کا خیال تھا کہ ان کا انداز روایتی قوالی کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ صابری برادران نے ان پر سرقہ کا الزام بھی لگایا، مگر کچھ ثابت نہیں ہوسکا۔

چھ دسمبر 2000ء کو تہران میں ان کا انتقال ہوا، جہاں وہ ایرانی حکومت کے مہمان تھے۔ انھیں ملتان میں دفن کیا گیا۔

☆ پروین شاکر

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پزیرائی کی

پاکستان میں رومانوی شاعری کی نمائندگی پروین شاکر سے بہتر اور کون کرسکتا ہے۔ ان کے نسائی لہجے میں بغاوت کی تپش تو تھی مگر وہ مضر آگ نہیں تھی، جو اردگرد کو راکھ کر دے۔ یہی ان کی خوبی تھی۔ عہد حاضر کی شاید ہی کسی شاعرہ کو وہ شہرت اور پزیرائی ملی ہو جو خوشبو کی سفیر پروین شاکر کے حصے میں آئی۔ گو ان کے زمانے میں کئی بڑی شاعرات کا ظہور ہوا مگر ان کے جذبات واحساسات کی رسائی زیادہ رہی۔

ان کا بیشتر کلام فنون کی زینت بنا۔ شاعری میں انھیں احمد ندیم قاسمی کی سرپرستی حاصل رہی۔ ان کا بنیادی موضوع محبت، بنیادی محور عورت تھا۔ آپ کو یہ موضوعات فرسودہ لگ سکتے ہیں مگر اس ہی نے انھیں لاکھوں مداح عطا کیے۔ 1976ء

میں ان کے مجموعے "خوشبو" کی اشاعت کے ساتھ ہی ان کی گنتی ہر دل عزیز شاعرات میں ہونے لگی۔ پھر صد برگ، خود کلامی اور انکار نے اردو دنیا میں وہ مقبولیت اور احترام بخشا، ہر شاعر جس کی تمنا کرتا ہے۔ "ماہِ تمام" آخری کتاب تھی، جو 1994ء میں شائع ہوئی۔

وہ 24 نومبر 1954ء کو کراچی کے ایک پڑھے لکھے گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ گھرانے میں کئی شعرا اور ادبا گزرے، جن میں بہار حسین آبادی ایک اہم نام۔ ان کے نانا حسن عسکری بھی ادبی ذوق کے حامل تھے، جنھوں نے پروین کو شاعری کے ابتدائی اسباب پڑھائے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی صلاحیتیں آشکار ہوئیں۔ وہ مباحثوں میں حصہ لینے لگیں۔ ریڈیو میں قدم رکھنے کے بعد صلاحیتوں میں نکھار آگیا۔ مشاعرے پڑھنے لگیں۔ انھوں نے انگریزی میں جامعہ کراچی سے ماسٹرز کیا۔ اوائل میں تدریس سے وابستہ رہیں۔ پھر محکمہ کسٹمز کا حصہ بن گئیں۔ 1986ء میں اسلام آباد میں سیکریٹری ہوگئیں۔ 1991ء میں ہاورڈ یونیورسٹی سے پبلک ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے شادی کی تھی، مگر وہ زیادہ عرصے چل نہ سکی۔

"خوشبو" کے برعکس ان کے بعد کے مجموعوں میں زندگی کے مسائل اور کھردرا پن بھی نظر آیا، مگر اس کا لبادہ وہی تھا جو ان کے اسلوب نے عطا کیا تھا۔

ایک مشت خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

26 دسمبر 1994ء کو یہ شاعرہ ایک ٹریفک حادثے میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

☆ شوکت صدیقی

نہ تو اردو ادب کا تذکرہ اُن کے بغیر مکمل، نہ ہی اردو صحافت کا ذکر اُن کے بنا جامع۔ دنیا کا کوئی محقق اردو کے بہترین ناولوں کی فہرست بنائے اور اُن کے ناول شامل نہ کرے، نہیں جناب یہ تو ممکن ہی نہیں۔ "خدا کی بستی" اور "جانگلوس" کی ادبی حیثیت پر تو کوئی سوال ہی نہیں، مگر ان دونوں کتابوں سے متعلق ایک اہم قابل پہلو یہ بھی ہے کہ فروخت کے معاملے میں یہ دونوں ناول دیگر ناولوں سے میلوں آگے ہیں۔ اشاعت کو عشرے گزر گئے مگر یہ آج بھی تواتر سے شائع ہو رہے ہیں، پڑھے جا رہے ہیں۔ ان ہی ناولوں کی وسیلے سے پی ٹی وی کو دو ایسے ڈرامے ملے، جنھیں سنگ میل کا درجہ حاصل ہے۔ آج بھی لوگ ان کے سحر میں ہیں۔

یہ جناب شوکت صدیقی کا ذکر ہے، جن کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا، مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ کراچی اپنے اس جید ادیب کو بھول گیا ہے۔ شوکت صاحب 20 مارچ 1923ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ گھر سے مذہبی تعلیم حاصل کی۔ سیاسیات میں انھوں نے ایم اے کیا۔ بٹوارے کے تین برس بعد پاکستان آئے اور کراچی میں ڈیرا ڈالا۔ دو برس بعد ان کی شادی ہوگئی۔ صحافت اور تخلیق ادب کو انھوں نے یافت کا ذریعہ بنایا۔ دونوں میں رجحان ساز ٹھہرے۔ پوری ایک نسل کی تربیت کی۔ نظریاتی طور پر پکے ترقی پسند تھے۔

روزنامہ مساوات، کراچی کے وہ بانی ایڈیٹر رہے۔ روزنامہ مساوات، لاہور اور روزنامہ انجام کے چیف ایڈیٹر رہے۔ ضیا مارشل لا کے خلاف توانا ترین آواز تصور کیے جانے والے افق سے بھی جڑے رہے۔ آج کے کئی اہم صحافی انھیں اپنا استاد کہتے ہیں۔

ان کے افسانوی مجموعے ... تیسرا آدمی، اندھیرا اور اندھیرا، راتوں کا شہر، کیمیا گر اور ناول ... کمیں گاہ، خدا کی بستی اور جانگلوس کے عنوان سے شائع ہوئے۔ سب ہی بیسٹ سیلر ٹھہرے۔ "جانگلوس" کئی اقساط میں شائع ہوا، جسے کچھ لوگ پنجاب کی الف لیلیٰ بھی کہتے ہیں۔ وہ ایک ادبی کارنامہ تھا۔ "خدا کی بستی" کا بیالیس دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ اعزاز کسی اور ناول کو حاصل نہیں۔ وہ ان گنے چنے اردو ادیبوں میں سے تھے جنھیں کتابوں کی خاطر خواہ رائلٹی ملتی تھی۔ مشہور تھا کہ وہ اس معاملے میں خاصے سخت تھے اور ناشر کو کسی نوع کی رعایت نہیں دیتے تھے۔

وہ ادبی سرگرمیوں میں خاصے متحرک رہے۔ لوگوں کے لیے مثال تھے۔ مختصر علالت کے بعد 18 دسمبر 2006ء کو ان کا انتقال ہوا۔

☆ شیخ ایاز

سندھی ادب کے تاج کا وہ سنہری پنکھ۔ جدید سندھی ادب کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ انھیں شاہ لطیف بھٹائی کے بعد سندھ کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے۔ ترقی پسند فکر ان کی شاعری پر غالب تھی۔ فیض احمد فیض، حبیب جالب، گل خان نصیر اور اجمل خٹک کی طرح ایاز بھی کئی برس پابند سلاسل رہے۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ جیل ہی میں تخلیق ہوا۔ اس میں انقلابی اور مزاحمتی رنگ در آنا قابل فہم ہے۔ ان کی کتابوں پر پابندی لگی۔ ملک دشمنی اور غداری کے الزامات لگے۔ فتوے بھی آئے۔ اور یہ متوقع تھا۔ ان کا لہجہ ہی ایسا تھا۔ فکر چونکا دینے والی تھی۔ الفاظ میں کاٹ تھی۔ منافقت پر گہرا طنز تھا۔

اصل نام شیخ مبارک علی۔ وہ 23 مارچ 1923ء کو شکار پور میں پیدا ہوئے اور آنے والے برسوں میں اس شہر کی پہچان بن گئے۔ کتنی ہی کتابیں لکھیں۔ سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ ''شاہ جو رسالو'' کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا، جو ایک عظیم کارنامہ تھا۔

ان کا تعلق اس نسل سے تھا جس نے بٹوارے کے بعد کراچی کی بندرگاہ سے اپنے دوستوں کو رخصت ہوتے دیکھا تھا۔ اپنی دھرتی سے جدائی کا کرب ایک چیخ کی صورت ان کی شاعری کا حصہ بن گیا۔ وہ قارئین کو پکارتے ہیں۔ ''میری روح کی راگنی سن رہے ہو؟''

قوم پرستی کی جھلک بھی ان کی شاعری میں ملتی ہے لیکن اس کا کینوس وسیع ہے۔ آمریت کے وہ خلاف تھے۔ جنگی جنون کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے۔ یہی سبب ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہونے والی جنگوں میں وہ نظر بند رہے۔ البتہ آخری برسوں میں ان کی شاعری کا لہجہ بدلا ہوا محسوس ہوا۔ وہ مذہب کی جانب مائل نظر آئے۔ کفر کے فتوے لگانے والے خاموش ہو گئے۔ 1994ء میں انھیں ہلال امتیاز سے نوازا گیا۔ وہ حرکت قلب بند ہونے سے 28 دسمبر 1997ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

سندھ انھیں اپنا قومی شاعر قرار دیتا ہے۔ ان کے گیتوں کو سندھ میں ترانے کا درجہ حاصل ہے۔ کوئی سیاسی اور ادبی جلسہ ان کے اشعار کے بنا مکمل نہیں ہوتا۔ اور وہ اس کے حق دار تھے۔ شاید ہی یہ خطہ کبھی ان کے اثر سے نکل سکے۔

☆ اظہار قاضی

انھیں پاکستانی امیتابھ بچن کہا جا سکتا ہے۔ اس کا سبب لمبا قد بھی ہو سکتا ہے، مگر اصل وجہ یہ تھی کہ اظہار قاضی کی شکل امیتابھ بچن سے خاصی ملتی تھی۔ بڑی متاثر کن شخصیت تھی۔ اداکار بھی خوب۔ ٹی وی اور فلموں میں اپنے جوہر دکھائے۔ پلے بیک سنگر بھی رہے۔

انھیں ان کے احباب ایک کھرے اور ایمان دار شخص کے طور پر یاد کرتے ہیں، جو اپنے کردار سے انصاف کرنے کی بھرپور کوشش کرتا۔ لو ان نیپال، عالمی جاسوس اور خزانہ میں وہ اپنے عروج پر نظر آئے۔

وہ کراچی میں پیدا ہوئے۔ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ اسٹیل مل میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ اسٹیل مل ہی کے ایک سینئر افسر نے ان کا تعارف فاطمہ ثریا بجیا سے کروایا جو ان دنوں نئے چہروں کی تلاش میں تھیں۔ یہاں ان کی پُروقار شخصیت اور پاٹ دار آواز کام آئی۔

1982ء میں بجیا کے کھیل انا سے انھوں نے اپنا کیریئر شروع کیا۔ جس پہلے منظر میں وہ نظر آئے، اس میں گو کوئی مکالمہ نہیں تھا، مگر ان کی موجودگی محسوس کی گئی۔ جلد انھوں نے شناخت حاصل کر لی۔ دائرہ اور گردش میں وہ ابھر کر سامنے آئے۔

اس زمانے میں فلم انڈسٹری کی حالت خاصی بہتر تھی۔ انھوں نے اس تجربے کا فیصلہ کیا۔ کوشش کو سراہا گیا۔ کئی فلمیں کیں، جنھوں نے سامعین پر مثبت چھاپ چھوڑی۔ فلم انڈسٹری کی خستہ حالی کے باعث وہ اس سے علیحدہ ہو گئے۔

انھوں نے پھر ٹی وی کا رخ کیا۔

پرائیویٹ چینلز کے علاوہ انھوں نے پی ٹی وی کے لیے "پانی پہ نام" نامی کھیل کیا، جس پر انھیں بہتر اداکاری کی کیٹیگری میں نامزد کیا گیا۔ ویسے اپنے کیریر میں انھوں بہترین اداکار کے لیے نگار، نیشنل ایوارڈ، گریجویٹ اور بولان ایوارڈ جیتے۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے دور کے چوٹی کے فنکاروں میں شمار ہوتے تھے۔

اظہار قاضی کا حرکت قلب بند ہوجانے کے باعث 24 دسمبر 2007ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔

☆ روشن آرا بیگم

ملکۂ موسیقی کا خطاب پانے والی روشن آرا بیگم برصغیر کی کلاسیکی گائیکی میں ایک ممتاز شخصیت تھیں۔

ان کا اصل نام وحید النسا بیگم تھا۔ وہ 1915ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق موسیقی کے کیرانا گھرانے سے تھا۔ ان کے والد استاد عبدالحق خان ایک قابلِ احترام فنکار تھے۔ گائیکی کی صلاحیت ان میں بہ درجہ اتم موجود تھی۔ ریاض بھی خوب کام آیا۔ ابتدا میں ان کی والدہ چندا بیگم نے تربیت کا فریضہ نبھایا۔ پھر استاد لڈن خان سے موسیقی کے اسرار و رموز سیکھے۔ اس گھرانے کے نامور استاد عبدالکریم خان کی شاگردی اختیار کی۔ عبدالکریم خان ان کے کزن بھی تھے۔ مستقبل میں وہ کیرانا گھرانے کی سب سے ممتاز نمائندہ بن کر ابھریں۔ بمبئی ریڈیو نے انھیں شہرت بخشی۔ ان کے فن نے کتنوں ہی کو گرویدہ بنالیا۔

اس زمانے میں لاہور آنا جانا رہا، جو فن وثقافت کا مرکز تھا۔ موچی گیٹ کے علاقے میں ان کا قیام رہتا۔ فلموں میں بھی کام کیا۔ ان کی شادی ایک پولیس افسر چوہدری احمد خان سے ہوئی تھی، جو موسیقی کے دل دادہ تھے۔ چوہدری احمد خان لالہ موسیٰ کے تھے۔ یوں قیام پاکستان کے بعد روشن آرا بیگم لالہ موسیٰ آگئیں۔ ادھر ریڈیو پاکستان نے ان کی صلاحیتوں کو شناخت کیا۔ لاہور میں ان کے نام کا ڈنکا بجا کرتا تھا۔ کیا ریڈیو، کیا ٹی وی کیا فلم انڈسٹری... ہر طبقے نے ان سے استفادہ کیا۔

کلاسیکی گائیکی پر ان کی گرفت حیران کن تھی۔ جدت بھی ان کے ہاں ملتی تھی۔ کتنے ہی فنکاروں کی انھوں نے تربیت کی۔ سازندے ان کے ساتھ کام کرنے کو اعزاز گردانتے تھے۔

روشن آرا بیگم کو حکومتِ پاکستان نے صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی اور ستارۂ امتیاز سے نوازا۔ 5 دسمبر 1982ء کو اس نامور فن کارہ کا انتقال ہوا۔ انھیں لالہ موسیٰ میں دفن کیا گیا۔

☆ چوہدری محمد علی

پاکستان کے چوتھے وزیراعظم بننے والے چوہدری محمد علی 15 جولائی 1905ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے 12 اگست 1955ء تا 12 ستمبر 1956ء یہ اہم ترین منصب سنبھالا۔

وہ ایک ذہن انسان تھے۔ پنجاب یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ پھر مقابلے کا امتحان دے کر انڈین سول سروس کا حصہ بن گئے۔ 1936ء میں ریاست بہاول پور کا اکاؤنٹنٹ ہوجانا ان کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ انھوں نے تیزی سے ترقی کے مراحل طے کیے۔ 1945ء میں برطانوی سرکار کا حصہ بننا بہت بڑی کامیابی تھی۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے، جس نے سیکریٹری آف دی اسٹیٹ کے مشیر مالیات کے عہدے تک رسائی حاصل کی۔ وہ سول سروس میں مسلمانوں کے لیے قابلِ تقلید مثال تھے۔ تقسیم کے بعد انھوں نے پاکستان کا رخ کیا۔ ادھر سیکریٹری جنرل کا عہدہ سنبھالا۔ اور اس نئی ریاست کے لیے بجٹ کی تیاری میں اہم کردار ادا کیا۔

1951ء میں انھیں فنانس منسٹر بنایا گیا۔ اس حیثیت میں وہ خاصے فعال رہے۔ جب گورنر جنرل اسکندر مرزا نے محمد علی بوگرہ کو ہٹایا تو انھیں یہ عہدہ سونپا گیا۔ 1955ء میں وہ وزیراعظم بنے۔ گو وہ انتہائی مختصر عرصے کے

لیے اس عہدے پر رہے مگر انھوں نے آئین سازی جیسا اہم کام انجام دیا جو جمہوری اقدار اور اسلامی اصولوں کا عمدہ امتزاج تھا۔

مسلم لیگ میں بڑھتا اختلاف اس عرصے میں ان کے لیے دردسر بنا رہا۔ اسی انتشار نے ری پبلکن پارٹی کی بنیاد رکھی، جس نے قومی اسمبلی میں اکثریت کا دعویٰ کر دیا ہے۔ مسلم لیگ کے جانب سے جو مطالبات ان کے سامنے رکھے گئے تھے، وہ انھیں قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کا مؤقف تھا کہ یہ ملک کے مفاد میں نہیں تھے۔ حالات بگڑتے چلے گئے۔ بالآخر مایوس ہو کر انھوں نے وزیراعظم کے عہدے اور مسلم لیگ، دونوں سے استعفیٰ دے دیا۔ بعد کے برسوں وہ سیاست سے دور رہے۔ 2 دسمبر 1980ء کو ان کا کراچی میں انتقال ہوا۔ ان کی عمر 75 برس تھی۔ ان کے بیٹے نے بھی سیاست میں قدم رکھا اور نام کمایا۔

☆ دلیپ کمار

شہنشاہ جذبات کا خطاب پانے والے دلیپ کمار پشاور کے محلہ خداداد میں 11 دسمبر 1922ء کو لالہ غلام سرور کے ہاں پیدا ہوئے۔ نوجوانی میں اپنے خاندان کے ساتھ بمبئی آگئے۔ اس زمانے کی معروف اداکارہ اور فلم ساز دیوکا رانی کی جوہر شناس نگاہوں نے بیس سالہ یوسف خان میں چھپے اداکار کو شناخت کیا۔ فلم "جوار بھاٹا" میں انھیں دلیپ کمار کے نام سے کاسٹ کیا گیا۔ گو فلم زیادہ کامیاب نہیں ہوئی، مگر ان کی راہ زندگی کا تعین ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

دلیپ کمار کا کیریئر چھ دہائیوں پر محیط ہے۔ انھوں نے درجنوں فلموں میں یادگار کردار نبھائے۔ فلم فیئر ایوارڈ متعدد بار حاصل کیا۔ مسلسل تین بار یہ معتبر ایوارڈ جیتا۔ ہندوستانی حکومت نے انھیں پدم بھوشن ایوارڈ سے نوازا۔ 1994ء میں داداصاحب پھالکے ایوارڈ ان کے حصے میں آیا۔

کیریئر کے آغاز میں وہ ایک ایسے رومانوی ہیرو کے طور پر سامنے آئے، جو ٹریجڈی کو اسکرین پر پیش کرنے میں ملکہ رکھتا تھا۔ آن، دیوداس، مغل اعظم، گنگا جمنا جیسی فلموں کی اصل قوت وہی تھے۔ بعد کے کیریئر میں خاصے وقفے آئے۔ 1981ء میں آنے والی فلم "انقلاب" ایک طویل دوری کے بعد ریلیز ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں "شکتی" اور "کرما" جیسی فلمیں کیں۔ "سوداگر" میں وہ اور راج کپور یادگار کرداروں میں نظر آئے۔ آخری فلم "قلعہ" تھی، جو 1998ء میں ریلیز ہوئی۔ وی جنتی مالا کے ساتھ ان کی جوڑی بے حد مقبول تھی۔

بے شک انھیں کنگ آف ٹریجڈی کہا جاتا ہے، مگر ان کے ہاں بہت تنوع تھا۔ انھوں نے کوہ نور، آزاد، گنگا جمنا اور رام اور شیام میں کامیڈی بھی بہت عمدہ کی۔ محمد رفیع کی آواز ان پر خوب جچتی تھی۔ ان کی وجیہہ شخصیت کو دیکھ کر برطانوی اداکار ڈیوڈ لین نے فلم "لارنس آف عریبیہ" میں ایک رول کی پیشکش کی تھی لیکن وہ ان کے شایانِ شان نہیں تھا، سو انھوں نے انکار کر دیا۔

بعد میں سیاست میں آئے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان ثقافتی تعلقات استوار کرنے کے لیے مثبت کوششیں کیں۔ پاکستان نے انھیں نشانِ امتیاز سے نوازا۔ کارگل جنگ میں ان کے لیے یہ اعزاز مصیبت بن گیا۔ شوسینا کے انتہا پسند سربراہ بال ٹھاکرے نے مطالبہ کیا کہ وہ یہ اعزاز واپس کر دیں مگر دلیپ کمار نے انکار کر دیا۔

دلیپ کمار نے 1966ء میں سائرہ بانو سے شادی کی۔ اب وہ تقریبات میں ساتھ نظر آتے ہیں۔ گزشتہ کچھ برس سے ان کی گرتی صحت خبروں کی زینت بنی ہوئی ہے۔ 2011ء میں ان کے انتقال کی خبر پھیل گئی تھی، مگر پھر اس کی تردید کی گئی۔

وہ وراسٹائل اداکار تھے۔ لوگ ان کے انداز کی نقل کرتے۔ لڑکیاں ان پر مرتیں۔ اداکارائیں بھی ان کی التفات کی منتظر رہتیں۔ امیتابھ بچن اور شاہ رخ خان جیسے سپر اسٹار نے انھیں شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ہندوستانی انڈسٹری کا سب سے بڑا اداکار قرار دیا۔

☆ عامر خان

پاکستانی نوجوانوں میں صلاحیت کی کمی نہیں۔ بس مواقع اور رہنمائی کی ضرورت ہے، یہ میسر ہو تو انھیں فتح کے جھنڈے گاڑنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ بدقسمتی سے ہمارے نوجوانوں کی صحیح رہنمائی نہیں کی جاتی۔ ان کی صلاحیتیں

مثبت کے بجائے منفی شعبے میں خرچ ہو رہی ہیں۔ بیرونِ ملک جب سازگار ماحول میسر آتا ہے، تو یہ خوب صورت پھولوں کے مانند یک دم کھل اٹھتے ہیں۔ عامر خان ہی کی مثال لیجیے۔ آج عالمی باکسنگ میں پاکستان کا جھنڈا تھام رکھا ہے۔

یہ پاکستانی نژاد برطانوی باکسر مختلف کیٹیگریز میں خود کو منوا چکے ہیں۔ دو بار چیمپین کا ٹائٹل اپنے نام کر چکے ہیں۔ یہ نوجوان 8 دسمبر 1986ء کو برطانوی علاقے بولٹن میں مقیم ایک پنجابی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اجداد کا تعلق راولپنڈی سے۔ بولٹن ہی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہ تصوف کی جانب بھی جھکاؤ رکھتے ہیں اور نقش بندی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

وہ اولمپکس مقابلوں میں باکسنگ میں گولڈ میڈل جیتنے والے کم عمر ترین برطانوی کھلاڑی ہیں۔ انھوں نے یہ اعزاز فقط 17 برس کی عمر میں حاصل کیا۔ وہ برٹش چیمپین بننے والے کم سن ترین کھلاڑی بھی ہیں۔ فقط 22 سال کی عمر میں یہ اعزاز انھیں مل چکا تھا۔ برطانیہ میں انھیں سپر اسٹار کا درجہ حاصل ہے۔ جب انھوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تو پاکستان حکومت کو بھی انھیں سراہنے کا خیال آ گیا اور انھیں مختلف اعزازات سے نوازا جانے لگا۔ پاکستان کے دورے پر آئے، تو خواہش ظاہر کی کہ یہاں کے نوجوانوں کو باکسنگ کی جانب مائل کریں مگر موجودہ حالات دیکھتے ہوئے یہ ذرا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

☆ راجا پرویز اشرف

کسی قدر عجیب بات ہے کہ کوئی شخص پاکستان کا وزیر اعظم رہا ہو، مگر آج جب اس کا تذکرہ کیا جائے، تو فقط کرپشن کی کہانیوں کی بازگشت سنائی دے، اسے کٹھ پتلی وزیر اعظم کہہ کر یاد کیا جائے۔ بدقسمتی سے راجا پرویز اشرف کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔

وہ پاکستان کے 17 ویں وزیر اعظم تھے۔ جون 2012ء سے مارچ 2013ء تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔ انھوں نے سپریم کورٹ کی جانب سے یوسف رضا گیلانی کو نا اہل قرار دیے جانے کے بعد یہ عہدہ سنبھالا تھا۔ واضح رہے کہ اس وقت بہت سے سینئر سیاست دان یہ عہدہ سنبھالنے سے کترا رہے تھے کیونکہ یہ نمائشی عہدہ سمجھا جا رہا تھا۔

وہ 26 دسمبر 1950ء کو پیدا ہوئے۔ سیاست پیپلز پارٹی تک لے گئی۔ اوائل میں زیادہ معروف نہیں تھے، زرداری صاحب کے منظر میں آنے کے بعد وہ نمایاں ہوئے۔ سیاست کے علاوہ انھوں نے زراعت اور کاروبار میں بھی نام کمایا۔

وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے سے قبل وہ پانی اور بجلی کے وفاقی وزیر تھے۔ ان کی وزارت شدید تنقید کی زد میں رہی۔ ان پر کرپشن کے متعدد الزامات لگے، بالخصوص رینٹل پاور پراجیکٹ پر انگلیاں اٹھائی گئیں، مخالفین انھیں طنزاً راجا رینٹل کہا کرتے تھے۔ اس وقت بھی ان کے خلاف عدالتوں میں مقدمات چل رہے ہیں۔

☆ ثقلین مشتاق

بے شک کرکٹ کی تاریخ میں مرلی دھرن سب سے کامیاب آف اسپنر ہیں لیکن آپ ثقلین مشتاق کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ وہ ایک جینئس تھے جنھوں نے ''دوسرا'' نامی انوکھی گیند ایجاد کر کے کرکٹ کی دنیا میں کھلبلی مچا دی تھی۔ کچھ تجزیہ کار تو انھیں مرلی سے بہتر قرار دیتے ہیں کہ نہ تو ان کے ایکشن پر کبھی کوئی اعتراض ہوا، نہ ہی کسی اور تنازعے میں الجھے۔ وہ ایک سچے فائٹر تھے۔

ثقلین مشتاق 29 دسمبر 1976ء کو پیدا ہوئے۔ جب انھوں نے پاکستانی کرکٹ میں قدم رکھا، اس وقت اسپن کا شعبہ زیادہ مضبوط نہیں تھا۔ مشتاق احمد تنہا تھے۔ ثقلین نے انھیں قوت فراہم کی۔ جلد ان کی صلاحیتوں نے جوش مارا۔ ان کی مخصوص گیند جو پڑ کر باہر نکلتی تھی... بیٹسمینوں کے لیے معمہ بنی رہی۔

ٹیسٹ ہو یا ایک روزہ کرکٹ ثقلین مشتاق کپتان وسیم

اکرم کی اُمیدوں کا سب سے بڑا مرکز رہے۔ انھوں نے کبھی اپنے کپتان کو مایوس نہیں کیا۔ رنز بھی وہ روکتے اور وکٹیں بھی بٹورتے۔ فاسٹ بولرز والا مزاج تھا۔ آخر کے اوورز میں بولنگ کرنے میں وہ ماہر تھے۔ ون ڈے میں دو ہیٹ ٹرک کرنا ان کا بڑا کارنامہ تھا۔

ٹیسٹ کرکٹ اور ون ڈے کرکٹ دونوں میں انھوں نے وکٹوں کی ڈبل سنچری مکمل کی۔ اگر وہ مسلسل کھیلتے رہتے تو جانے کتنے ریکارڈ مزید بناتے۔ اعداد و شمار پر نظر ڈالیے۔ 48 ٹیسٹ میچز میں 207 وکٹیں۔ بہترین بولنگ، 164 رنز کے عوض 8 وکٹیں۔ 169 ون ڈے انٹرنیشنل کھیلے، جن میں انھوں نے 288 وکٹیں لیں۔ 20 رنز کے عوض 5 وکٹیں لینا ان کی بہترین کاوش رہی۔

گو آل راؤنڈر نہیں تھے، مگر بیٹنگ کا شوق رکھتے تھے۔ وسیم اکرم کے ساتھ ٹیسٹ میں ریکارڈ شراکت بنائی۔ سنچری بھی اسکور کی۔ انھیں یقین تھا کہ ان میں بہت کرکٹ باقی ہے، مگر کرکٹ بورڈ کی رائے مختلف تھی۔ انھیں پاکستان کرکٹ سے الگ ہونا پڑا۔ بعد میں وہ کوچنگ کرتے دکھائی دیے۔ جب سعید اجمل کے ایکشن پر پابندی لگی تو انھوں نے اسے درست کروایا۔

☆نور جہاں

موسیقی کا شاید ہی کوئی شائق ہو جو ملکۂ ترنم سے ناواقف ہے، شاید ہی ایسا کوئی کمپوزر ہو جس نے ان کے لیے دھنیں ترتیب دینے کی آرزو نہ کی ہو، شاید ہی کوئی گلوکار گزرا ہو، جس نے اُن کے انداز کو نہ اپنایا ہو، مگر ان کی تقلید دشوار تھی، وہ اپنے فن میں یکتا تھیں۔ یہ میڈم نور جہاں کا تذکرہ ہے، جن کے بغیر برصغیر کے فن موسیقی کی تاریخ نامکمل ہے۔ اگر وہ نہ ہوتیں، تو شاید پاکستانی انڈسٹری ادھوری ہوتی۔ ایک اندازہ کے مطابق مختلف زبانوں پر عبور رکھنے والی اس فنکارہ نے دس ہزار کے قریب گانے گائے۔

میڈم نور جہاں 21 ستمبر 1928ء کو قصور میں پیدا ہوئیں۔ وہ استاد بابا غلام محمد کی شاگرد تھیں۔ ٹھمری، دھروپد، خیال اور دیگر اصناف پر کم عمری میں عبور حاصل کرلیا۔ ایک بار جو گائیکی کا سلسلہ شروع ہوا، تو فن نکھرتا چلا گیا۔ قصور سے اہل خانہ کے ساتھ کلکتہ چلی گئیں۔ 1935ء میں ''پنجاب میل'' نامی فلم میں دکھائی دیں، مگر اصل کامیابی معروف فن کار مختار بیگم کا اعتماد جیتنا تھا۔ انھوں نے ہی اپنے شوہر آغا حشر کاشمیری سے سفارش کی کہ وہ نور جہاں کی رہنمائی کریں۔ وہ زمانہ تربیت کے اعتبار سے خاصا اہم تھا۔

لاہور لوٹ کر انھوں نے اپنی گائیکی پر توجہ مرکوز کی۔ 1942ء میں پران کے مدمقابل فلم ''خاندان'' میں پہلی بار لیڈ رول کیا۔ بمبئی کے زمانے میں ہدایت کار سید شوکت حسین سے ملیں۔ جلد ان کی شادی ہوگئی، گو خاندان اس رشتے کے سخت خلاف تھا۔ بٹوارے سے قبل وہ 69 فلموں میں جلوہ گر ہوئیں اور انھوں نے 127 گیت گائے۔ ''مرزا صاحبان'' سے یہ سفر اختتام کو پہنچا۔ اب یہ ہیرا پاکستانی انڈسٹری کے تاج کا حصہ بننے والا تھا۔

آنے والے برسوں میں انھوں نے چن وے، دوپٹا، گلنار سمیت کئی یادگار فلمیں کیں۔ ''مجھ سے پہلی سی محبت'' جیسے یادگار گیت گائے۔ پہلے شوہر سے طلاق کے بعد اداکار اعجاز درانی سے شادی کرلی تھی، مگر یہ شادی بھی اختلافات کا شکار رہی۔ شوہر کے دباؤ کی وجہ سے انھوں نے اداکاری چھوڑ دی۔ آخری بار 1961ء میں فلم ''مرزا غالب'' میں دکھائی دیں۔ البتہ گائیکی کا سلسلہ ایک عرصے تک جاری رکھا۔ ان کے نام کا ڈنکا پوری دنیا میں بجا کرتا۔ لتا اور آشا جیسی گلوکارائیں ان کا نام احترام سے لیتیں۔ ملتیں، تو ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوجاتیں۔ 1986ء میں بیماری نے پہلا حملہ کیا۔ وہ جلد سنبھل گئیں، مگر امراض تعاقب میں تھے۔ 2000ء میں انھیں ہارٹ اٹیک ہوا۔ اُسی برس 23 دسمبر کو یہ منفرد گلوکارہ جہان فانی سے کوچ کرگئیں۔

☆ڈاکٹر فہمیدہ مرزا

گو پاکستان میں عورتوں کے لیے سہولیات کا فقدان

ہے، نہ تو تعلیم اور نہ ہی کیریئر کے یکساں مواقع ہیں، مگر حوا کی بیٹی صلاحیتوں میں کسی سے کم نہیں۔ فاطمہ جناح سے بے نظیر بھٹو تک، بیگم رعنا لیاقت سے بلقیس ایدھی تک، کتنی ہی روشن مثالیں ہیں۔ موجودہ عہد میں اس فہرست میں فہمیدہ مرزا کا نام بھی شامل کر لیں۔ وہ پہلی پاکستانی خاتون ہیں، جو قومی اسمبلی کی اسپیکر منتخب ہوئیں۔ انھوں نے 19 مارچ 2008ء میں یہ عہدہ سنبھالا۔ واضح رہے کہ اسپیکر کا عہدہ سنبھالنے والی وہ مسلم دنیا کی اوّل خاتون بھی ہیں۔

سندھ، بالخصوص بدین کی سیاست میں ان کا کردار کلیدی ہے۔ وہ معروف سیاست داں ذوالفقار مرزا کی زوجہ ہیں۔ جب ان کے شوہر زیرِ عتاب تھے، انھوں نے بھرپور سیاسی جدوجہد کی۔ وہ لگاتار تین بار (1997، 2002، 2008) عام انتخابات میں کامیاب ہو کر قومی اسمبلی تک پہنچیں۔ وہ ان گنی چنی خواتین میں سے ہیں جنھوں نے مختص نشستوں کے بجائے عام انتخابات کے ذریعے اسمبلی میں قدم رکھا۔

انھوں نے 20 دسمبر 1956ء کو حیدرآباد کے قاضی خاندان میں آنکھ کھولی۔ ان کے دادا قاضی عبدالقیوم، حیدرآباد میونسپلٹی کے پہلے مسلمان صدر تھے۔ والد قاضی عبدالمجید عابد وفاقی کابینہ میں بھی شامل رہے۔ ان کے چچا قاضی محمد اکبر بھی معروف سیاست داں تھے۔ الغرض سیاست انھیں وراثت میں ملی۔

ڈاکٹر فہمیدہ مرزا نے لیاقت یونیورسٹی آف میڈیکل ہیلتھ سائنسز، جامشورو سے 1982ء میں طب کی تعلیم مکمل کی۔ سیاست میں آنے سے پہلے وہ اشتہارات کی ایک کمپنی سنبھالتی رہیں۔ انھیں ایک قابلِ احترام اور باوقار خاتون تصور کیا جاتا ہے۔ حالیہ دنوں میں ذوالفقار مرزا اور آصف علی زرداری کے درمیان بڑھتے فاصلوں کی وجہ سے ڈاکٹر صاحبہ پی پی کی سیاست سے دور ہو گئی ہیں۔

☆ رانا بھگوان داس

منکسر المزاجی، ایمان داری اور سادگی کا امتزاج تھے

رانا بھگوان داس۔ کبھی سرِراہ آپ کی ان سے ملاقات ہو جائے، تو ان کی شفقت کے باعث آپ کو احساس ہی نہیں ہوگا کہ کبھی یہ شخص پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ کا چیف جسٹس رہا ہے۔ یاد کیجیے، ایک زمانہ تو ایسا تھا، جب پاکستان کی عدالتی اور سیاسی تاریخ انتہائی پُرپیچ موڑ پر آن کھڑی ہوئی تھی اور قسمت کا فیصلہ رانا بھگوان داس کے ہاتھ میں تھا۔

وہ 20 دسمبر 1942ء کو نصیر آباد، سندھ کے ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے۔ 1965ء میں بار میں شامل ہوئے۔ 1967ء میں جج ہو گئے۔ کئی سال سیشن جج کے طور پر فرائض انجام دیے۔ پھر سندھ ہائیکورٹ کے جج بنے۔ 2000ء میں آپ سپریم کورٹ میں تعینات ہوئے۔ 9 مارچ 2007ء کو جسٹس افتخار چوہدری کی معزولی کے بعد جسٹس رانا بھگوان داس کو حکومت نے قائم مقام چیف جسٹس تعینات کیا۔ اس دوران بھگوان داس پاکستان میں موجود نہیں تھے۔ سیاسی نظام میں ڈیڈلاک پیدا ہو گیا۔ پوری قوم ان کی واپسی کی منتظر تھی۔ انھوں نے لوٹنے کے بعد بطور چیف جسٹس ایک یادگار فیصلہ دیا۔ عدالتی ریفرنس روکر دیا گیا۔ ایمرجنسی نافذ ہونے کے بعد وہ ان جج صاحبان میں شامل تھے، جنھوں نے حلف اٹھانے سے انکار کیا۔ اس دوران انھوں نے نظر بندی کا کرب سہا۔ جسٹس رانا بھگوان داس 65 سال کی عمر میں اپنے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔ نومبر 2009ء تا دسمبر 2012 وہ فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین بھی رہے۔ نومبر 2014ء میں انھیں چیف الیکشن کمیشن بنانے پر اتفاق ہوا، لیکن انھوں نے یہ عہدہ سنبھالنے سے انکار کر دیا۔ رانا بھگوان داس کا انتقال 23 فروری 2015ء میں ہوا۔

وہ ہندو برادری سے تعلق رکھنے والے سپریم کورٹ کے پہلے جج تھے۔ یہ ان کی قابلیت اور صلاحیت تھی، جس نے انھیں عدالتی نظام کے اعلیٰ ترین عہدے تک پہنچایا۔ وہ انتہائی اچھی شہرت کے حامل تھے اور اپنی پوری خدمت کے دوران ہمیشہ غیر متنازع ثابت ہوئے۔ وہ اسلامی تعلیمات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ قانون کے ساتھ انھوں نے اسلامیات میں بھی

ماسٹرز کیا۔ رسول کریم ﷺ کے عقیدت مند تھے۔ انھوں نے متعدد نعتوں کی صورت رحمت العلمین ﷺ کو نذرانہ عقیدت پیش کیا۔

☆عبدالرزاق

2 دسمبر 1979ء کو لاہور میں پیدا ہونے والے عبدالرزاق میں ایک عظیم کھلاڑی چھپا ہوا تھا، وہ پاکستانی تاریخ کے بڑے آل راؤنڈرز کی فہرست میں شامل ہو سکتے تھے، مگر مصلحت، موقع پرستی اور پسند ناپسند نے اس باصلاحیت کھلاڑی کے کیریر کو وقت سے بہت پہلے ختم کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان میں آج بھی کرکٹ باقی ہے۔

عبدالرزاق نے 5 نومبر 1999ء کو آسٹریلیا کے خلاف ڈیبیو کیا۔ انھیں اپنی شناخت بنانے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ورلڈ کپ 1999ء میں بھی ان کی کارکردگی متاثر کن رہی۔ وسیم اکرم کی کپتانی میں وہ ٹیم کا مستقل حصہ تھا۔ وہ ان کے عروج کا دور تھا۔ 46 ٹیسٹ میچز میں 100 وکٹیں لیں اور 1946 رنز بنائے۔ ان کا اصل میدان ون ڈے کرکٹ تھا، جہاں 265 مقابلوں میں انھوں نے 269 وکٹیں اپنے نام کیں اور تین سنچریوں اور 23 نصف سنچریوں کی مدد سے پانچ ہزار سے زاید رنز بنائے۔ اگر وہ کھیلتے رہتے، تو شاید کئی ریکارڈ اپنے نام کر لیتے لیکن انھیں شکوہ ہے کہ کچھ کپتانوں نے انھیں ٹیم میں مستقل جگہ بنانے کا موقع نہیں دیا۔

ماہرین کے ساتھ حریف بھی یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ رزاق کا بلا چل نکلے، تو انھیں روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بولنگ بھی بڑی نپی تلی کرتے تھے۔ شارجہ میں منعقدہ چیمپئنز ٹرافی میں پاکستان کے 196 رنز کے ٹارگٹ کا تعاقب کرتی سری لنکا ٹیم کا بھٹا رزاق ہی نے بٹھایا۔ انھوں نے ایک تاریخی اسپیل کیا اور سری لنکا کو یقینی فتح سے محروم کر دیا۔ ساؤتھ افریقا کے خلاف وہ یادگار سنچری بھی مداحوں کے دلوں پر نقش ہے، جب اس باصلاحیت کھلاڑی نے تن تنہا میچ کا نقشہ بدل دیا تھا۔ میگ گرا جیسے عظیم بولر کو آسٹریلوی پچ پر ایک اوور میں پانچ چوکے بھی جڑے تھے رزاق نے۔ بدقسمتی سے اقربا پروری ان کی کامیابی میں رکاوٹ بن گئی۔

النظام ابراہیم بن سیار مجاحتی بن اشک بصرہ کا ایک نامور مفکر۔ اس کی زندگی کے آخری سال بغداد میں گزرے اور وہیں وفات پائی۔ مورخین کے خیال میں سن وفات 220ھ سے 230ھ کے درمیان ہے۔ وہ عباسی دور کی ایک اہم شخصیت تھا۔ فلسفہ اسلام کے علاوہ بلند پایہ شاعر بھی تھا اور اسلامی نظریے کے ارتقا میں بلند مقام رکھتا ہے۔ دہریہ اور ایسی ہی تمام تحریکوں کے خلاف اس نے ایک زبردست تحریک چلائی جس کا ذکر الغزالی کی "طہافت" میں بھی ملتا ہے۔ اس نے توحید اور قرآن پر وسیع تحقیق کی۔ اصل التوحید میں یہ دہریہ مذہب کے خلاف قرآن کی آیات کی تشریح کرتا ہے۔ اس میں دنیا کی تشکیل اور بنانے پر وسیع بحث ہے جو نو ملاطونی افکار کے تابع معلوم ہوتی ہے۔ اپنی دوسری تصنیف "اصل العدل" میں انسانی آزادیوں پر بحث کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمام فعل انسانی اس حیات کی وجہ سے ہیں جو خدا نے جسم انسان میں پوشیدہ کر رکھی ہیں جو روح ہے۔ انسان جس کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اس کی تفسیری کتاب فقہ پر ہے یہ اصل الودد الولویہ، کہلاتی ہے۔

مرسلہ: سیدہ نرجس خاتون، لاہور

☆مہرین جبار

پاکستان کی خواتین ہدایت کاروں کی فہرست میں مہرین جبار ایک اہم نام ہیں۔ ان کا شوبز کی سمت آنا حیران کن نہیں تھا کہ جس ماحول میں آنکھ کھولی، وہ اس تعلق سے زرخیز اور سازگار تھا۔ وہ معروف سیاست داں اور میڈیا پرسن جاوید جبار کی صاحب زادی ہیں۔

انھوں نے 29 دسمبر 1971ء کو کراچی میں آنکھ کھولی۔ سینٹ جوزف کالج سے گریجویشن کیا۔ پھر امریکا سے فلم اور ٹی وی میں ڈگری لی۔ پاکستان لوٹ کر انھوں نے تصویر

پروڈکشن کی بنیاد رکھی، جس کے تحت انھوں نے سیریز اور سیریل بنائیں، جنھیں نہ صرف ناظرین بلکہ ناقدین نے بھی خوب سراہا۔

عصمت چغتائی کے افسانے پر مبنی نیولا ان کا پہلا کھیل تھا، 1994ء میں مکمل ہونے والا یہ کھیل کبھی نشر نہیں ہوسکا۔ پی ٹی وی نے اسے یہ کہہ کر چلانے سے انکار کردیا کہ یہ ایک ہندوستانی ادیب کی کہانی پر مبنی ہے۔ انھوں نے مایوس ہونے کی بجائے کئی ایسے ڈرامے اور شارٹ فلمز بنائیں، جنھیں مثبت ردعمل ملا۔

مہرین کی اصل دلچسپی سینما میں تھی۔ ان کی صلاحیتیں دیکھتے ہوئے لوگوں کو اُمید بھی تھی۔ اس وقت سینما انڈسٹری کی حالت دگرگوں تھی لیکن انھوں نے رسک لینے کا فیصلہ کیا۔ 2008ء میں ان کی فلم ''رام چند پاکستانی'' ریلیز ہوئی، جسے انڈیا اور برطانیہ میں بھی پیش کیا گیا۔ اسے ناقدین نے خوب سراہا۔ کئی بین الاقوامی اعزازات اس کے نام رہے۔ اس فلم نے ایک اُمید جگائی۔ اس کے بعد ٹی وی کے کئی ہدایت کاروں نے مہرین کے نقوش پا کا تعاقب کرتے ہوئے مشکلات کے باوجود فلم بنانے کا رسک لیا۔ 2013ء میں ان کی ٹیلی فلم ''دل میرا دھڑکن تیری'' نشر ہوئی، جو 1968ء میں آنے والی مشہور فلم کا ری میک تھی۔ اس وقت اپنے پراجیکٹ ''دوبارہ پھر سے'' پر کام کر رہی ہیں۔ وہ ایک سماجی کارکن بھی ہیں۔

☆ محمد آصف

سیانے کہتے ہیں، جب شہرت کی چوٹی پر ہو، تو محتاط ہوجاؤ، ذرا سی غفلت ہوئی اور پاؤں پھسل گیا۔

پاک بھارت ٹیسٹ میچ میں ایک طلسماتی گیند پر عظیم بلے باز سچن ٹنڈولکر کو بولڈ کرنے والے محمد آصف کو کبھی پاکستان کا مستقبل کہا جاتا تھا۔ اس دراز قد بولر میں گیند کو سوئنگ کرنے کی صلاحیت شاید بہ درجہ اتم موجود تھی۔ گو رفتار زیادہ نہیں تھی مگر نتائج حیران کن تھے۔ ایسا لگتا تھا، یہ شخص طویل عرصے تک پاکستان کی نمائندگی کرے گا مگر وہ مصائب میں پھنس گئے۔ پہلے ممنوعہ ادویہ کے مسئلے نے حملہ کیا۔ پھر اسپاٹ فکسنگ کے اسکینڈل میں الجھ گئے اور ایسے داغ دار ہوئے کہ لوگ ان کے تذکرے سے بھی اجتناب برتنے لگے۔

21 دسمبر 1982ء کو شیخوپورہ میں پیدا ہونے والے محمد آصف نے جنوری 2005ء میں آسٹریلیا کے خلاف اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ کچھ عرصے ٹیم سے ان آؤٹ ہوتے رہے مگر 2006ء میں جب بھارتی ٹیم پاکستان کے دورے پر آئی تو کراچی ٹیسٹ میں ایسا جادو جگایا کہ ٹیم کا مستقل حصہ بن گئے۔ فقط 22 ٹیسٹ میچز میں 105 وکٹیں لے کر دنیا کو حیران کر دیا۔ اس دوران سات بار پانچ وکٹیں ایک بار دس وکٹیں اپنے نام کیں۔ ون ڈے ٹیم میں بھی جگہ بنالی تھی۔

2006ء کے اواخر میں ممنوعہ ادویہ کے استعمال کے باعث ان پر پابندی لگی۔ ان کے واپس لوٹنے کے بعد کچھ عرصے تو سکون رہا، مگر 2010ء میں جب پاکستانی ٹیم انگلینڈ کے دورے پر گئی تو ان کے کیریئر میں ایک طوفان آگیا۔ بولنگ کا اصل بوجھ آصف اور محمد عامر کے کاندھوں پر تھا، شومئی قسمت وہ ٹیم کے کپتان سلمان بٹ سمیت اسپاٹ فکسنگ کو بے نقاب کرنے والے پرچے ''نیوز آف ورلڈ'' کے چنگل میں پھنس گئے۔

ثبوت پکے تھے۔ پوری دنیا میں پاکستان کی بدنامی ہوئی۔ الزامات بہ آسانی ثابت ہوگئے۔ پابندی ہی نہیں لگی بلکہ انھیں برطانیہ میں پابند سلاسل بھی رہنا پڑا۔ پانچ برس کرکٹ سے دور رہنے کے بعد اب وہ دوبارہ اپنی جگہ بنانے کے لیے کوشش کررہے ہیں۔

نچلے متوسط طبقے میں پیدا ہونے والے محمد آصف کی فرسٹ کلاس میں کارکردگی خاصی متاثر کن تھی۔ وہ کبھی مینجمنٹ کے لیے مسئلہ نہیں رہا، مگر انٹرنیشنل کرکٹ میں قدم رکھنے کے بعد جب شہرت ملی، تو اسے سنبھال نہیں سکے۔ کرکٹ میدانوں کے علاوہ بھی وہ تنازعات میں رہا۔ بالخصوص وینا ملک کے ساتھ اس کا افیئر خبروں کی زینت بنا رہا۔

مریم کے خان

کرکٹ ایک ایسا کھیل ہے جو خواص کے لیے مخصوص تھا۔ صرف امراء ہی کھیلا کرتے تھے لیکن جب عوام میں مقبول ہوا تو عوامی دلچسپی کا محور بن گیا۔ دنیا کے اس کونے سے اس کونے تک اس کے دیوانے نظر آنے لگے۔ اس کھیل کے ذریعے کمائی بھی خوب خوب شروع ہو گئی۔ اب جب یہ کھیل سونے کی چڑیا بن گیا ہے تو اسے قفس میں ڈالنے، من پسند نتائج حاصل کرنے کے لیےسیاست کی بازی گری عروج پر پہنچ گئی۔ اس کام میں پہل بھارت نے کی اور بگ تھری کا فارمولہ اپنایا۔ اس نے کس کس طرح کی چالیں چلیں اسنی کا خلاصہ۔

کھیل کے میدان کو سیاست کا اکھاڑا بنانے والوں کا تذکرہ

بگ تھری کہانی ہے لالچ، خودغرضی اور سفاکی کی حد کو پہنچی ہوئی ہوس کی جس میں سب سمیٹ لینے اور دوسرے کو کچھ نہ دینے کی خواہش ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک گھر میں دس بھائی رہتے ہوں۔ وہ یہیں پل بڑھ کر جوان ہوئے۔ کچھ بڑے اور کچھ چھوٹے ہیں۔ جو کبھی بہت چھوٹے تھے وہ اب قد و قامت اور قوت میں بڑوں کے برابر آ گئے اور جو کبھی بہت بڑے ہوتے تھے وہ اب برابر کے ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک بھائی زیادہ ہی

امیر ہو گیا اور اس نے دولت کے بل بوتے پر دو بڑے بھائیوں کو ساتھ ملا کر اس پورے گھر پر قبضے کی ٹھانی جو اصل میں دسوں بھائیوں کی ملکیت ہے اور سب اس میں برابر کے حصے دار ہیں۔ مگر کچھ دولت اور قوت میں باقی بھائیوں جیسے نہیں ہیں اس لیے وہ مجبور ہیں کہ ان تین بڑوں کے غلام بن جائیں۔ حالانکہ وہ جائز وارث ہیں مگر اب وہ اس گھر میں رہنے کے لیے ان تین بڑوں کے محتاج ہیں۔

عوامی کھیلوں میں فٹ بال کے بعد اگر کسی کھیل کو دنیا میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے تو وہ کرکٹ ہے۔ دنیا کی ایک چوتھائی آبادی باقاعدگی سے اس کھیل میں شریک ہے۔ وہ کھیلتی ہے یا دیکھتی ہے جب کہ ایک تہائی آبادی رکھنے والے ممالک میں اسے مقبول کھیل کا درجہ حاصل ہے۔ اپنے آغاز میں یہ دولت مندوں کا کھیل تھا۔ برطانوی لارڈز اسے کھیلتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے انہوں نے پیشہ ور کرکٹ کا آغاز کیا۔ انہوں نے اپنے کلب بنائے اور پیسا دے کر بہترین کھلاڑیوں کی خدمات حاصل کرنے لگے۔ یہ بہترین کھلاڑی عام طور سے نچلے طبقے سے نکل کر آتے تھے، یوں چند دہائیوں میں کھیل کی حد تک کرکٹ امرا کے ہاتھ سے نکل گئی اور اب وہ اس سے صرف دل بہلاتے تھے۔ غربت کے سخت حالات سے اٹھ کر آنے والے سخت جان کھلاڑیوں سے مقابلہ کرنا ان نازک مزاج لارڈز کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔

مگر کلب ان کے تھے۔ پیسا ان کا تھا اس لیے کھیل پر ان ہی کا راج تھا۔ یہ قوانین بنانے اور اسے نافذ کرنے کے لیے آزاد تھے جب کہ اسے کھیلنے والے کھلاڑیوں کی حیثیت ریس میں حصہ لینے والے قیمتی گھوڑوں سے زیادہ نہیں تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز تک انگلینڈ میں کرکٹ لارڈز کا کھیل ہی رہی۔ مگر اس وقت تک دوسرے ممالک میں بھی کرکٹ اپنی جڑیں پکڑنے لگی تھی اور وہاں چونکہ لارڈز نہیں تھے اس لیے کرکٹ اب عوامی کھیل بن گیا۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقا میں کرکٹ بدستور پیشہ وارانہ سطح پر کھیلی جاتی تھی۔ یہاں کھیل کو سپورٹ کرنے کے لیے ادارے تھے۔ کرکٹ بورڈ بنے اور یہ مقامی کرکٹ کو پیشہ وارانہ خطوط پر چلانے لگے۔ آمدنی کے ذریعے تلاش کیے جاتے اور اس آمدنی سے کھلاڑیوں کو معاوضہ دیا جاتا اور ٹیموں کو سہولتیں مہیا کی جاتی تھیں۔ پیشہ ور کلب وجود میں آئے جو امرا کی سرپرستی اور گیٹ منی کی مدد سے خاصی رقم جمع کر لیتے تھے اور پھر اس رقم سے بہترین پیشہ ور کھلاڑیوں کی خدمات حاصل کرتے تھے۔

اس پیشہ ور کرکٹ کے متوازی تیسری دنیا میں عوامی کرکٹ کی ایک نئی قسم پھل پھول رہی تھی۔ جس میں پیسا نہیں تھا مگر شوق اور جنون بے پناہ تھا۔ اس کرکٹ کے دو مراکز تھے۔ ایک برصغیر اور دوسرا جزائر کریبین۔ یہ دونوں خطے انگریزی استعمار کے چنگل میں تھے اور انگریزوں نے ان خطوں کو باقاعدہ کالونیاں بنالیا تھا۔ وہ یہاں کرکٹ لائے اور اسے رواج دیا۔ اس وقت شاید انگریزوں نے بھی نہیں سوچا ہوگا کہ ایک وقت آئے گا جب یہ خطے کرکٹ میں ان سے آگے نکل جائیں گے اور یہاں کی ٹیمیں انگلینڈ آ کر کرکٹ کے بانیوں کو کرکٹ کے نئے نئے سبق سکھا کر جائیں گی۔ برصغیر اور جزائر کریبین میں کرکٹ غریب ترین طبقات کی تفریح تھی۔ بچے اور نوجوان ایک جنون کے عالم میں گرم ترین موسم سے بے نیاز چھٹی کے دنوں میں کرکٹ کھیلتے تھے اور یہ جنون اب بھی برقرار ہے۔ اگرچہ اس کی شدت میں کمی آ گئی ہے۔

دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہی ان خطوں کے ملکوں نے بڑے درجے کی کرکٹ کھیلنا شروع کر دی تھی اور وہ ٹیسٹ میچوں میں انگلینڈ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقا کی سفید فام برتری کو چیلنج کرنے لگے تھے۔ دوسری جنگ عظیم تک ان ممالک نے اپنی یہ برتری کسی نہ کسی طرح قائم رکھی۔ مگر پچاس کی دہائی تبدیلی لے کر آئی۔ پاکستان، انڈیا اور ویسٹ انڈیز کی ٹیموں نے فتوحات حاصل کرنا شروع کیں اور یہاں سے کرکٹ کے کھیل میں سیاست کا آغاز ہوا۔ انگلینڈ اور آسٹریلیا جو اصل میں کرکٹ کے کرتا دھرتا تھے اور اصول و قواعد سے لے کر کرکٹ کے ہر معاملے میں حتمی فیصلہ وہی کرتے تھے۔ حتمی کیا اصل میں فیصلے وہی کرتے تھے اور دوسرے ممالک جو کرکٹ کھیلتے تھے وہ صرف ان کا اتباع کرتے تھے۔ مگر جب بھی اتباع کرنے والے ممالک میدان میں انہیں شکستوں سے دوچار کرنے لگے تو ان ملکوں سے یہ برداشت نہیں ہوا۔

قوانین میں پے در پے تبدیلیاں کی جانے لگیں۔ جس چیز میں ان دو ملکوں کو اپنا فائدہ نظر آتا اسے فوراً قانون کا درجہ دے دیا جاتا۔ جس قانون میں انہیں اپنا نقصان نظر آتا اسے بدل دیا جاتا یا پھر سرے سے ختم کر دیا جاتا۔ اس

کی ایک بڑی مثال باؤنسر پر پابندی کا قانون تھا۔ جب تک آسٹریلیا اور انگلینڈ کے پاس تیز رفتار بالر تھے اور وہ تیز باؤنسی پچوں پر دورہ کرنے والی مہمان ٹیموں کے کھلاڑیوں کے خلاف باؤنسر کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ خود آپس کے مقابلوں میں باڈی لائن بالنگ کرتے تھے تب باؤنسرز کا استعمال جائز تھا مگر جب ویسٹ انڈیز اور پاکستان کے فاسٹ بالرز نے انہیں ان ہی کے سکوں میں ادائیگی شروع کی تو انہیں بیٹسمینوں کی حفاظت کا خیال آیا اور باؤنسرز پر پابندی لگا دی گئی۔ اسی طرح خاموشی سے گالیاں کھانے والے تیسری دنیا کے کھلاڑیوں نے جب ان ہی کی زبان میں جواب دینا شروع کیا تو میدان میں ضابطہ اخلاق نافذ کردیا گیا۔

سیاست کی مدد سے اپنی تسکین کرنے کے بعد گوروں نے کرکٹ کو پیشہ وارانہ سطح پر ایک نیا رخ دیا اور کیری پیکر سرکس سامنے لے آئے۔ کیری پیکر اور اس جیسے بہت سے لوگ بھانپ گئے تھے کہ کرکٹ سے پیسا کمایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ کرکٹ کو اجارہ داروں کے چنگل سے نکالا جائے۔ کرکٹ بورڈز تو گیٹ منی اور اسپانسر شپ سے اچھا خاصا پیسا کما رہے تھے۔ مگر کھلاڑیوں کو کچھ نہیں مل رہا تھا۔ انگلینڈ، آسٹریلیا، جنوبی افریقا اور نیوزی لینڈ کے کھلاڑی مقامی سطح پر پیشہ ور کرکٹ کھیل کر اچھا خاصا کما لیتے تھے۔ مگر پاکستان، انڈیا، ویسٹ انڈیز اور بعد میں آنے والی سری لنکا کے کھلاڑیوں کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ نہ ڈومیسٹک کرکٹ میں پیسا تھا اور نہ انٹرنیشنل کرکٹ میں۔ ان کے حصے میں صرف ناموری اور کرکٹ ریکارڈ ہی آتے تھے۔ البتہ جو کھلاڑی انگلینڈ جا کر کاؤنٹی کرکٹ کھیل لیتے تھے انہیں کچھ رقم مل جاتی تھی ورنہ باقیوں کی مالی حالت ہمیشہ پتلی ہی رہتی تھی۔

کھلاڑیوں میں بھی احساس بڑھ رہا تھا کہ انہیں کچھ نہیں مل رہا ہے۔ وہ مہینوں اپنے گھر والوں سے دور رہ کر کرکٹ کے میدانوں میں جان مارتے ہیں اور سارا فائدہ ان کے بورڈز اٹھا رہے ہیں۔ اس لیے جیسے ہی کیری پیکر سامنے آیا۔ اس نے دنیا کی پہلی نجی پیشہ ور کرکٹ لیگ شروع کی۔ ساری دنیا سے بہترین کھلاڑی کھنچ کر اس کی طرف جانے لگے۔ انہوں نے اپنے بورڈز کی پابندیوں اور دھمکیوں کی پروا بھی نہیں کی تھی کیونکہ کیری پیکر انہیں ایک سیزن کھیلنے کا وہ معاوضہ دے رہا تھا جو وہ دس سال کرکٹ کھیل کر بھی نہیں کما سکتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دنیائے کرکٹ کے تمام نامور ستارے کیری پیکر کرکٹ کھیلنے جا پہنچے اور بورڈز نئے ناموں سے نجی ٹیمیں بنانے پر مجبور ہو گئے۔ مگر عوام نے ان ٹیموں کو مسترد کردیا اور بورڈز پر دباؤ بڑھنے لگا کہ وہ اپنے اسٹار کھلاڑیوں کو واپس لائیں۔

بورڈز نے ایک حد تک مقابلہ کیا اور پھر عوام کے دباؤ کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اب بورڈز کھلاڑیوں کو واپس لینا چاہتے تھے مگر کھلاڑی آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہیں زندگی میں پہلی بار فائیو اسٹار سہولتوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے کو ملی تھی۔ اب وہ صرف کرکٹ کھیلنے کو تیار نہیں تھے۔ اس لیے ضروری ہو گیا کہ کھلاڑیوں کو خودمختاری دی جائے۔ وہ کیری پیکر بھی کھیل سکیں اور ساتھ ہی بین الاقوامی کرکٹ بھی کھیلیں۔ ساتھ ہی کھلاڑیوں کے معاوضے میں بھی اضافہ کیا جائے۔ بادل ناخواستہ کرکٹ بورڈز نے یہ دونوں قدم اٹھائے۔ وہ کھلاڑیوں کو زیادہ معاوضہ دینے کو تیار تھے مگر کیری پیکر کی صورت میں ایک نجی کرکٹ لیگ ان سے کسی صورت ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے ساز باز کی گئی تھی اور کیری پیکر کی ون ڈے کرکٹ میں کی گئی اصلاحات کو برقرار رکھتے ہوئے آسٹریلین بورڈ نے اسے ورلڈ سیریز کرکٹ کے نام سے شروع کر دیا۔ نائٹ کرکٹ، سفید بال اور کھلاڑیوں کا رنگین لباس کیری پیکر کا تحفہ تھا۔ مگر اس اولین کرکٹ لیگ کا خاتمہ کر دیا گیا۔ البتہ اس کے اثرات اتنے دیر پا تھے کہ آج بھی کھلاڑی کیری پیکر کے احسان مند ہیں جس نے ان کی قیمت بڑھائی۔

ورلڈ سیریز کی صورت میں تمام تر فوائد آسٹریلیا نے سمیٹ لیے اور وہ ہر سال اس سے کثیر منافع کمانے لگا اور اس منافع میں سے صرف اس کے کھلاڑیوں کو ایک حصہ ملتا تھا۔ باقی دنیا اور خاص طور سے تیسری دنیا کے کھلاڑی بس وہی حاصل کر سکے تھے جو انہیں کیری پیکر نے چند سیزن میں دیا تھا۔ ویسٹ انڈیز کے کھلاڑی کاؤنٹی کرکٹ میں بیش قیمت معاوضے حاصل کر رہے تھے مگر پاکستانی اور انڈین اس سے محروم تھے۔ تیسرے ورلڈ کپ میں انڈیا کی فتح کے بعد انگلینڈ میں بورڈز اور کاؤنٹی ٹیموں پر دباؤ بڑھنے لگا کہ وہ غیر ملکی کھلاڑیوں میں کمی کریں اور ان پر پابندی لگائیں، وہ انگلینڈ میں کھیل کر مقامی حالات سے واقف ہو جاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انگلینڈ میں ہونے والے تینوں ورلڈ کپ میں فاتح ٹیم باہر کی ہوتی تھی۔ پہلے دو ورلڈ کپ ویسٹ انڈیز نے جیتے

اور تیسرا بھارت کے نام رہا تھا۔ باتیان کرکٹ یعنی انگلینڈ اور آسٹریلیا اب تک ورلڈکپ سے محروم تھے۔

پاکستان اور انڈیا کے کھلاڑیوں کی کسمپرسی دیکھتے ہوئے سابق پاکستانی کپتان اور آل راؤنڈر آصف اقبال اور یو اے ای کرکٹ بورڈ کے چیئرمین عبدالرحمٰن بخاطر نے صحرا میں کرکٹ کا انوکھا خیال پیش کیا۔ اس وقت ماہرین نے اس کی شدید مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ صحرا کی شدید گرمی، خشک موسم اور کرکٹ کے لیے ناموافق حالات میں یہ منصوبہ ناکام ہوگا۔ سب سے بڑھ کر مقامی افراد کو کرکٹ سے کوئی دل چسپی نہیں تھی اور عبدالرحمٰن بخاطر جیسے دیوانے چند ایک ہی تھے۔ اتفاق سے یہ سارے ماہرین گورے تھے۔

اس وقت یو اے ای میں کوئی کرکٹ اسٹیڈیم نہیں تھا۔ مگر دھن کے پکے ان دونوں افراد نے اس بہ ظاہر ناممکن نظر آنے والے کام کو ممکن بنانے کا بیڑا اٹھایا۔ شارجہ کے ریگ زار میں بین الاقوامی سطح کا اسٹیڈیم تعمیر کیا گیا۔ یہاں انڈیا، پاکستان اور سری لنکا کی ٹیموں کو مدعو کر کے ٹورنامنٹ کرایا گیا اور خلافِ توقع پہلے ہی ٹورنامنٹ نے بے پناہ کامیابی حاصل کی۔

جہاں اس ٹورنامنٹ کی کامیابی میں منتظمین کی محنت کا ہاتھ تھا۔ وہیں امارات میں آباد لاکھوں پاکستانی، انڈین باشندوں نے بھی دیوانوں کی طرح اسٹیڈیم کا رخ کر کے اسے کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہر میچ میں اسٹیڈیم گنجائش سے زیادہ ہی بھرا ہوتا تھا اور خاص طور سے جب میچ پاکستان انڈیا کا ہو تو ٹکٹ دس گنا زیادہ قیمت پر بلیک ہوتے تھے۔ میچوں کے نشریاتی حقوق بڑی قیمت پر فروخت ہوتے تھے۔ کیونکہ یو اے ای میں براڈ کاسٹ کی وہ ساری جدید ترین ٹیکنالوجی موجود تھی جو اس وقت صرف انگلینڈ اور آسٹریلیا کے پاس تھی۔ پاکستان اور بھارت اس سے محروم تھے اس لیے یہاں میچوں کے نشریاتی حقوق برائے نام قیمت پر پی ٹی وی اور دور درشن کو دے دیے جاتے تھے۔ پھر شارجہ میں گیٹ منی بہت زیادہ تھی۔ پاکستان اور بھارت میں لوگوں کو سو روپے کا ٹکٹ بھی مہنگا لگتا تھا مگر یو اے ای میں وہ ہزاروں روپے کے ٹکٹ لے کر میچ دیکھنے آتے تھے۔

کیونکہ شارجہ میں کرکٹ کرانے کا مقصد پاکستان اور انڈیا کے نئے اور سابق کرکٹرز کو مالی فائدہ دینا تھا۔ اس لیے اس ٹورنامنٹ کا انعقاد کرنے والے ادارے کرکٹرز بینیفٹس فنڈ سیریز کی طرف سے ہر ٹورنامنٹ میں انڈیا اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے دو دو کھلاڑیوں کو پچاس ہزار ڈالرز کی خطیر رقم دی جانے لگی۔ یہ انعامی رقومات کے علاوہ تھیں۔ 1982ء سے لے کر 2003ء تک شارجہ میں مسلسل کرکٹ ٹورنامنٹ ہوتے رہے تھے اور اس دوران میں شارجہ کے گراؤنڈ نے دو سو سے زائد ون ڈے میچوں کی میزبانی کی۔ آج بھی یہ ریکارڈ شارجہ کے پاس ہی ہے کہ یہاں سب سے زیادہ بین الاقوامی ایک روزہ میچ کھیلے گئے۔

اس عرصے میں لاتعداد پاکستانی اور انڈین کھلاڑیوں کو بڑی رقومات سے نوازا گیا۔ بعد میں اس میں سری لنکن کھلاڑی بھی شامل ہوئے۔ اس دوران میں یہاں میچ فکسنگ کے الزامات بھی اٹھتے رہے۔ مگر حاصل ہونے والے فوائد اتنے زیادہ تھے کہ ان الزامات کو نظرانداز کیا جاتا رہا۔ اس دوران میں نہ تو کوئی اور ٹورنامنٹ (بہ شمول ورلڈکپ) اور نہ ہی کوئی مقامی سیریز کھلاڑیوں کو اس قدر رقومات دے رہی تھیں۔ آسٹریلیا، انگلینڈ، جنوبی افریقا اور نیوزی لینڈ کے کھلاڑی سینٹرل کنٹریکٹ کے تحت تنخواہیں بھی حاصل کرتے تھے اور میچ فیس اور دوسرے طریقوں سے الگ کماتے تھے۔ ان کی میڈیا ویلیو بھی تھی اور وہ اس سے خاصی رقم حاصل کرتے تھے۔ تجارتی اور صنعتی ادارے انہیں برانڈ ایمبیسیڈر کے طور پر استعمال کرتے تھے اور انہیں خاصا معاوضہ ملتا تھا۔ پاکستان، انڈیا، سری لنکا اور ویسٹ انڈیز کے کھلاڑی ان فوائد سے محروم تھے۔ انہیں نہ تو سینٹرل کنٹریکٹ ملتا تھا اور نہ ہی ان کی میڈیا ویلیو تھی اور اگر تھی بھی تو ان کے اپنے ملک میں نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں تھی۔ ایسے میں سی بی ایف ایس نے برصغیر کے کرکٹرز کی مالی حالت بہتر بنانے میں شاندار کردار ادا کیا۔ اگرچہ شارجہ میں کرکٹ شروع کرنے میں انڈیا کا کوئی کردار نہیں تھا اور اس کے کھلاڑی بعد میں آگے آئے مگر ان کو اس کا پورا پورا فائدہ ملا۔

☆☆☆

کیری پیکر کی طرح کرکٹ میں دوسری بڑی تبدیلی بھی آسٹریلیا میں آئی، جب پہلی بار کرکٹ ورلڈکپ کا کمرشل سطح پر انعقاد کیا گیا۔ آسٹریلین کرکٹ بورڈ نے اپنے وسیع تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے اس میں ایسی جدتیں پیدا کیں کہ ورلڈکپ یکا یک ہی عالمی براڈ کاسٹرز کے لیے نہایت پرکشش ایونٹ بن گیا۔ اس سے پہلے ہونے والے چاروں ورلڈکپ غیر تجارتی بنیادوں پر ہوئے تھے اور بورڈز

نے اپنے بل بوتے پر یا اپنی حکومتوں کے مالی تعاون سے ان کا انعقاد کیا تھا۔ پہلی بار رنگین لباس اور سفید بال کے ساتھ رات کی روشنی میں ورلڈ کپ کھیلا گیا تھا۔ ورلڈ کپ کے نشریاتی حقوق آسٹریلیا کے چینل نائن نے حاصل کیے اور اس نے اسے ساری دنیا میں مقامی چینلو کی مدد سے نشر کیا۔ اسے ساری دنیا میں ایک ارب سے زیادہ افراد نے دیکھا اور یہاں سے کرکٹ کی کمرشل ویلیو نے جنم لیا۔ اس تبدیلی نے جس ملک کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ انڈیا تھا۔ بنیوں نے کرکٹ کی تجارتی اہمیت بھانپ لی اور انڈیا کی ایک ارب آبادی سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ درحقیقت یہاں سے بگ تھری کا آغاز ہوا تھا۔

1992ء کا ورلڈ کپ اگر کامیاب تھا تو 1996ء کا ورلڈ کپ کامیاب ترین ثابت ہوا اور کرکٹ کی پوری تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ پاکستان اور انڈیا کے بورڈز کے خزانے بھر گئے۔ میڈیا رائٹس کے میدان میں انڈیا خاصا آگے جا چکا تھا کیونکہ گزشتہ ایک عشرے میں وہاں کیبل ٹی وی اپنی جگہ بنا چکا تھا اور ٹی وی دیکھنے والے افراد کی تعداد نصف ارب تک جا پہنچی تھی ایسے میں وہ کمپنیاں جو پہلے ہی انڈیا کی بڑی منڈی سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھیں۔ ان کے لیے کرکٹ ایک پُرکشش کھیل بن گیا۔ کرکٹ کے دیوانے کرکٹرز کو ٹی وی پر دیکھ کر مزید دیوانے ہوئے تھے اور انہوں نے غریب سمجھے جانے والے کھلاڑیوں کو دنیا کے امیر ترین کھلاڑیوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میڈیا کے میدان میں کرکٹ چھا گئی۔ چند سالوں میں بے شمار اسپورٹس چینل جو پہلے کرکٹ کا نام بھی نہیں لیتے تھے اب کرکٹ دکھانے لگے اور بہت سے ایسے چینل کھلے جو صرف کرکٹ دکھاتے ہیں۔

پچھلی صدی میں معاملات پھر بھی حد میں تھے لیکن نئی صدی کی آمد کے ساتھ ہی کرکٹ کی کمرشل ویلیو اتنی زیادہ ہوئی کہ اس نے اس کی تمام اقدار کو قطعی پس پشت ڈال دیا۔ وہی ٹیمیں جو کبھی انڈیا کے ساتھ یوں کھیلتی تھیں جیسے اسے بھیک دے رہی ہوں اب اس کے ساتھ کھیلنے کو بے تاب رہنے لگیں۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اگر ان کی ٹیم انڈیا سے کھیل رہی ہو گی تو انہیں میڈیا رائٹس اور اسپانسر شپ کی مدوں میں بہت بڑی رقم ملے گی۔ قطع نظر اس کے کہ انڈیا کی ٹیم کس معیار کی ہے اور وہ شائقین کو اس درجے کی تفریح فراہم کر سکے گی جیسی تفریح بڑی ٹیمیں فراہم کرتی ہیں۔ پاکستان اور جنوبی افریقا جیسی اعلیٰ درجے کی ٹیموں کی وہ اہمیت نہیں تھی جو بھارت کی تھی۔ جس کے پاس سوائے بلے بازوں کی ایک لائن کے اور کچھ نہیں تھا اور یہ بلے باز عام طور سے صرف ملک میں ہی کارکردگی دکھاتے تھے۔ بیرونِ ملک تیز رفتار وکٹوں پر یہ ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔ انڈیا کی بیرونِ ملک تسلسل سے ناکامیاں اس کا سب سے بڑا ثبوت ہیں اس کے باوجود انڈیا سب کی پسند ہے تو یہ سب کمرشل کرکٹ کا کرشمہ تھا۔

انڈیا کی مڈل کلاس جو ملٹی نیشنل کمپنیوں کی ٹارگٹ ہوتی ہے اس کی تعداد کرکٹ کھیلنے والے تمام ملکوں کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے انڈیا اپنے طور پر سب سے زیادہ کمانے والا ملک تو بن گیا تھا مگر آئی سی سی یعنی انٹرنیشنل کرکٹ کونسل کے پاس آنے والا زیادہ تر پیسا بھی انڈیا کی وجہ سے تھا۔ اس لیے آئی سی سی میں انڈیا کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اکثر کلیدی عہدے انڈینز کے پاس چلے گئے اور اکثر کمیٹیوں میں جو کرکٹ میں قانون سازی کرتی ہیں ان میں انڈین افراد کی تعداد دوسرے تمام ممالک کے افراد سے کل تعداد سے بھی بڑھ گئی۔ جو اچھا انڈین کھلاڑی ریٹائر ہوتا وہ یا تو سیدھا انڈین کرکٹ بورڈ، یا پھر کسی براڈ کاسٹر یا پھر آئی سی سی میں چلا آتا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ انڈین کھلاڑیوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں آ گیا۔ وہ جتنا کرکٹ سے کماتے ہیں اس سے زیادہ نان کرکٹ سے کمانے لگے۔ دھونی اور کوہلی جیسے ٹاپ کھلاڑیوں کی آمدنی دنیا میں سب سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے والے کھلاڑیوں کی فہرست میں جگہ بنانے لگی۔

1909ء میں جب آئی سی سی کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت یہ امپریل کرکٹ کانفرنس تھی۔ اس میں تمام تر استحقاق صرف دو کرکٹ کھیلنے والے ملکوں کو حاصل تھے یعنی انگلینڈ اور آسٹریلیا۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ کرکٹ میں اس کی اجارہ داری برقرار رہی۔ پھر 1965ء میں اس کا نام بدل کر انٹرنیشنل کرکٹ کانفرنس کر دیا گیا۔ مگر یہ تبدیلی صرف نام کی حد تک تھی کیونکہ آسٹریلیا اور انگلینڈ بدستور اس کے تمام معاملات پر حاوی تھے اور باقی کرکٹ کھیلنے والے ممالک کی کسی بھی معاملے میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ کوئی بھی قانون بنا سکتے تھے کسی قانون کو بدل یا ختم کر سکتے تھے اور اگر رائے شماری میں فیصلہ ان کے خلاف آتا تو اسے ویٹو کرنے کا اختیار بھی انگلینڈ اور آسٹریلیا کے پاس تھا۔

البتہ جب تیسری بار 1989ء میں اس کا نام بدلا اور یہ انٹرنیشنل کرکٹ کونسل ہوئی تب اس سے انگلینڈ اور آسٹریلیا کی اجارہ داری ختم ہوگئی اور اسے جمہوری ادارے کے طور پر چلایا جانے لگا۔ دس ممالک انگلینڈ، آسٹریلیا، جنوبی افریقا (1992ء میں) نیوزی لینڈ، ویسٹ انڈیز، پاکستان، انڈیا، سری لنکا، زمبابوے اور بنگلہ دیش (1999ء) اس کے مکمل ممبر ہیں۔ بالفاظ دیگر صرف ان دس ممالک کو ٹیسٹ کھیلنے کا استحقاق حاصل ہے۔ سینتیس ممالک اس کے ایسوسی ایٹ ممبرز ہیں جو ایک روزہ اور ٹی ٹوئنٹی کے بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لینے کے مجاز ہیں جب کہ انسٹھ مبصر ممبر ہیں جہاں کرکٹ منظم نہیں ہے۔ یہ ممالک کسی بین الاقوامی مقابلے میں حصہ نہیں لے سکتے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی باقاعدہ کرکٹ ٹیم ہے۔

آئی سی سی کا کام بین الاقوامی سطح پر کرکٹ ٹورنامنٹس جیسے ورلڈ کپ، چیمپینز ٹرافی اور ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ منعقد کرنا، ان میں امپائرز اور ریفری مقرر کرنا، اسپانسر شپ حاصل کرنا اور میڈیا رائٹس فروخت کرنا، دو ملکوں کے درمیان کھیلے جانے والے ٹیسٹ، ایک روزہ اور ٹی ٹوئنٹی میچوں کے لیے امپائرز اور ریفریز کا تقرر کرنا، کھلاڑیوں کے لیے ضابطہ اخلاق جاری کرنا اور اس کی نگرانی کرنا۔ اس کے لیے آئی سی سی نے باقاعدہ ایک کوڈ آف کنڈکٹ بنایا ہے۔ بین الاقوامی اصولوں اور قواعد کو مدِنظر رکھ کر کرکٹ میچز کے اصول و قواعد تشکیل دیئے۔ تاکہ تنازعات کم سے کم کیے جا سکیں۔ اس کے علاوہ میچ فکسنگ اور کرپشن کے معاملات دیکھنا بھی آئی سی سی کی ذمے داری ہے۔ اس کا ایک شعبہ اینٹی ڈوپنگ ہے، جس کا مقصد کھلاڑیوں میں ممنوعہ ادویات کا استعمال روکنا ہے۔ ان کاموں کے علاوہ دنیا کے دوسرے نان کرکٹنگ ممالک میں کرکٹ کا فروغ بھی اس کی ضمنی ذمے داریوں میں آتا ہے اور اس مقصد کے لیے آئی سی سی ہر سال لاکھوں ڈالرز خرچ کرتی ہے۔

1990ء تک انڈین کرکٹ بورڈ کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور اسے سیریز حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرنا پڑتی تھی۔ مگر جب اس کے پاس پیسا آنا شروع ہوا اور دوسرے ممالک اس سے کھیلنے کو بے قرار رہنے لگے تو دبے اور مجبور رہنے والے آئی سی بی کو اچانک اپنی اہمیت کا احساس ہوا اور اس نے بین الاقوامی کرکٹ امور میں اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کردیئے۔ اس کا پہلا نشانہ پاکستان بنا اور پہلے اس نے سرحدی کشیدگی اور دوسرے تنازعات کو بہانہ بنا کر پاکستان سے دوطرفہ کرکٹ کھیلنے سے انکار کردیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان دنوں انڈین کرکٹ ٹیم کو پاکستان سے تقریباً ہر میچ میں شکست کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور یہ بات اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے شارجہ میں کرکٹ کھیلنے سے انکار کردیا۔ بہانہ میچ فکسنگ اور کرکٹ میں سٹے بازی تھی۔ مگر وجہ وہی تھی کہ شارجہ میں اسے پاکستان کے خلاف مسلسل شکست ہو رہی تھی۔

ایک وقت آیا جب انڈیا نے زیادہ کرکٹ حاصل کرنے کے لیے آئی سی سی کو مجبور کر کے فیوچر کرکٹ پروگرام تشکیل دیا اور اس میں لازمی قرار پایا کہ ہر ٹیسٹ کھیلنے والی ٹیم دوسری ٹیم سے تین سال میں ایک بار لازمی سیریز کھیلے۔ مگر اس فیوچر پروگرام کی دھجیاں بھی خود انڈیا اور اس کے ساتھ انگلینڈ و آسٹریلیا نے بکھیر دیں۔ انہوں نے آپس میں تو زیادہ سے زیادہ سیریز طے کرلیں لیکن کرکٹ کھیلنے والے چھوٹے ممالک کو نظر انداز کردیا۔ جیسے زمبابوے اور بنگلہ دیش کو بہت کم سیریز ملی تھیں۔ سری لنکا اور ویسٹ انڈیز کو بھی زیادہ کرکٹ ملی تھی جب کہ پاکستان جیسی ٹیم کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ بہرحال یہاں انڈیا مجبور ہوا اور کیونکہ فیوچر پروگرام کے تحت سیریز کھیلنا لازمی تھیں اس لیے اس نے پاکستان سے تین سیریز کھیلیں مگر جیسے ہی ممبئی حملہ ہوا انڈیا نے پاکستان سے کھیلنے سے انکار کردیا۔ کیونکہ آئی سی سی کے رول کے تحت کوئی بورڈ اپنے طور پر کھیلنے سے انکار نہیں کرسکتا ہے۔ ہاں اگر اس ملک کی حکومت پابندی لگائے تو آئی سی سی بھی کچھ نہیں کرسکتا ہے اور یوں انڈین حکومت کی پابندی کے بہانے انڈیا نے پاکستان سے کرکٹ کھیلنے سے انکار کردیا۔

کھیل میں سیاست کی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جو انڈیا نے قائم کی۔ اس کے زیرِ اثر آئی سی سی خاموش رہا اور فیوچر پروگرام کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ انڈیا کی مزید خوش قسمتی اور ہماری مزید بدقسمتی کہ اسی دوران میں پاکستان میں سری لنکن ٹیم پر حملہ ہوا اور پاکستان سے نہ صرف ورلڈ کپ کے میچز لے لیے گئے بلکہ تب سے اب تک پاکستان اپنے ہاں انٹرنیشنل کرکٹ کروانے میں ناکام رہا ہے۔ پھر میچ فکسنگ کے الزامات سے ہماری کرکٹ مزید کمزور ہوئی۔ ہمارے کھلاڑیوں پر پابندیاں لگیں اور دوسری ٹیمیں ہم سے میچ کھیلنے سے کترانے لگیں۔ انڈیا نے اس سے مزید فائدہ اٹھایا

اور آئی سی سی میں اپنی پوزیشن مضبوط کر کے اس نے بالآخر بگ تھری کے لیے لابنگ شروع کر دی۔ اس میں اصل کرتا دھرتا تو انڈیا ہی ہوتا لیکن کیونکہ انگلینڈ اور آسٹریلین کرکٹ بورڈ کی شمولیت کے بغیر یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے انڈیا نے انہیں بھی تین بڑوں میں شامل ہونے کا لالچ دیا اور وہ اس کے ساتھ آگئے۔

وجہ تنازعہ وہ خطیر رقم تھی جو آئی سی سی مختلف ٹورنامنٹس کی اسپانسر شپ اور میڈیا رائٹس کے ساتھ دوسرے طریقوں سے حاصل کرتی ہے۔ انڈیا کا دعویٰ ہے کہ اس میں سے اسّی فیصد آمدنی اس کی وجہ سے آتی ہے اور اسی وجہ سے آئی سی سی دنیا کی دولت مند ترین کھیلوں کی باڈی بنا ہوا ہے۔ آئی سی سی اپنے اخراجات سے ہٹ کر بچ جانے والی تمام رقم ایسوسی ایٹ ممبران میں مساوی طور پر تقسیم کرتا ہے۔ انڈیا اس کے خلاف تھا اور اس کا کہنا تھا کیونکہ زیادہ آمدنی اس کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اس لیے اسے زیادہ حصہ دیا جائے۔ آئی سی سی کا موجودہ آئین اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مگر بدقسمتی سے آئی سی سی میں ان ہی تین ملکوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی بھرمار تھی اور یہ لوگ آئی سی سی سے زیادہ اپنے ملکوں کے بورڈز سے وفاداری کا دم بھر رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آئی سی سی میں بیٹھے ان ممالک کے افراد نے بگ تھری کا منصوبہ بنایا۔

مالی لحاظ سے تینوں بورڈز بہت مضبوط ہیں خاص طور سے انڈین کرکٹ بورڈ جس کا خزانہ اتنا بھر گیا ہے کہ اس کے کرتا دھرتا اسے خرچ کرنے کے راستے تلاش کرنے لگے ہیں۔ اس کی مضبوطی میں بنیادی کردار آئی پی ایل یعنی انڈین پریمیر لیگ کا ہے۔ اس کی بے پناہ کامیابی نے انڈین بورڈ کا خزانہ ہی نہیں بھرا بلکہ اس کے اعلیٰ حکام کے دماغوں میں ایسا خناس بھی بھرا جس کی وجہ سے انہیں سوائے اپنے سب ہیچ نظر آنے لگے۔ یہ خناس عالمی کرکٹ پر قبضے کا تھا۔ مگر کتنے ہی دولت مند اور طاقتور ہونے کے باوجود وہ بہرحال اکیلے عالمی کرکٹ پر قبضہ نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہیں مجبوراً انگلش اور آسٹریلین کرکٹ بورڈ کو بھی اپنے ساتھ ملانا پڑا۔ یوں کرکٹ کے نام نہاد بگ تھری کا آغاز ہوا۔ نام نہاد یوں کہ تین میں سے دو کا یہ حال ہے کہ وہ صرف اپنی سرزمین پر کھیلے جانے والے میچز میں کامیابی حاصل کرتے ہیں لیکن کرکٹ بیرونِ ملک ہو تو عام طور سے سارے ورنہ بیشتر میچ میں ہار ان کا مقدر ہوتی ہے۔

یہ دو ملک انڈیا اور انگلینڈ ہیں۔ تیسرا ملک آسٹریلیا جو اپنے ملک کے علاوہ دوسروں ملکوں میں بھی کامیابی حاصل کرتا ہے مگر جہاں اسے برصغیر کی پچوں پر کھیلنا پڑتا ہے اس کی حالت بھی ان دو ممالک جیسی ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود یہ تینوں آئی سی سی میں اپنے اثر و رسوخ اور دولت کے بل بوتے پر بگ تھری بننے میں کامیاب رہے۔ ورنہ ٹیم رینکنگ کے لحاظ سے یہ مشکل سے ہی کہیں تین بڑوں میں نظر آتے ہیں۔ صرف آسٹریلیا تینوں فارمیٹس کی رینکنگ میں پہلی تین پوزیشنوں میں آتا ہے جب کہ انگلینڈ اور انڈیا صرف ایک ایک فارمیٹ میں پہلی تین پوزیشن میں سے کسی ایک پر ہیں۔ انگلینڈ کی ٹیسٹ کرکٹ میں تیسری پوزیشن کو پاکستان سے خطرہ ہے وہ اس سے صرف ایک پوائنٹ اوپر ہے اور جلد یو اے ای میں اس کی پاکستان سے سیریز ہے۔ انڈیا صرف گھر کا شیر ہے اور باہر اسے زیادہ تر شکستوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے انڈیا کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کرکٹ اپنے ملک میں کھیلے۔ اس سے پیسا بھی آتا ہے اور اسے فتوحات بھی ملتی ہیں۔ جس سے اس کی رینکنگ بہتر ہوتی ہے۔

انگلینڈ کا حال سب کے سامنے ہے اور اس کی کارکردگی میں قطعی تسلسل نہیں ہے۔ آسٹریلیا کی کارکردگی پہلے جیسی نہیں رہی ہے اور اس کی لگاتار فتوحات تو ماضی کا حصہ بن کر رہ گئی ہیں۔ اگر وہ ایک سیریز میں کامیابی حاصل کرتا ہے تو اگلی سیریز میں اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس نے چند سالوں میں جتنی بھی سیریز بیرونِ ملک کھیلی ہیں ان میں اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اگر کارکردگی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ تینوں ملک بگ تھری بننے کے قابل نہیں ہیں۔ ہاں مالی لحاظ سے یہ تینوں ملک بہت مضبوط ہیں۔ مگر صرف اس بنیاد پر تین بڑے بننا ایسا ہی ہے جیسے لاٹھی والے کا بھینسوں کا رکھوالا بننا۔ یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ یا جس طرح عالمی سیاست کے کھلاڑی ہیں جو طاقتور ہے وہ سپر پاور ہے۔ پہلے یورپ اور اب امریکا سپر پاور ہے کیونکہ ان ملکوں کے پاس قوت ہے۔

مگر کھیلوں کی دنیا میں ایسا رواج کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ وہ کھیل جو خالص ترقی یافتہ ممالک کھیلتے ہیں اور ان کی عالمی فیڈریشنوں یا تنظیموں میں سارے عہدیداران ان ہی ملکوں سے لیے جاتے ہیں وہاں بھی ایسی کوئی اندھی نہیں ہوئی۔ دنیا کی تمام کھیلوں کی تنظیموں نے مساوات اور

جمہوریت کی اقدار اپنائی ہوئی ہے۔ جیسے فیفا ہے۔ کوئی بھی شخص جو کسی بھی ملک سے تعلق رکھتا ہو اور اس کا ملک فیفا کا ممبر ہو وہ فیفا کا صدر بن سکتا ہے۔ اس میں امیر غریب ممالک کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ گولف جو زیادہ تر ترقی یافتہ ممالک میں کھیلا جاتا ہے اور ترقی پذیر ملکوں میں بھی امرا کا کھیل ہے اس کی عالمی تنظیم کی باڈی خالصتاً جمہوری اصولوں پر قائم ہے۔ اسی طرح ٹینس، ہاکی، ایتھلیٹکس اور دوسرے بے شمار کھیل ہیں جن میں چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ انوکھا منظر صرف کرکٹ کی عالمی باڈی میں دیکھنے میں آیا جہاں تین دولت مند ممالک نے تمام اختیارات اور عالمی مقابلوں سے حاصل ہونے والی آمدنی ہتھیانے کا فیصلہ کیا اور نہایت ڈھٹائی سے تمام اعتراضات مسترد کرتے ہوئے سازشوں اور جوڑتوڑ کی مدد سے اس پر عمل درآمد کرالیا۔

جس وقت بگ تھری کا منصوبہ منظر عام پر آیا تو ان تین ملکوں کے علاوہ تقریباً تمام ہی ممالک نے اس کی شدید مخالفت کی تھی۔ یہی نہیں ان ملکوں سے تعلق رکھنے والے سابق کرکٹرز اور کھیل سے تعلق رکھنے والے افراد نے بھی اسے کھیل کی اقدار کے خلاف قرار دیا اور اسے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ اکثر سابق کھلاڑیوں کا کہنا تھا کہ بگ تھری اصل میں کرکٹ کے خاتمے کی طرف ایک قدم ہے اور اگر یہ نافذ ہو گیا تو جلد یا بدیر کرکٹ مقبول کھیلوں کی صف سے نکل جائے گی۔ کھل کر مخالفت کرنے والے بورڈز میں پاکستان، جنوبی افریقا، سری لنکا اور بنگلہ دیش کے بورڈ تھے۔ نیوزی لینڈ کا بورڈ شروع سے حامی تھا مگر اس نے خاموشی اختیار کی ہوئی تھی اور ویسٹ انڈین بورڈ ہتھیار ڈالنے کے بہانے تلاش کر رہا تھا۔ تین بڑوں نے سب سے پہلے کمزور بورڈز کی طرف توجہ دی اور ان کی حمایت حاصل کرنے کے لیے جوڑتوڑ شروع کیا۔ ویسٹ انڈین کرکٹ بورڈ سب سے زیادہ مالی مشکلات کا شکار رہتا ہے کیونکہ اس کی کارکردگی کی مناسبت سے اسے اسپانسر شپ اور میڈیا رائٹس بہت کم ملتا ہے۔ اس کی آبادی بھی کم ہے اور درحقیقت یہ سات ملکوں کا مجموعہ ہے جو ویسٹ انڈیز کے نام سے کرکٹ کھیلتے ہیں اس لیے اس ٹیم کے لیے اسپانسرز میں کوئی کشش نہیں ہے۔

مقامی سطح پر کھلاڑیوں کو اچھا معاوضہ نہ دینے کی وجہ سے وہ زیادہ تر بیرونِ ملک کھیلنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ آئے دن بورڈ اور کھلاڑیوں میں معاوضے پر تنازعات سامنے آتے ہیں۔ پچھلے دنوں اسی وجہ سے ویسٹ انڈیز کرکٹ ٹیم انڈیا کا دورہ ادھورا چھوڑ کر چلی گئی۔ بڑی ٹیموں نے ویسٹ انڈیز جانا تقریباً چھوڑ دیا ہے اور دوسرے ملکوں سے سیریز بھی کم ملتی ہے۔ اس لیے ویسٹ انڈیز کو زیادہ کرکٹ اور زیادہ رقم کا لالچ دیا گیا اور وہ فوراً بک گیا۔ زمبابوے کی سرے سے پوزیشن ہی نہیں تھی۔ اس نے بھی حامی بھرلی۔ اب تین بڑوں کی راہ میں رکاوٹ تین چھوٹے رہ گئے تھے۔ مگر یہ مالی لحاظ سے چھوٹے ہیں ورنہ کھیل میں ان تین بڑوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ان تین میں سب سے کمزور سری لنکا ہے جس کا بورڈ ہمیشہ سے مالی بحران کا شکار رہا ہے اور زیادہ بین الاقوامی کرکٹ بھی اسے سہارا نہیں دے پاتی ہے کیونکہ کم آبادی اور غربت کی وجہ سے اسے اسپانسر شپ اور میڈیا رائٹس کی مد میں زیادہ نہیں ملتا ہے۔

سری لنکا سے نمٹنے کا بیڑا انڈیا نے اٹھایا اور اسے آنے والے سالوں میں کئی دوروں کی یقین دہانی کرا کے بالآخر وہ سری لنکا کی حمایت بھی حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ مگر سری لنکا نے شرط رکھ دی کہ اس کی حمایت پاکستان اور جنوبی افریقا کی حمایت سے مشروط ہوگی۔ اس وقت تاثر ایسا تھا کہ بگ تھری کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جنوبی افریقا ہوگا۔ کیونکہ ان تینوں میں مالی لحاظ سے سب سے مضبوط بورڈ اسی کا ہے۔ پاکستان کی حالت سری لنکا سے اتنی بہتر ہے کہ آمدنی اور اخراجات میں توازن ہے اور ہم خسارے میں نہیں جارہے ہیں۔ آئی سی سی کا اجلاس ہونے والا تھا اور اچانک خبر آئی کہ جنوبی افریقا بھی بگ تھری کی حمایت کے لیے راضی ہے۔ اس خبر نے دنیائے کرکٹ کو دم بخود کر دیا تھا۔ اندرونِ خانہ کیا ہوا اور جنوبی افریقا جو سب سے سختی سے جما ہوا تھا وہ اچانک کیسے مان گیا؟ یہ کہانی ابھی تک اندرون راز ہے۔

لیکن سامنے کی بات ہے کہ اسے بھی دھمکی اور لالچ سے منوایا گیا۔ یہ وہی گاجر اور چھڑی والی پالیسی تھی جو عالمی سیاست میں بڑی طاقتیں چھوٹے ملکوں کو دھمکانے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ ایک افواہ کے مطابق اس میں خاصا کردار جنوبی افریقا سے تعلق رکھنے والے آئی سی سی کے سابق صدر کا رہا اور اس نے اپنے بورڈ کو راضی کیا کہ وہ بگ تھری کی حمایت کرے۔ دنیا دیکھ رہی تھی کہ ایک ایک کر کے کیسے سب پیسے کے بت کے آگے ڈھیر ہوتے جارہے ہیں۔ کرکٹ جسے شرفا کا کھیل کہا جاتا ہے اور اس میں فتح و شکست سے زیادہ ہمیشہ اقدار کو ترجیح دی جاتی رہی تھی۔ جب صاف

آؤٹ کھا لیے جاتے یا کسی کھلاڑی کو بالکل غلط آؤٹ قرار دیا جاتا تو کھلاڑی سر جھکا کر امپائرز کا فیصلہ تسلیم کرتے ہیں۔ جب کھلاڑی یہ جانتے ہی کریز چھوڑ دیتا ہے کہ وہ آؤٹ ہے اور وہ فیصلے کے لیے امپائر کی طرف دیکھتا بھی نہیں ہے۔

جس کھیل میں اکثر کریز سے باہر نکل آنے والے کھلاڑی کو بالراس لیے رن آؤٹ نہیں کرتا ہے کہ اسے کھیل کا ایک حصہ ہونے کے باوجود انتہائی ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک غلط فیصلہ میچ کا نتیجہ بدل دیتا ہے لیکن اس کے باوجود شکست خوردہ ٹیم اسے تسلیم کرتی ہے۔ تقریباً ہر کھیل میں آف دی فیلڈ فیصلہ بدلا جا سکتا ہے کھیل ختم ہونے کے بعد بھی بدلا جاتا ہے مگر کرکٹ میں ایسا نہیں ہوتا کیونکہ یہ شرفا کا کھیل ہے جو کرکٹرز کو سکھاتا ہے کہ کھیل ہی سب کچھ نہیں ہے انسانی اقدار اس سے بڑھ کر ہیں۔ انگلینڈ اور آسٹریلیا کے بورڈز بھی اپنے وقت میں اسے بہت غرور آمیز برتری کے ساتھ چلاتے رہے۔ انہوں نے نسلی تعصب بھی برتا، کھیل میں اپنی مرضی سے تبدیلیاں کیں۔ مگر ساتھ ہی کھیل کی اقدار کا خیال رکھا۔ جوڈینس للی میدان میں بدزبانی کرتا تھا اور مخالف کھلاڑیوں کو باؤنسر مارتا تھا۔ وہ شام کو ڈریسنگ روم میں جا کر اس کھلاڑی سے ملتا اور اس کی تعریف کے ساتھ معذرت بھی کرتا تھا۔

ویسٹ انڈیز ٹیم کے دورہ انگلینڈ پر انگریز کپتان نے چند تعصب آمیز جملے کہے تو پورا انگلینڈ اس پر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور بالآخر اسے ویسٹ انڈیز کی ٹیم سے، اپنے ہی لوگوں اور میڈیا سے بھی معافی مانگنا پڑی تھی۔ جب پہلی بار انگلینڈ کا دورہ کرنے والی پاکستانی ٹیم نے خلافِ توقع اوول میں انگلینڈ کو شکست دی جو بڑے ناموں سے سجی ہوئی ٹیم تھی تو فراخ دلی سے فضل محمود کو اوول کا ہیرو قرار دیا۔ پاکستانی کھلاڑی جنہیں کوئی جانتا نہیں تھا اس دورے کے خاتمے تک یہ حال تھا کہ اگر کہیں فضل محمود یا خان محمد نظر آ جاتے تو پرستاروں کا ایک ہجوم جمع ہو جاتا تھا۔ فلم دیکھنے سینما جاتے تو فلم روک کر حاضرین کو بتایا جاتا کہ ان کے درمیان پاکستانی ٹیم کے کھلاڑی موجود ہیں۔ یہ کھیل کی اقدار تھیں جو پچھلی صدی میں کسی نہ کسی طور برقرار رہیں۔ کیونکہ اس وقت معاملات آسٹریلیا اور انگلینڈ کے ہاتھ میں تھے۔ جنوبی افریقا سے دلی ہمدردی کے باوجود وہ اس پر نسلی تعصب کی وجہ سے پابندی لگانے پر مجبور ہوئے تھے۔

مگر نئی صدی میں کرکٹ کے معاملات انڈیا کے ہاتھ میں آ گئے جو کرکٹ جیسے کھیل میں بھی چانکیہ کے فلسفے پر عمل پیرا تھا۔ جب تک وہ کمزور رہا تھا۔ انگلینڈ اور آسٹریلیا کی خوشامد سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ان ملکوں کے دورے پر بھارتی کپتان خوشامدی قسم کے بیانات دیتے تھے کہ وہ یہاں کرکٹ کھیلنے نہیں بلکہ سیکھنے آئے ہیں۔ جب تک انڈین کرکٹ اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہوئی کرکٹرز بینیفٹس فنڈز سیریز ان کے لیے قبلہ و کعبہ تھی۔ کئی ایک انڈین کھلاڑی اس کے ترجمان اور شدید حامی تھے لیکن جیسے ہی انڈیا کے پاس پیسا آیا اس نے پینترہ بدلا اور اپنی ٹیم پر شارجہ یا یو اے ای میں کھیلنے پر پابندی لگا دی۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ یہاں میچ فکسنگ اور کرکٹ میں سٹے بازی ہوتی ہے۔ وہی کھلاڑی جنہوں نے یہاں سے لاکھوں ڈالرز بٹورے تھے شارجہ کو سٹے بازی اور کرپشن کا گڑھ قرار دینے لگے۔ حالانکہ یہاں کبھی بھی ایسے ثبوت منظر عام پر نہیں آئے جنہیں فکس قرار دیا جا سکے یا کسی کھلاڑی پر سٹے بازوں سے روابط کا ثبوت ملا ہو۔

ایک حقیقت جسے دنیا بڑی سادگی سے نظر انداز کر دیتی ہے کہ میچ فکسنگ یا سٹے بازی میں دنیا کی کسی بھی ٹیم کا کھلاڑی ملوث ہو۔ اس کے تانے بانے ہمیشہ انڈیا سے جا کر ملتے ہیں۔ ہنسی کرونئے، ہرشل گبس، جو آن بوتھا، شین وارن اور چند دوسرے کھلاڑیوں نے انڈین سٹے بازوں سے تعلق یا رقم لینے اور میچ فکسنگ کے اعترافات کیے۔ ان پر پابندیاں لگیں۔ پاکستانی کھلاڑیوں پر جب پابندی لگی تو اس میں بھی ایک انڈین ملوث تھا اور حیرت انگیز طور پر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ اسپاٹ فکسنگ ہو یا میچ فکسنگ ہمیشہ انڈین سٹے باز اس میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ گویا خرابی کا آغاز انڈیا سے ہو رہا ہے۔ مگر نہ آئی سی سی اور نہ ہی کرکٹ میڈیا ان سٹے بازوں کے بارے میں ایک لفظ کہتا ہے۔ آئی پی ایل اسکینڈل سامنے آیا اور چند کھلاڑیوں کو سزا بھی ہوئی مگر واقفانِ حال کہتے ہیں کہ اصل گند اس سے کہیں زیادہ ہے اور آئی پی ایل کرپشن کا ایک ایسا گڑھ بن چکی ہے۔ جو آنے والے دنوں میں بہت بڑے بم کی طرح پھٹے گی۔

مگر آئی سی سی نے اس بڑی کرپشن کی طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں اور اسے انڈین کرکٹ بورڈ پر چھوڑا ہوا ہے۔ جس نے چند کھلاڑیوں کو تو سزا دے دی مگر اس کرپشن میں ملوث بڑے لوگوں کو بچانے کی پوری کوشش کی

مگر بھارتی عدالتوں نے یہ پردہ چاک کیا کہ اصل مجرم تو ٹیموں کے کرتا دھرتا ہیں۔ انہیں نظر انداز کر دیا گیا۔ دھونی اور چند دوسرے کلیئر قرار دے دیئے گئے۔ مگر حیرت انگیز طور پر اس خالص بھارتی کرپشن میں بھی ایک پاکستانی کو لٹکا دیا گیا۔ پاکستانی امپائر اسد رؤف جو یہ میچ سپروائز کر رہے تھے ان کے خلاف چند نام نہاد میڈیا رپورٹس کو بنیاد بنا کر آئی سی سی نے نہ صرف انہیں امپائرنگ پینل سے نکال دیا بلکہ پینل میں رہ جانے والے واحد پاکستانی امپائر علیم ڈار کو اہم مقابلوں کی امپائرنگ سے روک دیا۔ جیسے عالمی مقابلوں کے فائنل اور سیمی فائنل یا ایشز سیریز وغیرہ۔ اس کے علاوہ انہیں انڈیا، انگلینڈ اور آسٹریلیا کے میچوں کی امپائرنگ نہیں دی جاتی ہے۔

اسد رؤف کے خلاف آئی پی نے کوئی کیس نہیں بنایا اور نہ ان پر شبہ کیا اور نہ ہی بین الاقوامی میڈیا کی طرف سے کوئی الزام سامنے آیا اس کے باوجود وہ ایک اچھے امپائر ہوتے ہوئے آئی سی سی ایلیٹ پینل میں واپس نہیں آسکے۔ صرف اس لیے کہ وہ پاکستانی ہیں۔ دوسری طرف سری نواسن جس کا داماد گروپن نہ صرف اسپاٹ فکسنگ میں ملوث پایا گیا بلکہ اسے ہی اصل ملزم قرار دیا۔ وہ سری نواسن اب بگ تھری کے آئی سی سی کا سربراہ ہے اور تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں ہیں۔ اس ایک حقیقت سے کرکٹ کی معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی جان سکتا ہے کہ اب یہ کھیل کس رخ پر جا رہا ہے۔۔ جب کرپشن کے گڑھ سے اٹھنے والا شخص اور جس کا قریب ترین عزیز کرپشن میں ملوث ہے وہ آئی سی سی کا سربراہ بن کر اسے کس نہج پر چلائے گا۔ یہ سب کھلی کتاب کی طرح واضح ہوتا جا رہا ہے۔ آنے والے وقت میں کرکٹ میں میچ فکسنگ اور کرپشن آئی سی سی کی سطح پر کی جائے گی۔ 2011ء کے ورلڈ کپ میں اس کی کامیاب ریہرسل بھی کر لی گئی تھی۔

انڈین کرکٹ بورڈ نے میڈیا رائٹس اور اسپانسر شپ سے پیسا تو بے پناہ کما لیا تھا مگر ابھی تک اس کا عالمی کرکٹ پر قبضے کا خواب پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسے میں انڈیا کے ایک بڑے تجارتی گروپ زی انٹرٹینمنٹ انٹرپرائز نے آئی سی ایل یعنی انڈین کرکٹ لیگ کے نام سے ایک نجی کرکٹ لیگ شروع کی۔ کیری پیکر کے بعد یہ دوسرا موقع تھا جب ایک نجی کرکٹ لیگ سامنے آئی اور اس نے انڈیا میں ایک ٹورنامنٹ کرایا۔ جس میں چار بین الاقوامی اور نو بھارتی ٹیمیں شامل ہوئی تھیں۔ 2007ء میں ہونے والے اس ٹورنامنٹ میں لاہور بادشاہ نے انضمام الحق کی قیادت میں کامیابی حاصل کی۔ خطیر معاوضوں اور انعامی رقومات کی وجہ سے اس لیگ نے جہاں کھلاڑیوں کی توجہ حاصل کی۔ وہیں انڈین کرکٹ بورڈ اور دنیا کے دوسرے بورڈ اس کی مخالفت پر اتر آئے۔

نتیجے میں آئی سی سی نے اسے غیر قانونی لیگ قرار دے دیا اور اس میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں اور آفیشلز پر پابندیاں لگ گئیں۔ اس کے باوجود معاوضہ اتنا زیادہ تھا کہ کھلاڑی پابندیوں کی پروا کیے بغیر آئی سی ایل کھیلنے جا رہے تھے۔ ان میں تمام ٹیموں کے اسٹار کھلاڑی شامل تھے۔ ایک بار پھر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی اور کرکٹ بورڈ سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ اس صورتِ حال کا مداوا کیسے کیا جائے۔ جہاں تک ٹی ٹوئنٹی کا تعلق تھا تو انگلینڈ نے سب سے پہلے 2003ء میں اپنے مقامی سیزن میں اس کا ٹورنامنٹ کرایا۔ اگلے سال پاکستان دوسرا ملک بنا جس نے اپنے ہاں ٹی ٹوئنٹی ٹورنامنٹ کرایا۔ اس کے بعد آسٹریلیا، ویسٹ انڈیز اور جنوبی افریقا نے بھی مقامی سیزن میں ٹی ٹوئنٹی ٹورنامنٹ کرانے شروع کیے۔ مگر بین الاقوامی سطح پر اس کا کوئی ٹورنامنٹ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کوئی ایسی لیگ تھی جس میں ساری دنیا کے کھلاڑی شامل ہوں اور شائقین انہیں ایکشن میں دیکھ سکیں۔

نجی لیگ کا توڑ کرنے کے لیے آئی سی سی نے عرصے سے زیرِ تجویز ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور اوّلین ورلڈ کپ جنوبی افریقا میں ہوا اور اس میں بھارت نے کامیابی حاصل کی۔ یہ تجربہ نہایت کامیاب رہا اور دو سال بعد ہونے والا ٹورنامنٹ پہلے سے زیادہ کامیاب رہا اور آئی سی سی کو خطیر آمدنی حاصل ہوئی اس لیے اگلے ہی سال تیسرا ورلڈ کپ منعقد کیا گیا۔ دوسرے ورلڈ کپ میں کامیابی نے پاکستان کے قدم چومے اور تیسرے ورلڈ کپ میں انگلینڈ نے کامیابی حاصل کی۔ مگر اس کے بعد آئی سی سی نے اس ٹورنامنٹ کو ایک روزہ ورلڈ کپ کی طرح ہر چار سال بعد کرانے کا فیصلہ کیا کیونکہ اب متعدد مقامی لیگز بھی بین الاقوامی سطح کے ٹورنامنٹ کرانے لگی تھیں اور مصروف شیڈول میں ورلڈ کپ کے لیے گنجائش کم بچتی تھی۔

باوجود اس کے کہ ورلڈ کپ کا تجربہ نہایت کامیاب رہا تھا۔ ایک لیگ کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ جو بگ

وقت مقامی اور بین الاقوامی سطح پر ہو۔ اس میں مروجہ فرسٹ کلاس ٹیموں کے بجائے کمرشل سطح پر فرنچائز ٹیمیں بنا کر ان میں مقامی اور غیر ملکی کھلاڑیوں کا مجموعہ بنایا جائے۔ ان کو خطیر معاوضے دیے جائیں تاکہ نجی لیگز کی حوصلہ شکنی ہو۔ ایسے میں انڈیا کو نظر آیا کہ اس طرح کرکٹ کا چودھری بننے کا خواب پورا ہو سکتا ہے اور اس نے آئی سی سی میں آئی سی ایل کو ختم کرنے کے لیے اس کے متوازی ایک کرکٹ لیگ شروع کرنے کا منصوبہ پیش کیا۔ اس میں انڈیا اور ساری دنیا سے بہترین کھلاڑی شرکت کرتے اور انہیں بیش بہا معاوضے اور انعامات دیے جاتے۔ یوں آئی سی ایل خود بہ خود ختم ہو جائے گی۔ کھلاڑیوں کی بغاوت کا خطرہ بھی نہیں رہے گا۔

بدقسمتی سے دنیا والوں نے آئی پی ایل کے مضمرات پر غور کیے بغیر اس کی حمایت کر دی اور نتیجے میں انڈیا کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار آ گیا جس کے بل بوتے پر وہ دنیا کی کرکٹ کو تباہ کر سکتا تھا اور اپنی کرکٹ کو ترقی دے سکتا تھا۔ آئی پی ایل کا پہلا ایڈیشن ہی نہایت کامیاب رہا۔ دنیا بھر سے کھلاڑیوں کی بولیاں لگیں اور مختلف فرنچائز نے انہیں ناقابلِ یقین حد تک بڑے معاوضوں پر خریدا۔ ٹنڈولکر کو سولہ لاکھ ڈالرز کے عوض خریدا گیا اور کئی ملین ڈالرز کھلاڑی سامنے آئے۔ پھر معاوضے بھی ہوش ربا تھے۔ فلمی ستاروں اور شوبزنس کی آمیزش سے آئی پی ایل کو مزید پُرکشش بنایا گیا۔ شائقین کا دل لبھانے کے لیے پہلی مرتبہ کرکٹ میں چیئر لیڈرز کو شامل کیا گیا۔ بھاری اسپانسر شپ اور میڈیا رائٹس سے حاصل ہونے والی رقم سے انڈین بورڈ مالا مال ہو گیا۔ اس کے باوجود آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام کے مترادف اسٹیڈیم کا رخ کرنے والے شائقین سے بھاری رقم وصول کی گئی اور کم سے کم ٹکٹ بھی ہزار سے اوپر کا تھا۔

کیونکہ یہ انڈین کرکٹ بورڈ کا شو تھا اس لیے اس میں آئی سی سی کو کچھ نہیں ملا الٹا اسے امپائرز اور آفیشلز بھیجنے پڑے جن کا معاوضہ آئی سی سی خود ادا کرتی ہے۔ یہ کرم نوازی صرف آئی پی ایل کے لیے مخصوص ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر انڈیا نے یہ منوا لیا کہ جو غیر ملکی کھلاڑی آئی پی ایل میں کھیل رہا ہوگا اسے ڈومیسٹک سیزن کیا بین الاقوامی کرکٹ میں اس کی ٹیم کے لیے بھی واپس نہیں لیا جائے گا اور وہ لازمی پوری آئی پی ایل کھیل کر ہی فارغ ہوگا۔ حیرت انگیز طور پر انڈیا کی یہ بات بھی مان لی گئی۔ اب آئی پی ایل کھیلنے والے کھلاڑی کی اس کی قومی ٹیم میں کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو اسے پہلے آئی پی ایل کھیلنا ہوگی اور اس کے بعد ہی وہ اپنی قومی ٹیم کے لیے کھیل سکے گا۔ آئی سی سی کے دو بڑوں یعنی انگلینڈ اور آسٹریلیا نے اس کی زیادہ پروا نہیں کی کیونکہ آئی پی ایل میں ان کے زیادہ تر ریٹائرڈ کھلاڑی حصہ لے رہے تھے۔

جیسے شین وارن، گلین میک گرا اور اسٹیو وا وغیرہ انگلینڈ کی طرف سے آئی پی ایل کھیلنے والے کھلاڑیوں کی تعداد ہمیشہ کم رہی اور ان میں سوائے کیون پیٹرسن کے اور کوئی نمایاں نام شامل نہیں تھا۔ بعد میں جب ان ملکوں کے نامور کھلاڑی آئی پی ایل کی طرف آئے تو وہ اسی مناسبت سے اپنا کرکٹ شیڈول بنانے لگے۔ یوں آئی پی ایل کی مدد

اسکینر سے گزرنے والی خاتون ہلاک

روس میں ایک جوان خاتون ائرپورٹ کی اسکیننگ مشین سے گزرنے کے بعد فوت ہو گئی کیوں کہ اس کے دل میں بیٹری سے چلنے والا پیس میکر نصب تھا۔ روسی اخبار کے حوالے سے ایک سعودی روزنامے کی رپورٹ کے مطابق 30 سالہ ڈیانا ٹولسٹووا اپنے 33 سالہ شوہر میکسم کے ساتھ ائرپورٹ گئی جہاں سے اسے دوسرے شہر جانے کے لیے ایک پرواز میں سوار ہونا تھا۔ میکسم نے بتایا کہ اس کی بیوی نے سیکیورٹی اہلکاروں کو میڈیکل رپورٹ دکھائی جس میں واضح تھا کہ اس کے دل میں پیس میکر لگا ہوا ہے جو اسکینر کی ریڈیائی لہروں سے شدید متاثر ہو سکتا ہے اور خاتون کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ تاہم سیکیورٹی اہلکاروں نے ڈیانا کو پھر بھی اسکینر سے گزرنے پر مجبور کیا۔ میکسم کے مطابق ڈیانا اسکینر سے گزرنے کے بعد ..... جیسے ہی ویٹنگ لاؤنج میں پہنچی اسے چکر آیا اور وہ اچانک گر گئی۔ میکسم کا کہنا تھا کہ میں طبی امداد کے لیے چیختا رہا مگر اتنی دیر میں وہ دنیا سے جا چکی تھی۔ ائرپورٹ حکام نے اس واقعے کی تحقیقات کا حکم دے دیا ہے۔

مرسلہ: ہانی رضوی۔ لاہور

سے انڈیا نے بگ تھری کا پہلا مرحلہ کامیابی سے عبور کرلیا۔ اس نے بورڈز کو اپنے آگے جھکنے پر مجبور کردیا۔ آئی سی سی سے اپنی شرائط منوالیں۔ آئی پی ایل کے پہلے ایڈیشن میں پاکستانی کھلاڑی ایکشن میں تھے اور مین آف دی ٹورنامنٹ کا اعزاز بھی ایک پاکستانی سہیل تنویر نے حاصل کیا تھا۔ جس نے ممبئی انڈینز کو آئی پی ایل کا پہلا فاتح بنایا تھا۔ اس کے بعد ممبئی حملے کو بہانہ بنا کر آئی پی ایل کے دروازے پاکستانی کھلاڑیوں کے لیے بند کردیئے گئے۔ یہ غیر اعلانیہ پابندی آج بھی برقرار ہے۔

مقامی طور پر بے پناہ آمدنی حاصل کرنے کے باوجود انڈین کرکٹ بورڈ کی نظریں آئی سی سی کی آمدنی پر تھیں اور اس کا دعویٰ تھا کہ اس آمدنی پر بڑا حق اس کا ہے۔ اس مطالبے کے ساتھ ہی انڈیا نے بین الاقوامی کرکٹ اور آئی سی سی کے بائیکاٹ کی دھمکیاں دینا شروع کردیں۔ اس پر دوسرے ملکوں کے بورڈز اور آئی سی سی کے ہوش اڑ گئے تھے کیونکہ یہ انڈین مارکیٹ تھی جس کی وجہ سے وہ بین الاقوامی ایونٹس کو بھاری رقم پر فروخت کرتے تھے اور آئی سی سی ہر سال پندرہ ارب ڈالرز کی بڑی رقم اسی وجہ سے حاصل کرتا ہے۔ اگر انڈیا اپنی دھمکی پر عمل کرتا تو آئی سی سی کی آمدنی یک دم ہی بہت کم ہوجاتی اور یہی حال ان ممالک کا ہوتا جن کے ساتھ انڈیا سیریز کھیلتا تھا۔ انڈیا سے سیریز ان کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی تھی۔ اگر انڈیا کرکٹ نہ کھیلتا تو ان ملکوں کے بورڈز خسارے میں چلے جاتے۔ اس دھمکی کے بعد انڈیا، آسٹریلیا اور انگلینڈ کی طرف سے بگ تھری کی تجویز پیش کی گئی۔

اگرچہ اس تجویز کو خوشنما الفاظ سے سجایا اور سنوارا گیا تھا اور دنیا کے دیگر چھوٹے ملکوں کے بورڈز کو یقین دلایا گیا تھا کہ ان تینوں کے بگ تھری بننے سے ان کے مالی مفادات اور کرکٹ کو کوئی زک نہیں پہنچے گی بلکہ کرکٹ زیادہ ترقی کرے گی۔ مگر بگ تھری کے پس پشت جو مقاصد کارفرما تھے ان کا زیادہ تذکرہ نہیں تھا۔ پھر فوراً ہی سازشیں بھی شروع ہو گئیں۔ ابھی تجویز آئی سی سی میں بھی نہیں گئی تھی اور یہ تینوں بورڈز دوسرے ملکوں کے بورڈز کو خفیہ ترغیبات سے منانے کی کوشش کررہے تھے۔ انہیں سب سے زیادہ خطرہ جنوبی افریقا، پاکستان اور سری لنکا سے تھا کہ ان کے بورڈز اگر دیوار بن گئے تو بگ تھری کا خواب یوں پورا ہوگا کہ آئی سی سی میں صرف بگ تھری رہ جائیں گے اور اس کا لازمی نتیجہ کرکٹ کی عالمی تنظیم کی تقسیم کی صورت میں نکلے گا۔

دیکھا جائے تو درحقیقت کرکٹ میں تقسیم تو اسی وقت شروع ہوگئی تھی جب ان تین ممالک نے فیوچر پروگرام کو پس پشت ڈال کر آپس میں زیادہ سے زیادہ کرکٹ کھیلنا شروع کردی تھی۔ ایشز سیریز جو پہلے ہر دو سال بعد ہوتی تھی اور یہ معمول ایک صدی سے زیادہ عرصے سے چلا آرہا تھا اچانک ہی اس میں تبدیلی آئی اور اب تین سال میں دو بار ایشز سیریز ہونے لگی ہے۔ اسی طرح انڈیا عام طور سے ہر پانچ سے چھ سال بعد انگلینڈ اور آسٹریلیا کا دورہ کرتا تھا مگر اب وہ ہر تیسرے سال ان ملکوں میں کرکٹ کھیل رہا ہے۔ انگلینڈ اور آسٹریلیا پہلے سات سے آٹھ سال بعد انڈیا کے دورے پر آتے تھے مگر اب وہ ہر تیسرے یا چوتھے سال انڈیا میں مکمل سیریز کھیلتے ہیں اور اس کے علاوہ درمیان میں ون ڈے اور ٹی ٹونٹی سیریز الگ ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ ممالک ستر فیصد کرکٹ آپس میں کھیل رہے ہیں۔

جنوبی افریقا، پاکستان اور سری لنکا کی بہترین کارکردگی کے باوجود بگ تھری ان سے کم کرکٹ کھیل رہے ہیں۔ جنوبی افریقا کو پھر بھی زیادہ کرکٹ مل جاتی ہے مگر پاکستان اور سری لنکا سے یہ ممالک بہت کم کھیلتے ہیں۔ انڈیا اور پاکستان کو آخری بار ٹیسٹ کھیلے چھ سال ہوگئے ہیں۔ پاکستان نے آسٹریلیا اور انگلینڈ کا آخری دورہ پانچ سال پہلے کیا تھا۔ اسی طرح سری لنکا کو بھی ان ممالک میں کم مدعو کیا جاتا ہے اور سری لنکا میں مکمل سیریز بھی بہت عرصے بعد اور مختصری کھیلتے ہیں۔ اس لیے گزشتہ چھ سالوں کے دوران میں ان تین چھوٹے ممالک نے زیادہ تر کرکٹ آپس میں کھیلی ہے اور اس کا تناسب بھی تقریباً ستر فیصد بنتا ہے۔ ان کے بعد ویسٹ انڈیز، نیوزی لینڈ، زمبابوے اور بنگلہ دیش بچتے ہیں۔ ان کو کرکٹ ویسے ہی کم ملتی ہے۔ ویسٹ انڈیز کی زیادہ دل چسپی اب ایک روزہ کرکٹ اور ٹی ٹونٹی میں رہ گئی ہے۔ نیوزی لینڈ کو آسٹریلیا اور انگلینڈ سے میچز مل جاتے ہیں۔ باقی اس کا گزارہ بھی مختصر فارمیٹس پر ہے۔ بنگلہ دیش اور زمبابوے بھی کم کرکٹ کھیلنے والے ممالک میں سے ہیں اور یہ ہمیشہ سے بگ تھری کی نظر کرم کے محتاج رہے ہیں۔

بدقسمتی سے کرکٹ اسپانسر اور میڈیا رائٹس لینے والے چینل اور ادارے بھی زیادہ تر ان تین ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ ان پر بھی اپنا اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔ دیگر بورڈز سے ہونے والے معاہدات میں بگ تھری کی مداخلت

عام سی بات ہے۔ مثال کے طور پر انڈین بورڈ کے ایک میڈیا گروپ سے تعلقات خراب ہوئے اور پاکستانی بورڈ نے اسی گروپ سے معاہدہ کر رکھا ہے۔ آنے والی سیریز (جس کے بارے میں انڈیا کی نیت ہی نہیں ہے) کے لیے الٹی سیدھی شرائط کے ساتھ انڈیا نے یہ شرط بھی رکھ دی کہ پاکستان اس میڈیا گروپ کے ساتھ اپنا معاہدہ ختم کرے۔ اس پر ہمارے بورڈ نے میڈیا گروپ کے سامنے شرط رکھ دی اور اس سے کہا کہ معاہدہ اسی صورت پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے جب وہ انڈیا کو راضی کر لے۔ مگر نہ نو من تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی۔ گروپ کی آمادگی اس وقت ہوگی جب انڈیا سیریز کھیلنے کو تیار ہوگا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اچھی خاصی رقم دینے والا یہ میڈیا گروپ ناراض ہو کر ہم سے معاہدہ ختم کر دے۔

ایسی اور کئی مثالیں ہیں۔ ماضی میں پاکستان نے سگریٹ ساز کمپنیوں سے ایسے ہی اعتراضات کی وجہ سے بیش قیمت معاہدے ختم کیے جو نہ صرف ہماری بین الاقوامی کرکٹ بلکہ ڈومیسٹک کرکٹ کو بھی اسپانسر کرتی تھیں۔ ان کے بعد ہمیں ڈومیسٹک کرکٹ کے لیے ڈھنگ کے اسپانسر میسر نہیں آئے۔ مزے کی بات ہے آسٹریلیا اس کے بعد بھی خاصے عرصے تک سگریٹ فروخت کرنے والی کمپنیوں کی اسپانسرشپ سے فائدہ اٹھاتا رہا اور آئی سی سی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ شاید ہمیں اپنا حق لینا ہی نہیں آتا ہے۔ سیاسی بنیادوں پر تعینات کرکٹ بورڈ کے چیئر مین کرکٹ سے زیادہ دوسرے معاملات میں دل چسپی رکھتے ہیں اور اکثر کو تو کرکٹ کے معاملات اور اس کی باریکیوں کا پتا ہی نہیں ہوتا جیسے ہمارے ٹی ٹوئنٹی کپتان کو عین میچ میں آؤٹ ہونے کے بعد خیال آتا ہے کہ ٹی ٹوئنٹی میں ری ویو ہوتا ہے یا نہیں اور مزے کی بات ہے وہ یہ بات امپائر سے سرعام اشارے سے پوچھ بھی لیتے ہیں۔ یہی ناواقفیت ہماری جگ ہنسائی کا سبب بنتی ہے۔ ہر شعبے کی طرح کرکٹ میں زوال کا بنیادی سبب بھی جہالت اور لالچ ہے۔ لالچی دوسرے ملک بھی ہیں مگر وہ کم سے کم جہالت سے دور ہیں۔

انڈیا، آسٹریلیا اور انگلینڈ کی بیک ڈور ڈپلومیسی رنگ لائی۔ بیشتر بورڈز اور آئی سی سی نے زیادہ مزاحمت نہیں کی اور ہتھیار ڈال دیئے۔ اس لیے طے ہوا کہ آئندہ ہونے والی میٹنگ میں آئی سی سی کے ایجنڈے میں بگ تھری کو بھی رکھا جائے۔ مگر وہ صرف اسے ایجنڈے پر رکھنا نہیں بلکہ اسے منظور کرانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہیں دس فل ممبران میں سے سات کے ووٹ درکار تھے اور وہ انہوں نے حاصل کر لیے تھے۔ اب صرف پاکستان، جنوبی افریقا اور سری لنکا اس کے مخالف تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ اگر اس صورت میں بگ تھری منظور کرانے سے یہ تین ممالک بائیکاٹ پر چلے جاتے تو آئی سی سی لازمی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی کیونکہ ان تین ممالک کا کرکٹ میں حصہ چالیس فیصد بنتا ہے اور اگر یہ چالیس فیصد آئی سی سی کے اختیار سے نکل جاتا تو اس کی آمدنی اور دوسرے متعلقہ بورڈز کی آمدنی میں بہت ہی زیادہ کمی واقع ہو سکتی تھی۔

اس لیے بگ تھری کو تمام ٹیسٹ کھیلنے والے ممالک کی منظوری سے بنانا بھی ضروری ہو گیا تھا۔ اصل میں ساری جوڑ توڑ ہی ان تین ممالک کے لیے تھی۔ بگ تھری پلان کی اصل شقوں کی تشہیر سے گریز کیا گیا۔ مگر انہیں چھپانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس کے تین اہم نقاط تھے۔ اوّل تمام بین الاقوامی درجے کے ٹورنامنٹس صرف ان تین ملکوں میں ہوں گے۔ یعنی ایک روزہ عالمی کپ، ٹی ٹوئنٹی عالمی کپ، چیمپنز ٹرافی اور انڈر نائنٹین ورلڈ کپ۔ دوسرا نقطہ آئی سی سی کی گورنر باڈی پر ان تین ملکوں کا کنٹرول ہوگا۔ یہ اپنی مرضی سے کھیل کے قوانین میں تبدیلی کر سکیں گے۔ تمام منصب ان کی مرضی سے کسی کو دیئے جائیں گے۔ ہر طرح کے کرکٹ شیڈول اور تاریخوں کا اختیار ان تین ملکوں کے پاس ہوگا۔ تیسرا سب سے اہم نقطہ آئی سی سی کی اسّی فیصد آمدنی پر یہ تین ملک قابض ہوں گے۔ اور باقی بیس فیصد سات فل ممبران، سینتیس ایسوسی ایٹ ممبران اور ساری دنیا کے ان ملکوں کے حصے میں آئے گا جو کرکٹ کھیلنے میں دل چسپی رکھتے ہیں۔

اس لیے بگ تھری کا یہ دعویٰ کہ بگ تھری بننے کے بعد دوسرے ممالک کو پہلے سے زیادہ رقم ملے گی بالکل غلط ہے۔ کمزور بورڈز کو زیادہ رقوم کا لالچ اس صورت میں دیا گیا کہ بگ تھری ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ سیریز کھیلیں گے اور اس سے ان کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ مگر ان وعدوں کی حقیقت معاہدے کی سیاہی خشک ہونے سے پہلے ہی سامنے آگئی جب انڈیا نے پاکستان کے ساتھ چھ سیریز کے تحریر شدہ معاہدے پر عمل درآمد سے صاف انکار کر دیا ہے۔ دوسری طرف یہی سلوک آسٹریلیا نے بنگلہ دیش سے کیا اور طے شدہ سیریز شروع ہونے سے چند دن پہلے سیکیورٹی کا بہانہ بنا کر منسوخ کر دی۔ حالانکہ بنگلہ دیش نے بگ تھری

ابھی حضرت عیسیٰ کی آمد اور تاریخ کے پہلے دور کی تکمیل میں کئی صدیاں باقی تھیں۔ یاد ش بخیر۔ تاریخ کو عموماً دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک قبل از میلاد مسیح جسے۔ ق۔م۔ کے مختصر اور معروف حروف سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ دوسرا دور بعد از فراق مسیح جسے۔ ع۔ (عیسوی) کے حروف سے پہچان دی جاتی ہے۔ دیگر سنین کی نسبت عیسوی سن کو زیادہ قبول عام کی سند حاصل ہے۔ اس طرح یہ 1015 قبل از مسیح (ق۔م) اور آج سے تین ہزار سال پہلے کا ذکر ہے۔ حضرت سلیمانؑ۔ اہل یہود (بنی اسرائیل) کے تیسرے بادشاہ منتخب ہو چکے تھے۔ ان کے والد حضرت داؤد کا دور گزر چکا تھا اور جب لحن داؤدی کی کوکھ سے شوکت سلیمانی نے جنم لیا تو اس کے آگے جن وانس۔ چرند پرند حتیٰ کہ ہوا نے بھی سر تسلیم خم کر دیا اور امتثال امر کا جوا گلے میں ڈال لیا۔ آہ! آج ہم میں نہ تو لحن داؤدی رہی نہ ہی ہم شوکت سلیمانی کے اہل رہے۔ جو رہے تو صرف ذہنی جمود اور بے عملی کے پیکر بنے رہے۔ جلال و جمال کے بنیادی فقدان نے دین کا رکھا نہ دنیا کا۔ اندھے تعصب اور تنگ نظری نے کنویں کا مینڈک بنا رکھا ہے مگر چند ایک علمائے حق کو چھوڑ کر باقی علماء بھی چاہ زم زم کے مینڈک بنے ہیں۔ تقدس و تحریم کا لبادہ اوڑھے، خضر راہ بننے کے دعوے دار ہیں۔ قلب و نظر کی نعمت سے کلیتاً محروم۔ روشن ضمیری کی لذت سے یکسر نا آشنا۔ سوز دل سے خالی۔ ظاہر پرست علماء کے ہجوم بے نجوم میں علمائے حق کا وجود مسعود بھی گم ہو کر رہ گیا ہے۔ جن کی پہچان ناممکن ہو چکی ہے۔ سو حق کے متلاشی کہاں جائیں۔ کسے راہ نما بنائیں؟ غالب خستہ حال یاد آ گئے ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

پتا نہیں غالب کہاں کہاں یاد آئیں گے۔ حضرت داؤد ہیکل کی صرف بنیاد ہی ڈال پائے تھے۔ جو روایت کے

کے معاملے میں انڈیا کے ساتھ تقریباً غلامانہ رویہ رکھا اور چار چھوٹی ٹیموں میں پہلے بہ ظاہر بگ تھری کی شدید مخالفت کی اور اچانک ہی یوٹرن لیتے ہوئے اس کا حامی ہو گیا۔ یہ اس کا طے شدہ ایکٹ تھا۔

ایسا لگ رہا ہے کہ بنگلہ دیش نے پہلے سے ڈیل کر کے مخالفت کا رویہ اپنایا اور اچانک ہی حامی بن گیا۔ اس سے دوسرے کمزور بورڈز کا حوصلہ جلد جواب دے گیا اور ویسٹ انڈیز اور زمبابوے بھی بگ تھری کے حامی بن گئے۔ مگر اس خدمت کا صلہ بنگلہ دیش کو یہ ملا۔ اس لیے اب

اس کا بھی کوئی امکان نہیں ہے کہ بگ تھری کے ممالک اپنے ان وعدوں کو پورا کریں جو انہوں نے خفیہ طور پر کیے تھے جب کہ وہ کھلے بندوں کیے معاہدوں سے مکر رہے ہیں اور طے شدہ سیریز منسوخ کر رہے ہیں۔ جن کے میچوں کی تاریخیں، مقامات اور دوسرے انتظامات تک مکمل ہیں۔ بنگلہ دیش جیسا لالچ ویسٹ انڈیز کو دیا گیا۔ ویسٹ انڈیز اپنی پوری تاریخ میں پہلی بار کسی آئی سی سی ایونٹ سے باہر ہوا۔ یعنی اگلے سال انگلینڈ میں ہونے والی چیمپنز ٹرافی میں شرکت کا اہل نہیں رہا۔

کیونکہ ون ڈے کی ٹاپ آٹھ ٹیمیں ہی چیمپنز ٹرافی میں شرکت کی اہل ہوتی ہیں اور ویسٹ انڈیز نویں نمبر پر ہونے کی وجہ سے شرکت کی اہل نہیں رہی۔ مگر ویسٹ انڈیز کسی اچھی ٹیم سے ون ڈے سیریز کھیل کر اور جیت کر اچھی پوزیشن میں آسکتی تھی۔ اس موقع پر جب کہ زمبابوے میں پاکستان اور زمبابوے کے ساتھ اس کی ٹرائی سیریز طے ہو گئی تھی۔ مگر پاکستان سری لنکا کو سیریز ہرا کر آٹھویں پوزیشن پر آ گیا تھا۔ تب اس نے ٹرائی سیریز کھیلنے سے انکار کر دیا اور ویسٹ انڈیز کچھ نہیں کر سکی کیونکہ بگ تھری کی حمایت کر کے وہ پہلے ہی اپنے ہاتھ پاؤں کٹوا چکی تھی۔ اس نے انڈیا سے مدد اور دورہ ادھورا چھوڑنے پر معافی مانگی مگر انڈیا نے بے مروتی سے ویسٹ انڈیز کو کورا سا جواب دیا۔ جب کہ ویسٹ انڈیز ٹیم انڈیا کے اکسانے میں آ کر پاکستان سے سیریز کھیلنے سے گریز کرتی رہی ہے اور گزشتہ سات سال میں اس نے صرف ایک بار پاکستان کا دورہ کیا جب کہ اس دوران میں پاکستان نے ویسٹ انڈیز کے دو مکمل دورے کیے۔ پاکستان کے برعکس انڈیا نے خاصے عرصے سے ویسٹ انڈیز کا کوئی دورہ نہیں کیا ہے اور نہ آنے والے سالوں میں اس کے دورے کا امکان ہے۔

مطابق سنگ مرمر کی تھی۔ باقی تعمیر حضرت سلیمانؑ نے مکمل کی۔ حضرت سلیمانؑ جن کی تاریخ پیدائش ایک ہزار تینتیس ق۔م بتائی جاتی ہے۔ ان کا عہد بہت مشہور ہے۔ اکثر بڑے بڑے آدمی ان کا کلام سننے کے لیے یروشلم جاتے تھے۔ ان کے پُرحکمت اقوال۔ عہد نامہ عتیق قدیم میں درج ہیں جو مشعل راہ ہیں۔ تاریخ جہانی کے مطابق جب حضرت سلیمانؑ نے سلطنت کے ضروری امور سے فراغت پائی تو جملہ مطیعان دین وسلطنت کو طلب کیا اور فرمایا کہ ہیکل کی تعمیر کا کام مکمل کرنا اب ہے۔ آپ نے جنات کو حکم دیا کہ تم سب سنگ وخشت، زروجواہر اور ہر رنگ کے فرش بہم پہنچاؤ اور اسباط یعنی امت موسیٰ کے بارہ فرقوں کو مامور کیا کہ تم میں سے ہر ایک فرقہ ایک ایک دیوار تعمیر کرے۔ یوں بارہ دیواریں بنیں۔ روایت ہے کہ ہیکل کو زمین سے چھت تک زیور سے مرصع کیا گیا۔ بارہ برج بنائے گئے جو سونے چاندی اور بیش قیمت جواہرات سے جگمگاتے، سب کی توجہ کا مرکز بنے رہتے۔ ہیکل عربی زبان کا لفظ ہے۔ مونث قاعدے میں مستعمل ہے۔ لغت میں تشریح کچھ یوں ہے کہ وہ لعبت یا صورت جو کسی سیارے کے نام پر بنائی جائے۔ مجاز آسیارے کا بت۔ استھان۔ ستارے کا مندر۔ جیسے ہیکل ماہ۔ ہیکل آفتاب۔ اہل یہود کی عبادت گاہ۔ بڑے جسم کا گھوڑا۔ تعویذ۔ حمائل۔ جنتر۔ تصویر۔ شکل۔ نقشہ، اس کا تلفظ۔ ہے کل۔ ہے اور جمع ہیاکل ہے۔ اسی طرح علم ریاضی میں نو کے ہندسے کو بھی ہیکل کہا جاتا ہے جو سب سے بڑی اور آخری اکائی ہے۔ ہیکل سلیمانی جو آج بیت المقدس کے نام سے مشہور ومعروف ہے یہودی۔ عیسائی۔ مسلمان۔ تینوں کے لیے محترم اور مقدس ہے۔ جسے اہلِ اسلام کا قبلہ اوّل ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔

اقتباس: یادوں کی بستی از محمد ایاز راہی

قارئین کو اندازہ ہوا ہوگا کہ بگ تھری کو منظور کرانے کے لیے کس طرح سازشوں اور ترغیبات کا جال بچھایا گیا۔ سب سے پہلے کمزور بورڈز کو گھیرا گیا اور انہیں ایک ایک کر کے یوں شکار کیا جیسے ہانکے میں آنے کے بعد باری باری جانوروں کو شکار کیا جاتا ہے۔ شکاری نہایت عیار اور چالاک تھے۔ انہوں نے پوری منصوبہ بندی سے کام کیا۔ جب انہیں ووٹ کی مطلوبہ طاقت مل گئی تو وہ کھل کر سامنے آئے اور بگ تھری کے لیے آئی سی سی کی میٹنگ طلب کر لی۔

اس وقت دنیا کو پتا چلا کہ آئی سی سی میں ہو کیا رہا ہے۔ اس خبر نے ایک بھونچال سا برپا کر دیا تھا۔ تقریباً سب کا ردِعمل نہایت مخالفانہ تھا۔ حد یہ کہ وہ بورڈز جو اندرون خانہ ڈیل کر چکے تھے وہ بھی بہ ظاہر اس کے حق میں نظر نہیں آرہے تھے صرف ایک نیوزی لینڈ نے معاملہ کھلتے ہی کھل کر بگ تھری کی حمایت کا اعلان کیا۔ زمبابوے خاموش تھا اور ویسٹ انڈیز نیم رضامند تھا۔ بنگلہ دیش نے انکار اور پھر اقرار کا منافقانہ عمل کیا۔

ایسے میں ساری دنیا کی نظریں پاکستان، جنوبی افریقا اور سری لنکا پر مرکوز ہو گئیں۔ اگر یہ تینوں ڈٹ جاتے تو دنیا کرکٹ کی اخلاقی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہو جاتیں۔ تینوں ملکوں کے بورڈز آپس میں مشورے بھی کر رہے تھے اور ایک مشترکہ حکمتِ عملی کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک ہی سری لنکا نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ صاف ظاہر تھا کہ ایک طرف یہ تینوں آپس میں مشورے کر رہے تھے تو دوسری طرف بگ تھری اپنی سازشوں پر عمل پیرا تھے۔ سری لنکن بورڈ کی کمزور مالی حالت نے اسے مجبور کیا کہ وہ بگ تھری پلان مان لے

اسی صورت میں وہ مستقبل میں ان ملکوں سے کرکٹ کھیل سکتا تھا۔ گاجر اور چھری والا حربہ یہاں بھی کام کر گیا۔ اب میدان میں رہ گئے تھے پاکستان اور جنوبی افریقا۔ پاکستانی بورڈ کے چیئرمین ذکا اشرف نے بگ تھری کی کھل کر مخالفت کی اور وہ آخر تک مخالفت پر ہی ڈٹے رہے۔ ایسے میں اچانک ہی ذکا اشرف، بورڈ کی چیئرمین شپ سے ہٹا دیئے گئے اور ان کی جگہ نجم سیٹھی کرتا دھرتا بن گئے۔

اس تبدیلی نے پاکستان کے مؤقف میں بھی تبدیلی پیدا کی تھی اور پاکستان نے اس صورت میں بگ تھری کو تسلیم کرنے کا عندیہ دیا کہ اسے بھی حصہ دیا جائے۔ مگر بگ تھری اس معاملے پر لچک دکھانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ دوسری طرف جنوبی افریقا جو بگ تھری کا سب سے زیادہ مخالف تھا

اور اس نے کسی صورت اسے تسلیم نہ کرنے کا اعلان کر رکھا تھا اچانک ہی اندرون خانہ چند یقین دہانیوں کے بعد اس کا حامی ہو گیا۔ جنوبی افریقا مالی لحاظ سے مضبوط پوزیشن میں ہے اور اس کی ڈومیسٹک کرکٹ نفع بخش ہے۔ پھر یہ بین الاقوامی کرکٹ سے بھی بہت سے فوائد حاصل کرتا ہے۔ جب نسلی تعصب کی وجہ سے اسے اکیس سال تک بین الاقوامی کرکٹ سے دور رہنا پڑا تو وہ اپنی ڈومیسٹک کرکٹ کے بل بوتے پر رہا اور اس کا معیار اتنا اچھا تھا کہ جب وہ بین الاقوامی مقابلوں میں واپس آیا تو فوراً ہی اسے ایک مضبوط ترین ٹیم کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔

یعنی اسے مالی لحاظ سے دھمکایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے جنوبی افریقا کے معاملے میں بگ تھری نے اپنی حکمت عملی تبدیل کی اور اپنے دوسرے مقصد یعنی تمام تر بین الاقوامی ایونٹس ان تین ملکوں میں ہوں گے۔ انہوں نے جنوبی افریقا کو پیشکش کی کہ وہ ہر کچھ عرصے بعد اسے بھی ایک ایونٹ کی میزبانی دیں گے۔ درحقیقت جنوبی افریقا کو بگ تھری پر سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ انہوں نے سارے ٹورنامنٹس کی میزبانی اپنے لیے وقف کر لی تھی اور اسے کوئی ایونٹ نہیں مل رہا تھا۔ انہوں نے جنوبی افریقا کی دکھتی رگ کو چھیڑا اور وہ مان گیا۔ عالمی کرکٹ کے معاملات میں جنوبی افریقا کو مناسب حصہ ملا ہوا ہے۔ مالی لحاظ سے اسے آئی سی سی کی بہت زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ اس کی کرکٹ ٹیم اتنی مضبوط ہے کہ ہر ٹیم اس سے کھیلنے کی خواہش رکھتی ہے۔ یعنی بگ تھری اسے کسی اور طرح سے مجبور نہیں کر سکتے تھے اور دوسری طرف اسے بگ تھری کے قیام سے کوئی خاص نقصان بھی نظر نہیں آرہا تھا اس لیے وہ کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر مان گیا۔

اب رہ گیا تھا پاکستان تو یہاں بورڈ کا چیئرمین بحال اور معطل ہونے کے ایسے ڈرامے جاری تھے جو سمجھ سے بالاتر تھے۔ بارہ گھنٹے بعد چیئرمین بدل رہے تھے۔ بالآخر آئی سی سی میٹنگ کے وقت اقتدار نجم سیٹھی کے ہاتھ میں آیا اور وہ پاکستان کا مؤقف لے کر آئی سی سی پہنچ گئے۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ پاکستان کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ اگر پاکستان ڈٹا رہا تو وہ عالمی کرکٹ میں اکیلا رہ جائے گا اور اگر مان گیا تو اسے کچھ نہیں ملے گا اور وہ آخری چار چھوٹوں کی صف میں شامل ہو جائے گا۔ مگر اس موقع پر پاکستانی وفد نے کچھ ایسی مہارت سے پاکستان کا مقدمہ پیش کیا اور پاکستان کے بائیکاٹ کے نتائج کی تصویر کشی کی کہ انڈیا ہم سے نہ صرف کھیلنے (نہ کھیلنے کی نیت کے ساتھ) راضی ہو گیا بلکہ پاکستان کو آمدنی میں چوتھا بڑا حصے دار بھی تسلیم کر لیا گیا اور یہی پاکستان کی اصل کامیابی تھی۔ کیونکہ چوتھا حصہ بھی ہمارے اس شیئر سے زیادہ بنے گا جو آئی سی سی پہلے ہمیں دیتا رہا ہے۔ جنوبی افریقا جو اس امید میں تھا کہ اسے چوتھا بڑا بننے کا موقع ملے گا آمدنی میں اس کا حصہ پانچواں بنا۔

یوں کھیلوں کی دنیا کے عجوبے بگ تھری کا قیام عمل میں آیا اور اس کی منظوری ملتے ہی سری نواسن سمیت انگلش اور آسٹریلین بورڈز کے سربراہوں نے ایک طرح سے آئی سی سی پر مکمل غلبہ حاصل کر لیا اور اسے ذاتی بورڈ کی طرح چلانے لگے۔ سب سے پہلے تو آئی سی سی ایونٹس کی میزبانی کی بندر بانٹ ہوئی اور آنے والے دس سالوں میں آپس میں تقسیم کر لی اور ان میں سے کوئی ایک ایونٹ بھی جنوبی افریقا کو نہیں دیا جیسا کہ اس سے وعدہ کیا گیا تھا البتہ اسے تسلی ضرور دی گئی کہ وہ اس کے بعد مختلف عالمی مقابلوں کی میزبانی حاصل کر سکے گا۔ اس میں سے زیادہ تر مقابلے انڈیا کو دے دیے گئے ہیں۔ آنے والے دس برسوں میں انڈیا تین بڑے عالمی مقابلوں کی میزبانی کرے گا۔ انگلینڈ کو دو مقابلے ملے ہیں اور دو ہی مقابلے آسٹریلیا کو ملے ہیں۔ آسٹریلیا اپنے مقابلوں میں سے کچھ شیئر نیوزی لینڈ کو دے گا مگر انگلینڈ اور انڈیا اب تمام عالمی مقابلے مکمل طور پر اپنے ہاں منعقد کریں گے۔

کرکٹ پر گہری نظر رکھنے والے ماہرین خدشہ ظاہر کر رہے ہیں کہ صرف ایونٹس ہی نہیں بلکہ ان کی فتح بھی ان تین ملکوں نے آپس میں تقسیم کر لی ہے۔ جیسے انڈیا میں ہونے والا ورلڈ کپ انڈیا نے جیتا اور آسٹریلیا میں ہونے والا آسٹریلیا کے حصے میں آیا۔ انڈیا میں ہونے والا ٹی 20 ورلڈ کپ اگر انڈیا جیتتا ہے اور آئندہ ایک روزہ ورلڈ کپ جو انگلینڈ میں ہوگا اگر وہ انگلینڈ جیت جاتا ہے تو اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہے گا کہ بگ تھری نے عالمی مقابلوں، آمدنی اور اختیارات کے ساتھ ساتھ فتح بھی آپس میں بانٹ لی ہے۔ آئی سی سی پر کلی غلبے کے بعد یہ کوئی مشکل کام نہیں رہا ہے۔ امپائرز اور ریفری جو اصل میں آئی سی سی کے ملازم ہیں اور ان کی نوکریاں بگ تھری کے اشارہ ابرو کی محتاج ہوں گی وہ فیصلے کرنے میں کیسے آزاد ہوں گے؟ بین الاقوامی مقابلوں میں اب گراؤنڈ اور پچ آئی سی سی کی ذمے داری ہوتی ہے۔ اس کے عملے کو بگ تھری کی مرضی کی وکٹ

بنانے سے کون روکے گا؟ براڈ کاسٹر اور اس کا تکنیکی عملہ جو گرافک کی مدد سے تھرڈ امپائر کی مدد کرتا ہے وہ بھی بگ تھری کے لیے ہی کام کرے گا۔ بورڈز کو خرید لینا اور ان کی ٹیموں کو میچ فکسنگ کے لیے استعمال کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ پچھلے دونوں ورلڈ کپ میں اس کا مظاہرہ بھی ہوا۔ خاص طور سے انڈیا میں ہونے والے چند میچ نہایت مشکوک تھے اور ان کے نتائج پہلے ہی سوشل میڈیا پر آچکے تھے۔ مگر آئی سی سی سکون سے بیٹھی رہی۔ کیونکہ یہ سب اس کی منشا کے مطابق ہو رہا تھا۔ یہ وہی کھیل ہے جو اقوام متحدہ میں سلامتی کونسل کے مستقل ممبران آپس میں طے کر کے کرتے ہیں اور کوئی ایک دوسرے کے معاملے میں مداخلت نہیں کرتا ہے۔ اسی طرح سری لنکا کے ایک اخبار نے سری لنکا میں ہونے والے ایک میچ میں فکسنگ کی رپورٹ ثبوتوں کے ساتھ شائع کی جس میں انڈیا کے سریش رائنا اور چند دوسرے کھلاڑیوں کا نام آیا مگر اس بار بھی آئی سی سی کے اینٹی کرپشن یونٹ کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ جو شاید پاکستانی کھلاڑیوں کی کرپشن پر نظر رکھنے کے لیے بنایا گیا ہے۔

اپنی کرکٹ ریٹنگ اور ریکنگ بڑھانے، اس سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے اور بگ تھری کا راج برقرار رکھنے کے لیے یقیناً بہت لمبی پلاننگ کر لی گئی ہے۔ آپس میں یہ ایک دوسرے کو موقع دے کر کھیلتے ہیں اس کی ایک مثال انڈیا کا آسٹریلیا کا حالیہ ٹور تھا جس میں ایسی پچیں تیار کی گئیں جو آسٹریلیا کے بجائے بھارت کی پچیں زیادہ لگ رہی تھیں۔ ان سلو بیٹنگ پچوں پر آسٹریلیا کے فاسٹ بالرز سر پیٹ کر رہ گئے اور اپنے بورڈ پر برس پڑے تھے۔ اگرچہ انڈیا کو اس سے بہت فائدہ نہیں ہوا اور وہ پھر بھی سیریز دو صفر سے ہار گیا۔ اس کے بعد ون ڈے ٹرائی سیریز میں بھی اسے عبرت ناک شکستوں سے دوچار ہونا پڑا۔ انگلینڈ آسٹریلیا گئی تو ایشز ہار گئی اور جب آسٹریلیا انگلینڈ آئی تو وہ ایشز ہار گئی۔ چند سال پہلے آسٹریلیا انڈیا میں چار صفر کی ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوئی۔ انڈیا کی ون ڈے ریکنگ کم ہوئی تو آسٹریلیا اور انگلینڈ نے انڈیا میں سیریز کھیل کر اسے بہتر بنایا۔ انڈیا نے اس کا صلہ یوں دیا کہ آئی پی ایل میں آسٹریلین کھلاڑیوں کی بھرمار کر دی اور انہیں بے پناہ معاوضوں سے نوازہ۔

بگ تھری کے قیام نے کرکٹ کو ایسے دوراہے پر لاکھڑا کیا ہے جس میں عالمی کرکٹ زیادہ عرصے ایک ہو کر چلتی نظر نہیں آرہی ہے۔ چھوٹے بورڈز کی مالی مشکلات بڑھ جائیں گی اور اگر بگ تھری نے اپنے وعدے پورے کرنے سے گریز کیا جس کے آثار بھی نمایاں ہیں تو جلد چھوٹے کرکٹ بورڈ اور خاص طور سے پاکستان، جنوبی افریقا اور سری لنکا اپنے راستے الگ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس کا امکان ہے کہ یہ تینوں ملک مل کر ایک عالمی کرکٹ لیگ منعقد کریں اور اس کی آمدنی سے اپنی حالت بہتر کریں۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یہ آئی سی سی کو بائی پاس کر کے اپنے ٹورنامنٹس شروع کریں اور انہیں اپنے بل بوتے پر چلائیں۔

وہ ٹیمیں جو آج بہ ظاہر کمزور ہیں جیسے زمبابوے اور بنگلہ دیش۔ ضروری نہیں ہے آنے والے دنوں میں بھی یہ کمزور رہیں۔ خاص طور سے بنگلہ دیش نے ون ڈے سیریز میں یکے بعد دیگرے پاکستان اور بھارت کو شکست دے کر خطرے کی گھنٹی بجا دی ہے۔ ان ٹیموں کی طرف سے اچھے کھیل کے بعد یقیناً ان کی میڈیا اور اسپانسرز کے نزدیک اہمیت اور قیمت بڑھے گی۔ جب یہ سات یا چھ چھوٹے ممالک بگ تھری سے ہٹ کر آپس میں کوئی ٹورنامنٹ کھیلیں گے تو اس کی بہت زیادہ اہمیت ہوگی۔ اسی طرح اگر پاکستان، سری لنکا اور جنوبی افریقا مل کر اپنی پروفیشنل لیگ شروع کریں اور ان کی مقامی فرنچائزکے مل کر ٹورنامنٹ میں شرکت کریں تو اس کے بین الاقوامی ہونے کی بنا پر اس کی کشش یقیناً آئی پی ایل سے زیادہ ہو جائے گی۔ یہ لیگ باری باری تینوں ملکوں میں کرائی جا سکتی ہے۔

انڈیا، آسٹریلیا اور انگلینڈ بگ تھری کے نام پر آئی سی سی پر قبضہ کر سکتے ہیں لیکن وہ ان کرکٹ کھیلنے والے ملکوں کو آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتے۔ اسی طرح وہ دھاندلی سے ٹورنامنٹ جیت سکتے ہیں مگر اپنی دھاندلی کو دنیا سے زیادہ عرصے چھپا نہیں سکیں گے۔ سچ بہر حال کھلتا ہے۔ کہتے ہیں نا کہ آپ بہت عرصے تک بہت سے لوگوں کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ ایسا ہی بگ تھری کے معاملے میں بھی ہو گا۔ ان کا لالچ اور ہوس ہی شاید اس کے خاتمے کی وجہ بن جائے۔ بگ تھری ساجھے کی ہنڈیا ہے جس میں سب زیادہ سے زیادہ حصہ چاہتے ہیں اور ایسی ہنڈیا چوراہوں پر ہی پھوٹتی ہے۔ جلد ان نام نہاد بڑوں کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ کرکٹ میں پیسا ہی سب کچھ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اخلاقی اقدار اصل اہمیت رکھتی ہے۔

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر: 104

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے۔ جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زرو تکی کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرو تکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرو تکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جینس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالتِ مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی ”شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔“ ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچا دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا ”کنور ہوشیار“ سادی کو لے کر چیمبر......“ مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو جیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا جیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کردیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائنائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہے پھر وہ مجھے قید کرکے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا۔ مگر آگے جاکر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کرکے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہوگیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا ”پاپا“ تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کردیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہوگیا۔ ہم آگے چلے جارہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ ڈیزی نے سنبھال لیا۔

کرل نے باسو کو ری پھینک کر بچالیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے میری کنپٹی دبا کر بے ہوش کر دیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے وہاں سے مجھے گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچا دیا، وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو از سرِ نو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریناٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زیرِ لب کہا ''اعلانِ جنگ'' میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنہ کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحہ کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈبھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ تبھی سومرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔ مجھے ملزم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا ابھی نہیں تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقہ زادِ راہ کے علاوہ ایک رہبر کو بھی ساتھ کر دیا۔ پھر مجھے روبیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آ گئے۔ سامیرا نے ملایک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔ ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور روبیر کو اٹھا لے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے کہ ایک ساشا ملی جو گیرٹ کی بیٹی تھی۔ گیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تیاری کر رہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ گو کہ میں سامیرا کے قلعے میں جا نہیں سکتا تھا مگر برف والے کی منشا یہی تھی کہ میں سامیرا کی مدد کروں، میں نے اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور چھاپہ مار جنگ پر تیار ہو گیا۔ آرگون کی فوج نے آ کر سامیرا کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ہم نے فوج کے عقب میں کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان پہنچا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ آرگون میں داخل ہو جاؤں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت شہر میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مرد پر سپاہی تشدد کر رہے ہیں۔ اس مرد، عورت اور بچے کو بچا کر اس کے گھر پہنچایا تھا کہ سپاہیوں کے دوسرے دستے نے مکان کو گھیر کر گھر والوں پر تشدد شروع کر دیا۔

(اب آگے پڑھیں)

آنے والے دو مسلح سپاہی تھے جنہوں نے سرمئی رنگ کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ ان کے ہتھیار اور دوسرا سازو سامان بہت اعلیٰ درجے کا تھا اور وہ خود بھی یقیناً اعلیٰ تربیت یافتہ تھے۔ ان میں سے آگے والے نے آتے ہی مجھ پر نیزے سے وار کیا۔ مگر میں ہوشیار تھا۔ میں ایک طرف ہوا اور نیزہ میری گردن کے پاس سے گزرا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ نیزہ واپس کھینچتا۔ ربیک کا چلایا ہوا تیر اس کی آنکھ میں اتر گیا تھا۔ اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور وہ بے جان ہو کر نیچے گرنے لگا۔ میں نے اس کا نیزہ پکڑا اور اسے الٹی سمت سے دوسرے کے سر پر مارا۔ وہ ربیک کو نشانہ بنانے جا رہا تھا۔ میری ضرب نے اسے گڑبڑا دیا اور ایک لمحے کے لیے اس کی توجہ ربیک سے ہٹی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ربیک نے دوسرا تیر اس کی گردن میں اتار دیا۔ انہوں نے زرہ اور خود پہن رکھا تھا اس لیے ربیک کھلی اور نازک جگہوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ تیر کھا کر اس نے بھیانک آواز نکالی اور نیچے گر کر تڑپنے لگا۔ اسے اذیت سے نجات دلانے کے لیے میں نے نیزے سے اس کے چہرے پر وار کیا اور وہ ایک لمحے میں آخری بار تڑپ کر ساکت ہو گیا۔

مکان کی ساخت ایسی تھی کہ دونوں کمرے آگے پیچھے تھے اور ایک پتلی سی گلی آگے پیچھے کے صحنوں کو ملا رہی تھی۔ آنے والے اسی گلی سے نمودار ہوئے تھے۔ میں نے ربیک کو اشارہ کیا اور وہ سر ہلاتے ہوئے پھرتی سے کمرے کی چھت پر چڑھ گیا۔ چھت آٹھ فٹ اونچی تھی۔ اوپر چڑھنے سے پہلے اس نے کمان شانے پر لگائی اور نیزہ میرے حوالے کر دیا تھا اس لیے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ میں نے گلی میں جھانک کر دیکھا اور بال بال بچا تھا۔ تیر میرے پاس سے گزرا تھا۔ دوسری طرف دشمن کمان لگائے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ہاتھ سے نیزہ سنبھالا اور دوسرے سے دشمن سپاہی کی لاش اٹھائی اور اسے سامنے کر کے آگے بڑھا۔ اسی لمحے ربیک نے اوپر سے کارروائی کی کیونکہ آگے کسی کی لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ مجھ پر چلایا جانے والا دوسرا تیر لاش کے سینے میں اتر گیا۔ اس سے آگے میں نے تیر انداز کو مہلت نہیں دی اور لاش اس پر پھینک کر پہلو سے نیزہ اس کے پیٹ میں اتار دیا۔ اس نے ڈکرانے کی آواز نکالی اور آگے جھکا۔ لاش بدستور ہمارے درمیان تھی۔ اس کا وزن نیزہ پر آیا تو اس کی انی زخم کو پھاڑتی ہوئی

آزاد ہوئی۔ سپاہی اس بار حلق پھاڑ کر چلایا تھا۔

اگلے صحن کا منظر تشویش ناک تھا۔ راٹر ایک طرف دیوار سے ٹکا ہوا تھا اور اس کا ہاتھ پیٹ پر تھا جہاں سے اس کا کرتہ خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ رینور اس کے نزدیک زمین پر ڈھیر تھی اور کسی قدر حرکت کر رہی تھی۔ مارے جانے والے دو سپاہیوں کے علاوہ بھی وہاں دو سپاہی تھے۔ ان میں سے ایک راٹر کی طرف لپک رہا تھا۔ شاید وہ اسے ختم کرنا چاہتا تھا یا ڈھال بنانا چاہتا تھا۔ میں نے رسک نہیں لیا اور عقب سے نیزہ اس کی کمر میں اتار دیا۔ اسی لمحے ربیک کا چلایا ہوا تیر بھی اس کی گدی میں اتر کر دوسری طرف نکل گیا اور وہ اوندھے منہ گر کر ساکت ہو گیا۔ چھٹا جو صحیح سلامت تھا اس نے موقع کی نزاکت بھانپ کر فرار کی کوشش کی مگر میرا نیزہ راستے میں آیا اور وہ رک گیا۔ اس نے اپنا نیزہ پھینک دیا اور تقریباً رونے والے انداز میں بولا۔ ''مجھے مت مارو...... سینتور کے لیے۔''

ربیک اوپر سے گلی میں دیکھ رہا تھا کہ وہاں کوئی اور تو نہیں ہے مگر گلی میں اور کوئی نہیں تھا۔ شاید یہی ایک دستہ آیا تھا۔ اطمینان کرنے کے بعد ربیک اوپر سے کودا۔ ''بس یہی چھ تھے۔''

''یہ ایک زندہ ہاتھ آیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ذرا اس سے پوچھ گچھ کرو۔ جب تک میں ان کو دیکھتا ہوں۔''

میرا اشارہ راٹر اور رینور کی طرف تھا۔ ربیک نے دھکا دے کر سپاہی کو اوندھے منہ گرایا اور اس کا نیزہ اسی کی گدی پر رکھ کر اس سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ میں راٹر کے پاس بیٹھا اور اس کا کرتہ اوپر کر کے دیکھا۔ اس کے پیٹ پر نیزے کا زخم تھا جس سے رہ رہ کر خون ابل رہا تھا۔ میں نے اسی کا کرتہ پھاڑا اور اس کے ایک حصے کی گدی سی بنا کر دوسرے حصے کو پٹی بنا کر اس کے گرد کس کر لپیٹ دیا۔ بہ ظاہر اس کے کسی اہم عضو کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ مگر خون روکنا ضروری تھا۔ اگر خون زیادہ بہہ جاتا تو اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ راٹر نے رینور کی طرف اشارہ کیا۔ ''اسے دیکھو، اس کے سر پر چوٹ آئی ہے۔''

رینور کے سر پر کسی چیز کی ضرب لگی تھی۔ اس کی کنپٹی ہلکی سی متورم تھی مگر وہ ہل رہی تھی یعنی اسے ہوش آنے والا تھا۔ میں اندر آیا کہ پانی لاؤں تو ان دونوں کا بڑا بیٹا کمرے میں کھڑا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ میں نے پانی لیا اور باہر آیا۔ رینور کے منہ اور حلق میں پانی ڈالا تو اسے تیزی سے ہوش آ گیا۔ وہ اٹھ بیٹھی اور پھر راٹر کو زخمی پا کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ میری بات نہیں سمجھتے مگر میں ان کی بات سمجھ سکتا تھا۔ رینور روتے ہوئے راٹر سے اس کی طبیعت کا پوچھ رہی تھی وہ اس کا زخم بھی دیکھنا چاہتی تھی مگر راٹر نے اسے روک دیا۔ ''میں ٹھیک ہوں، ان لوگوں نے ایک بار پھر ہمیں بچا لیا ہے۔''

ان کی طرف سے اطمینان کے بعد میں باہر گلی میں آیا۔ مکان میں خاصا شور شرابا ہوا تھا مگر آس پاس ایسے کوئی آثار نہیں تھے کہ کسی کے کان پر جوں بھی رینگی ہو۔ لوگوں نے یقیناً سنا ہوگا مگر کسی نے باہر نکل کر صورت حال جاننے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی معقول وجہ تھی سرکاری کام میں مداخلت کرنے والے خود مشکل میں پڑ جاتے۔ اس لیے کسی نے مداخلت کرنا تو ایک طرف رہا گھر سے جھانک کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ میں گلی کے سرے تک آیا اور بڑی سڑک پر جھانک کر دیکھا تو مجھے دور سے سرخ وردی میں ملبوس ایک چھوٹا دستہ اسی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں تیزی سے واپس آیا اور ربیک سے کہا۔ ''کچھ اور عام سپاہی اس طرف آ رہے ہیں۔''

وہ فکر مند ہو گیا۔ ''ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

''اس نے کیا بتایا ہے؟''

''اس کا کہنا ہے کہ اس کے دستے کو یہاں چھاپہ مار کر دو عام سپاہیوں کو گرفتار کرنے کا حکم ملا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مکان میں موجود افراد کو گرفتار کرنے کا حکم تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ اگر مزاحمت کی جائے تو سب کو ختم کر دیا جائے۔''

ربیک کی بات سن کر میں نے اطمینان محسوس کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم پر عمومی شک تھا اور ہمارا شمار بھی باغیوں میں کیا جا رہا تھا ورنہ خصوصی دستے کو ہمیں ختم کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ ان کی آمد پر مجھے خدشہ ہوا تھا کہ شاید ہماری باہر سے آمد کا راز کھل گیا ہے اور چھاپہ اسی وجہ سے مارا گیا تھا۔ میرا دھیان ڈیوڈ شا کی طرف گیا تھا۔ مگر اطمینان کے باوجود خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ ہمیں یہاں سے فوری نکلنا تھا۔ راٹر اور رینور مجھے ایک اجنبی زبان بولتے پا کر حیران ہوئے تھے۔ مگر فی الحال وہ ایسی مصیبت میں تھے کہ اپنی حیرت کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ بھی خطرے میں ہیں، انہیں یہاں سے جانا ہوگا۔''

''سنو تم دونوں کو خطرہ ہے۔'' ربیک نے ان سے کہا۔ ''جلد مزید سپاہی آنے والے ہیں ان کی آمد سے پہلے تمہیں نکلنا ہوگا۔ ورنہ وہ تمہیں گرفتار کر لیں گے یا مار دیں

گے۔"

راٹر نے سر ہلایا۔"تم فکر مت کرو ہمارے پاس جگہ ہے۔تم دونوں اب کہاں جاؤ گے؟"

"ہمارے اور ساتھی ہیں ۔ہم ان کے پاس واپس جائیں گے۔"

راٹر اس دوران میں سنبھل گیا تھا۔اس کا خون بہنا رک گیا تھا۔مگر ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بدلا ہوا لگ رہا تھا۔کچھ دیر پہلے وہ دبا ہوا اور سہما ہوا لڑکا تھا مگر اب زخمی ہونے کے باوجود اس کے انداز میں ایک طرح کا اعتماد اور حوصلہ نظر آرہا تھا۔اس نے کہا۔"نہیں آپ ہمارے ساتھ جائیں گے۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟" رینور نے جیسے خبردار کرنے والے انداز میں کہا مگر راٹر نے اسے تسلی دی۔

"یہ ہمارے ہی لوگ ہیں۔کیا یہ لاشیں ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔تم بچوں کو لو۔"

میں چونکا اور ربیک سے کہا۔"ان سے کھل کر بات کریں کیا یہ ریناٹ کے مخالفوں میں سے ہیں؟"

ربیک نے پوچھا تو راٹر نے سر ہلایا۔"ہاں اور میرے بیشتر ساتھی پکڑے جا چکے ہیں۔خوش قسمتی سے میں محفوظ رہا۔"

رینور اندر چلی گئی تھی۔اس کے جاتے ہی راٹر نے اٹھ کر ایک نیزہ اٹھایا اور اچانک ہی عقب سے زمین پر لیٹے سپاہی کی پشت میں عین دل کے مقام پر اتار دیا۔وہ چند لمحے کو تڑپا اور ساکت ہوگیا۔میں نے یا ربیک نے مداخلت نہیں کی۔اس کا انجام بالآخر یہی ہونا تھا اور راٹر کے ہاتھ ہوا تھا اس لیے ہمیں زحمت نہیں کرنا پڑی تھی۔رینور دونوں بچوں کو لے آئی،اس نے ایک نظر مارے جانے والے سپاہی کو دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔شاید اسے بھی علم تھا کہ اس سپاہی کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔ربیک مجھے ایک طرف لے گیا۔"کیا ہم ان پر اعتماد کر سکتے ہیں؟"

"کرنا پڑے گا اس کے سوا ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔"ہمیں جلد از جلد اپنے لوگوں سے رابطہ کرنا ہے۔"

"یہ بتا رہا ہے ان میں سے بیشتر پکڑے جا چکے ہیں۔"

"اس کے باوجود کچھ نہ کچھ بچے ہیں۔جیسے یہ لوگ اور ہمیں ان کی مدد سے باقیوں کو بھی چھڑانا ہوگا۔"

ربیک چونکا اور پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔ہم باہر آئے اور مرکزی شاہراہ سے مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔ایک گلی عبور کرتے ہی راٹر مڑ گیا تھا۔وہ زخمی ہونے کے باوجود تیز چل رہا تھا اور ہم سے آگے تھا۔ہر گلی میں داخل ہونے سے پہلے وہ جھانک کر دیکھ لیتا تھا۔چھوٹے بچے کو رینور نے اٹھا رکھا تھا اور بڑا لڑکا ربیک نے اپنے شانے پر بٹھا لیا تھا۔میں سب سے پیچھے تھا اور پیچھے کا خیال رکھتے ہوئے چل رہا تھا۔میرا خیال تھا کہ راٹر ہمیں عام آبادی کے کسی مکان یا ٹھکانے تک لے جائے گا مگر جب وہ پوش علاقے کے پاس پہنچا اور اس عام آبادی سے جدا کرنے والی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تو میں چونکا اور ربیک کے توسط سے پوچھا۔"تم کہاں لے جا رہے ہو؟"

راٹر نے جواب دیا۔"ہمیں امرا والے حصے میں جانا ہے۔"

"وہاں سارے حکومت کے حامی ہیں۔" ربیک بولا۔

راٹر رک گیا اور اس نے ربیک کی طرف دیکھا۔"سب نہیں ہیں بہت سے ریناٹ کے مخالف بھی ہیں۔آخر کیرٹ بھی تو اس کا مخالف تھا۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" میں نے ربیک سے کہا۔"ہمیں اس پر اعتماد کرنا چاہیے۔"

ربیک نے سر ہلایا اور ہم دوبارہ آگے روانہ ہوئے۔خوش قسمتی سے سپاہی ہمارے پیچھے نہیں آئے تھے یا پھر میں نے جو دستہ دیکھا تھا وہ کہیں اور جا رہا تھا۔راٹر دیوار کے ساتھ چلتے چلتے اچانک رکا اور دیوار کے ساتھ لگی پھولدار جھاڑی میں گھس گیا۔جھاڑی نے دیوار کو اچھی طرح کور کیا ہوا تھا۔چند لمحے بعد اس نے اندر سے سر نکالا اور ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ہم جھاڑی میں گھسے تو نیم تاریکی میں دیوار کی جڑ میں ایک چھوٹا سا خلا نظر آیا راٹر اس سے رینگ کر دوسری طرف جا رہا تھا۔بظاہر یہ پانی کی نکاسی کا سوراخ تھا جسے ذرا بڑا کر لیا گیا تھا۔یہ دو فٹ چوڑا اور زمین سے کوئی ایک فٹ اونچا تھا۔راٹر کے بعد ربیک گیا۔رینور نے چھوٹا بچہ اسے پکڑایا اور خود گئی اس سے پہلے اس کا بڑا بیٹا دوسری طرف گیا تھا۔سب سے آخر میں میں دوسری طرف نکلا۔مٹی سے رگڑ کھا کر ہمارے لباس خراب ہوئے تھے مگر اس وقت کسی کو لباس کا ہوش نہیں تھا۔میں نے ربیک کے توسط سے پوچھا۔

"اب کتنی دور جانا ہے؟"

"زیادہ دور نہیں ہے۔" راٹر نے جواب دیا۔میں

نے اشارے سے اسے روک لیا۔
''تمہیں بتایا تھا کہ ہمارے ساتھی بھی ہیں۔''
''اگر وہ کسی محفوظ جگہ ہیں تو ان کی فکر مت کرو ورنہ ان کو بھی اسی جگہ بلوا لیں گے۔'' راٹر نے کہا اور چلنے لگا۔ چند منٹ بعد ہم ایک خاصے بڑے اور سرخ رنگ میں رنگے مکان کے سامنے تھے۔ یہاں آس پاس کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ راٹر نے آگے بڑھ کر لکڑی کے گیٹ پر دستک دی۔ فوراً گیٹ میں ایک چھوٹی کھڑکی کھلی اور وہ سرگوشیوں میں کسی سے بات کرنے لگا۔ اس گفت و شنید کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک منٹ بعد گیٹ میں چھوٹا دروازہ کھلا اور راٹر نے پلٹ کر ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اندر جاتے ہوئے میرے ذہن میں چند لمحے کے لیے خدشہ آیا تھا۔ بہ ظاہر تو دونوں راٹر ریناٹ مخالف گروہ سے تعلق رکھتا تھا اس نے کیرٹ کا حوالہ بھی دیا تھا۔ مگر انسان کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے بعض اوقات انسان خود کو بھی دھوکے میں رکھتا ہے۔ دوسروں کو دھوکا دینا تو بہت عام سی بات ہے۔ ہم اندر آئے یہ خاصا بڑا احاطہ تھا جس کے وسط میں بڑا سا کوٹھی نما مکان تھا۔ ہم راٹر کی رہنمائی میں اندر آئے۔ وہ ہمیں ایک کمرے میں لے آیا۔

''آپ سب بیٹھیں۔'' اس نے فرش پر بچھے عمدہ قالین کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔''

رینور بھی بچوں کے ساتھ ہمارے ساتھ ہی تھی۔ میں اور ربیک قالین پر بیٹھ گئے مگر ہم نے اپنے ہتھیار ساتھ ہی رکھے تھے۔ رینور اپنے بچوں کو سمیٹ کر بیٹھی ہوئی تھی اور وہ مطمئن نظر آرہی تھی۔ اس نے جس طرح راٹر کو ٹوکا تھا اس سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ پوری طرح شامل تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ دونوں کم عمر میاں بیوی اپنے گھر اور بچوں کے ساتھ یہ بھاری ذمے داری بھی اٹھائے ہوئے تھے۔ وہاں ایک طرف مٹی کے صراحی نما جگ میں پانی اور مٹی کے ہی پیالے رکھے تھے۔ مجھے پیاس لگی تھی مگر میں نے احتیاطاً پانی سے گریز کیا۔ کچھ دیر بعد رینور کے بیٹے نے پانی مانگا تو اس نے اسے جگ سے پانی نکال کر دیا اور جب اس نے پی لیا تو میں نے اور ربیک نے بھی طلب کیا۔ میں نے پیالہ ختم کیا تھا کہ راٹر ایک شخص کے ہمراہ اندر آیا اور میں اسے دیکھ کر چونکا جیسے وہ مجھے دیکھ کر چونکا تھا۔ یہ شاہی قید خانے کا نگران لمبا تڑنگا اور خوش رو جوان تھا۔ اس نے دوران قید میرے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ ''تم......؟''

راٹر چونکا۔ ''آپ انہیں جانتے ہیں۔''
نگران نے سر ہلایا۔ ''بہت اچھی طرح اور تم بالکل صحیح آدمی کو لے کر آئے ہو۔''

وہ اور راٹر میرے سامنے قالین پر بیٹھ گئے۔ میں نے ربیک کے توسط سے کہا۔ ''میرا خیال نہیں تھا کہ تم بھی ریناٹ کے مخالفوں میں سے ہو گے؟''

''تقریباً پورا آرگون سوائے ایک مخصوص ٹولے کو چھوڑ کر ریناٹ کا مخالف ہے مگر اس کی قوت اور جبر کے آگے مجبور ہیں۔'' نگران نے جواب دیا۔ ''میرا نام انسار ہے۔''

''میرے بارے میں تو تم جانتے ہو گے۔ یہ ربیک ہے اور میرے ساتھ ایک درجن افراد اور بھی ہیں۔''
''وہ کہاں ہیں؟''
''فی الحال وہ ایک محفوظ جگہ ہیں۔'' میں نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔ ربیک نے ترجمان کی ذمے داری سنبھال لی تھی اور اپنے طور پر کچھ کہنے سے گریز کر رہا تھا۔ انسار سمجھ گیا اس نے دوبارہ پوچھنے سے گریز کیا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ ایک اہم سرکاری عہدہ رکھنے والا بھی کیرٹ کے ساتھیوں میں سے تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ اس قید خانے کا نگران تھا جہاں ہمارے ساتھی قید کیے گئے تھے۔ اگر کوئی فرد اس شہر میں مجھے سب سے زیادہ بہتر انداز میں صورتِ حال سے آگاہ کر سکتا تھا تو وہ انسار ہی تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا راٹر اسے اپنی روداد سنانے لگا کہ اس پر کیا گزری اور وہ کیسے ہمیں لے کر یہاں پہنچا۔ انسار یہ سن کر فکر مند ہو گیا کہ راٹر کے مکان پر چھ خاص سپاہ کے آدمی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ اس نے کہا۔

''اب وسیع پیمانے پر تم سب کی تلاش شروع ہو جائے گی۔''

میں جانتا تھا کہ ایسا ہی ہوگا اور اب مجھے باغ میں رکے اپنے ساتھیوں کی فکر ہوئی۔ اسی وقت انسار نے مجھ سے کہا۔ ''تمہارے ساتھیوں کا یہاں آنا ضروری ہو گیا ہے فی الحال اس شہر میں میرے گھر سے زیادہ محفوظ جگہ اور کوئی نہیں ہے۔''

میں نے اسے نظر جما کر دیکھا۔ ''تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''کیونکہ یہاں ہمارے تین ٹھکانے ہیں مگر ان میں سے کسی پر چھاپہ نہیں مارا گیا لیکن عام آبادی کا ہر ٹھکانہ

حکومت کا نشانہ بنا ہے۔"

یہ سنتے ہی میرے اندر جیسے گھنٹی سی بجنے لگی۔ "تمہارا مطلب ہے ہر ٹھکانہ جہاں رینانٹ کے مخالف موجود تھے؟"

انسار نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہر ٹھکانہ، کوئی جگہ نہیں بچی، صرف وہی بچ سکے جو اس وقت وہاں نہیں تھے۔"

"اور وہ تمام افراد اس وقت یہاں پوش علاقے میں ان تین ٹھکانوں پر ہیں؟" میں نے اگلا سوال کیا۔

"بالکل ان تین ٹھکانوں پر سو کے قریب لوگ ہیں اور یہاں حکومت نے چھاپہ نہیں مارا۔"

"وہ اب چھاپہ ماریں گے۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "ہمیں فوری یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

ربیک نے میری بات کا ترجمہ کیا تو انسار پریشان ہو گیا۔ "کیا کہہ رہے ہو، یہاں کیوں چھاپہ پڑے گا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو؟ جو لوگ عام آبادی میں مخالفوں کے ایک ایک ٹھکانے سے واقف ہوں وہ پوش آبادی میں ان کے ٹھکانوں سے بے خبر ہو سکتے ہیں۔"

"وہ یقیناً واقف نہیں ہیں۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ وہ صرف انتظار کر رہے ہیں کہ سب یہاں جمع ہو جائیں تو وہ ایک ساتھ سب کو لے جائیں۔" میں نے ربیک اور راٹر کی طرف دیکھا۔ "ہمیں فوری یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

"انسار اب کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ "تم کہاں جاؤ گے؟"

"میرے پاس ایک ٹھکانا ہے۔ ہم صبح ہونے سے پہلے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "انسار تمہارے ساتھ جو آدمی ہیں وہ میرے حوالے کر دو، ورنہ وہ سب پکڑے جائیں گے اور تمہارے خلاف ثبوت بن جائیں گے جب حکومت کو تمہارے پاس سے کوئی غیر متعلق آدمی نہیں ملے گا تو تم خود بہ خود بے گناہ بن جاؤ گے۔"

انسار نے اپنی پیشانی رگڑی۔ "تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔"

"میں نے بروقت خبردار کر دیا ہے۔ تم حکومت میں ہو لیکن اس سے بے خبر ہو کہ اس وقت رینانٹ کا دماغ ایک ایسا شخص بنا ہوا ہے جس کی سازشوں سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ وہ اس سارے کھیل کے پیچھے ہے۔"

انسار نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سر ہلایا۔ "میں تیار ہوں لیکن تم ان آدمیوں سے کیا کام لو گے؟"

"میں سب سے پہلے قید خانے سے باقی افراد کو آزاد کراؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔"

اتنی دیر میں انسار موقع کی نزاکت کو پوری طرح محسوس کرنے لگا تھا اور وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد ربیک نے راٹر کا زخم دیکھا۔ اس سے خون بہنا بند ہو گیا تھا مگر وہ فی الحال حرکت کے قابل نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "تمہیں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ یہیں رہنا ہوگا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "سپاہی میری تلاش میں بھی ہوں گے۔"

"تم اس قابل نہیں ہو کہ کسی سرگرمی میں حصہ لے سکو اور رینور عورت ہے بچے بھی ساتھ ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم سمجھو جنگ پر نکل رہے ہیں اور آنے والے وقت کا کچھ پتا نہیں ہے۔"

راٹر فکر مند ہو گیا۔ "اس کے علاوہ تو ہمارے پاس کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔"

"انسار سے بات کرو شاید اس کے پاس ایسی کوئی جگہ ہو جہاں وہ تم سب کو چھپا سکے۔"

انسار کچھ دیر بعد اندر آیا اور اس نے کہا۔ "میں نے تینوں ٹھکانوں سے آدمی بلوا لیے ہیں۔"

"ہم ہجوم لے کر نہیں جا سکتے ہیں۔" میں نے اس سے کہا۔ "دوسرے سب کو پوری طرح مسلح اور لڑائی کے لیے تیار ہونا چاہیے۔"

انسار نے سر ہلایا۔ "میں نے کہہ دیا ہے۔" اس نے کہتے ہوئے راٹر کی طرف دیکھا۔ "اب مجھے اسے اور اس کے بیوی بچوں کو چھپانے کا انتظام کرنا ہے۔ یہ تمہارے ساتھ نہیں جا سکتے۔"

میں نے اطمینان محسوس کیا۔ "یہی میں کہہ رہا ہوں کہ یہ ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے۔"

"تم بتاؤ کہ ان لوگوں کو کہاں بھیجنا ہے میں انہیں ٹولیوں کی صورت میں روانہ کر دوں۔"

میں نے ربیک کی مدد سے انسار کو بتایا میرے ساتھی کہاں مقیم ہیں لیکن پہلے میرا جانا لازمی تھا ورنہ غلط فہمی ہونے کی صورت میں ہم آپس میں ہی لڑ پڑتے۔ انسار کو سمجھا کر میں نے کہا۔ "ہمیں سب سے پہلے قید خانے پر حملہ کرنا ہے اور وہاں قید اپنے ساتھیوں کو چھڑانا ہے۔ یہ بتاؤ کہ وہاں حفاظتی انتظامات کی کیا پوزیشن ہے؟"

''بہت سخت۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہاں رینانٹ کا خاص دستہ لگا ہوا ہے اور مجھے میرے عملے سمیت وہاں سے ہٹا دیا ہے۔''

میں نے حفاظتی انتظامات کا جو احوال لیا اس کے مطابق قید خانے پر تقریباً سو افراد پر مشتمل ایک دستہ تعینات تھا۔ یہ رینانٹ کے خاص دستے کے سپاہی تھے۔ انسار کا کہنا تھا کہ اس دستے میں سپاہیوں کی تعداد ایک ہزار سے اوپر تھی اور عملاً آرگون ان کے سپرد تھا۔ عام سپاہ میدانِ جنگ میں جا چکی تھی یا پھر فصیلوں تک محدود تھی مگر اس کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ وقت کم تھا اس لیے میں انسار سے زیادہ سوالات نہیں کر سکا۔ اس سے پہلے میرا خدشہ درست نکلتا ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ اگر میرا خدشہ غلط بھی تھا اور رینانٹ کے آدمی انسار اور باقی دو پوش علاقے کے ٹھکانوں سے بے خبر تھے تب بھی ہمارا حرکت میں آ جانا ضروری تھا۔ ہمارے پاس انتظار کرنے کے لیے نہ تو وقت تھا اور نہ ہی وسائل تھے۔ ہمیں میدان جنگ سے دور آئے ہوئے ایک دن سے زیادہ وقت گزر گیا تھا اور ہم وہاں کے حال سے بے خبر تھے۔ انسار صرف اتنا جانتا تھا کہ ابھی جنگ شروع نہیں ہوئی ہے۔ یہ سن کر میں نے اچھا محسوس کیا تھا۔ جنگ میں جتنی تاخیر ہوتی ہمارے لیے اتنا ہی اچھا تھا۔ البتہ سامیرا کی فوج کو چھوٹی موٹی چھاپہ مار کارروائیاں کرتے رہنی چاہیے تھی۔

انسار کے گھر سے روانہ ہوتے ہوئے میرا ذہن کئی سمتوں میں الجھا ہوا تھا۔ شہر میں گزشتہ روز ہونے والی چھاپہ مار کارروائی سے ظاہر تھا کہ ان کی پوری مخبری کی گئی تھی۔ سوال یہ تھا کہ مخبری آرگون کے اندر سے کسی نے کی تھی یا پھر سامیرا کے نزدیک موجود کسی غدار کا کام تھا۔ مگر آرگون میں موجود ان دستوں کے بارے میں زیادہ لوگ نہیں جانتے تھے۔ ان کا اصل انچارج بیناٹ ہے۔ کچھ غور کرنے کے بعد مجھے لگا کہ غدار آرگون کا کوئی فرد تھا جو باغیوں کے ساتھ تھا اور موقع پا کر اس نے انہیں پکڑوا دیا۔ میں اور ربیک انسار کے گھر سے نکل کر اسی راستے سے عام آبادی میں داخل ہوئے جہاں سے راتڑ ہمیں لے کر آیا تھا اور پھر ہم اس باغ کی طرف بڑھے جہاں میں باقی سب کو ٹھہرا کر آیا تھا۔ ہم جان بوجھ کر تاریک گلیوں سے گزر رہے تھے۔ ربیک نے کہا۔ ''راتڑ کا ملنا اچھا ثابت ہوا۔''

''ہاں ہم جس مقصد کے ساتھ یہاں آئے تھے وہ حاصل ہو گیا ہے اور اب ہمیں اپنے اصل منصوبے پر عمل کرنا ہے۔''

''ہم کُل ایک درجن ہیں اور انسار کے پاس اب سو آدمی رہ گئے ہیں کیا اتنے لوگ قید خانے پر حملے کے لیے کافی ہوں گے؟''

''اگر کوشش کی جائے تو کافی ہو سکتے ہیں۔ ہمیں اپنا منصوبہ اچھی طرح تیار کرنا ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اگر ہم کامیاب ہو جاتے ہیں اور قید خانے سے اپنے لوگوں کو چھڑا لیتے ہیں تب بھی ہماری تعداد پانچ سو سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس صورت میں رینانٹ کا خاص دستہ بھی ہم سے دوگنا بڑا ہوگا۔''

ربیک کا انداز بحث کرنے والا نہیں تھا اور نہ ہی وہ خوفزدہ تھا۔ میں اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا اس لیے نرمی سے جواب دیا۔ ''تعداد کبھی میدانِ جنگ کا فیصلہ نہیں کرتی ہے۔ تم لوگ جنگ سے نا آشنا ہو لیکن یہاں سے باہر کی دنیا کے لیے جنگ انوکھی شے نہیں ہے۔ وہاں لاتعداد بار ایسا ہوا ہے کہ دس گنا کم فوج نے فتح حاصل کی اور جو دس گنا زیادہ تھے وہ شکست خوردہ ٹھہرے۔ اصل اہمیت حوصلے، دلیری اور حکمتِ عملی کی ہے۔ وہی فوج کامیاب ہوتی ہے جو ان تین شعبوں میں بہتر ہو۔''

''آپ جانتے ہیں ہمارا حوصلہ بلند ہے اور ہم لڑنے مرنے کے لیے تیار ہیں۔''

''باقی رہی حکمتِ عملی تو یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ اللہ نے چاہا تو ہم انہیں شکست دیں گے۔''

اس گفتگو کے دوران ہم باغ کے نزدیک پہنچ گئے اور محتاط ہو گئے۔ میرے ذہن میں تھا کہ ممکن ہے میرے ساتھی پکڑے گئے ہوں اور باغ میں اس وقت رینانٹ کے آدمی ہمارا انتظار کر رہے ہوں۔ اس لیے ہم خاموشی سے اور تاریکی کا سہارا لیتے ہوئے اس کی چار دیواری تک پہنچے۔ ربیک نے اندر جھانکا اور ہلکی سی پرندے والی آواز نکالی۔ اس کا فوری ردِعمل ہوا اور اندر سے بھی ایسی ہی آواز آئی۔ چند لمحے بعد ایرٹ نمودار ہوا اور ہمیں دیکھتے ہی اس نے شکوہ کیا۔ ''آپ لوگ تو ایسے گئے کہ بس، یہاں ہم سب کا دم خشک ہو رہا تھا۔''

''ہمیں دیر ہوئی ہے۔'' ربیک نے کہا۔ ''لیکن ہم کامیاب لوٹے ہیں۔''

''کیا ہوا ہے؟'' ایرٹ بے تاب ہو گیا۔

''آرام سے۔'' میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟''

''ایک بار ہوا تھا۔'' ایرٹ نے کہا۔ ''چند عام سپاہی یہاں آ گئے تھے اور ساشا نے آواز نکال کر انہیں متوجہ کر لیا مجبوراً ہمیں ان سب کا خاتمہ کرنا پڑا۔''

''ان کی لاشیں؟''

''وہ ہم نے ایک نزدیکی خالی گھر میں ڈال دیں۔ کسی نے نہیں دیکھا اور نہ ہی ان کی تلاش میں مزید کوئی آیا۔''

ہم اندر آئے تو ساشا اس حالت میں پڑی تھی کہ ہاتھ پاؤں کے ساتھ ساتھ اس کا منہ بھی بند تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ ہماری اتنی مخالف کیوں ہو رہی تھی۔ اس کے باپ کا قاتل تو ریناٹ تھا۔ اسی نے کیرٹ کو سولی پر لٹکایا تھا مگر وہ اس کی طرفداری کر رہی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھا اور اس کے منہ سے کپڑا نکالا۔ ''تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟''

''یہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا اور جب آئے گا تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔''

''تم کیا سمجھتی ہو کہ اگر ہمارے پاس سے چلی جاؤ گی تو ریناٹ یا اس کے آدمی تمہیں بخش دیں گے؟''

''میں نہیں جانتی میں بس یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔''

وقت نہیں تھا اس لیے میں نے مزید بحث سے گریز کرتے ہوئے ساشا کا منہ بند کر دیا اور ربیک کی مدد سے سب کو آنے والی صورت حال پر بریف کیا۔ وہ یہ سن کر پُر جوش ہو گئے کہ سو کے قریب افراد مزید ہمارے ساتھ شامل ہونے والے تھے۔ پھر میں نے بتایا کہ ہمیں قید خانے پر حملہ کر کے باقی ساتھیوں کو چھڑانا ہے کیونکہ ان کے بغیر ہم آرگون میں مزید جدوجہد نہیں کر سکتے تھے۔ خلاف توقع یہ سن کر وہ زیادہ پُر جوش ہو گئے تھے۔ دوسروں کی آمد کسی وقت بھی متوقع تھی اس لیے ہم سب ہوشیار ہو گئے۔ اس کا امکان تھا کہ ان کے پیچھے ریناٹ کے آدمی بھی چلے آئیں۔ آرگون جیسے چھوٹے شہر میں سو افراد کا چھپ کر حرکت کرنا آسان نہیں تھا۔ خاص طور سے جب شہر میں ہنگامی حالات نافذ ہوں اور جگہ جگہ فوج موجود ہو۔

میں اور دو افراد باغ میں رہے اور باقی آس پاس پھیل گئے تاکہ نگرانی کر سکیں۔ پہلی ٹولی ہماری آمد کے مشکل سے پندرہ منٹ بعد نمودار ہوئی اور باغ کی طرف آئی۔ وہ عام لباس میں لیکن پوری طرح مسلح تھے۔ ربیک نے ان سے سوال کیا کہ انہیں کس نے بھیجا ہے۔ انہوں نے انسار کا نام لیا تو انہیں باغ میں آنے کی اجازت دے دی مگر ان سے کہا کہ وہ اپنا اسلحہ ایک طرف ڈالتے جائیں۔ انہوں نے بلا چوں چرا حکم کی تعمیل کی۔ اپنا اسلحہ ایک طرف ڈال کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ٹولیوں کی مسلسل آمد شروع ہو گئی۔ سب اپنا اسلحہ جمع کراتے رہے اور ایک طرف بیٹھتے رہے۔ میں نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ سوچ کے اعتبار سے یہ لوگ بہت سادہ ہیں۔ یہ جلدی اعتبار کر لیتے ہیں اور بلاوجہ شک نہیں کرتے ہیں۔ ممکن ہے ہماری دنیا میں یہ سب اتنی آسانی سے نہ ہوتا۔ نہ انسار مجھ پر اعتماد کرتا اور نہ اس کے آدمی اتنی آسانی سے ہم پر اعتبار کر کے اپنا اسلحہ ہمارے حوالے کرتے۔

میں آنے والوں کو گن رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد بانوے تک پہنچ گئی تھی اور اس کے بعد ان کی آمد رک گئی۔ ربیک کی مدد سے میں نے ... ان سے معلوم کرایا کہ ان میں کوئی اجنبی تو نہیں ہے وہ سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟ سب کی ہی کسی نے کسی نے تصدیق کی کہ وہ ان میں سے ہے۔ پھر میں نے مزید آنے والوں کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ ان میں مزید پندرہ کے قریب ساتھی تھے جنہیں آنا تھا۔ مگر پندرہ کے بجائے مزید دس افراد ہی آئے تھے اور پانچ افراد نہیں آئے حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔ یہ سارا عمل تقریباً دو سے ڈھائی گھنٹے میں مکمل ہوا تھا۔ ایک سو دو افراد آئے تھے اور اب ہماری تعداد ایک سو پندرہ ہو گئی تھی۔ آخری فرد ساشا تھی مگر عملاً وہ دشمن بنی ہوئی تھی۔ آنے والے افراد میں آرگیو نامی شخص تھا۔ وہ یہاں باغیوں کا سربراہ تھا۔ وہ اپنے پانچ نہ آنے والے ساتھیوں کے بارے میں فکر مند تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ ریاست کے آدمیوں کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ وہ ان کے بارے میں سب سے پوچھتا رہا تھا۔

''وہ الگ نکلے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں وہ سب مختلف ٹولیوں کے ساتھ تھے اور راستے میں کہیں رہ گئے۔''

''میرا خیال ہے وہ کسی غلطی سے نہیں بلکہ جان بوجھ کر رہ گئے۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ ٹولی سے بچھڑنا کس طرح ممکن ہے۔''

آرگیو چونکا۔ ''تمہارا مطلب ہے وہ غدار ہیں۔''

''اگر غدار نہیں ہیں تب بھی بزدل ضرور ہیں وہ جنگ سے جان بچا رہے ہیں۔''

میرا آرگیو سے تعارف ہوا تھا اور وہ کسی حد تک مجھ

سے واقف تھا۔ روشنی ہونے کے بعد ہم باغ کے اندرونی حصے میں آگئے تھے تاکہ باہر سے ہماری جھلک بھی نظر نہ آئے۔ نگرانی کے لیے تیس پینتیس افراد کو لگا دیا گیا تھا۔ ان میں سے کچھ بلند درختوں پر چڑھ کر آس پاس نظر رکھے ہوئے تھے اگر کوئی اس طرف آتا تو ان کی نظروں سے بچ نہیں سکتا تھا۔ میں آریگو سے آرگون کی صورت حال جاننے لگا۔ اس نے بتایا کہ چھاپے ایک ہی وقت میں اور اتنے اچانک مارے گئے تھے کہ اس وقت اپنے ٹھکانوں پر موجود سارے ہی حریت پسند پکڑے گئے تھے۔ صرف وہی بچے تھے جو باہر تھے۔ چند ایک فرار ہونے میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے ہی آریگو اور باقیوں کو خبردار کیا تھا۔ چھاپوں میں مزاحمت کرنے پر سو سے زیادہ حریت پسند مارے گئے تھے۔ پکڑے جانے والوں میں سے کئی شدید زخمی تھے۔ میں نے آریگو سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے اگر انہیں چھڑانے کی کوشش کی جائے تو کامیابی کا کیا امکان ہے؟''

آریگو تقریباً پینتیس سے چالیس برس کا مضبوط جسم والا آدمی تھا اس کے لمبے سنہری بال شانوں سے بھی نیچے تک آرہے تھے۔ اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ ''بہت کم امکانات ہیں سمجھو لو خودکشی کے مترادف ہوگا۔''

''ہمیں یہ کام کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ان پانچ سو افراد کے بغیر ہم ریناٹ اور اس کے آدمیوں پر قابو نہیں پا سکتے ہیں۔''

آریگو کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تم اتنی دور کا سوچ رہے ہو؟''

''میں اسی لیے یہاں آیا ہوں۔ تم فکر مت کرو میں جانتا ہوں کہ ایسے مشکل کام آسانی سے کس طرح ہوتے ہیں۔ مگر اس کے لیے ضروری ہے میں جیسا کہوں تم ویسا ہی کرو گے۔''

آریگو کا چہرہ سپاٹ ہو گیا۔ ''ہمیں سامیرا کی طرف سے ایسی کوئی ہدایت نہیں ملی ہے۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کیا تم میری حیثیت سے بے خبر ہو۔ میں سامیرا سمیت قلعوں میں موجود ہر فرد کا سربراہ ہوں۔ اس کی تصدیق یہ لوگ کر سکتے ہیں جو میرے ساتھ آئے ہیں۔''

ایرٹ اور ربیک نے میری تائید کی۔ ''شہباز ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ سب کے سربراہ ہیں۔''

آریگو کی آنکھوں میں شک نظر آنے لگا۔ ''ایسا کیسے ممکن ہے کہ باہر سے آنے والا ایک فرد ہمارا سربراہ بن جائے۔''

''یہ برف والے کے حکم سے ممکن ہوا ہے۔'' ربیک بولا۔ ''کیا تم برف والے کا حکم ماننے سے انکار کر سکتے ہو؟''

آریگو نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''کیا تمہیں کیرٹ یا یہاں موجود کسی اور اہم فرد نے نہیں بتایا ہے؟''

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''اگر ایسا ہوتا تو میں حکم کی تعمیل کرتا، تم سے بحث کیوں کرتا؟''

یہ ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے تم مجھے سربراہ نہیں سمجھ رہے ہو لیکن میری تجویز پر تو غور کر سکتے ہو۔ تم سوچو کہ ان سوا سو افراد کے ساتھ ہم کیا کر لیں گے۔ بلکہ کچھ وقت گزرے گا تو ہمیں اپنے کھانے کی فکر پڑ جائے گی کیونکہ ہمارے پاس خوراک نہیں ہے اور تم لوگ بھی خالی ہاتھ آئے ہو۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ہم ان سوا سو افراد کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتے۔''

''اس لیے پہلے ہمیں قید خانے میں موجود اپنے ساتھیوں کو چھڑانا ہوگا۔''

''یہ ممکن نہیں ہے، وہاں سخت پہرہ ہے۔ ریناٹ کے خاص دستے وہاں لگے ہیں اور ان سے لڑنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔''

''ہم کل سے اب تک اسی خاص دستے کے دس افراد کو ٹھکانے لگا چکے ہیں۔'' ربیک نے کہا۔ ''ہمارا ایک آدمی بھی زخمی نہیں ہوا۔ اس سے پہلے ہم شہر سے باہر درجنوں سپاہیوں کو ہلاک کر چکے ہیں اور ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا۔''

''یہ اتنے تربیت یافتہ بھی نہیں ہیں جتنا کہ تم سمجھ رہے ہو۔'' ایرٹ بولا۔ ''لگتا ہے تم ان سے مرعوب ہو؟''

آریگو کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''یہ جھوٹ ہے میں ان سے ڈرتا نہیں ہوں۔''

''تم ڈرتے نہیں ہو لیکن کچھ کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہو۔''

''ہم سامیرا کی فوج کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب وہ باہر سے حملہ آور ہوگی تب ہم اندر سے ریناٹ کے آدمیوں پر حملہ کریں گے۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تم سے کس نے کہا کہ سامیرا کی فوج یہاں حملہ کرے گی؟ وہ تو خود ریناٹ کی فوج کے محاصرے میں ہے اور مدافعتی جنگ لڑ رہی ہے۔''

آرگیو کے چہرے پر ایک بار پھر شک کے آثار نظر آئے اس نے کہا۔ ”لیکن وہاں سے جو اطلاعات آئی ہیں ان کے مطابق سامیرا کی فوج کھل کر ریناٹ کی فوج پر حملے کر رہی ہے اور جلد اسے پسپا کرتی ہوئی آرگون تک پہنچ جائے گی۔“

آرگیو کی بات چونکانے والی تھی۔ ”تم تک یہ اطلاع کیسے پہنچی، انسار نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔“

”انسار صرف ہمارا مددگار ہے اسے ہر بات کا علم نہیں ہوتا ہے۔“

”تم تک یہ اطلاع کب آئی؟“

”کل شام۔“ اس نے جواب دیا۔ اس وقت ہم ٹیلے پر وقت گزاری کر رہے تھے اور ہمیں قلعوں سے دور نکلے تقریباً سترہ اٹھارہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ اتنی جلدی وہاں صورتِ حال میں تبدیلی آئی تھی کہ سامیرا کی فوج ریناٹ کی فوج پر جارحانہ حملے کر رہی تھی اور جلد وہ آرگون تک پہنچنے والی تھی۔ یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ ٹھیک ہے سامیرا کی فوج پہلے سے زیادہ بہتر حالت میں تھی اور اس میں لڑنے والوں کی تعداد اور استعداد میں بھی اضافہ ہوا تھا مگر ریناٹ کی فوج تعداد میں اس سے زیادہ اور یقیناً بہتر تربیت یافتہ تھی۔ اس کے پاس اسلحہ بھی بہتر اور کہیں زیادہ تھا۔ اگرچہ فصل کے جلنے سے ریناٹ کا ابتدائی پروگرام کسی حد تک متاثر ہوا ہوگا مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس کے پاس خوراک نہیں رہی تھی۔ آرگون میں موجود خوراک کے ذخیرے یقیناً کہیں زیادہ تھے بہ نسبت سامیرا کے قلعوں میں موجود خوراک کے ذخائر کے۔

ریناٹ اب بھی مدافعتی جنگ کو ترجیح دیتا اور اگر اسے سارے سرما بھی محاصرہ کرنا پڑتا تو وہ اسے جاری رکھتا۔ عقب سے اس کی فوج کو رسد ملتی رہتی اور ہر گزرتے دن قلعوں میں خوراک کے ذخائر کم ہوتے جاتے۔ سامیرا کو اپنے لوگوں کی پروا تھی اس کے برعکس ریناٹ کو آرگون کی عام آبادی کی قطعی پروا نہیں تھی اگر اسے ان کی خوراک بند کرنا پڑتی تو وہ یہ کام بھی کر گزرتا۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو انسانوں پر اپنا مکمل اقتدار چاہتے ہیں۔ انہیں اس کی پروا نہیں ہوتی ہے کہ یہ اقتدار کتنے انسانوں پر ہوتا ہے۔ اس لیے اگر وادی کی اکثر آبادی جنگ یا بھوک سے فنا کے گھاٹ اتر بھی جاتی تو ریناٹ کا کوئی نقصان نہیں تھا۔ بلکہ شاید فائدہ تھا کہ بچ جانے والے باقی عام لوگ اس کے اور اس کے خاص ٹولے کے غلام بن جاتے۔ اس لیے اگر وادی اور اس کے لوگوں کو بچانا تھا تو ریناٹ اور اس کے ٹولے کا خاتمہ ضروری تھا۔

اس کے لیے ہمیں آرگون میں خود کو مضبوط کر کے حرکت میں آنا تھا اور مضبوط کرنے کے لیے قید خانوں میں موجود حریت پسندوں کی رہائی لازی تھی۔ مگر یہاں رکاوٹ آرگیو کی صورت میں سامنے آئی تھی۔ وہ حریت پسندوں کا سربراہ تھا اور جنگ کے موڈ میں نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ جلد جنگ آرگون تک آئے گی اور تب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ریناٹ کی فوج پر اندر سے حملے کرے گا۔ اس کے خیال میں جنگ کا وہی وقت تھا۔ وہ اس سے پہلے حرکت میں آنے کو تیار نہیں تھا۔ دوسری طرف مجھے یقین تھا کہ جنگ کے آرگون کی فصیل تک آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ یہ ہمارے پلان میں شامل ہی نہیں تھی۔ سامیرا اور اس کے ساتھی سمجھتے تھے کہ وہ کھل کر جنگ لڑنے کے بجائے مدافعتی جنگ سے اپنے مقاصد بہتر حاصل کر سکتے ہیں۔ میں نے ربیک اور ایرٹ کی مدد سے یہ بات آرگیو کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ جیسے سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ ربیک اور ایرٹ غصے میں آ گئے۔ وہ مجھے ایک طرف لے گئے۔ ایرٹ نے کہا۔

”اگر یہ سمجھ نہیں رہا تو ہمیں معاملات اپنے ہاتھ میں لے لینے چاہییں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ ہم آرگیو سے اختیار چھین لیں تو یہ آسان نہیں ہوگا اور شاید ہم آپس میں لڑ پڑیں۔“

”تب ہم کیا کریں؟“ ربیک نے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ بہت کم سمجھ آدمی ہے میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس نے بہکایا ہے کہ جنگ جلد آرگون تک آنے والی ہے۔“

میں چونکا۔ ”یہ تم نے کام کا سوال کیا ہے، اب اس سے پوچھو کہ اس کی اطلاع کا ذریعہ کیا ہے؟“

ربیک آرگیو کے پاس گیا اور کچھ دیر اس سے محوِ گفتگو رہا پھر اس نے واپس آ کر کہا۔ ”آرگیو کا کہنا ہے کہ اسے غیاث سے اطلاع ملی ہے۔“

میں نے انکار کیا۔ ”غیاث ایسی بات کر ہی نہیں سکتا، اوّل تو اسے ہمارے پلان کا اچھی طرح علم ہے دوسرے اس وقت قلعے محاصرے میں ہیں اور وہاں سے آرگون تک کوئی پیغام نہیں بھیجا جا سکتا ہے۔“

”اس کا کہنا ہے کہ پیغام تیر سے باندھ کر باہر پھینکا گیا تھا۔ آرگون کی فوج میں بھی ان کے ساتھی شامل ہیں ان

کے توسط سے یہ پیغام آیا ہے۔''

میں قدرتی طور پر فکر مند ہو گیا کیونکہ میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ آرگون کی فوج میں سامیرا کے حامی ہیں اور وہ آرگون کے حریت پسندوں تک پیغام رسانی کر رہے تھے۔ دوسری طرف آریگو کا کہنا تھا کہ اسے پیغام مل رہے تھے۔ اگر یہ پیغام سچ مچ سامیرا کی طرف سے نہیں تھے تو اس کا مطلب تھا کہ آریگو اور دوسرے حریت پسند ٹریپ ہو گئے تھے اور اسی وجہ سے ان کی بڑی تعداد پکڑی گئی اور عین اس وقت جب ہم آرگون میں داخل ہونے والے تھے۔ کیا یہ بھی اتفاق تھا؟ میں جیسے جیسے سوچ رہا تھا۔ میرا شبہ بڑھ رہا تھا کہ اس سارے معاملے کے پس پشت کوئی سازش ہے۔ سازش کی یہ زنجیر سامیرا کے قلعوں سے یہاں تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں غداروں کی موجودگی تو مجھے دی جانے والی سزا سے ہی واضح ہو گئی تھی۔ یقیناً وہی لوگ وہاں کی درست اطلاعات یہاں ریناٹ تک اور غلط اطلاعات حریت پسندوں تک پہنچا رہے تھے۔

میں واقعات کی کڑیاں ملا رہا تھا۔ ہماری آمد سے پہلے حریت پسندوں کو اچانک چھاپوں میں گرفتار کر لیا گیا۔ گویا یہاں میری مدد کرنے والے خود بے یار و مددگار ہو گئے۔ جو تھوڑے بہت باقی بچے ان کو کس گائیڈ کیا جا رہا تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ جب ریناٹ اور اس کے آدمی ان بچے حریت پسندوں تک رسائی رکھتے تھے تو انہیں کیوں نہیں پکڑ لیا؟ اس کا ممکنہ جواب یہ تھا کہ وہ ان کی مدد سے مجھ تک رسائی چاہتے تھے۔ میں ان سے رابطہ کرتا اور وہ پھر چھاپہ مار کر مجھ سمیت سب کو ایک ساتھ ہی لے جاتے۔ ایک بار وہ آرگون کی طرف سے بے فکر ہو جاتے تو اس کے بعد وہ آرام سے سامیرا اور اس کے لوگوں کے قلعوں میں بھوکے مرنے کا نظارا کر سکتے تھے۔ انہیں جنگ کرنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی اور اگر سامیرا کی سپاہ حملہ کرتی تو وہ اسے بآسانی ناکام بنا سکتے تھے۔ ان کی قوت کہیں زیادہ تھی اور انہیں عقب سے مسلسل رسد مل رہی تھی۔

میں سوچ رہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ موجودہ صورتِ حال میں کیا حکمتِ عملی اپنائی جائے آریگو مجھے سخت اور بے لچک شخص لگا تھا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اپنی سوچ سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے گا۔ اگر ہم اسے قابو کرنے کی کوشش کرتے تو اس کے ساتھی آڑے آتے اور ہمارے درمیان جنگ چھڑ جاتی۔ میں سوچتا رہا اور ٹہلتا رہا۔ رفتہ رفتہ ایک حکمت عملی سمجھ میں آنے لگی۔ میں نے اس پر مزید سوچا اور پھر ربیک کو بلایا۔ ''میں آریگو اور اس کے ساتھیوں سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم میری بات کا موثر ترجمہ کرو گے۔''

''میں پوری کوشش کروں گا۔''

ہم آریگو کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ ہم اس سے اور اس کے آدمیوں سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے اعتراض کیا۔ ''جو بات کرنی ہے مجھ سے کرو میرے آدمیوں سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''تم صرف سن لو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''میں صورتِ حال تم سب کے سامنے رکھنا چاہ رہا ہوں۔''

کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ آریگو مان گیا۔ اس نے اپنے سارے آدمیوں کو بلا لیا۔ ہم باغ کے وسط میں تھے اور سوائے پہرہ دینے والوں کے باقی سب ہی وہاں موجود تھے۔ میں وسط میں کھڑا ہوا اور کہنا شروع کیا۔ ''دوستو میرا تعلق اس وادی سے نہیں ہے۔ میں باہر سے آیا ہوں۔ بلکہ آیا نہیں ہوں بلایا گیا ہوں۔ مجھے برف والے نے بلایا ہے تاکہ میں وادی کے لوگوں کے درمیان جاری اس جنگ کا خاتمہ کر سکوں اور ان لوگوں کا ساتھ دوں جو آزادی سے زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ برف والے کے حکم پر مجھے سامیرا اور اس کے ساتھیوں کا سربراہ بنایا گیا اور میں نے وہاں فوج کی تربیت کی اور انہیں از سر نو منظم کر کے اس قابل بنایا کہ وہ ریناٹ کی بڑی فوج کا مقابلہ کر سکیں۔ مگر تعداد اور اسلحے کے لحاظ سے وہ اب بھی اس قابل نہیں ہیں کہ کھلی جنگ میں ریناٹ کی فوج کا مقابلہ کر سکیں۔''

ربیک میری بات کا ترجمہ کر رہا تھا۔ میں ایک جملہ کہہ کر خاموش ہو جاتا اور ربیک اس کا ترجمہ کر دیتا تو میں دوسرا جملہ کہتا۔ میں ان کو قلعوں کے حالات بتانے لگا اور یہ بھی کہ وہاں ریناٹ کے آدمی موجود ہیں بالکل اسی طرح جیسے آرگون میں حریت پسند موجود ہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ کس طرح مجھے سازش میں پھنسا کر قلعوں سے نکلوایا گیا۔ اس ذلت آمیز سزا کے باوجود میں ان کے ساتھ رہا۔ میں نے فصلوں کو آگ لگا کر ریناٹ کی ابتدائی حکمت عملی کو ناکام بنا دیا، پھر میں آرگون میں آیا مگر ریناٹ کے جاسوس کام کر رہے ہیں اور انہوں نے میری آمد کی اطلاع دی اس کی بنیاد پر حریت پسندوں کی بڑی تعداد کو گرفتار کر لیا گیا اور جو باقی رہ گئے وہ اس قابل نہیں رہے کہ آرگون میں کوئی بڑی کارروائی کر سکیں۔ میں دلائل سے بات کر رہا تھا کہ حریت پسندوں کی گرفتاری اس کا سب سے بڑا ثبوت

ہے کہ ریناٹ کے جاسوس دونوں طرف پوری طرح سرگرم ہیں۔ پھر میں نے ان کو ڈیوڈ شا اور اس کے عزائم کے بارے میں بتایا جو اس وقت ریناٹ کے ساتھ تھا اور وہی اسے چلا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان میں سے اکثر میری تقریر سے نہ صرف حیران تھے بلکہ اس کے قائل بھی نظر آرہے تھے۔ آخر میں میں نے کہا۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ قید خانوں میں قید نہ صرف اپنے ساتھیوں بلکہ ان عام لوگوں کو بھی چھڑایا جائے جنھیں بے گناہ یا معمولی جرموں میں قید کیا ہوا ہے۔ اس سے ہمیں دو فائدے حاصل ہوں گے اوّل ہماری تعداد بڑھ جائے گی اور ہم اندر موجود ریناٹ کی سپاہ سے نمٹ سکیں گے۔ دوسرے ہمیں آرگون کے عام لوگوں کی حمایت اور مدد حاصل ہو جائے گی۔ کوئی فوج اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کر سکتی جب تک اس کے پس پشت عوام نہ ہوں۔"

میری تقریر کے دوران آریگو بے چین تھا اور جب میں نے صورت حال کے حوالے سے اپنی رائے دی تو اس سے برداشت نہیں ہو سکا اس نے اچانک کہا۔ "بس بہت ہو گیا تم میرے آدمیوں کو بہکانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"اس کے برعکس میں انہیں حالات سے آگاہ کر رہا ہوں۔ یہ وقت آرام سے بیٹھنے کا نہیں بلکہ حرکت میں آنے کا ہے تم سامیرا کی جس فوج کا انتظار کر رہے ہو وہ صرف اسی صورت میں یہاں آسکتی ہے جب ہم ریناٹ اور اس کے ٹولے پر قابو پا کر آرگون کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔"

"مجھے یقین ہے وہ فوج جلد آنے والی ہے۔"

"اگر وہ فوج آنے والی ہوتی تو مجھے اتنی مشکل سے آرگون میں داخل نہ ہونا پڑتا۔ ہم اپنی جان پر کھیل کر یہاں تک آئے ہیں۔ تم خود سوچو کہ اگر سامیرا کی فوج اس قابل ہوتی تو میں اس کے ساتھ فاتحانہ کیوں نہ آتا۔"

"کیونکہ تم سزا یافتہ مجرم ہو۔"

"یہ الزام اور سازش تھی۔ جس لڑکی کے توسط سے یہ سازش کی گئی وہ آرگون میں قید ہے۔ اگر ہم نے قید خانے سے اسے چھڑا لیا تو وہ خود بتائے گی۔"

"ہم کچھ نہیں جانتے۔" آریگو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اگر تم نے کچھ کرنا ہے تو ہم سے الگ ہو جاؤ۔ مجھے تو حیرت ہے انسار نے تم جیسے مجرم پر اعتماد کیسے کر لیا۔"

"تم بار بار مجھے بے عزت کر رہے ہو۔" اس بار میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اب میں برداشت نہیں کروں گا۔"

آریگو کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ "کیا کر لو گے؟"

"میں تم سے لڑوں گا۔"

"ان چند لوگوں کے ساتھ؟" اس نے حقارت سے میرے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

"نہیں ہمارے درمیان دو بدو مقابلہ ہوگا جو جیتے گا وہی سب کا سربراہ ہوگا۔ بولو منظور ہے؟"

وہ بدکا۔ "یہ سربراہی کہاں سے درمیان میں آگئی؟"

"کوئی شکست خوردہ شخص لڑنے والوں کی سربراہی کے قابل ہوتا ہے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔" اس نے انکار کیا۔

میں نے آریگو کے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ "تم نے دیکھا یہ شخص اصل میں لڑنے کے لیے ہی تیار نہیں ہے جو ایک شخص سے مقابلہ نہ کرے وہ بھلا ایک فوج سے لڑنے کے لیے کیوں تیار ہوگا؟"

میری اس بات نے آریگو کو جامے سے باہر کر دیا۔ وہ غراتا ہوا اٹھا۔ "تمہیں بہت شوق ہے لڑنے کا، میں تمہیں سبق سکھاتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر میرے مقابل آیا تو میں نے کہا۔ "میں تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا اور میری کوشش ہوگی کہ تمہیں کوئی خطرناک زخم یا چوٹ نہ لگے۔"

اس نے بھیڑیے کی طرح دانت نکالے۔ "میں تمہیں ایسی کوئی ضمانت نہیں دے سکتا۔"

"میں تم سے ضمانت مانگ بھی نہیں رہا تمہاری جو مرضی میرے خلاف کرو۔"

میں نے اپنا نیزہ سنبھال لیا۔ آریگو کے ہاتھ میں بھی نیزہ تھا۔ ہم نے باقی ہتھیار الگ کر کے رکھ دیے تھے۔ میرے ساتھی کسی قدر مضطرب ضرور ہوئے مگر وہ جانتے تھے کہ مجھے کوئی آسانی سے قابو نہیں کر سکتا ہے۔ آریگو نے پہلا وار ہی مہلک کیا اور جھکائی دے کر میرے پیٹ کو نشانہ بنایا میں پوری طرح ہوشیار تھا اس لیے با آسانی اس کا وار ناکام بنا دیا۔ میں نے دائیں پاؤں پر زور ڈالا اور رقص کے انداز میں یوں گھوما کہ نیزہ میرے برابر سے گزرا اور میں نے مڑتے ہوئے اپنے نیزے سے آریگو کے پہلو پر ضرب لگائی۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ میں نے نیزے کو ڈنڈے کی طرح استعمال کیا تھا اس

لیے اسے چوٹ آئی مگر زخم نہیں آیا۔ چند لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی، اسے توقع نہیں تھی کہ میں اس کا وار یوں ناکام بنادوں گا اور اسے ضرب بھی لگاؤں گا۔

اس صدمے سے سنبھل کر اس نے اگلا نشانہ میرے اوپری جسم کا لیا۔ اس بار میں نے نیزے سے اس کا وار روکا اور اس کا نیزہ گھماتے ہوئے دبا کر زمین پر لگایا اور اس کے اوپر سے اپنی لات گھمائی جو اس کے منہ پر لگی اور وہ اپنا نیزہ چھوڑ کر پیچھے جا گرا۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے آدمی دم بہ خود تھے اور میرے ساتھی اب اس مقابلے سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہیں اطمینان ہو گیا تھا کہ مجھ پر قابو پانا آریگو کے بس کی بات نہیں تھی۔ حسبِ توقع وہ مشتعل ہو کر آیا اور اس نے نیزہ اٹھا کر مجھ پر پے در پے وار کیے۔ میں اس کے وار ناکام بناتا رہا اور جیسے ہی وہ میرے نزدیک آیا میں نے اچانک بیٹھتے ہوئے سوئپ کک ماری اور وہ دھڑام سے پورے وزن کے ساتھ زمین پر گرا۔ دھمک بتا رہی تھی اسے خاصی چوٹ آئی تھی۔ اس کے سنہری بال کھل گئے تھے اور چہرہ وحشیانہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ بنا نیزے کے میری طرف جھپٹا اور میں نے نیزہ اس کے پیروں میں پھنسایا۔ وہ منہ کے بل میرے سامنے گرا اور میں نے اس کی پشت پر گھٹنا ٹیکتے ہوئے اس کے بال پکڑ کر اسے قابو کر لیا۔ اس نے تڑپ کر زور لگایا مگر جب یہ زور اس کی گردن پر آیا تو وہ ساکت ہو گیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''میں چاہتا ہوں تم زندہ رہو اور ہمیں کامیابی حاصل کرتے دیکھو۔''

ربیک نے میری بات کا ترجمہ کیا اس نے بھنچی آواز میں کہا۔ ''چھوڑ دو مجھے۔''

میں نے ایک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑ دیے اور پشت سے گھٹنا ہٹا لیا۔ دباؤ ہٹتے ہی وہ حرکت میں آیا اور اس نے وہ کام کیا جو میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس نے نیچے گرے ہوئے مٹھی میں ریت بھر لی تھی اور وہی ریت اس نے اٹھتے ہوئے اچانک میری آنکھوں میں جھونک دی۔ میں نے آخری لمحے میں رخ پھیرا مگر کچھ ذرات آنکھوں میں گئے اور میں بے ساختہ آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہوا۔ ریت نے لمحوں میں جیسے میری آنکھوں میں مرچ سی لگا دی تھی اور میں لڑکھڑا کر پیچھے ہوا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آریگو اپنے نیزے کی طرف لپکا اور اسے اٹھاتے ہی مجھ پر وار کیا۔ اس وقت تک میں آنکھیں مل کر کسی حد تک ریت نکال چکا تھا اور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وار کا احساس ہوتے ہی میں نیچے گرا اور نیزہ میرے اوپر سے گزرا۔ میں یقیناً بال بال بچا تھا۔

آریگو نے ناکامی کے بعد اسے واپس کھینچا اور دوبارہ میرے جسم میں اتارنے کی کوشش کی۔ اس کوشش کو میں نے کروٹ لے کر ناکام بنایا۔ نیزہ زمین میں دھنس گیا اور اس سے پہلے وہ اسے واپس کھینچتا میں نے واپس گھوم کر اسے پکڑ لیا اور سامنے کی طرف لات چلائی۔ یہ ایک اندھا وار تھا کیونکہ مجھے ابھی بھی صاف نظر نہیں آرہا تھا مگر میرے جوتے کی ایڑی بالکل درست جگہ لگی اور یہ جگہ آریگو کا گھٹنا تھا۔ ہلکی سی چٹخنے کی آواز آئی جو فوراً ہی آنے والی دھاڑ میں دب کر رہ گئی۔ آریگو لڑکھڑا کر پیچھے گیا اور نیچے گر گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور دوسری دھاڑ کے ساتھ دوبارہ نیچے گرا اور شدت کرب سے پاؤں پکڑ کر کراہنے لگا۔ وہ لڑنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں کھڑا ہوا اور ربیک نے مجھے پانی کی چھاگل دی۔ میں نے آنکھوں میں پانی مارا جس سے ریت نکلی اور تکلیف کی شدت اتنی کم ہوئی کہ میں آنکھیں درست طریقے سے کھول سکوں۔

آریگو کے آدمی اسے دیکھ رہے تھے مگر کسی نے مداخلت کرنے یا اس کی حمایت میں کچھ کہنے کی کوشش نہیں کی۔ آنکھیں صاف کر کے اور دیکھنے کے قابل ہونے کے بعد میں آریگو کی طرف آیا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تمہارا گھٹنا ٹوٹ گیا ہے مگر اس کے لیے تم نے مجھے مجبور کیا۔''

جواب میں اس نے نیچے تھوکا اور بولا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو اس طرح میرے آدمیوں کو اپنے قابو میں کر لو گے۔''

''مجھے کسی کو قابو کرنے کا شوق نہیں ہے۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں ایک بڑے مقصد کے لیے کام کر رہا ہوں اور اس قسم کی چیزوں کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔ تم اپنے لوگوں کے لیے کچھ کرنے کے بجائے صرف سرداری کے چکر میں پڑے ہو۔ تم میں اور رینالٹ میں کیا فرق ہے۔''

''تم باہر سے آئے ہو اور تمہیں ہمارے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' اس نے بدستور ہٹ دھرمی سے کہا۔

میں نے اس کے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ''تم نے دیکھ اور سن لیا ہے، اب تم کیا کہتے ہو کیا تم میرا ساتھ دو گے کہ تمہارے ساتھیوں کو قید خانے سے چھڑایا جائے یا پھر تم آریگو کا ساتھ دو گے جو کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور صرف وقت ضائع کر رہا ہے۔''

آرگو اپنے آدمیوں کی طرف دیکھ کر دھاڑا۔ ''اس کی باتوں میں مت آؤ۔''

''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔'' میں نے خبردار کیا۔ ''شاید ریناٹ کی فوج اس طرف آرہی ہے اور اب تم لوگ فیصلہ کرلو کہ کس کے ساتھ ہو۔ اگر تم آرگو کے ساتھ ہو تو میں جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس چلا جاؤں گا کیونکہ میں پھر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان خطرے میں نہیں ڈالوں گا۔ لیکن اگر تم میرا ساتھ دیتے ہو تو میں یہیں رہوں گا اور آخری دم تک جدوجہد کروں گا چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔''

آرگو کے آدمی خاموش کھڑے رہے وہ ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے جیسے فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں۔ مجھے مایوسی ہونے لگی ایسا لگ رہا تھا کہ آرگو کے آدمی بھی اس کی طرح کم فہم اور کم ہمت تھے۔ چند منٹ بعد میں نے گہری سانس لی اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ''دوستوں اب ہمیں اپنے طور پر جدوجہد کرنا ہوگی۔ چلنے کی تیاری کرو۔''

آرگو تکلیف کے باوجود فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ اس نے کہا۔ ''میں جانتا تھا کوئی تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔ یہ سب میرے آدمی ہیں۔''

''میں نہیں ہوں۔'' خلاف توقع ایک آواز آئی اور ایک ادھیڑ عمر مگر مضبوط جسم والا شخص آگے آیا اور اس نے میری طرف دیکھا۔ ''میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔'' اس کے فوراً بعد دوسرا آگے آیا۔

''میں بھی......''

''میں بھی......''

اس کے بعد تو لائن لگ گئی ایک ایک کر کے وہ سب میری طرف آنے لگے۔ چند ہی منٹوں میں سوائے چار افراد کے باقی سب میرے پاس آچکے تھے۔ آرگو دم بہ خود رہ گیا اور جب اس کے ساتھ صرف چار آدمی رہ گئے تو وہ چلایا۔ ''تم ایسا نہیں کرسکتے میں تمہارا آقا ہوں۔''

''تم صرف ہمارے سردار تھے۔'' سب سے پہلے آنے والے ادھیڑ عمر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مگر تم نے اپنی بزدلی اور کم ہمتی سے ثابت کر دیا کہ تم اس قابل نہیں ہو۔''

آرگو بہ مشکل ایک درخت کے تنے کا سہارا لے کھڑا ہوا۔ اس دوران میں دوسرے جا کر نگرانی کرنے والوں کو بھی بلا لائے تھے اور سوائے ایک کے باقی بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ آرگو اور اس کے پانچ ساتھی نکالنے کے بعد میرے ساتھ ایک سو نو افراد تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ ''دوستو میں اس اعتماد کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں لیکن مجھے صرف تمہارا ساتھ نہیں چاہیے۔ یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہم زندہ رہیں گے یا نہیں مگر ہم آخری دم تک لڑیں گے۔ کیا تم لوگ اس کے لیے تیار ہو؟''

''ہم تیار ہیں۔'' ادھیڑ عمر آدمی نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''اگر سب ساتھ چھوڑ جائیں تب بھی میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' ربیک نے اس سے پوچھا۔

''ایزارٹ۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں آرگو کا نائب تھا لیکن میں اس کی حکمتِ عملی سے متفق نہیں تھا۔ بہت سے مواقعوں پر میں نے اس سے اختلاف کیا۔ مگر یہ خود پسند آدمی ہے جو صرف اپنی بات کو درست سمجھتا ہے۔'' اس نے آرگو کی طرف دیکھا تو وہ زہریلے انداز میں بولا۔

''اب تم یہی کہو گے کل تک میری ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔''

میں نے آرگو سے کہا۔ ''یہ وقت آپس میں اختلاف کا نہیں ہے۔ جلد ریناٹ کی فوج حرکت میں آئے گی اور ہمیں اپنی جان بچانا مشکل ہو جائے گا اس سے پہلے ہمیں قید خانے سے اپنے ساتھیوں کو چھڑا لینا چاہیے۔ کیا تم ساتھ دو گے؟''

آرگو نے نفرت سے کہا۔ ''مجھے مرنے کا شوق نہیں ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے سر ہلایا اور حکم دیا۔ ''ان پانچوں کو گرفتار کرلو۔''

میرے ساتھی تیزی سے حرکت میں آئے اور انہیں بے بس کر کے رسی سے جکڑ دیا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ وہ مدافعت نہ کرسکے۔ آرگو حلق پھاڑ کر چلّانے لگا تھا کہ میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ ''فکر مت کرو تم مرو گے نہیں کیونکہ تمہیں مرنے کا شوق نہیں ہے لیکن میں تمہیں اس کی اجازت بھی نہیں دوں گا کہ تم ریناٹ سے ساز باز کر کے ہمیں مروا دو۔ اب جب تک ہم کامیاب نہیں ہو جاتے تم سب اسی جگہ قید رہو گے۔''

ان سب کو الگ الگ درختوں سے باندھ دیا گیا۔ ہاتھ پیروں کے ساتھ ان کے منہ بھی بند کر دیئے تھے تاکہ وہ آواز نکال کر کسی کو متوجہ نہ کرسکیں۔ آرگو کے سابق آدمیوں

میں سے کسی نے ان کے ساتھ کیے جانے والے سلوک پر احتجاج یا ردِعمل نہیں دیا تھا بلکہ وہ ان کے ساتھ کیے جانے والے سلوک پر مطمئن نظر آرہے تھے۔ ایزارٹ نے مجھ سے کہا۔ ''تم نے بالکل ٹھیک کیا، یہ شخص قطعی قابلِ بھروسا نہیں ہے۔''

''پھر بھی تم لوگوں کا سربراہ ہے؟''

''یہ سربراہ نہیں ہے ہمارا سربراہ جوروٹ ہے۔ وہ بھی گرفتار ہوگیا ہے اس کے بعد یہ از خود سربراہ بن بیٹھا اور ہم نے جھگڑا نہ ہونے کی وجہ سے اسے سربراہ تسلیم کرلیا مگر اس نے اپنی حرکتوں سے ثابت کردیا کہ یہ اس قابل نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہمیں قید خانے تک جانا ہے اور اپنے ساتھیوں کو آزاد کرانا ہے لیکن اس سے پہلے یہاں سے نکلنا ہوگا امکان ہے ریناٹ کے جاسوس اس جگہ سے واقف ہو چکے ہیں اور جلد یہاں بھی چھاپہ پڑے گا۔''

''میرے علم میں ایک جگہ ہے، وہاں ہم سب آرام سے چھپ سکتے ہیں وہ سوائے میرے اور کسی کے علم میں نہیں ہے۔''

''یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''زیادہ دور نہیں ہے، میرے ساتھ چلو۔''

ہم باغ سے نکلے اور ایزارٹ کی رہنمائی میں روانہ ہو گئے۔ ہمیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا تھا۔ مشکل سے نصف کلومیٹر کے بعد ایک اور باغ میں داخل ہوئے۔ بلکہ اسے جنگل کہنا مناسب ہوگا۔ باغ یہ کسی زمانے میں رہا ہوگا اب یہاں اتنے گھنے اور اونچے درخت تھے کہ ان کے تلے اندھیرا سا تھا۔ اس کے گرد کسی زمانے میں پتھروں سے بنی چار دیواری تھی جو اب جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ ایزارٹ نے بتایا۔ ''کسی زمانے میں یہ خوب صورت باغ تھا لیکن پھر یہاں ساؤں رہنے لگیں۔''

''ساؤں کیا؟''

میرے سوال پر ربیک نے جو مجھے سمجھایا اس کا مطلب آسیب، بدارواح یا بھوت وغیرہ نکلتا تھا۔ ساؤں سے مراد یہاں یہی لی جاتی تھی۔ باغ میں آنے والوں کو عجیب وغریب چیزیں دکھائی دیتی تھیں اور وہ چیزیں کبھی نظر آتیں اور کبھی غائب ہو جاتیں۔ لوگ بہت ڈر گئے اور اس کے بعد یہاں آنا چھوڑ دیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد باغ کی دیکھ بھال بھی چھوڑ دی گئی اور جلد یہ جنگل میں بدل گیا۔ ایزارٹ کا کہنا تھا کہ یہ بلند قامت اور گھنے درخت یہاں از خود اگ آئے تھے اس وجہ سے لوگ اور بھی ڈر گئے اور اس کے پاس سے بھی گزرنا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اور تم ہمیں یہاں لے آئے ہو۔''

''ہاں کیونکہ میں ایسی چیزوں پر یقین نہیں رکھتا ہوں۔'' ایزارٹ نے جواب دیا۔ وہ یقین نہیں رکھتا تھا مگر اس کے اکثر ساتھی تو یقین رکھتے تھے اور وہ ڈرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اگر ریناٹ کی فوج کا خطرہ نہ ہوتا تو وہ شاید یہاں آنے سے انکار کردیتے۔ اب بھی وہ باغ کے زیادہ اندر نہیں گئے تھے۔ سب ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھے اور آس پاس بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ ایزارٹ سے کچھ دیر گفتگو کر کے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ آریکو کی نسبت کہیں ذہین اور حوصلہ مند آدمی تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''یہ تمہارے ساتھی ہیں اور تم ان کو زیادہ بہتر سمجھتے ہو اس لیے میں تمہیں ان کا سربراہ بنا رہا ہوں۔ اب میں ان سے جو کام لینا چاہوں گا وہ تمہاری مدد سے لوں گا تم مجھے جواب دہ ہوگے۔''

''میں اس اعتماد پر شکر گزار ہوں۔'' وہ خوش ہوگیا۔ ''میں تمہاری توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔''

اس فیصلے کا اعلان بھی کردیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ ان میں سے کچھ کے دلوں میں شاید خیال ہو کہ ایک باہر سے آنے والا ان کا آقا بن گیا تھا اور آریکو کو ہٹا دیا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ان میں سے ہی سربراہ چن لوں۔ دوسرے میں نے محسوس کیا کہ ربیک اور ابریٹ کے ساتھ ایزارٹ بھی میرا معتمد بن سکتا تھا اور ہم چاروں ایک طرف آکر اپنی حکمتِ عملی واضح کرنے لگے۔ میں نے کہا۔ ''یہ تو طے ہے کہ ہمیں آج رات ہی قید خانے پر حملہ کرنا ہے۔''

''بالکل۔'' ایزارٹ نے تائید کی۔ ''جتنی دیر ہوتی جائے گی کامیابی کا امکان اتنا ہی کم ہوتا جائے گا۔''

''اس کے بعد دوسرا مرحلہ شہر کی فصیلوں اور پھاٹک پر قبضہ کرنا ہے تاکہ کوئی ہماری مرضی کے بغیر اندر آسکے اور نہ باہر جاسکے۔''

وہ تینوں اس پر بھی متفق تھے۔ میں نے آخری مرحلہ ان کے سامنے رکھا۔ ''ریناٹ اور اس کے ٹولے کا خاتمہ۔''

ایزارٹ جوش سے بولا۔ ''یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔''

''اب ہمیں پہلے مرحلے کے لیے ایسا منصوبہ بنانا ہے جس میں ناکامی کا امکان بہت کم ہو۔''

ایزارٹ اور اس کے ساتھی رنگ برنگے حلیوں میں

تھے۔ اکثر نے سفید عام لباس پہنا ہوا تھا کچھ کے لباس رنگین تھے مگر فوجی لباس بہت کم کے پاس تھا۔ ہمارے پاس بھی دو درجن سے زیادہ وردیاں نہیں تھیں اور ان لوگوں کے پاس ایک درجن وردیاں تھیں۔ اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ کاش ہم راٹر کے مکان میں مارے جانے والے چھ خاص سپاہیوں کی وردیاں بھی اتار لاتے۔ مگر اس وقت ہمیں فرار کی جلدی تھی۔ قید خانے کے نزدیک جانے کے لیے ہمیں ان وردیوں کی ضرورت تھی۔ ایزارٹ نے تصدیق کی کہ اس طرف کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ عام سپاہ کا داخلہ بھی اس طرف بند تھا۔ وہ بہت کچھ جانتا تھا اس نے بتایا کہ فصیل اور گیٹ کی حفاظت کے لیے سو کے قریب عام سپاہی تھے جن میں سے نصف ڈیوٹی پر ہوتے تھے اور نصف آرام کرتے تھے۔ ربیک نے تجویز پیش کی۔

''کیوں نہ پہلے ان سے نمٹ لیا جائے۔ پھر ہم اندر کی طرف بڑھیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''قیدیوں اور شہریوں کو رہا کرانا اشد ضروری ہے اس کے بغیر آرگون پر قبضہ ممکن نہیں ہے۔''

آرگون کا نقشہ دیکھنے کے بعد میں نے عملی طور پر بھی سارا شہر دیکھ لیا تھا اور اس کا نقشہ اب میرے ذہن میں نقش تھا۔ شاہی علاقے تک جانے کے تین راستے تھے۔ اوّل مرکزی شاہراہ جو عام شہریوں کے لیے بند تھی۔ دوسری فوجی بیرکس سے جانے والا راستہ جو آگے جا کر اسی شاہراہ پر نکلتا تھا اور تیسری امرا کے علاقہ سے گزرنے والی شاہراہ تھی۔ سب سے آسان راستہ مرکزی شاہراہ کا تھا مگر ایزارٹ کا کہنا تھا کہ اس پر آگے خاص سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ قید خانے سے خاصا پہلے ان کی چیک پوسٹ آجاتی تھی اور اس سے گزرے بغیر کوئی قید خانے کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔ بلکہ شہریوں کے ساتھ عام سپاہ کو بھی اس طرف جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم بھی اس طرف سے اس وجہ سے نکل آئے کہ ہم آرہے تھے۔ جا نہیں رہے تھے ورنہ ہمیں بھی روک لیا جاتا۔ اچانک مجھے خیال آیا میں نے ایزارٹ سے کہا۔ ''خاص سپاہیوں کی وردیاں کہیں تو بنتی ہوں گی اور یہ کام عام لوگ ہی کرتے ہوں گے۔''

''ایسا ہی ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ کہاں بنتی ہیں اور کون بناتا ہے؟''

''اپنے آدمیوں سے پوچھو، خاص طور سے یہ کہ خاص فوجی وردیاں کہاں سے مل سکتی ہیں۔''

ایزارٹ اپنے آدمیوں سے پوچھنے لگا اور اس پوچھ گچھ کا مفید نتیجہ نکلا۔ وہ دو آدمیوں کو ساتھ لے کر آیا اور مجھ سے کہا۔ ''یہ دونوں اسی کارخانے میں کام کرتے ہیں جہاں فوجی وردیاں سلی جاتی ہیں۔''

میں نے ان سے سوال کیے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ وردیوں کے حصول کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وردیاں سلنے کا کارخانہ خاص علاقے میں تھا اور وہاں تک فوجی بیرکس سے جانے والے راستے سے رسائی حاصل کی جا سکتی تھی۔ البتہ اس علاقے کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں وہ زیادہ نہیں جانتے تھے۔ ان سے بات کر کے میں نے فوری فیصلہ کیا اور ان دونوں کو بھی آرگون کی عام سپاہ کا لباس مہیا کیا گیا۔ ہم ایک درجن افراد آرگون کی فوج کے روپ میں روانہ ہوئے مگر ہم عام گلیوں سے گزر رہے تھے۔ فوجی بیرکس سے خاصے فاصلے پر آکر ہم نے مرکزی شاہراہ عبور کی اور ایک بڑے اور سرسبز پارک سے ہوتے ہوئے آرگون کے مشرقی حصے کی طرف بڑھے تیسری شاہراہ اسی علاقے میں تھی۔ یہاں سرمئی وردی والے نظر نہیں آئے مگر بیرکوں کے سامنے میدان میں کچھ سرخ وردی پوش دکھائی دے رہے تھے۔

انہوں نے ہماری طرف توجہ دی اور نہ ہی ہماری طرف آنے کی کوشش کی۔ ہم فوجی دستے کی طرح ہی حرکت کر رہے تھے اور چھ چھ کی قطار میں ایک مخصوص انداز اور رفتار سے چل رہے تھے۔ شاہراہ پر آکر ہم شمال کی طرف مڑ گئے بلکہ شمال مغرب کی طرف مڑ گئے۔ یوں سمجھیں کہ ہم نے تکون جیسا ٹرن لیا تھا۔ ایزارٹ کے آدمی نے بتایا کہ اس شاہراہ پر ہی گوداموں اور کارخانوں والا علاقہ لگتا تھا۔ چند منٹ بعد ہم اس کے نزدیک تھے۔ ابھی تک اس شاہراہ پر کوئی فرد نظر نہیں آیا تھا اور نہ ہی کوئی چیک پوسٹ یا پہرہ تھا۔ غالباً اسے محفوظ سمجھتے ہوئے خالی چھوڑ دیا تھا۔ یہ بات ہمارے حق میں تھی۔ اس شاہراہ کے آخری حصے میں لازمی پہرہ ہوتا۔ مگر ہم اس سے پہلے ایک گلی میں گھوم گئے۔ اب ایزارٹ کے آدمی ہماری رہنمائی کر رہے تھے۔ یہاں گلیوں میں ویرانی تھی اور کارخانے و گودام بند پڑے تھے کیونکہ ان میں کام کرنے والے جبری بھرتی کر لیے گئے تھے یا اپنے ہی گھروں میں بند تھے۔

''یہ کارخانہ ہے۔'' ایزارٹ کے ایک آدمی نے ایک احاطے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے ربیک کی طرف دیکھا تو اس نے اپنے ہتھیار رکھے اور اچھل کر دیوار پر

دونوں ہاتھ جما کر اندر دیکھا اور بولا۔
"اندر کوئی نہیں ہے۔"
"دو آدمی اور لے کر جاؤ اور تصدیق کرو۔"
ریبک کے ساتھ دو نوجوان اور اندر گئے اور چند منٹ بعد انہوں نے تصدیق کر دی کہ اندر کوئی نہیں ہے۔ ایک ایک کر کے ہم سب اپنے اسلحے سمیت اندر پہنچ گئے۔ احاطے کے اندر دو بڑی عمارتیں تھیں۔ جن پر لکڑی کی ترچھی چھتیں تھیں۔ ایزارٹ کے آدمیوں نے اس عمارت کی نشان دہی کی جس میں تیار وردیاں رکھی جاتی تھیں۔ اس کا دروازہ بند تھا اور اس پر پتھر اور رسی کی مدد سے لاک لگایا گیا تھا۔ یہاں تالے نہیں پائے جاتے تھے کیونکہ یہ دھات سے نا آشنا تھے پھر یہاں چوری کا رواج نہیں تھا اس لیے بھی تالوں کی ضرورت نہیں تھی ورنہ شاید یہ کوئی طریقہ نکال ہی لیتے۔ رسی کھول کر پتھر ہٹانے میں ذرا وقت لگا مگر ہم با آسانی اندر داخل ہو گئے۔ یہاں کپڑوں کے بڑے بڑے بنڈل رکھے تھے۔ ہم سب ہی بیک وقت بنڈل کھول کر دیکھنے لگے اور سرمئی وردیاں تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

مگر یہ بالکل سادہ وردیاں تھیں۔ ایزارٹ کے آدمیوں نے بتایا کہ ان پر عہدے کے نشانات کہیں اور لگائے جاتے تھے یہاں صرف سادہ وردیاں بنتی تھیں۔ لیکن اتنا بھی بہت تھا کہ ہمیں وردیاں مل گئی تھیں۔ ان کی تعداد خاصی تھی اور ہماری ضرورت سے کہیں زیادہ تھی۔ میں نے حکم دیا کہ دس دس وردیوں کے بنڈل بنا لیے جائیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اس کے بعد ہم نے اپنی وردیوں تلے سرمئی وردیاں پہنیں۔ سب نے ایک ایک بنڈل اپنی پشت پر رسی کی مدد سے یوں کس کر باندھا کہ دور سے نمایاں نہ ہو۔ یہ کام نمٹا کر ہم باہر آئے اور گودام کا دروازہ جیسے بند تھا ویسے ہی دوبارہ رسی اور پتھر کی مدد سے بند کر دیا۔ جس جگہ سے ہم نے دیوار پھلانگی تھی اسی جگہ سے باہر آئے اور شاہراہ کی طرف روانہ ہوئے۔ شاہراہ کے پاس آ کر میں نے احتیاطاً جھانک کر دیکھا اور یہی احتیاط کام آ گئی۔ شاہی علاقے کی سمت سے ایک بڑا فوجی دستہ اسی طرف آ رہا تھا۔

"پیچھے ہٹو۔" میں نے عجلت میں حکم دیا۔ "ریناٹ کا خاص دستہ سڑک پر آ رہا ہے۔"

یہ گلی سیدھی تھی اور سڑک سے گزرتے ہوئے بھی ہمیں دیکھا جا سکتا تھا مگر اس وقت میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ وہ ہمارے لیے آ رہے تھے۔ میں نے ایک جھلک دیکھی تھی اور میرا اندازہ تھا کہ آنے والوں کی تعداد پچاس سے زیادہ ہی تھی یعنی وہ ہم سے چار گنا زیادہ تھے۔ سب تیزی سے واپس بھاگے تھے اور اس جگہ پہنچ کر رکے جہاں سڑک سے براہِ راست دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ میں سب سے آخر میں پہنچا اور دیوار سے ذرا سا سر نکال کر دیکھنے لگا۔ دستہ مارچ کے انداز میں آ رہا تھا۔ وہ تقریباً پانچ منٹ بعد گلی کے کنارے پہنچا اور اس کے سامنے سے گزرتا ہوا چلا گیا۔ اس کا رخ عام فوج کی بیرکوں کی طرف تھا۔ جب سے میں آرگون میں آیا تھا میں نے صرف ایک موقع پر سرمئی وردی والوں کو شہر کے خاص علاقے سے باہر دیکھا تھا جب وہ راٹر کے مکان پر آئے تھے اور ہمارے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے ان خاص سپاہیوں کو شہر میں نہیں دیکھا تھا۔

خاص سپاہی کسی خاص وجہ سے آرگون کے دوسرے حصوں میں جاتے تھے اور اب بھی وہ یقیناً کسی خاص وجہ سے آ رہے تھے اور میری چھٹی حس نے اشارہ کیا کہ وہ ہمارے لیے ہی آئے تھے۔ اگرچہ وہ تاخیر سے حرکت میں آئے تھے کہ ہمیں محفوظ مقام پر پہنچنے کا موقع مل گیا تھا اور اگر یہ باغ تک جاتے تو انہیں صرف آریگو اور اس کے ساتھی بندھے ہوئے ملتے۔ ہم ان کے پیچھے نہیں جا سکتے تھے۔ اتنے سارے لوگوں کا چھپنا ممکن نہیں تھا اگرچہ ہم سرمئی وردی میں تھے مگر یہ وردیاں بنا کسی نشان کے تھیں اور ہم فوراً نظر میں آ جاتے۔ ساتھ ہی ہمیں جلد از جلد اپنے ٹھکانے پہنچ جانا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہاں کوئی گڑبڑ ہوتی۔ اگرچہ وہاں ایرٹ تھا اور وہ ذہین تھا اس کے باوجود میں چاہتا تھا کہ کسی مشکل موقع پر میں خود وہاں موجود ہوں۔ میں نے ایزارٹ کے ساتھیوں سے پوچھا۔ "یہاں سے جانے کا کوئی اور راستہ ہے؟"

"ہے لیکن وہ مرکزی شاہراہ پر نکلتا ہے اور پوش علاقے کے سامنے ہے۔"

"اس کے علاوہ کوئی راستہ؟"

ان میں سے ایک نے سوچ کر کہا۔ "ہمیں اسی علاقے میں اندر گلیوں سے جانا ہوگا اور ہم کسی گودام کی دیوار پھلانگ کر نکل سکتے ہیں۔"

"تب ایسا ہی کرو۔" میں نے سر ہلایا اور ہم روانہ ہوئے۔ گودام اور کارخانوں پر مشتمل یہ علاقہ فی الحال بالکل ویران تھا اور یہاں ایک فرد بھی موجود نہیں تھا۔ اس وجہ سے ہمیں کسی سے نمٹنے کی زحمت نہیں کرنا پڑی تھی۔ ریناٹ نے

ساری سیکیورٹی اپنے لیے مخصوص کر لی تھی اور باقی شہر ایسے ہی چھوڑ دیا تھا دیکھا جائے تو یہ ہمارے لیے ہی فائدے مند ثابت ہوا تھا۔ اگر وہ ذرا بھی ہوشیاری سے کام لیتا اور کچھ خاص دستے اس علاقے میں اور پورے شہر میں نہ سہی آنے جانے کے راستوں پر لگا دیتا تو ہم آرگون میں اتنی آسانی سے نقل و حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ دس منٹ بعد ہم ایک بڑے گودام کے سامنے تھے۔ ایزارٹ کے ساتھی نے کہا۔ ”ہم اس کے اوپر سے چڑھ کر دوسری طرف اتر سکتے ہیں۔“

”دوسری طرف کیا ہے؟“

”مرکزی شاہراہ۔“

گودام کی عمارت خاصی اونچی تھی اور اوپر سے اس کی چھت ترچھی تھی۔ ریبک نے اپنا سامان اتارا اور دو افراد کا سہارا لے کر تقریباً گیارہ فٹ اوپر چھت تک پہنچ گیا۔ ہاتھ جما کر اس نے خود کو اوپر کیا اور احتیاط سے ترچھی چھت پر چڑھ گیا جو لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ اوپر جا کر وہ کچھ دیر کے لیے غائب ہوا اور چند منٹ بعد واپس آ کر اس نے رسی طلب کی۔ رسی لے کر وہ پھر غائب ہو گیا۔ اس عمارت پر بغیر رسی کے چڑھنا اترنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی اسی لیے ریبک نے رسی مانگی تھی۔ وہ کہیں باندھنے گیا تھا۔ ایک منٹ بعد رسی نیچے گری اور ریبک نے جھانک کر کہا۔ ”اس رسی کی مدد سے اوپر آئیں اور پہلے میرا سامان دے دیں۔“

اس کا سامان دے کر ہم باری باری رسی کی مدد سے اوپر چڑھے اور ترچھی چھت کے کنارے چلتے ہوئے گھوم کر دوسری سمت آئے۔ ہم مرکزی شاہراہ کے عین اوپر تھے اور یہاں سے عام آبادی زیادہ دور نہیں تھی مگر میں نے فوری اترنے سے گریز کیا۔ میرا خیال تھا کہ خاص دستہ ابھی مرکزی شاہراہ تک نہیں پہنچا تھا۔ جب وہ گلی کے سامنے سے گزرا تو میں نے اپنے ابتدائی تخمینے پر نظر ثانی کی تھی۔ دستے میں سپاہیوں کی تعداد کم سے کم اتنی تھی۔ مگر جب چند منٹ بعد وہ شاہراہ پر نمودار ہوا اور اسے عبور کر کے عام آبادی میں داخل ہونے لگا تو میں نے بلندی سے انہیں واضح دیکھا اور گنا۔ ان کی تعداد سو سے اوپر ہی تھی اور وہ زرہ بکتر سمیت تمام ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سڑک عبور کر کے آبادی میں داخل ہو گئے۔

لوگوں نے فوج کی آمد محسوس کر لی تھی اور یہاں بلندی سے میں گھروں اور گلیوں میں ہونے والی ہل چل دیکھ سکتا تھا۔ سب جلدی جلدی اپنے گھروں میں جا کر دروازے بند کر رہے تھے۔ دستے کے آخری سپاہی کے آبادی میں داخل ہوتے ہی ہم حرکت میں آئے اور چھت سے نیچے اترنے لگے۔ سب سے آخر میں ریبک رسی کھولتا ہوا آیا اور ہم فوجی دستے کے انداز میں سڑک پر چلنے لگے۔ یہاں آنے کے بعد اگرچہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو بعض مشکل مراحل سے گزرنا پڑا تھا لیکن مجموعی طور پر ہمیں کسی بہت بڑی مشکل یا لڑائی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اندرونی حریت پسند مل جانے سے ہماری تعداد بھی تسلی بخش ہو گئی تھی۔ پھر ہم جس طرح شہر میں آزادی سے حرکت کر رہے تھے اس سے لگ رہا تھا کہ ریناٹ کی شہر پر گرفت اتنی مضبوط نہیں تھی جتنی کہ ہم سمجھ رہے تھے۔

اس کی وجہ بھی تھی اس کی ساری توجہ اپنے خاص حصے کے دفاع پر تھی اور باقی شہر پر اس کی توجہ کم تھی۔ یہاں جاسوسی کا نظام بھی ناقص تھا۔ اطلاع دیر سے جا رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ریناٹ کے فوجی بہت تاخیر سے یہاں آئے تھے اور ہمیں محفوظ مقام پر پہنچنے کا موقع مل گیا تھا۔ ہم ایک اور جگہ سے عام آبادی میں داخل ہوئے اور ہماری آمد پر بھی ہلچل مچی تھی لوگوں جو گھروں سے باہر تھے وہ اندر بھاگے اور جن کے دروازے کھلے ہوئے تھے انہوں نے دروازے بند کر لیے۔ کسی نے ہماری راہ میں آنے یا روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے باوجود ہم ہوشیار تھے کہ کہیں ہمیں ریناٹ کے سپاہی سمجھ کر حملہ نہ کر دیا جائے۔ آرگون میں آبادی بہت سادہ اور سیدھے طریقے سے بسائی گئی تھی۔ تمام گلیاں اور سڑکیں سیدھی یا ایک دوسرے کے متوازی تھیں۔ کسی جگہ پہنچنے کے لیے بھٹکنا نہیں پڑتا تھا۔

میں نے خاص دستے کی لوکیشن ذہن میں رکھی تھی اور ہم اس طرح آگے جا رہے تھے کہ اس سے سامنا نہ ہونے پائے۔ ہم متوازی سفر کر رہے تھے اور ہر گلی کراس کرنے سے پہلے اس کا جائزہ لیتے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم اس پارک کے نزدیک نکلے جہاں آریگو اور اس کے ساتھیوں کو قید کیا تھا اور حسب توقع خاص دستہ وہاں موجود تھا۔ انہوں نے باغ کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور ان میں سے کچھ باغ میں داخل ہوئے کچھ ہی دیر بعد باقی بھی اندر داخل ہو گئے انہوں نے یقیناً آریگو اور اس کے ساتھیوں کو دریافت کر لیا تھا۔ مگر جب وہ واپس آئے تو ان کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ ہم دور سے ان کی گفتگو تو نہیں سن سکتے تھے مگر ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ انہیں باغ میں کوئی نہیں ملا تھا۔ آریگو اور اس کے ساتھی شاید کسی طرح آزاد ہو گئے تھے اور ایک لحاظ سے یہ

اچھا ہی ہوا کہ وہ رینات کے آدمیوں کے ہاتھ نہیں آئے تھے۔ اب فوج آس پاس پھیل رہے تھے اور گھروں میں گھس رہے تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے ساتھیوں سمیت آگے روانہ ہو جاؤں۔ ربیک نے مجھ سے کہا۔

''ایسا لگ رہا ہے آریگو اور اس کے آدمی فرار ہو گئے ہیں۔''

''یہی مناسب تھا ورنہ وہ راز کھول دیتے کہ ہم قید خانے پر حملے کا منصوبہ بنا رہے ہیں اور وہ ہوشیار ہو جاتے۔''

ربیک نے سر ہلایا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اس لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔''

ہمیں متروک باغ تک جانے کے لیے خاصا گھومنا پڑا تھا اور ہم دوسرے راستے سے اس میں داخل ہوئے۔ اس کے وسط سے گزرتے ہوئے ایزارٹ کے دونوں آدمی کسی قدر خوفزدہ نظر آئے۔ وہ جان بوجھ کر ہمارے درمیان میں آ گئے تھے میں نے ربیک سے پوچھا۔ ''تم ساؤں پر یقین رکھتے ہو؟''

''ہاں لیکن میں نے آج تک کوئی ساؤں دیکھی نہیں ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''دوسرے میں یقین رکھتا ہوں نگران سے ڈرتا نہیں ہوں۔''

''ہم بھی یقین رکھتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

ہم کیونکہ گفتگو کرتے ہوئے جا رہے تھے اور یہ آوازیں جب باغ کے اگلے حصے موجود ہمارے ساتھیوں تک پہنچیں تو ان میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ انہوں نے ہتھیار سنبھال لیے اور جو ذرا ڈرے ہوئے تھے وہ پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے نزدیک پہنچ کر ان کی تسلی کے لیے بلند آواز سے کہا۔ ''یہ ہم ہیں۔''

''سامنے آئیے۔'' ایرٹ نے کہا تو ہم سامنے آئے اور ان لوگوں نے سکون کا سانس لیا۔ ''آپ اس طرف سے آئے ہیں؟''

''ہاں کیونکہ پرانے باغ کے آس پاس رینات کے خاص فوجی موجود ہیں اور وہ آریگو اور اس کے ساتھیوں کو پانے میں ناکام رہے۔''

ایرٹ مسکرانے لگا۔ ''کیونکہ انہیں ہم لے آئے ہیں۔''

میں حیران ہوا۔ ''تمہارے ذہن میں یہ خیال کیسے آیا؟''

''جب آپ گئے اور میں نے سوچا کہ اگر چچ مچ رینات کی فوج وہاں آ گئی اور ان لوگوں کو پکڑ لیا تو وہ فوراً ہمارے اور ہمارے ارادوں کے بارے میں بتا دیں گے۔'' ایرٹ نے کہا۔ ''میں نے کچھ آدمیوں کو روانہ کیا اور ان کو یہاں بلوا لیا۔ اب وہ یہاں قید ہیں۔''

آریگو اور اس کے ساتھی اب یہاں درختوں سے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ''تمہاری خوش قسمتی اور خوش فہمی سامنے آ گئی ہے۔ خوش قسمتی یوں اگر میرا ساتھی تمہیں نہ بلاتا تو اس وقت تم رینات کی فوج کے ہتھے چڑھ چکے ہوتے اور خوش فہمی یہ کہ رینات کو تمہارے بارے میں علم نہیں ہے۔ ابھی ہم دیکھتے ہوئے آئے ہیں کہ اس باغ کو فوج نے گھیر لیا ہے جہاں کچھ دیر پہلے ہم تھے۔''

ایرٹ اور دوسرے لوگ یہ جان کر بے تاب ہو گئے کہ ایک فوجی دستہ یہاں موجود ہے۔ ایزارٹ نے جوش سے کہا۔ ''یہ ہمارے لیے موقع ہے۔''

''موقع تو ہے لیکن اس صورت میں یہاں ہماری موجودگی کا راز کھل جائے گا۔''

''وہ ہماری موجودگی سے پہلے ہی واقف ہیں۔'' ایرٹ نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مگر رینات سمجھ رہا ہے ہم چھپتے پھر رہے ہیں اگر ہم نے اس دستے پر حملہ کیا تو ہمارے جارحانہ عزائم قبل از وقت کھل جائیں گے اور اس کے بعد ممکن ہے ہم قید خانے پر اتنی آسانی سے حملہ نہ کر سکیں۔ ہمارا پہلا اہم ترین مقصد اپنے ساتھیوں کو آزاد کرانا ہے۔ اس کے بعد ہی ہم اس قابل ہوں گے کہ آرگون میں کھل کر کوئی کارروائی کر سکیں۔''

ایرٹ اور ایزارٹ کسی قدر مایوس ہوئے تھے۔ مگر انہوں نے پھر اصرار نہیں کیا اور جب انہیں پتا چلا کہ ہم اپنے مشن میں کامیاب واپس آئے ہیں تو ان کی مایوسی کم ہوئی تھی اور وہ خوش ہو گئے تھے۔ رہی سہی مایوسی یہ سن کر دور ہو گئی کہ ممکنہ طور پر آج ہی رات ہم قید خانے پر دھاوا بولنے کی کوشش کریں گے۔ وردیوں کے بنڈل کھولے گئے اور سب اس میں سے اپنے اپنے سائز کی وردی تلاش کرنے لگے۔ دوپہر کا وقت ہو گیا تھا۔ میں گزشتہ ایک دن سے جاگ رہا تھا۔ تھکن کی وجہ سے میں ایک طرف لیٹ کر آرام کرنے لگا۔ تھکن کے باوجود نیند آنکھوں سے غائب تھی۔ ایزارٹ ربیک کے ساتھ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اس وقت کوئی ایسی حرکت

رینائٹ کو چوکنا کردے گی اور ہمارے لیے سب سے اہم اپنے قیدی ساتھیوں اور شہریوں کو چھڑانا ہے۔"

"بالکل اس کے بعد ہی ہم اس قابل ہوں گے کہ کھل کر رینائٹ کو للکار سکیں۔"

ان خاص وردیوں کی وجہ سے ہم با آسانی قید خانے تک جاسکیں گے۔

"یہ کام اتنا آسان نہیں ہوگا۔ ان وردیوں پر نشانات نہیں ہیں۔ دور سے تو دھوکا دیا جاسکتا ہے لیکن قریب آنے پر ہماری اصلیت کھل جائے گی۔ اس لیے ہمیں بہت ہوشیاری سے اور ایسے حملہ کرنا ہے کہ وہ مقابلہ نہ کرسکیں۔"

ایزارٹ نے سر ہلایا۔ "میں سمجھتا ہوں۔ کیا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے؟"

میں نے سر ہلایا۔ "ایک منصوبہ ہے جس سے ہم ان کو دھوکا دے سکتے ہیں لیکن ابھی میں اس پر غور کررہا ہوں اور اگر مجھے مناسب لگا تو میں پھر تم سب کے سامنے رکھوں گا۔ ہم آپس میں مشورہ کرکے اسے حتمی صورت دیں گے۔"

"جیسا تم مناسب سمجھو۔" ایزارٹ نے تابعدارانہ لہجے میں کہا۔ اگرچہ میرا اس سے زیادہ واسطہ نہیں رہا تھا لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ باصلاحیت اور باکردار ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی عزت کرنا بھی جانتا تھا۔ میں آرام کرنے کے ساتھ اونگھنے لگا۔ درمیان میں کسی وقت نیند نے غلبہ پالیا اور جب میری آنکھ کھلی تو شام ہوچکی تھی اور آسمان پر تیزی سے سیاہی چھارہی تھی۔ آج موسم کسی قدر سرد تھا۔ یہاں آنے کے بعد میں نے اب تک موسم خوشگوار ہی پایا تھا۔ رات میں ہلکی سی ٹھنڈ ہوجاتی تھی مگر یہ چبھتی نہیں تھی اور دن میں موسم ہلکا سا گرم ہوتا تھا۔ کبھی کبھی گرمی بڑھ جاتی مگر یہ بھی ناگوار نہیں ہوتی تھی۔ اس لحاظ سے میں نے پہلی بار موسم میں تبدیلی محسوس کی۔ مجھے یہاں آئے ہوئے مہینے سے زیادہ ہوگیا تھا اور ہم جون کے آخر میں یہاں پہنچے تھے اس لحاظ سے یہ اگست کا پہلا یا دوسرا ہفتہ ہوسکتا تھا۔

عام طور سے سطح سمندر سے سات یا آٹھ ہزار فٹ بلند جگہوں پر موسم اگست کے آخر تک سرد ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ دس ہزار فٹ سے زیادہ بلند علاقوں میں باقاعدہ سردی پڑنے لگتی ہے اور کے ٹو کے بیس کیمپ کنکورڈیا میں برف باری کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اگست کا آخر یہاں سیزن کا بھی آخر ہوتا ہے اور ستمبر آنے سے پہلے بیس کیمپ اجڑ چکا ہوتا ہے اور کوہ پیما ٹیمیں واپس جاچکی ہوتی ہیں۔ یہ وادی اگرچہ چھ سات ہزار فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی لیکن اس کے چاروں طرف چودہ پندرہ ہزار فٹ بلند ہمالیائی سلسلہ تھا۔ یہاں موسم نہایت سرد ہوچکا ہوگا۔ اس کا اثر شاید پہلی بار نیچے آیا تھا۔ میں کسی قدر فکرمند ہوگیا اگر یہاں میں مسائل حل کرلیتا اور مجھے واپس جانے کا موقع ملتا تو اوپر موسم واپسی کے لیے اتنا سازگار نہ ملتا۔ راستے میں شدید برف باری، طوفان اور کم درجۂ حرارت بڑی رکاوٹ ثابت ہوتے اور میں آسانی سے واپس نہیں جاسکتا تھا۔

ایرٹ نے تیار دلیہ نما کھانا میرے سامنے رکھا تو میں ذہن میں آنے والے خدشات جھٹک کر کھانے کی طرف متوجہ ہوا۔ ان لوگوں کے پاس راشن کم تھا مگر ایک دو وقت کے گزارے لائق تھا۔ پہریداروں نے بتایا کہ آس پاس کوئی فوجی سرگرمی نہیں تھی۔ یہاں بھی ایرٹ اور ربیک نے نگرانوں کو بلند درختوں پر چڑھا دیا تھا جہاں سے وہ دور تک کی نگرانی کرسکتے تھے۔ جو شروع میں ڈرے ہوئے تھے اب ان کا خوف کسی حد تک کم ہوگیا تھا۔ وردیوں کا مسئلہ حل ہوگیا

میرا خیال ہے کہ خلابازی کی تاریخ میں اتنا بڑا حادثہ کبھی نہیں ہوا ہوگا۔

اور یہ حادثہ تھا ایک ایسی خطا کے نتیجہ میں جیسی غلطی شاید ہی کبھی ہوئی ہوگی صورت حال دلچسپ بھی تھی اور خطرناک بھی۔

یہ کہانی ہے ناسا کی۔ ایک مصنوعی سیارچہ کو خلا میں روانہ کرنے کی پلاننگ مکمل ہوگئی تھی۔ یہ سیارچہ خلا میں جاکر بے شمار معلومات بھیجنے والا تھا۔

لیکن اس سیارچے کی پرواز کی پلاننگ میں ایک ایسی احمقانہ غلطی سرزد ہورہی تھی۔ جس کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

ناسا کے انجینئرز کی ٹیم ناپ تول کے انگریزی نظام کے تحت کام کررہی تھی۔ جبکہ دوسرے افراد نے میٹرک سسٹم اپنا رکھا تھا۔

لہٰذا جو تباہی ہوئی تھی وہ ہو ہی گئی۔

سیارچہ خلا میں گیا اور دونوں سسٹم کے اعداد و شمار میں فرق ہونے کی وجہ سے لامحدود خلا کی وسعتوں میں ایسا گم ہوا کہ آج تک اس کا سراغ نہیں مل سکا۔

اب ایسی غلطی کو کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس مہم پر 165.6 ملین کا نقصان ہوا تھا۔

مرسلہ: انعام حفیظ، کوئٹہ

تھا اور تقریباً سب نے اپنے اپنے سائز کی وردیاں تلاش کر لی تھیں۔ ایرٹ نے مجھ سے کہا۔ ''ایزارٹ بتا رہا ہے کہ آپ کے ذہن میں قید خانے پر حملے کے حوالے سے کوئی منصوبہ ہے؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''ہاں مگر ابھی میں کچھ اور سوچنا چاہتا ہوں۔''

ایرٹ سمجھ گیا اور میرے پاس سے اٹھ گیا۔ منصوبہ خاصی حد تک میرے ذہن میں تھا مگر میں اس کے بعض ایسے گوشوں پر سوچ رہا تھا جو مجھے کمزور لگ رہے تھے۔ کھانے کے دوران میں نے خاصا غور کیا اور کچھ حل ذہن میں آئے۔ اب مناسب تھا کہ میں اپنے ساتھیوں کے سامنے اسے رکھوں اور پھر ان کی رائے لوں۔ ممکن ہے ان کے ذہن میں ایسا حل آجائے جو میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ میں نے ربیک اور ایرٹ کے ساتھ ایزارٹ کو طلب کر لیا اور ان کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا۔ وہ غور سے سن رہے تھے۔ میں داستان گوئی کے دوران بعض اوقات ذکر کرنا بھول جاتا ہوں کہ ربیک اور ایرٹ کے علاوہ ہر فرد سے میں ان دونوں میں سے کسی ایک کی مدد سے ہی بات کرتا ہوں۔ اس لیے اگر کسی سے گفتگو براہِ راست محسوس ہو تو قارئین ان دونوں میں سے کسی ایک کو حاضر سمجھا کریں۔

عام طور سے ربیک ترجمان کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ایزارٹ کسی قدر حیران تھا کہ میری بات تو اسے ترجمہ کر کے بتائی جاتی تھی مگر اس کی کہی بات میں از خود سمجھ لیتا تھا۔ مگر اس نے اس بارے میں کچھ پوچھا یا تعجب کا زبانی اظہار نہیں کیا۔ جب میں نے بات ختم کی تو انہوں نے سوالات اور اعتراضات شروع کیے۔ میں نے منصوبہ بیان کرنے سے پہلے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ سننے کے دوران اس کا تنقیدی جائزہ لیتے رہیں اور جو بات قابلِ اعتراض محسوس ہو اسے ضرور میرے سامنے رکھیں۔ صرف اس لیے خاموش نہ رہیں کہ منصوبہ میرا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اعتراضات سوالوں کے ہمراہ میرے سامنے رکھے اور میں ممکن حد تک ان کا جواب دینے لگا۔ جہاں میں خود کو لاجواب محسوس کرتا وہاں بنا کسی جھجک کے اس کا اعتراف کر لیتا اور ان سے کہتا کہ وہ اس پر سوچیں۔ ایزارٹ نے کئی اچھے اعتراضات کیے اور پھر اس نے اپنی طرف سے تجاویز بھی رکھی تھیں۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''اس کام کے لیے ہم آریگو اور اس کے ساتھیوں کو استعمال کر سکتے ہیں۔''

''کیا وہ راضی ہو جائیں گے؟''

''نہیں انہیں اسی طرح باندھ کر اور ان کے منہ بند کر کے استعمال کیا جائے گا۔'' ایزارٹ نے کہا تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ مجھے اس کی تجویز اچھی لگی کیونکہ ہمارے پاس افرادی قوت کی کمی تھی۔ یہ پانچ افراد اگر ہم آریگو اور اس کے آدمیوں کی جگہ استعمال کرتے تو ہمیں کمی کا سامنا کرنا پڑتا۔ جب کہ ہمیں پانچ سے زیادہ آدمیوں کی ضرورت تھی۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے انہیں بھی استعمال کریں گے مگر ہمیں ان سے زیادہ لوگوں کی ضرورت ہے۔''

''کتنے افراد کی؟''

''کم سے کم دو درجن لوگوں کی۔''

ربیک نے ہاتھ اوپر کیا اور بولا۔ ''میری تجویز ہے کہ ان لوگوں کو بھی چھوٹے ہتھیاروں سے مسلح رکھا جائے۔''

''یہ بھی مناسب ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وقت پڑنے پر وہ فوری ہماری مدد کریں گے۔''

منصوبے کی نوک پلک سنوارتے ہوئے رات کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ ربیک نے تمام افراد کو بریفنگ دی۔ اس دوران میں ایزارٹ اور ایرٹ نے مخصوص افراد چن لیے اور ان کو الگ سے بریف کرنے لگے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر میں نے ایرٹ، ربیک اور ایزارٹ سے کہا۔ ''ایک بار ہم جا کر دیکھتے ہیں کہ موقع پر کیا صورتِ حال ہے آگے ہم اسی کے مطابق عمل کریں گے۔''

''میں بھی یہی کہنے والا تھا۔'' ایزارٹ نے تائید کی۔ ''ہمارے پاس قید خانے کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں معلومات پرانی ہیں۔''

ہم چاروں روانہ ہوئے۔ پہلی بار مجھے سرمئی وردی کی افادیت کا احساس ہوا کہ رات کی تاریکی میں اس کا رنگ غیر نمایاں تھا۔ اگرچہ شاہراہوں پر مشعلیں جلادی گئی تھیں مگر عام آبادی اور اس کے بعد گوداموں اور کارخانوں والے علاقے میں تاریکی تھی۔ میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ ہمیں اسی علاقے سے گزرنا ہے۔ وردیاں ملنے کے ساتھ ساتھ اس علاقے کا ہمیں یہ فائدہ تھا کہ یہ شاہی اور سرکاری علاقے سے ملا ہوا تھا اور یہاں کہیں کوئی پہریدار موجود نہیں تھا۔ ہم ایک نیچی چھت والی عمارت پر چڑھے اور اندر داخل ہوئے۔ گلیوں میں اتر کر آگے بڑھنے لگے۔ ایزارٹ اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ کئی جگہوں پر ہمیں آگے جانے کے لیے دیواریں

پھلانگنا پڑیں مگر یہ شارٹ کٹس تھے دوسری صورت میں گلیوں میں بہت گھوم پھر کر جانا پڑتا۔ بالآخر ہم ایک چھوٹی عمارت تک پہنچے جس کی چھت نیچی اور ہموار تھی۔ ایزارٹ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کے دوسری طرف سامنے ایک چھوٹے میدان کے بعد قید خانے کی عمارت ہے۔ یہاں سے اس کا پہلو والا حصہ نظر آتا ہے۔ شاہراہ پر اس کا سامنے والا حصہ ہے۔"

"میں جانتا ہوں کیونکہ میں یہاں قید رہ چکا ہوں۔" میں نے ایزارٹ کو بتایا تو وہ حیران ہوا۔

"تم پہلے بھی یہاں آچکے ہو؟"

"ہاں سامیرا کے پاس جانے سے پہلے میں یہیں آیا تھا۔ برف والے نے مجھے ریناٹ کے سپاہیوں کے حوالے کیا تھا کیونکہ یہاں مجھے کیرٹ سے ملنا تھا اور پھر کیرٹ نے مجھے رہائی دلوائی اور میں سامیرا کے پاس پہنچا۔"

ایزارٹ نے سر ہلایا۔"اسی لیے مجھے لگتا تھا کہ آپ آرگون سے اچھی طرح واقف ہیں۔"

"اتنی اچھی طرح بھی واقف نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔"جیسے مجھے اس علاقے کی افادیت کا علم نہیں تھا۔ وردیوں کے چکر میں مجھے معلوم ہوا کہ یہاں سے ہم براہ راست خاص علاقوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔"

ایزارٹ اور باقی چونکے۔ پھر ربیک نے جوش سے کہا۔"واقعی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"اور شاید ہم حملہ بھی اسی جگہ سے کریں۔ ہمارے تمام ساتھی باآسانی اس جگہ آ سکتے ہیں۔"

"مگر ہمارا منصوبہ؟" ایرٹ نے گویا مجھے یاد دلانا چاہا۔

"وہ اسی طرح ہوگا صرف ہمارے باقی ساتھی یہاں سے خاص علاقے میں داخل ہوں گے۔" میں نے کہا۔"اب اوپر چلو مگر بہت احتیاط سے، دوسری طرف تیز روشنی ہے اور قید خانے پر یقیناً اوپر سے نگرانی کرنے کا بندوبست بھی ہوگا۔"

پہلے ربیک اوپر چڑھا اور فوراً لیٹ گیا۔ پھر اس نے پلٹ کر نیچے جھانکا اور بولا۔"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں عمارت کے اوپر مینار میں ایک نگران ہے۔ مگر وہ اس وقت یہاں نہیں دیکھ رہا ہے۔"

میں اوپر چڑھا اور مجھے تقریباً دو منزل اوپر موجود چھوٹے سے مینار میں بیٹھے نگران کا سر نظر آیا۔ سر ساکت تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی چیز پر بیٹھا ہوا سو رہا ہو۔ ریناٹ جیسے خود غرض اور عیاش حکمران کے آدمی ایسے ہی ہو سکتے ہیں۔ قید خانے اور اس آخری گودام کے درمیان ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ پختہ پتھروں سے بنا ہوا یہ میدان ہموار اور صاف تھا۔ شاید اسے قید خانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ قید خانے کی عمارت کی دیوار پر ہر دس فٹ بعد تیز روشنی والی مشعل روشن تھی۔ یہ لوگ مشعلوں کو مخصوص روغن سے تر کر کے جلاتے تھے، جس سے ان کی روشنی نہ صرف تیز ہو جاتی تھی بلکہ یہ بہت دیر تک جلتی تھیں اور ان کے جلنے سے ایک بو سی اٹھتی تھی جس سے کیڑے مکوڑے پاس نہیں آتے تھے۔ عمارت کے اس طرف چھ سپاہی تھے اور یہ ریناٹ کے خاص دستے والے سپاہی تھے۔ میں نے ایزارٹ سے کہا۔

"یہ صرف چھ ہیں انسار نے بتایا ہے کہ قید خانے کی حفاظت پر بہت زیادہ سپاہی لگائے گئے ہیں۔"

"یہ تو صرف اس طرف ہیں۔ عمارت کے چاروں طرف اگر اس سے پانچ گنا زیادہ لگا لیں تو اندر موجود سپاہیوں کی تعداد باہر موجود سپاہیوں سے کم سے کم دوگنی ہوگی۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔"یعنی کم سے کم سو افراد؟"

اس نے سر ہلایا۔"اندر قیدیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کو قابو میں رکھنے کے لیے کم سے کم اتنے سپاہی لازمی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے اضافی کمک کے طور پر مزید سپاہی آس پاس کہیں موجود ہوں اور وہ ہنگامہ ہوتے ہی یہاں پہنچ جائیں۔"

ایزارٹ کی گفتگو میرے اندر مزید کھڑکیاں کھول رہی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ ہمیں یہاں موجود نگرانوں پر قابو پانے اور قیدیوں کو آزاد کرانے میں کچھ وقت لگتا اور اس دوران میں ریناٹ کی طرف سے مزید فوج کا بھیجا جانا لازمی تھا۔ اگر وہ ہمارا راستہ روک لیتی تو عملاً ہم بھی قیدی بن کر رہ جاتے۔ اگر فوج دیر سے آتی تب بھی ہمیں اتنے سارے افراد کے ساتھ نکلنا ہوتا اور پھر ان کو مسلح کرنا ہوتا تب کہیں جا کر ہم اس قابل ہوتے کہ فصیل اور گیٹ پر قبضہ کرتے۔ مگر ظاہر ہے اس دوران میں ریناٹ اور اس کے آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھے ہوتے اور سب سے بڑا خطرہ مجھے ڈیوڈ شا اینڈ کمپنی سے تھا جس کے پاس لازمی آتشیں اسلحہ تھا۔ یہ لوگ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں خود کو یکجا اور منظم کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔ لیکن یہ وقت ہمیں کیسے ملتا اس کے بارے میں غور کرنا تھا۔ اب

سب سے پہلے ہمیں قید خانے کے حفاظتی انتظامات کا مکمل جائزہ لینا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ ہم خود آگے جاتے۔

قید خانے کی عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس کا رقبہ مشکل سے ایک کنال تھا۔ اگر اس میں پانچ حریت پسندوں اور دوسرے شہریوں کو رکھا گیا تھا تو ان کی حالت کا سوچا جا سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں ان کو بہت مشکل سے رکھا گیا ہوگا۔ یہ عقب سے ایک دوسری عمارت سے ملی ہوئی تھی اسی طرح شاہراہ پر اس کے آگے ایک عمارت اور تھی گویا۔ اس کا شاہراہ والا اور اس میدان کا حصہ خالی تھا۔ لیکن اس طرف سے اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ نچلی منزل پر سپاٹ دیوار تھی۔ البتہ اوپری منزل پر ایک قطار میں چار کھڑکیاں تھیں۔ کھڑکیاں مضبوط لکڑی سے بنی ہوئی تھیں اور یہ بند تھیں۔ ربیک نے کہا۔ ''اگر ہم ان چھ سپاہیوں پر قابو پا لیں۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم ان کو تیروں سے نشانہ بنا سکتے ہیں۔''

''درمیانی فاصلہ زیادہ ہے۔'' میں نے انکار کیا۔ ''اگر ایک بھی بچ گیا اور اس نے چیخ ماری تو سارا کھیل خراب ہو جائے گا۔''

اس دوران میں، میں دیکھ رہا تھا کہ یہی عمارت شاہراہ تک بھی جا رہی تھی۔ میں نے ان سب سے وہیں رکنے کو کہا اور خود چھت پر لیٹا ہوا رینگ کر شاہراہ والے حصے کی طرف جانے لگا۔ مگر عمارت کی چھت شاہراہ سے پہلے ختم ہو گئی اس سے آگے ذرا سا احاطہ تھا۔ یہاں سے مجھے قید خانے کے سامنے والا حصہ کسی قدر نظر آ رہا تھا۔ قید خانے کے آگے سڑک کے ساتھ کم سے کم ایک درجن سرمئی وردی والے سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ یعنی یہاں زیادہ پہرہ تھا۔ میں چھت سے نیچے اترا اور احاطے کی دیوار سے سر نکال کر باہر دیکھا تو اس بار مجھے واضح دکھائی دیا۔ قید خانے کے سامنے دو درجن کے قریب سپاہی تھے۔ مگر اس کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ آگے غیر اہم سرکاری عمارتیں تھیں۔ شاہی علاقہ یہاں سے خاصے فاصلے پر تھا۔ یہ بات حوصلہ افزا تھی۔ یعنی مدد آنے میں وقت لگتا۔ اس کے باوجود ہمارے پاس وقت کم ہوتا۔

میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں اپنے ساتھیوں کو بھی یہیں بلانا ہوگا۔ ہمیں مزید اشیا کی ضرورت تھی۔ خاص طور سے اسلحہ اور خوراک کی۔ اتفاق سے ہمارے ساتھ ایزارٹ کا ایک آدمی تھا جس نے گودام تک ہماری رہنمائی کی تھی۔ میں نے واپس آ کر اس سے پوچھا۔ ''تم جانتے ہو کہ یہاں اسلحہ اور خوراک کے گودام کہاں ہیں؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''جانتا ہوں لیکن وہاں شاید کچھ نہ ملے کیونکہ ایک مہینا پہلے شاہی حکم سے سب کچھ شاہی محل کے گوداموں میں منتقل کر دیا گیا تھا۔''

''پھر بھی میں دیکھنا چاہوں گا۔'' میں نے ایزارٹ کی طرف دیکھا۔ ''تم اور ربیک واپس جا کر باقی ساتھیوں کو بھی یہیں لے آؤ۔''

وہ فوری روانہ ہو گئے۔ میں اور دوسرے اس آدمی کی رہنمائی میں اسلحے اور خوراک کے گوداموں کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاہی علاقہ اتنا بڑا نہیں تھا جو سارے شہر کی خوراک اور پوری فوج کے لیے بنایا جانے والا اسلحہ سمیٹ لیتا۔ یہ ممکن تھا بڑی مقدار میں خوراک اور اسلحہ لے جایا گیا مگر کچھ نہ کچھ مقدار ان گوداموں میں ہوگی۔ چند منٹ میں ہم ایک گودام کے سامنے تھے۔ ایزارٹ کے آدمی نے بتایا۔ ''یہ خوراک کا گودام ہے۔''

مترجم کے طور پر ایرٹ میرے ساتھ تھا۔ ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو کئی بڑے ہالوں پر مشتمل اس گودام کا بڑا حصہ خالی تھا مگر میرا اندازہ درست نکلا جب ہمیں ایک کونے میں بڑے سائز کے مٹکوں میں اجناس کا کچھ حصہ ملا۔ یہ ہماری خوراک کی کئی دن کی ضرورت پوری کر سکتی تھی۔ اس بڑے گودام میں بس یہی تھا۔ ایزارٹ کے آدمی نے بتایا کہ اس کے علاوہ بھی کئی گودام تھے جہاں خوراک رکھی جاتی تھی مگر میں نے اب خوراک کے بجائے اسلحے کے گودام تک چلنے کو کہا۔ اسلحے کا گودام یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ دو گلیوں بعد ایک مضبوط عمارت اسلحے کا گودام ثابت ہوئی۔ مگر یہاں ہمیں کچھ نہیں ملا تھا سوائے چند بیکار نیزوں اور چھوڑی ہوئی کمانوں کے۔ البتہ درجن بھر بڑی ڈھالیں تھیں جو تیروں سے بچاتی تھیں ان کے سوا سارا ہی اسلحہ سمیٹ لیا گیا تھا۔ ایزارٹ کا آدمی مزید کسی ایسے گودام سے ناواقف تھا جہاں اسلحہ رکھا جاتا ہو۔

ہم اس جگہ پہنچے جہاں سے ہم گوداموں اور کارخانوں والے علاقے میں داخل ہوئے تھے باقی افراد کو بھی اسی جگہ سے آنا تھا۔ جب تک ہم اس جگہ پہنچے ایزارٹ اور ربیک باقی سب کو لے آئے تھے اور وہ موقع دیکھ کر شاہراہ عبور کرنے لگے۔ چھ چھ افراد کے گروپ کی صورت میں وہ اس طرف آنے لگے۔ دس منٹ میں سب احاطے

کے اندر آچکے تھے۔ ان میں آریگو اور اس کے ساتھی نہیں تھے۔ ان کو اسی باغ میں بندھا چھوڑ آئے تھے۔ البتہ ساشا کو ساتھ لائے تھے۔ مگر اسے یہاں ایک ایسی جگہ قید کر دیا جہاں سے وہ از خود آزاد نہ ہو سکے اور نہ ہی کسی کو مدد کے لیے پکار سکے۔ ہم خوراک والے گودام تک آئے۔ خوراک دیکھ کر سب خوش ہوئے تھے کیونکہ ہمارے پاس کھانے کو کچھ رہا نہیں تھا۔ طے ہوا کہ فی الحال اسی گودام کو ٹھکانہ بنایا جائے۔ اس دوران میں، میں اپنے ذہن میں منصوبے کو حتمی صورت دے چکا تھا۔ میں نے ان سے کہا۔

"سب سے پہلے ہمیں باہر موجود سپاہیوں سے نمٹنا ہے۔ ان کی تعداد تیس کے آس پاس ہے۔ کوشش کرنی ہے کہ دو بدو مقابلے کی نوبت کم آئے اور ان کو تیروں کا نشانہ بنایا جائے۔ اگلا مرحلہ اندر گھس کر ریناٹ کے آدمیوں کو ختم کرنا اور اپنے ساتھیوں کو آزاد کرانا ہے۔"

"ہم کیا سامنے سے داخل ہوں گے؟" ایزارٹ نے پوچھا۔

"صرف سامنے سے نہیں بلکہ اس طرف سے بھی۔" میں نے قید خانے کے برابر والے میدان کی طرف اشارہ کیا۔

"اوپر نگران ہے۔"

"سب سے پہلے اسے تیر کا نشانہ بنانا ہے۔ پھر کمند ڈال کر اوپر جانا ہوگا۔"

ان کے پاس مڑی ہوئی لکڑی سے بنی مضبوط کمندیں تھیں۔ ان کی مدد سے وہ دو تین منزلہ بلند عمارت پر بھی چڑھ سکتے تھے۔ ایزٹ نے سر ہلایا۔ "یعنی ہمیں دو طرف سے حملہ کرنا ہے۔"

"بالکل۔" میں نے جواب دیا۔ "اس کے بغیر کامیابی مشکل ہے۔ ممکن ہے قید خانے کا دروازہ حملہ ہوتے ہی اندر سے بند کر لیا جائے اور اسے توڑنا بہت مشکل کام ہے اس صورت میں اوپر سے کیا جانے والا حملہ کارگر ہوگا۔"

"اس طرف سے کتنے آدمی حملہ کریں گے؟"

"کم سے کم تیس آدمی ادھر سے حملہ کریں گے۔ ماہر تیر اندازوں کا ایک گروہ پیچھے رہے گا۔ وہ نہ صرف عمارت میں نظر آنے والے دشمنوں کو نشانہ بنائے گا بلکہ اگر آس پاس کہیں سے ریناٹ کے آدمی آتے دکھائی دیں تو انہیں بھی روکے گا۔ سامنے سے جانے والے بھی اتنے ہی ہوں گے۔ باقی افراد کمک کے طور پر ہوں گے۔ جہاں ان کی ضرورت ہو ان کو طلب کر لیا جائے۔ ایک بات اور ہے کہ ہمیں اسلحے کی اشد ضرورت ہے اس لیے دشمن کا اسلحہ ہرگز نہ چھوڑا جائے۔ ایک تیر اور سنگی چاقو بھی نہ چھوڑا جائے۔"

"اگر ہم کامیاب ہوتے ہیں تو آزاد کرانے والوں کو کہاں لے کر جائیں گے۔"

"اسی جگہ لانا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے لیے ہمیں سیڑھیوں کی ضرورت ہوگی کہ آزاد ہونے والے ان کی مدد سے با آسانی اس طرف آسکیں۔ رسیوں سے یہ کام دیر میں اور دشواری سے ہوگا۔"

"سیڑھیاں کہاں سے ملیں گی؟" ربیک نے پوچھا۔

"اسی علاقے سے۔" میں نے یقین سے کہا۔

سیڑھی بنانے والا کارخانہ یہیں تھا اور ایزارٹ کا آدمی اس سے واقف تھا۔ میں نے ایک درجن افراد کے ساتھ اسے روانہ کیا کہ وہ جا کر سیڑھیاں لے آئے۔ سیڑھیوں کے علاوہ ہمیں آگ لگانے والے روغن کی ضرورت تھی۔ مگر اس کے بارے میں سب لاعلم تھے کہ وہ کہاں سے ملے گا۔ اس کے لیے ایک ٹیم روانہ کی جو گوداموں میں آتشیں روغن یا اس کے علاوہ جو کام کی چیز ملے وہ لے آئے۔ اب اگلا مرحلہ تھا۔ ڈرامے کی تیاری کا جس کی مدد سے ہمیں قید خانے کے نزدیک پہنچنا تھا۔ اس کے لیے پندرہ افراد کا انتخاب کیا۔ وہ سب کمزور صحتوں والے اور دیکھنے میں عام شہری لگتے تھے۔ پہلے آریگو اور اس کے ساتھیوں کو استعمال کرنے کا سوچا تھا مگر اس میں قباحت تھی کہ اگر وہ غیر متوقع طور پر آزاد ہو جاتے یا بول پڑتے تو ہمارا راز قبل از وقت کھل جاتا۔ اس لیے انہیں وہیں باغ میں چھوڑ دیا گیا تھا اور ساتھ لے جانے کے لیے تمام اپنے ساتھی منتخب کیے تھے۔ ایزارٹ کی مدد سے ماہر تیر انداز پہلے ہی الگ کر لیے تھے۔ انہیں قید خانے کے ساتھ گوداموں کی چھتوں پر لگا دیا تھا۔ یعنی ہر ایک کو اس کی جگہ بتا دی تھی مگر فی الحال وہ چھت پر نہیں تھے۔ خطرہ تھا کہ کسی وقت بھی انہیں قید خانے کے نگران مینار سے دیکھا جا سکتا تھا اس لیے وہ اسی وقت اپنی جگہوں پر جاتے جب حملے کا وقت آ جاتا۔

سیڑھیاں لینے کے لیے جانے والے آ گئے۔ اس دوران میں ہم اپنا ڈراما ٹیم تیار کر چکے تھے اور انہیں سمجھا چکے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ کسی قدر ریہرسل بھی کر لی تھی۔ کچھ دیر بعد دوسری ٹیم بھی آ گئی اور اس نے رپورٹ دی کہ آتشیں روغن کہیں نہیں تھا۔ البتہ ایک گودام سے انہیں کچھ اسلحہ ملا تھا وہ سمیٹ لائے تھے۔ اس میں پچاس کے قریب نیزے، اتنے ہی تیروں کے ترکش اور کمانیں

تھیں۔ یہ بھی غنیمت تھا۔ اس حملے میں سب سے اہم کردار تیر اندازوں کا تھا وہ جتنے تاک کر نشانے لگاتے اتنی ہی جلدی ہم اندر گھسنے میں کامیاب رہتے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمیں اسلحے کی اشد ضرورت تھی اور جتنا بھی اضافی اسلحہ ملتا ہماری کامیابی کے امکانات اتنے ہی بڑھ جاتے۔

میرا اندازہ تھا کہ نصف رات کا وقت گزر چکا ہے اور یہ شاید صبح سے پہلے کا پہر تھا۔ مگر ابھی صبح کی روشنی ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔ میرے حساب سے حملے کا بہترین وقت رات کا آخری پہر تھا۔ اس میں ابھی وقت تھا۔ میں نے ایرٹ کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ گوداموں اور کارخانوں میں کوئی ایسی عمارت تلاش کرے جہاں قید خانے سے چھڑائے جانے والے افراد کو رکھا جائے۔ ان میں سے اکثر کی حالت خراب ہی ہوتی اور وہ فوری طور پر کسی سرگرمی میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہوتے۔ انہیں خوراک اور آرام کی ضرورت ہوتی۔ خوراک کے خالی گودام بھی خاصے بڑے تھے لیکن وہ اس جگہ سے بہت نزدیک تھے اور اگر ریناٹ کے آدمی یہاں آتے تو سب سے پہلے ان ہی گوداموں کو چیک کیا جاتا۔ اس لیے یہاں سے دور نکل جانا ضروری تھا۔ ایک عمارت کا انتخاب کر کے خوراک کا ذخیرہ بھی وہیں پہنچا دیا گیا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا مگر ضروری کام بھی نمٹ گئے تھے اور بالآخر آرگون میں وہ وقت آ گیا جب میں پوری طرح حرکت میں آتا۔ شاید یہی اصل جنگ کا نقطۂ آغاز تھا۔ تقریباً پچاس افراد پر مشتمل منتخب دستہ لے کر ہم گوداموں اور کارخانوں سے نکل کر مرکزی شاہراہ پر آئے۔

ہم میں سے پندرہ افراد عام لباس میں تھے۔ ان کے لباس پھٹ گئے تھے اور ان کے جسموں اور لباس پر جگہ جگہ سرخی نمایاں تھی۔ وہ ہمارے گھیرے میں لڑکھڑا کر چل رہے تھے اور ہم خاص سپاہ کی سرمئی وردیوں میں تھے۔ ہم نے یوں انہیں گھیر رکھا تھا جیسے وہ قیدی ہوں اور مقابلے کے بعد گرفتار ہوئے ہوں۔ اس دستے کا سربراہ ایزارٹ تھا۔ میں نے اسے سربراہ اس لیے بنایا کہ میں نے محسوس کیا کہ ربیک، ایرٹ اور قلعوں سے تعلق رکھنے والے دوسرے نوجوان یہی زبان ذرا مختلف لہجے میں بولتے تھے۔ جب کہ ایزارٹ بالکل مقامی لہجہ رکھتا تھا کیونکہ اس کا تعلق آرگون سے ہی تھا۔ پھر ایزارٹ تجربے کار اور ذہین آدمی تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس میں موقع کی مناسبت سے سوچنے کی صلاحیت تھی۔ ہم ممکنہ حد تک فوجی چال ڈھال کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے مگر ہماری وردیوں پر مخصوص نشانات

نہیں تھے۔

نشانات والی جگہ کو ہم اسلحے اور دوسری چیزوں سے چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جیسے ہمارے پاس اضافی کمانیں اور ترکش تھے اسی طرح اضافی نیزے تھے۔ جیسے گرفتار لوگوں سے اسلحہ بھی ملا ہو۔ ابھی شاہراہ پر آگے پیچھے کوئی نہیں ملا تھا۔ مجھے کسی قدر تعجب تھا کہ ریناٹ کے آدمیوں نے باقی شہر کو یوں چھوڑ رکھا تھا جیسے اس سے کوئی غرض ہی نہ ہو اور صرف خاص حصوں تک محدود تھے۔ حالانکہ انہیں ان حصوں سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔ اس طرح انہوں نے شاہی اور سرکاری علاقے سے متصل گوداموں اور کارخانوں کے علاقے کو بالکل خالی چھوڑا ہوا تھا حالانکہ یہاں پہرہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر ایسا لگ رہا تھا کہ ریناٹ کے اعلیٰ فوجی افسران اپنا دماغ استعمال نہیں کر رہے تھے اور صرف ان ہی احکام پر عمل کر رہے تھے جو اوپر سے آ رہے تھے۔ آمریت میں ایسا ہی ہوتا ہے جب سرکاری اہلکار صرف وہی کرتے ہیں جس کا حکم دیا جاتا ہے اور کسی بھی معاملے میں اپنی مرضی نہیں چلاتے کہ کہیں یہ الٹا ان کے گلے نہ پڑ جائے۔ چاہے معاملہ ان کی ذمے داری کا کیوں نہ ہو۔ دس منٹ بعد ہم قید خانے کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ شروع میں سپاہی چونکے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے ہی بھائی بند چلے آ رہے ہیں تو وہ مطمئن ہو گئے۔ البتہ ہمارے ساتھ قیدیوں کو دیکھ کر ان میں سے دو افراد ہماری طرف آئے۔ ایزارٹ سب سے آگے تھا انہوں نے اسی سے پوچھا۔

”یہ کون ہیں؟“

”قیدی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”انہیں قید خانے میں ڈالنا ہے۔“

”یہاں مزید کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”اندر اتنے قیدی بھرے ہیں کہ ان کے لیٹنے تو کیا بیٹھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ انہیں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا تمہیں حکم نہیں ملا کہ باغیوں کو پکڑنے کے بجائے مار دو۔“

”ملا ہے لیکن یہ اہم قیدی ہیں ان سے پہلے معلومات حاصل کی جائیں گی۔ کل انہیں ایک اعلیٰ افسر کے سامنے پیش کیا جانا ہے۔“

”تب اپنے ساتھ لے جاؤ، اندر تو گنجائش نہیں ہے۔“

”مجھے یہاں کے نگران افسر سے ملواؤ۔“ ایزارٹ

نے مطالبہ کیا۔

"مجھ سے ملو میں یہاں کا نگران افسر ہوں۔" اس نے ایزارٹ کی آنکھوں میں جھانکا۔ "جب میں کہہ رہا ہوں کہ اندر گنجائش نہیں ہے تو نہیں ہے۔ اندر اتنی بدبو ہے کہ میں خود دفتر میں بیٹھنے کے بجائے یہاں بیٹھا ہوں۔ بہر حال کل تک ان کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہی قید خانے کو صاف کرانا پڑے گا۔"

میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی، فیصلے سے مراد میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ شاید ان سب قیدیوں کو عنقریب ختم کر دیا جاتا۔ یہ فیصلہ ناگزیر تھا مگر کسی وجہ سے اب تک ٹلتا آیا تھا۔ میرے ساتھ آنے والے بتدریج یوں پھیل رہے تھے کہ وہ پہرے پر معمور سپاہیوں کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ ایزارٹ سے گفتگو کرنے والا قید خانے کا نگران افسر بات کرتے ہوئے چونکا۔ اس نے کہا۔ "اے تمہاری وردیوں کے نشانات کہاں ہیں۔"

حملے کا وقت آ گیا تھا میں نے ایرٹ کی طرف دیکھا اور اس نے پرندے کی آواز نکالی۔ تیر انداز اپنی اپنی جگہ سنبھال چکے تھے اور ان کے تیر کمانوں پر کھنچے ہوئے تھے۔ سپاہی اور ان کا افسر پرندے کی آواز پر چونکے اور فوراً ہی سنسناتی آوازوں نے ان کو ہوشیار کیا۔ ان کا افسر چلایا۔ "ہوشیار...... حملہ ہوا ہے۔"

یہ اس کے آخری الفاظ تھے جو اس نے ادا کیے۔ اس کے فوراً بعد ایزارٹ کا نیزہ اس کے کھلے منہ میں داخل ہو کر دوسری طرف نکل گیا۔ اس نے اتنی سرعت سے وار کیا کہ میں بھی نہ دیکھ سکا۔ تیر اندازوں نے سامنے موجود سپاہیوں کو نشانہ بنایا تھا اور ان میں سے سات آٹھ گرے تھے۔ تیر اندازوں اور ایزارٹ کے حملے کے ساتھ ہی ہم حرکت میں آ گئے۔ قیدیوں کا کردار ادا کرنے والے اپنے لباس میں چھپے ننگے چاقو نکال کر حرکت میں آ گئے۔ مگر انہوں نے براہِ راست حملے کے بجائے سپاہیوں کو گھیر لیا اور دھوکا دے کر حملے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم ہوشیار تھے اس لیے ہم نے تذبذب کے شکار سپاہیوں پر ہلہ بولنے میں دیر نہیں لگائی جو نزدیک تھے۔ ان پر نیزے سے حملہ کیا اور دور والوں کے لیے تیر کمان سنبھال لیے تھے۔ حملہ کے آغاز کے ساتھ ہی جو مرنے سے بچ گئے تھے وہ زخموں کی وجہ سے چلا رہے تھے اور جو ٹھیک تھے وہ قید خانے میں موجود اپنے ساتھیوں کو خبردار کرنے کے لیے چیخ رہے تھے۔

ذرا سی دیر میں وہاں چھایا سناٹا اور سکون شور و ہنگامے میں بدل گیا تھا۔ مگر یہ شور و ہنگامہ ریناٹ کے شاہی علاقے میں موجود سپاہ تک نہیں جا سکتا تھا۔ البتہ اگر قریبی کوئی دستہ مقیم ہوتا تو وہ سن سکتا تھا۔ اس کے علاوہ خبردار کرنے کے لیے کوئی سنکھ پھونکا جاتا تو ریناٹ کے آدمی ہوشیار ہو جاتے۔ دوسروں سے بے نیاز ہو کر میں نیزے سمیت اس سپاہی پر جھپٹا جو اپنے افسر کے مرنے کے بعد ایزارٹ کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایزارٹ کا نیزہ افسر کی کھوپڑی میں پھنس گیا تھا اور وہ اسے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس حالت میں وہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے سپاہی ایزارٹ کو اپنے نیزے کا نشانہ بناتا میرا نیزہ اس کے نیزے والے بازو میں اتر گیا۔ اس نے دھاڑ کر نیزہ چھوڑ دیا اور میرے نیزے کو دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ میں نے اپنا نیزہ چھوڑ کر اس کا نیزہ اٹھا لیا اور اس بار اس کی گردن کو نشانہ بنایا۔ اس کا اپنا نیزہ اس کی گردن میں اترا تو اس نے میرا نیزہ چھوڑ کر اسے تھام لیا میں نے شکریے کے ساتھ اپنا نیزہ واپس لیا۔

"شکریہ۔" ایزارٹ نے میری طرف دیکھا اور قید خانے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ جو کھل گیا تھا اور اندر سے مزید سپاہی باہر آ رہے تھے۔ آنے والوں کی تعداد دو درجن کے لگ بھگ تھی اور اب ریناٹ کے سپاہیوں کی تعداد تقریباً ہمارے مساوی ہو گئی تھی۔ اس لیے پہلے سے طے شدہ حکمتِ عملی کے تحت ہم پیچھے ہٹنے لگے اور سب نے تیر کمان سنبھال لیے تھے۔ دوسری طرف تیر انداز دستے میں سے نصف یعنی پندرہ تیر انداز اس طرف موجود سپاہیوں سے نمٹنے کے بعد ہمارے ساتھ شامل ہو گئے تھے اور اب بلندی سے قید خانے کے سامنے موجود سپاہیوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کمندوں والا دستہ اپنا کام کرنے کو تیار تھا۔ شاہراہ کے اس طرف آنے کے بعد ہم پوش علاقے کے ساتھ لگے بڑے تنوں والے درختوں کی آڑ لے رہے تھے اور یہاں سے قید خانے کے سپاہیوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔

سامنے موجود سپاہیوں میں سے ڈیڑھ درجن گر چکے تھے اور ہمارے بھی تین آدمی نشانہ بنے تھے۔ سپاہی اپنی ڈھالوں کی پناہ لے رہے تھے مگر ان کے لیے مصیبت یہ تھی کہ اگر وہ ہماری سمت ڈھال کرتے تو گودام کی عمارت پر موجود تیر انداز انہیں نشانہ بنا سکتے تھے اور اگر وہ ان کی طرف ڈھال کرتے تو ہمارا نشانہ بنتے۔ پھر ہم ان کے پیروں کو نشانہ بنانے لگے جو ڈھال سے باہر تھے۔ آنے والے چند منٹوں میں مزید کوئی دس سپاہی ہمارا نشانہ بنے اور اتنے ہی

زخمی ہوئے تھے تو ان کا حوصلہ جواب دے گیا اور انہوں نے پلٹ کر عمارت میں گھسنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے وہ اندر جاتے دھماکے سے مرکزی دروازہ بند ہوا اور جو باہر تھے وہ باہر ہی رہ گئے۔ باہر آنے والوں کی تعداد ڈھائی درجن تک پہنچ گئی تھی۔ اتنے ہی باہر بھی تھے۔ یعنی ساٹھ کے قریب سپاہی تھے۔ ان میں سے پچیس مارے جا چکے تھے اور پندرہ زخمی تھے۔ گویا لڑنے کے قابل صرف بیس تھے اور انہوں نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی کہ وہ ہم سے لڑ نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے ہتھیار پھینکنا شروع کر دیئے اور ہاتھ اٹھا کر جان بخشی کی درخواست کرنے لگے۔ مگر ہمارے ساتھ موجود حریت پسند غصے میں بھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایزارٹ کے روکتے روکتے مزید چند سپاہیوں کو مار دیا تھا۔

مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ اندر گھسنے والے ہمارے آدمیوں نے دروازہ بند کیا تھا اور اب وہ اندر موجود سپاہیوں سے نمٹ رہے تھے۔ چیخ و پکار کی باہر تک آتی آوازیں بتا رہی تھیں کہ اندر جنگ ابھی جاری تھی۔ ایزارٹ کے آدمی گرفتار سپاہیوں کی مشکیں کسنے لگے۔ میں اور ایزارٹ دروازے تک پہنچ گئے اور دستک دے کر اسے کھولنے کو کہنے لگے۔ اندر سے آتی آوازوں کے پس منظر میں ہمیں چلانا پڑ رہا تھا۔ اندر گھسنے والے دستے کا سربراہ ریبک تھا۔ دروازہ اسی نے کھولا اور اس کا سرمئی لباس خون میں رنگا ہوا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے اندر قابو پالیا ہے۔ کچھ بچے ہیں ان سے نمٹ رہے ہیں۔''

ہم اندر آئے اور نگران افسر کی بات کی تصدیق ہو گئی۔ اندر شدید بدبو تھی اور قیدیوں کو جانوروں کی طرح کوٹھریوں میں ٹھونسا ہوا تھا۔ ان کو رفع حاجت کے لیے بھی باہر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم سب ہی کوٹھریوں کے دروازے کھولنے لگے۔ کم خوراکی، کم آرام اور غیر انسانی ماحول میں رہنے کی وجہ سب ہی کی حالت بری تھی۔ وہ یوں باہر نکلے جیسے جانور آزاد ہوتے ہیں۔ افسوسناک بات یہ تھی کہ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ مرد غضب ناک تھے اور انہوں نے باہر آتے ہی سب سے پہلے پکڑے جانے والے سپاہیوں پر حملہ کیا اور انہیں بے دریغ مارنے لگے۔ باہر موجود گرفتار سپاہی بھی اندر لائے گئے تھے۔ وہ ان پر بھی ٹوٹ پڑے اور وہ کسی کی سننے کو تیار نہیں تھے۔ ہمارے آدمیوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو وہ ان سے لڑنے کو بھی تیار ہو گئے تھے۔ ان کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''یہاں اسلحہ اور خوراک تلاش کرو۔''

وہ سب پھیل کر یہ دونوں چیزیں تلاش کرنے لگے۔ اس دوران میں، میں نے اور ایزارٹ نے بہ مشکل ان لوگوں کو سمجھایا کہ وہ انتقام کے چکر میں نہ پڑیں۔ اس سے پہلے کہ ریناٹ کی مزید فوج یہاں آئے اور ہم محصور ہو کر رہ جائیں ہمارا یہاں سے نکلنا لازمی ہے۔ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ ویسے بھی وہ سب ہی سپاہیوں کو ہلاک کر چکے تھے جو چند ایک بچے تھے ان کی حالت سے بھی لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہیں گے۔ ذرا سی دیر میں ریناٹ کی خاص فوج کا دسواں حصہ ختم ہو گیا تھا۔ ایزارٹ اپنے ساتھی الگ کر رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہاں کم سے کم ایک ہزار افراد قید تھے جن میں بڑی تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ مال غنیمت اور ان لوگوں کو لے کر ہم باہر نکلے اور ان لوگوں کو فوری طور پر سیڑھیوں کے سہارے گوداموں والے احاطے میں منتقل کیا جانے لگا۔ کمزور، زخمیوں، عورتوں اور بچوں کے لیے سیڑھیاں استعمال کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ دوسرے انہیں سہارا دینے لگے اور منظم طریقے سے یہ مشکل مرحلہ نمٹا لیا گیا۔

نصف گھنٹا گزر چکا تھا اور ابھی تک شاہی علاقے کی طرف سے کسی کی آمد کے آثار نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ شاید ان تک خبر پہنچی ہی نہیں تھی اور اگر ایسا ہی تھا تو یہ ہمارے لیے زیادہ اطمینان بخش بات تھی۔ اس سے پہلے کہ ریناٹ اور اس کے آدمی ہوشیار ہوتے ہمیں منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل کرتے ہوئے آرگون کی فصیل اور گیٹ پر قبضہ کر لینا تھا۔ آخری آدمی کے اندر جاتے ہی سیڑھیاں کھینچ لی گئیں اور وہ سب دوسری طرف اتر چکے تھے۔ ہم ان کو اسی عمارت میں لائے جہاں انہیں ٹھہرانا تھا۔ یہ سفر خاموشی سے نہیں ہوا تھا۔ زخمی کراہ رہے تھے۔ بچے اور بعض عورتیں رو رہی تھیں۔ انہیں نرمی سے چپ کرانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان کا رونا حق بہ جانب تھا۔ انہوں نے چند دن میں بہت زیادہ مشکلات دیکھی تھیں۔ اتفاق کی بات ہے ان کی رہائش کے لیے جس جگہ کا انتخاب کیا اس کے احاطے میں پانی کا کنواں تھا۔ پانی دیکھ کر لوگ اس کی طرف لپکے اور ہم ایک بار پھر انہیں روکنے میں ناکام رہے۔ میں نے ایزارٹ سے کہا۔

''انہیں چھوڑو، یہ دیکھو کہ ان میں سے کتنے ہیں جو فوری طور پر ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہیں۔''

''تقریباً سب تیار ہیں مگر جسمانی حالت سب کی

خراب ہے۔"

بچوں اور عورتوں کو اندر لے جایا گیا۔ ان کی حالت دیکھتے ہوئے کچھ رضا کار فوری طور پر انہیں کھانا پانی دینے لگے تھے۔ میں ایزارٹ کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ کون جسمانی لحاظ سے ہمارا ساتھ دینے کا اہل ہے۔ ہم ان افراد کو الگ کر رہے تھے۔ تقریباً سو افراد ایسے تھے جو فوری کھا پی کر ہمارا ساتھ دے سکتے تھے۔ اتفاق کی بات ہے ہمارے پاس اتنے ہی افراد کے لیے اضافی ہتھیار تھے۔ میرے ساتھی آتے ہوئے ممکنہ حد تک سارے ہی ہتھیار حد یہ کہ زرہ بکتر تک اتار لائے تھے۔ نئے لڑنے والوں میں ہتھیار تقسیم کیے جا رہے تھے اور انہیں عام سپاہ والے لباس جو پہلے سے ہمارے پاس تھے مہیا کیے گئے۔ کچھ سرمئی وردیاں قید خانے سے ہمارے ہاتھ لگی تھیں۔ اگرچہ گودام میں مزید سرمئی وردیاں تھیں۔ مگر فی الحال ہمیں ان کی ضرورت نہیں تھی۔ مجموعی طور پر ڈیڑھ سو افراد تیار ہو گئے اور انہیں نہ صرف اندر موجود عام سپاہ کو بے بس کرنا تھا بلکہ قلعے کی فصیل اور گیٹ پر بھی قبضہ کرنا تھا۔

باقی مسلح افراد کو وہیں عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا حالانکہ وہ بھی ساتھ جانے پر مصر تھے مگر ان کے لیے ہمارے پاس پورا اسلحہ نہیں تھا۔ پھر یہاں حفاظت کے لیے کچھ لڑنے والوں کا ہونا لازمی تھا۔ جن عورتوں کی حالت بہتر تھی انہوں نے کھانا بنانے اور کھلانے کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ ایک گھنٹے کے اندر حالات پُر سکون اور جیسے معمول پر آ گئے تھے۔ میں حیران ہوا کہ انسان کتنا سخت جان ہے۔ کچھ دیر پہلے یہ لوگ جانور ہو رہے تھے مگر ایک گھنٹے کے اندر انہوں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اکثر نے تو نہا دھو بھی لیا تھا۔ تقریباً سب ہی غلیظ ہو رہے تھے۔ لباس ان کے پاس تھے نہیں اس لیے لباس میں نہائے تھے اور انہیں صاف کر لیا تھا۔ جب ہم وہاں سے نکل رہے تھے تو کنویں کے پاس عورتیں بچوں کو نہلا رہی تھیں اور اس کے بعد وہ خود کو بھی صاف کرتیں۔ مجھے تشویش ہوئی کہ پانی کا اتنا زیادہ استعمال خود بتا دے گا کہ یہاں انسان موجود ہیں۔ یہ پانی نالیوں سے بہہ کر باہر بڑی نالیوں میں جا رہا تھا۔

اگرچہ ابھی تاریکی تھی تو پردہ تھا مگر دن میں راز فاش ہو جاتا کہ یہاں لوگ موجود ہیں۔ میں نے ایزارٹ سے کہلوایا کہ نہانے دھونے کے بعد پانی کے استعمال میں احتیاط کریں اور صرف اشد ضرورت کے وقت پانی لیں۔ اگر رینات کے آدمیوں کو یہاں ان کی موجودگی کا پتا چل گیا تو اس بار وہ انہیں قید نہیں کریں گے بلکہ مار دیں گے۔ ایزارٹ نے انہیں حکم دیا کہ اب وہ پانی بہت احتیاط سے استعمال کریں۔ ہم باہر نکل کر بیرکس کی طرف جانے والی سڑک پر آئے اور فوجی دستے کی صورت اختیار کر کے بیرکس کی طرف بڑھے۔ ایزارٹ نے عقل مندی کی تھی اور مارے جانے والے نگران افسر اور اس کے ساتھیوں کی وردیوں سے نشانات اتروا لیے تھے اور اب وہ اس کی اور دوسروں کی وردیوں پر تھے یعنی کچھ کے پاس نشانات تھے۔ عام سپاہ کی وردی والا دستہ پیچھے رکھا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے ایزارٹ اور ربیک نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ کے ذہن میں کیا ہے کیا ہم حملہ کریں گے؟"

"نہیں اس کے برعکس ہماری کوشش ہو گی کہ دونوں طرف سے ایک بھی جان ضائع کیے بغیر فصیل اور گیٹ پر قابض ہو جائیں۔"

وہ حیران ہوئے۔ "یہ کس طرح ممکن ہے؟"

میں نے انہیں اپنا منصوبہ بتایا تو وہ متفق نظر آنے لگے کہ یہ ممکن ہے۔ ہم روانہ ہوئے اور بیرکس کے پاس پہنچے تو اندر سے چند افسران نکل آئے۔ ایزارٹ نے ان سے کہا۔

"شاہ معظم نے حکم دیا ہے۔ مزید کمک میدانِ جنگ کی طرف روانہ کی جائے۔"

ایک افسر آگے آیا۔ اس نے کہا۔ "لیکن ہمارے پاس آدمی ہی کہاں ہیں۔ یہاں اب مشکل سے ڈھائی سو افراد رہ گئے ہیں جو فصیل اور گیٹ کی حفاظت کر رہے ہیں۔"

"اب فصیل اور گیٹ کی حفاظت ہم کریں گے۔ تم سب تیار ہو جاؤ۔" ایزارٹ نے کہا۔ "وہاں سپاہیوں کی اشد ضرورت ہے۔"

اب تک زبانی بات ہو رہی تھی۔ اس افسر نے پہلی بار کہا۔ "شاہ معظم نے حکم کے ساتھ نشانی بھیجی ہو گی۔"

اس کی مراد کسی خاص شے تھی۔ ایزارٹ اس سے واقف تھا اس نے کہا۔ "چھڑی عجلت میں رہ گئی ہے۔ اس سے اندازہ لگا لو کہ یہ حکم کتنی جلدی تعمیل کا متقاضی ہے۔"

میں ایزارٹ کی ذہانت کو داد دے رہا تھا۔ اس نے ایک واضح سقم کو بھی اپنے حق میں استعمال کر لیا تھا۔ دوسرے اس کا انداز اتنا پُر اعتماد تھا کہ میں بھی دل ہی دل میں داد دے رہا تھا۔ وہ پوری دھونس اور بااختیار انداز میں بات کر رہا تھا۔ افسر ہچکچایا پھر اس نے پلٹ کر اپنے آدمیوں سے

کہا۔ ''سب کو فوری روانگی کا حکم دو۔''

''فصیل اور گیٹ پر موجود سپاہ کو بھی بلوا لو۔ وہاں میرے آدمی تعینات ہوں گے۔'' ایزارٹ نے حکم دیا۔ چند منٹ میں ہم فصیل کی طرف روانہ ہوئے تھے کیونکہ وہاں سے عام سپاہ کے آدمی ہٹ رہے تھے۔ ڈھائی سو کے قریب عام سپاہی اپنے ہتھیاروں اور ساز و سامان کے ساتھ روانہ ہونے کے لیے گیٹ کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔ میں بے چین تھا کہ یہ لوگ جلد از جلد گیٹ سے باہر جائیں اور ہم گیٹ بند کر دیں۔ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں ریناٹ کی فوج نہ نمودار ہو اور راز فاش ہو جائے۔ بیرکس کی طرف سے مزید سپاہی تیار ہو کر آ رہے تھے ان کے افسران آ چکے تھے۔ کچھ سپاہی باقی تھے۔ خدا خدا کر کے وہ بھی آئے اور ایزارٹ کے اشارے پر لکڑی کے بھاری بھرکم دروازے کھولنے والا پہیا گھمانا شروع کیا اور ایک کواڑ کھلنے لگا۔ میری نظر شہر سے آنے والی شاہراہ پر مرکوز تھی۔ اس لیے میں نے ہی سب سے پہلے اس طرف سے آنے والی سپاہ کو دیکھا۔ میں نے ایزارٹ کو اس طرف متوجہ کیا اور اس نے دیکھنے کے بعد کڑک کر جانے والے سپاہیوں سے کہا۔

''تم لوگوں کی سستی کی وجہ سے اب میری سرزنش ہو گی دیکھو شاہ معظم نے دیکھنے کے لیے دوسرا دستہ بھیج دیا ہے کہ تم لوگ روانہ ہوئے ہو یا نہیں اور یقیناً تم لوگوں کو بھی بعد میں سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

یہ سن کر سپاہیوں کے چہرے زرد پڑ گئے تھے۔ وہ ریناٹ کے سفاکی کے نہ صرف گواہ تھے بلکہ اس میں شریک بھی تھے۔ اس لیے انہوں نے گیٹ کے پوری طرح کھلنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور اس کی طرف لپکے تھے۔ اس وقت وہ اپنی فوجی تنظیم بھی بھول گئے تھے اور ہجوم کی طرح دوڑ رہے تھے۔ ان کے افسران آگے آگے تھے۔ ایزارٹ نے ایک بار پھر مشکل حالات کو اپنے حق میں استعمال کر لیا تھا۔ عام سپاہ ابھی نکل رہی تھی کہ میں نے ایرٹ کو اشارہ کیا وہ ساتھیوں کو تیار کرنے لگا۔ ان کا بڑا حصہ عجلت میں فصیل پر روانہ کر دیا گیا جہاں سے وہ بہتر حملہ کر سکتے تھے۔ شہر سے آنے والا دستہ ابھی فرلانگ کے فاصلے پر تھا کہ تمام سپاہی باہر نکل گئے اور پہیا گھمانے والے اب اسے الٹا گھما کر گیٹ بند کرنے لگے۔ سو کے قریب افراد فصیل پر جا چکے تھے اور یہ سب اچھے تیر انداز تھے باقی نیچے تھے جو نیزوں اور دست بدست لڑائی کے ماہر تھے۔ ہم اس طرح پوزیشن لے رہے تھے کہ حملے کی صورت میں اپنا بہترین دفاع کر سکتے تھے۔

ریناٹ کے آدمی جس طرح آ رہے تھے اس سے لگ رہا تھا کہ وہ ہمیں اپنا ہی آدمی تصور کر رہے تھے اور بے فکری سے چلے آ رہے تھے۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ریناٹ کی فوجی تنظیم میں کتنی بڑی خامیاں تھیں۔ اس کے آدمیوں میں آپس میں رابطے کا فقدان تھا۔ جو جنگ میں بہت بڑی خامی سمجھا جاتا ہے۔ بہت سی بڑی فوجیں اسی وجہ سے جنگ میں شکست کھا گئیں کہ ان کے مختلف دستوں میں آپس میں رابطہ نہیں تھا۔ وہ یہ تو جان گئے تھے کہ قید خانے پر حملہ کر کے قیدیوں کو چھڑا لیا گیا ہے مگر اس سے بے خبر تھے کہ حملہ کرنے والے ان کی ہی طرح وردیاں پہنے ہوئے تھے۔ حملہ آوروں اور مفروروں کی تلاش میں پارٹیاں روانہ کی گئی تھیں اور یہ ان میں سے ایک تھی۔ دستے میں سپاہیوں کی تعداد ساٹھ سے زیادہ نہیں تھی اور لازمی بات تھی کہ شہر کے دوسرے حصوں میں ایسے ہی دستے روانہ کیے گئے تھے۔

مجھے فکر ہوئی کہ کہیں انہیں گوداموں والے حصے کا خیال نہ آ جائے۔ وہاں لڑنے والوں کی تعداد مشکل سے ساٹھ ستر افراد پر مشتمل تھی اور ان کے پاس بھی ناکافی اسلحہ تھا۔ باقی افراد کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہ مسلح سپاہیوں سے لڑتے۔ اس صورت میں ان لوگوں کا خاتمہ یقینی ہوتا اور ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جب قید خانے سے قیدی آزاد کرائے جا رہے تھے تو میں خاص طور سے عورتوں میں روبیر کو دیکھ رہا تھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ اسے یقیناً کہیں اور رکھا گیا تھا اگر وہ زندہ تھی تو۔ جب ہم گودام پہنچے تو میں نے چھڑائے جانے والے مردوں میں شامین نامی مرد کے بارے میں پوچھا۔ مگر ان میں شامین بھی نہیں تھا۔ اگر شامین قید تھا تو وہ بھی یہاں نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ شامین روبیر سے مخلص نہیں تھا وہ صرف اسے استعمال کر رہا تھا۔ مگر ضروری نہیں تھا کہ میرا خیال درست نکلتا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ وہ دونوں اب زندہ نہ ہوں۔ ریناٹ نے انہیں سزائے موت دے دی ہو۔ ایزارٹ آنے والوں کو دیکھ رہا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔

''ان کا کیا کرنا ہے؟''

''خاتمہ لیکن اس طرح کہ ان میں سے ایک بھی فرار نہ ہو سکے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' اس نے سر ہلایا اور غیر محسوس انداز میں اپنے آدمیوں کو یوں پھیلانے لگا کہ جب ریناٹ کے آدمی نزدیک آتے تو عملاً وہ ان کے نرغے میں آ جاتے۔

اس طرح حملے کی صورت میں ان میں سے کسی کے بچ کر نکلنے کا امکان کم ہوتا۔ ایزارٹ اور وہ سپاہی آگے تھے جن کی وردیوں پر نشانات تھے اور باقی پس منظر میں یا اتنی دور تھے کہ نشانات کی غیر موجودگی واضح نہ ہو۔ دستہ مارچ کرتا ہوا ہمارے نزدیک پہنچا اور تقریباً بیس گز کے فاصلے پر رک گیا۔ اس کا افسر آگے آیا اور اس نے ایزارٹ سے کہا۔ ”قید خانے پر حملہ ہوا ہے اور وہاں موجود سپاہیوں کو قتل کر کے تمام قیدیوں کو آزاد کرا لیا گیا ہے۔ ہمارا ایک سپاہی بھی یہ بتانے کے لیے زندہ نہیں رہا کہ وہاں کیا ہوا تھا؟“

”یہ تو بری خبر ہے۔“

”ہمارے آدمی شہر بھر میں ان کو تلاش کر رہے ہیں۔ یہاں فصیل کے سپاہی اور کمانڈرز کہاں ہیں۔“

ایزارٹ نے انہیں بھی وہی بات کہی۔ ”انہیں شاہ معظم کے حکم سے کمک کے طور پر میدان جنگ میں بھیج دیا گیا ہے اور اب یہاں کی حفاظت میری ذمّے داری ہے۔“

”آپ کے لیے حکم ہے اب کسی کو آرگون سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔“

”حکم کی تعمیل ہوگی۔“ ایزارٹ نے کہا اور پھر سرسری سے انداز میں بولا۔ ”تمہارے سپاہی تھکے ہوئے ہیں کیا خیال ہے تم لوگوں کے لیے کچھ پینے کا بندوبست نہ کیا جائے۔“

یہ لوگ شراب پیتے تھے اور ایزارٹ کے معنی خیز انداز سے وہ یہی سمجھے تھے۔ افسر نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ”ایسا ہی ہے جناب ہم دن کے چار حصوں میں سے تین حصے پہرہ دیتے ہیں اور صرف ایک حصہ آرام کے لیے ملتا ہے۔“

”ایسا کرو اپنے خاص آدمیوں کو بلا لو میں تمہیں اپنے کمرے میں لے جاتا ہوں باقیوں کو یہیں مشروب دے دیا جائے گا۔“

افسر مڑا اور اس نے اپنے منظور نظر افراد کو آگے بلایا۔ ان کی تعداد دس کے قریب تھی اور باقی وہیں رہے۔ ایزارٹ نے آگے بڑھ کر رہ جانے والے سپاہیوں سے کہا۔ ”تم لوگ بیٹھو، اپنا اسلحہ اتار دو۔“

وہ اپنے افسر کا رویہ دیکھ چکے تھے اس لیے انہوں نے بلا حیل و حجت ڈھالیں اور اسلحہ نیچے رکھ دیا اور خود بھی نیچے ہی بیٹھ گئے۔ الگ ہونے والے دس افراد کو ہم نے اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ وہ بے خبر تھے کہ انہیں شراب کا نہیں موت کا جام ملنا ہے۔ میں نے ہاتھ اوپر کیا اور پانچوں انگلیاں پھیلا کر بند کیں تو اس کے ساتھ ہی میرے ساتھی حرکت میں آگئے۔ فصیل سے اچانک تیر انداز نمودار ہوا اور انہوں نے زمین پر بیٹھے سپاہیوں کو نشانہ بنایا۔ وہ سب ہی پاس پاس بیٹھے تھے اس لیے تیر اندازوں کا کوئی تیر خالی نہیں گیا اور فضا ان کی چیخوں سے گونج اٹھی جن کے جسموں میں تیر اترے تھے۔ نصف تو اسی وقت نشانہ بن گئے تھے۔ فوراً ہی تیر اندازوں کی دوسری قطار نمودار ہوئی اور انہوں نے ان سپاہیوں کو نشانہ بنایا جو ہتھیار سنبھال کر اٹھ رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر گر گئے۔ مجھے اس سے زیادہ دیکھنے کی مہلت نہیں ملی کیونکہ ہمیں ان دس افراد پر قابو پانا تھا جو ہمارے نرغے میں تھے۔ صورت حال بھانپتے ہی انہوں نے ہتھیار سنبھالے تھے مگر ہماری طرف سے تیز کارروائی کے نتیجے میں چار اسی وقت لقمۂ اجل بن گئے۔ ایزارٹ نے اپنا نیزہ افسر کی گردن پر رکھ دیا۔

”اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہتھیار پھینک دو۔“

”غدار۔“ اس نے دانت پیس کر کہا۔

”میں سرے سے ریناٹ کا آدمی ہی نہیں ہوں۔“ ایزارٹ نے کہا۔ ”ہم اس وادی کو اس سے نجات دلانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔“

افسر نوجوان اور غصہ ور شخص تھا مگر بالآخر اس نے اور اس کے بچ جانے والے ساتھیوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ ہتھیار پھینک دیں۔ دوسری طرف پچاس سپاہیوں میں سے بچ جانے والے بیس افراد نے ہاتھ اوپر کر لیے تھے اور ان کی جان بخشی کر دی گئی تھی۔ ان چھبیس افراد کی مشکیں کس کر ان کو فصیل کے قید خانے میں ڈال دیا گیا اور مارے جانے والے چوبیس افراد کی لاشیں وہاں سے اٹھا لی گئیں۔ کچھ افراد بالٹیوں میں پانی بھر کر لائے اور پتھریلے فرش پر پھیلا ہوا خون صاف کرنے لگے۔ مارے جانے والوں کی وردیاں اور ہتھیار بھی لے لیے گئے تھے اور اب ہمارے پاس مزید ساٹھ افراد کے لیے وردیاں اور ہتھیار تھے۔ ان وردیوں کو دھونے کی ضرورت تھی تاکہ ان سے خون صاف ہو جائے۔ یہ سب کچھ مشکل سے ایک گھنٹے میں ہو گیا تھا۔ اب وہاں آنے والا کوئی فرد نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہاں کچھ دیر پہلے دو درجن افراد مارے گئے تھے۔

رفتہ رفتہ حالات اس طرف جا رہے تھے جب ہم فیصلہ کن حملہ کریں۔ شہر میں ریناٹ کے مزید دستے پھیلے ہوئے تھے لیکن فی الحال ان سے الجھنا درست نہیں تھا۔ اگرچہ میرا مشن کامیابی سے جاری تھا مگر ابھی اصل منزل

بہت دور تھی۔ ہمیں ریناٹ تک پہنچنا اور اس کا خاتمہ کرنا تھا اور فی الحال اس کے بارے میں ہمارے پاس کوئی معلومات نہیں تھیں کہ وہ کہاں تھا اور اس تک رسائی کا ذریعہ کیا ہو سکتا تھا۔ قید خانے پر حملے کے وقت میں نے سوچا تھا کہ کچھ سپاہی یا افسران زندہ ہاتھ لگیں تو ہم ان سے معلومات حاصل کر سکتے تھے مگر آزاد ہونے والوں نے کسی کو زندہ ہی نہیں چھوڑا۔ اب کچھ زندہ دشمن ہاتھ آئے تھے اور ان سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا۔ میں ایرٹ کے ساتھ قیدیوں کے پاس آیا۔ ایرٹ نے ان سے کہا۔ ”تم لوگوں نے ریناٹ جیسے سفاک شخص کا ساتھ دیا جس نے اپنے ہی لوگوں کا خون بہایا تاکہ اس کا اقتدار قائم رہ سکے۔ اس نے لوگوں کے حقوق سلب کیے اور عام لوگوں کو بے دست و پا کر دیا۔ تم سب کو ان جرائم پر روشنی ہوتے ہی سزائے موت دے دی جائے گی۔“

اس نے میری کہی تقریر دہرائی تھی۔ بات معمولی لفظوں پر مشتمل تھی مگر اس کا اثر ہوا اور وہ رونے گڑگڑانے لگے کہ ان کا قصور نہیں تھا اور وہ وہی کرتے تھے جس کا حکم دیا جاتا تھا۔ ایرٹ انہیں دھمکیاں دیتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”صرف ان لوگوں کو رعایت مل سکتی ہے جو ہمارے ساتھ تعاون کریں۔“

اس پر سب ہی تعاون کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔ میرے اشارے پر ایک زرد چہرے والے نوجوان کو باہر نکالا گیا اور ہم اسے باہر لائے۔ سب کے سامنے پوچھ گچھ مناسب نہیں تھی۔ ایرٹ جانتا تھا کہ اسے کیا پوچھنا ہے اور وہ نوجوان سے سوال کرتا رہا۔ خوش قسمتی سے نوجوان نہ صرف شاہی علاقے میں ڈیوٹی دیتا رہا تھا بلکہ اس کی معلومات بھی خاصی تھیں۔ اس نے بتایا کہ شاہی علاقے اور سرکاری علاقے کی حفاظت سرمئی وردی والوں کے سپرد تھی اور ان کی تعداد ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ان میں سے نصف صرف شاہی کمپلکس کی حفاظت پر معمور تھے۔ میں نے حساب لگایا تو اب تک صرف ڈیڑھ سو سے اوپر خاص سپاہی مارے گئے تھے یا ہمارے ہاتھ آئے تھے گویا ان کی بڑی تعداد ابھی باقی تھی۔ نوجوان نے یہ بھی بتایا کہ پوش علاقے، عام علاقے اور گوداموں والے علاقے میں ایسے ہی چار دستے حملہ آوروں اور قید خانے سے فرار ہونے والوں کو تلاش کر رہے تھے۔ گودام والے علاقے کا سن کر میں تشویش زدہ ہو گیا اور میں نے فوری اس طرف جانے کا فیصلہ کیا۔

ایزارٹ سے بات کی تو اس نے مجھ سے اتفاق کیا اور میں ستر کے قریب ساتھی لے کر روانہ ہوا۔ میں نے بیرکس سے جانے والا راستہ اختیار کیا۔ ہماری رفتار تیز تھی اس لیے ہم بیس منٹ میں اس گودام کے پاس پہنچ گئے جہاں ہمارے ساتھی تھے اور اس کے نزدیک جاتے ہی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔ وہاں سے آوازیں آ رہی تھیں اور انداز فوجی کمانڈرز کا تھا۔ مزید نزدیک آنے پر صورت حال واضح ہو گئی کہ ریناٹ کی فوج کے دستے نے اس گودام کو گھیر لیا تھا اور اب اندر گھسنے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ انہوں نے ابھی تک حملہ نہیں کیا تھا۔ میرے ساتھ ربیک اور اس کا تیرانداز دستہ تھا۔ میں نے ان کو آس پاس نزدیکی عمارتوں پر چڑھنے کا حکم دیا مگر ساتھ واضح کر دیا کہ میرے حکم کے بغیر حملہ نہ کیا جائے۔ ریناٹ کے سپاہیوں کا دستہ وہی ساٹھ افراد پر مشتمل تھا اور وہ پوری طرح مسلح تھے۔ میں نے ایرٹ سے کہا۔

”انہیں الجھانا ہوگا۔“

ایرٹ کے پاس افسر کے نشانات تھے جو اس نے وردی پر لگا لیے تھے۔ میرے نشانات سپاہی والے تھے۔ ہم پندرہ نشانات والے سپاہی ان کے سامنے آئے تو وہ چونکے تھے مگر پھر ہماری وردیوں سے مطمئن ہو گئے۔ ربیک نے افسرانہ انداز میں پوچھا۔ ”کیا ہوا کوئی سراغ ملا ہے؟“

”ہمیں شبہ ہے کہ اس گودام میں کچھ لوگ موجود ہیں۔ یہ دیکھیں نالی میں کتنا پانی بہا ہے اور اندر سے کچھ آوازیں بھی آ رہی تھیں مگر اب خاموشی ہے۔“

میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔ ریناٹ کے آدمی عقل سے عاری نہیں تھے انہوں نے بجا طور پر درست اندازہ لگایا کہ اگر پانی بہہ رہا ہے تو یقیناً کوئی بہانے والا بھی ہو گا۔ بارش تو ہوئی نہیں تھی۔ ربیک نے کہا۔ ”ممکن ہے یہاں نگران ہوں۔“

”نہیں جناب اس وقت اس سارے علاقے میں کوئی سرکاری نگران نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا اور پھر ربیک سے پوچھا۔ ”آپ کس دستے سے ہیں؟“

”میں کسی دستے سے نہیں ہوں مجھے تم لوگوں کی کارکردگی دیکھنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔“ ربیک نے اپنا انداز یوں رکھا تھا جیسے وہ ان سب سے برتر ہو۔ اس دوران میں ریناٹ کے اکثر آدمی گودام کے ان تین اطراف میں پھیل گئے تھے جہاں گلیاں تھیں اور چوتھی سمت گودام کی پشت کسی دوسرے گودام یا کارخانے کی پشت سے ملی ہوئی

تھی۔ تین درجن سپاہی دوسری اطراف میں چلے گئے تھے اور یہاں دو درجن سپاہی رہ گئے تھے۔ میرے بیس ساتھی چھتوں پر تھے اور پینتیس کمک کے طور پر پیچھے اشارے کے منتظر تھے۔ ریناٹ کے آدمی اب گودام کا دروازہ توڑنے پر آمادہ تھے اور انہوں نے اس کے ساتھ زور آزمائی شروع کر دی تھی۔ ایرٹ نے مداخلت کی اور بولا۔ ''بیکار میں قوت ضائع کر رہے ہو۔ چھ آدمی بیک وقت اندر کود جائیں اور دروازہ کھول دیں۔''

''اگر اندر موجود افراد مسلح ہوئے تو میرے آدمیوں کو نقصان ہوگا۔'' دستے کا سربراہ دبے لفظوں میں بولا۔ اس پر ایرٹ غرایا۔

''تو کیا تمہارے پاس ہتھیار نہیں ہیں یا لڑنا نہیں آتا ہے۔ اپنے آدمیوں کو اندر بھیجو۔''

میں اس کی حکمتِ عملی کو سراہ رہا تھا۔ وہ مزید افراد کم کر رہا تھا تاکہ ہمیں کم سے کم افراد سے نمٹنا پڑے۔ مجبوراً افسر نے حکم دیا اور اس کے چھ آدمی بیک وقت دیواروں پر چڑھے اور اندر کود گئے۔ فوراً ہی اندر سے ایسی آوازیں آئیں جیسے دو بدو لڑائی ہو رہی ہو۔ میں نے ہاتھ پہلے ہی بلند کر لیا تھا مٹھی بند کر کے کھولی تو سنسناتے تیر آ کر ریناٹ کے آدمیوں کے جسموں میں اترنا شروع ہو گئے۔ میں اور میرے ساتھی پہلے ہی مناسب حد تک پیچھے ہٹ گئے تھے۔ اس لیے تیر اندازوں کو انہیں نشانہ بنانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہاں تاریکی تھی اس لیے وہ مشعلیں ساتھ لائے تھے مگر اب آسمان پر ہلکی سی روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ کم سے کم چھ افراد پہلی باڑ میں نشانہ بنے اور دوسری باڑ نے چار کو نشانہ بنایا۔ اس کے بعد وہ ہوشیار ہو گئے تو ہم اپنے ہتھیار سنبھال کر ان کی طرف بڑھے۔

لڑائی کا آغاز ہوتے ہی ہمارے بقیہ پینتیس ساتھی دوڑتے ہوئے آئے اور مساوی طور پر گودام کے دائیں بائیں کی گلیوں میں چلے گئے۔ تیر اندازوں نے وہاں بھی ریناٹ کی سپاہ کو نشانہ بنایا تھا اس کے بعد زمین والوں کے لیے ان سے نمٹنا زیادہ مشکل نہیں رہا تھا۔ اس دوران میں اندر والے چھ سپاہیوں سے نمٹ کر باہر نکل آئے اور عقب سے بچ جانے والے سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ان کا حملہ اتنا تیز اور وحشیانہ تھا کہ انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے سب کو ختم کر دیا۔ انسانی جان میرے نزدیک ہمیشہ محترم رہی ہے مگر کچھ عرصے سے میں ایسی جنگوں میں شامل ہوتا رہا جن میں بے دریغ انسانی لہو بہایا جا رہا ہے۔ خود

میرے ہاتھ سے بے شمار انسان مارے گئے تھے مگر میں اب بھی انسانوں کو یوں مرتے دیکھ کر اپنے اندر ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرتا ہوں۔

میرے چاروں طرف لاشیں تھیں۔گلیوں میں مرنے والوں کی چیخیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔ ایزارٹ کے آدمی ان پر رحم کرنے کو تیار نہیں تھے کیونکہ جب وہ بے بس تھے تو ان پر ذرا رحم نہیں کیا گیا تھا۔ نہ صرف ان کو بلکہ ان کے اہل خانہ کو ناقابلِ بیان اذیتوں اور تکلیفوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ ان کا جرم صرف آزادی کا مطالبہ تھا۔ اس لیے اب وہ جوش انتقام سے بھرے ہوئے تھے۔ مشکل سے نصف گھنٹے میں اس دستے کے تمام افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ ایرٹ ان کی لاشیں گن رہا تھا اور اس نے مجھے آگاہ کیا کہ کوئی جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ میں نے بے دھیانی سے کہا۔" یہ تو اچھی بات ہے۔ اب سب کو جمع کرو یہاں سے جانا ہے۔"

ایرٹ فکر مند ہو گیا۔" اتنے لوگوں کو لے کر کہاں جائیں گے؟"

"انہیں عام سپاہیوں کے لیے مخصوص بیرکس میں ٹھہرایا جائے گا اس طرف کسی کا دھیان نہیں جائے گا۔"

ایرٹ خوش ہو گیا۔" آپ ہر مسئلے کا بہترین حل سوچتے ہیں۔"

"انہیں کہنا کہ خوراک کا سارا ذخیرہ ساتھ لیں کچھ چھوڑ کر نہ جائیں آگے خوراک کا کچھ پتا نہیں ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں جناب۔" ایرٹ اندر چلا گیا۔ ربیک اور اس کے ساتھ مارے جانے والوں کا لباس اتار رہے تھے اور ان کا اسلحہ سمیٹ رہے تھے۔ اس کام میں یہاں موجود حریت پسند بھی شامل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ اسلحے اور وردیوں کے لحاظ سے ہماری ضرورت پوری ہوتی جا رہی تھی۔ روانگی سے پہلے وردیوں والے گودام میں موجود باقی وردیاں بھی اٹھالی گئی تھیں۔ آسمان پر سفیدی نمایاں ہونے سے پہلے ہزار کے قریب افراد پر مشتمل قافلہ روانہ ہوا۔ رفتار تیز رکھنے کے لیے بچوں کو گود میں اٹھا لیا گیا تھا اور زخمیوں و عورتوں کو سہارا دے رہے تھے۔ اب ان لوگوں کی حالت خاصی بہتر ہوئی تھی۔ انہوں نے خود کو صاف کر لیا تھا اور کھا پی کر ان کی توانائی بحال ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ چل پھر رہے تھے ورنہ جب ہم نے انہیں قید خانے سے رہا کرایا تھا تو ان کے لیے چلنا پھرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ خوراک اور دوسرا سامان خاصا تھا اس لیے سب نے کچھ نہ کچھ اٹھا رکھا تھا۔

میں اور کچھ مسلح افراد پیچھے تھے اور میں چاہتا تھا کہ کسی کی مداخلت سے پہلے ہم فوجی بیرکوں تک پہنچ جائیں۔ مگر انسان جو سوچتا ہے اکثر ویسا ہوتا نہیں ہے۔ ادھر ہم بیرکس والے میدان میں نمودار ہوئے اور ادھر مرکزی شاہراہ سے ریناٹ کی خاص فوج کا ایک دستہ برآمد ہوا۔ تعداد سے لگ رہا تھا کہ یہ وہی دستہ ہے جو مفروروں کی تلاش کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ مسلح افراد پیچھے تھے اور سامنے عورتیں، بچے اور عام سے نظر آنے والے افراد تھے۔ انہیں دیکھ کر ریناٹ کے آدمی غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ بس یہ نہتے اور بے بس لوگ ہیں اور وہ ہماری طرف آنے لگے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو قافلے والوں کی آڑ میں کر لیا۔ قافلہ رک گیا تھا اور درمیان میں موجود میرے ساتھی اپنے ہتھیار سنبھال کر تیار ہو گئے۔ خاص طور سے تیر انداز دستہ تیر کمان سنبھال چکا تھا۔ میں نے ان سے کہا۔" تم لوگوں نے ہوا میں تیر چھوڑنے ہیں۔ جب میں اشارہ کروں تو تیر چھوڑنا۔"

وہ سب تیار ہو گئے۔ میں فوجی دستے کے نزدیک آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ نزدیک آنے پر انہیں کوئی بھی مسلح فرد نظر نہیں آیا تو وہ مزید بے فکر ہو گئے تھے۔ جب وہ سو گز دور رہ گئے تو میں نے اشارہ کیا اور تقریباً ساتھ تیر اندازوں نے تیر ہوا میں چھوڑے وہ بلند ہوئے اور دستے پر برسے تھے۔ مگر انہیں صرف چند افراد کا نقصان ہوا۔ اصل میں یہ لوگ اس طرح سے تیر اندازی میں مہارت نہیں رکھتے تھے۔ اب میں نے انہیں براہِ راست نشانہ لینے کو کہا مگر اس دوران میں ریناٹ کے آدمی ہوشیار ہو گئے تھے اور انہوں نے ڈھالوں کی پناہ لے لی۔ کچھ پیروں پر تیر لگنے سے گرے مگر اب وہ اتنے نزدیک آ گئے تھے کہ ان سے دو بدو مقابلہ ناگزیر ہو گیا تھا ورنہ وہ عورتوں اور بچوں پر چڑھ دوڑتے۔ میں اپنے دستے کو لے کر آگے آیا۔ میرے ساتھ تیس کے قریب افراد تھے۔ ہماری ان سے مڈبھیڑ ہوئی اور پہلی بار میں نے مکمل جنگ کا ماحول دیکھا۔ میرے آس پاس ریناٹ کے آدمی تھے اور وہ مہارت سے حملے کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے میرے کئی آدمی گرا دیئے۔

ایسے میں تیر انداز کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ تیر ہمیں بھی لگ سکتے تھے البتہ وہ نزدیک آ گئے اور بالکل پاس سے یقینی نشانہ بنانے لگے۔ ایسے میں حریت پسند جواب تک جنگ

میں شامل نہیں ہوئے تھے انہوں نے اپنے طور پر ہتھیار منتخب کیے اور گھوم کر ریناٹ کے دستے کے عقب میں آ گئے۔ اس طرح سے انہوں نے کسی کے فرار کا راستہ بھی مسدود کر دیا تھا۔ پھر وہ پیچھے سے حملہ آور ہوئے اور انہوں نے ہمیں ایک نئی زندگی بخشی کیونکہ ہم دب رہے تھے۔ دو طرف سے گھرنے کے بعد ریناٹ کے آدمی گھبرا گئے اور ہم ان کا آسان شکار کرنے لگے۔ ایک بڑے دائرے میں انہیں گھیر کر چاروں طرف سے تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ ہم جان بوجھ کر ان کے جسموں کو نیچے سے یا درمیان سے نشانہ بنا رہے تھے کہ تیر خطا ہونے کی صورت میں دوسری طرف موجود ہمارے کسی ساتھی کو نہ جا لگے۔

حریت پسندوں کی ہمت نے بازی پلٹ دی اور جلد اس دستے نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ ان کا نقصان زیادہ نہیں ہوا تھا۔ پندرہ مارے گئے تھے اور دس زخمی تھے۔ باقیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس دوران میں ایزارٹ کے آدمیوں کی طرف سے بھی مدد آ گئی تھی۔ مارے جانے والوں کو اٹھا لیا گیا اور زخمیوں و قیدیوں کو وہ ساتھ لے گئے۔ اس دوران میں قافلے میں موجود عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بیرکوں کے عقبی حصے میں واقع ایک عمارت میں منتقل کیا گیا۔ سامان بھی وہیں پہنچا دیا گیا تھا۔ ریناٹ کا نقصان بڑھ رہا تھا اور ہمیں ہتھیار اور وردیاں مل رہی تھیں۔ مگر اس بار ہمیں بیس افراد کا نقصان اٹھانا پڑا تھا اور یہ بہت بڑا نقصان تھا۔ کل ملا کر ہمارے اب تک چالیس کے قریب ساتھی مارے جا چکے تھے یا شدید زخمی ہوئے تھے۔ ان میں تمام ہی صحت مند اور اچھے لڑنے والے افراد تھے۔ ریناٹ کی فوج بھی تقریباً پونے تین سو خاص سپاہیوں سے محروم ہو چکی تھی مگر اب بھی وہ تعداد میں ہم سے کئی گنا زیادہ تھے۔

عورتوں اور بچوں کو محفوظ جگہ پہنچانے کے بعد میں نے حریت پسندوں کو ان سے الگ کر کے ان کی گنتی کی۔ ان کی کل تعداد پانچ سو ساٹھ تھی۔ ان میں سے ڈیڑھ سو کے قریب لڑنے کی پوزیشن میں تھے اور باقی ابھی بحالی سے گزر رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کل تک اتنے ہی لوگ اور لڑنے کے قابل ہو جائیں گے اور ہمارے پاس فی الحال تین سو افراد کا ہی اسلحہ تھا۔ کچھ اسلحہ ہمیں فصیل سے بھی ملا تھا مگر یہ سب بھاری جنگی اسلحہ تھا جو گوریلا جنگ میں زیادہ کارآمد نہیں تھا۔ میں نے ان ڈیڑھ سو افراد کو الگ کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ کھائیں اور آرام کریں تاکہ کل تک لڑنے کے قابل ہوں۔ وہ خوش ہو گئے کہ انہیں منتخب کر لیا گیا ہے۔ میں نے خوراک کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ یہ زیادہ دیر چلنے والا نہیں تھا اتنے افراد زیادہ سے زیادہ دو دن میں سب ختم کر دیتے۔ ہمیں مزید خوراک کی ضرورت تھی۔ ایرٹ کی مدد سے میں نے باقی رہ جانے والے حریت پسندوں کو مختلف ذمے داریاں سونپیں اور انہیں ہدایت کی کہ مزید خوراک حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ان میں سے کچھ جانتے تھے کہ مزید خوراک کہاں سے مل سکتی تھی۔ مگر دن میں اس طرف جانا مناسب نہیں تھا۔ وہ رات میں کوشش کرتے۔

روشنی ہو گئی تھی اور اب ہمارے لیے چھپ کر کارروائی کرنا آسان نہیں رہا تھا۔ ویسے بھی مسلسل حرکت میں رہنے اور کئی معرکے سر کرنے کے بعد میں اور میرے ساتھی تھک گئے تھے اور ہمیں آرام کی ضرورت تھی۔ ہم واپس فصیل کی طرف آئے یہاں نیچے بے شمار کمرے تھے جہاں سونے کا انتظام بھی تھا۔ ایزارٹ نے خوشخبری سنائی کہ فصیل کے نیچے تہہ خانے سے کچھ خوراک ملی ہے جو ہم لوگوں کے لیے کافی تھی۔ ریک اور ایرٹ اسے معرکوں کی روداد سنانے لگے جس میں ہمیں نقصان ہوا تھا مگر سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہم نے اب تک کسی دشمن فوجی کو بچ کر جانے کا موقع نہیں دیا تھا سب مارے گئے یا پکڑے گئے۔ ہمارا نقصان کم تھا مگر اس لحاظ سے زیادہ تھا کہ ہماری افرادی قوت کل چھ سو سے بھی کم لوگوں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے بھی اکثر لڑنے کے قابل نہیں تھے اور یہ باقاعدہ تربیت یافتہ فوجی بھی نہیں تھے۔ بہرحال جنگ اپنا خراج لیتی ہے۔ میں ناشتا کر کے لیٹا تو لمحوں میں بے خبر ہو گیا اور میری آنکھ کھلی تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔ ایرٹ جاگ رہا تھا۔ وہ میرے لیے مقامی چائے لے آیا جس کی یہاں خاصی مقدار موجود تھی۔ اس نے بتایا۔

"باہر امن و سکون ہے ریناٹ کی طرف سے مزید کوئی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی ہے۔ اس نے جو دستے بھیجے تھے وہ بھی واپس چلے گئے۔"

میں چونکا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"یہاں فصیل کے اوپر مینار ہے وہاں سے پورا شہر صاف دکھائی دیتا ہے خاص طور سے شاہراہیں تو تینوں ہی نظر آتی ہیں۔ اس وقت سرکاری علاقے سے آگے ریناٹ کا کوئی آدمی نہیں ہے۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم اتنی آسانی سے یہاں غلبہ پا لیں گے۔"

"مگر اس سے یہ مت سمجھنا کہ ہمیں فتح ہو گئی ہے ابھی

ہمیں ایک ایسی آفت سے نمٹنا ہے جو اکیلا ہی ہم سب پر بھاری ہوسکتا ہے۔"

ایرٹ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔"ایسا کون ہوسکتا ہے جناب؟"

"تم اسے نہیں جانتے لیکن وہ میرے دشمنوں کے ساتھ اوپر سے آیا ہے۔" میں نے باسو کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔"اگر سب ریناٹ کا ساتھ چھوڑ دیں اور صرف یہی لوگ اس کے ساتھ رہ جائیں تب بھی ان پر قابو پانا ریناٹ کی تمام فوج پر قابو کے مترادف ہوگا۔"

ایرٹ کو حیرت ہوئی تھی۔"تب آپ نے ان کے بارے میں سب کو کیوں نہیں بتایا ہے؟"

"وہ بددل اور خوف زدہ ہوسکتے ہیں۔تم اور ربیک میرے اعتماد کے آدمی ہو اور میں تمہارے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔اس لیے تم لوگوں کو خبردار کررہا ہوں۔ہو سکتا ہے میں اس جنگ میں کسی مرحلے پر مارا جاؤں تب بھی میری یہ بات یاد رکھنا۔"

"آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے یقین سے کہا۔

"تم ایسا کیسے کہہ سکتے ہو؟" میں ہنسا۔

"پتا نہیں۔" اس نے سر جھٹکا۔"آپ کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ زندہ رہیں گے اور فتح حاصل کریں گے۔"

"اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو، اسی میں اس وادی کے لوگوں کی بھلائی ہے۔مگر میری خواہش ہے کہ یہ جنگ جلد از جلد اور مزید کسی نقصان کے ختم ہوجائے۔"

"اس کے لیے آپ ہی ہماری رہنمائی کریں۔"

"یہ شخص ایزارٹ کیسا آدمی لگا ہے؟"

"بہت زبردست۔" ایرٹ نے بے ساختہ کہا۔"اس نے سب کو متاثر کیا ہے۔یہ کسی حد تک آپ سے ملتا ہے۔ہر کام سوچ سمجھ کر کرتا ہے اور مسئلے کا جلد حل نکال لیتا ہے۔سب کے ساتھ نرمی اور مہربانی سے پیش آتا ہے۔اس نے حکم دیا ہے کہ قیدخانے سے چھڑائے گئے عورتوں اور بچوں کا خاص خیال رکھا جائے کیونکہ یہی ہمارا مستقبل ہیں۔"

"اس نے ٹھیک کہا۔" میں نے خالی ہو جانے والا پیالہ رکھا اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔"مجھے بھی مینار دکھاؤ جہاں سے شہر کا نظارا کیا جاسکتا ہے۔"

ایرٹ مجھے فصیل کے اس خاص حصے سے ذرا پیچھے بنے تقریباً ستّر یا اسّی فٹ اونچے مینار تک لایا جہاں کیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی۔یہ حصہ خاصا بڑا تھا اور یہاں پورا دربار سجایا جاسکتا تھا جیسا کہ ریناٹ نے سجایا تھا۔مینار فصیل سے بھی کوئی پچیس فٹ اوپر تھا اور ہم سیڑھیاں چڑھ کر اس کے آخری حصے میں آئے یہاں مشکل سے چارفٹ کی جگہ تھی جس میں ایک وقت میں تین سے زیادہ آدمی کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔یہاں ایک پہریدار پہلے سے موجود تھا مجھے دیکھ کر وہ مؤدب ہوگیا۔ایرٹ نے اسے سیڑھیوں پر جانے کو کہا تاکہ میں آرام سے شہر کا نظارا کرسکوں۔وہ سر جھکا کر چلا گیا۔اس کے جانے کے بعد ایرٹ نے شہر کی طرف اشارہ کیا۔"وہ دیکھیں جناب یہاں سے سب صاف نظر آرہا ہے۔"

مگر میری توجہ شہر کے بجائے مخالف سمت میں سامیرا کے قلعوں کی طرف تھی جو یہاں سے دکھائی دے رہے تھے مگر دوری کی وجہ سے منظر صاف نہیں تھا۔بہرحال ایسا لگ رہا تھا کہ وہاں امن تھا اور اگر جنگ ہوئی بھی تھی تو وہ محدود پیمانے پر تھی۔درمیان میں فصلوں کی جگہ اب سیاہ جلے ہوئے وسیع میدان تھے۔بعض جگہوں سے باغات کو بھی نقصان ہوا تھا مگر یہ معمولی نوعیت کا تھا۔وہ محفوظ رہے تھے۔فصلوں کے درمیان ایک لکیر تھی جو شاہراہ کی نشان دہی کر رہی تھی۔میں نے ریناٹ کی فوج کی طرف اشارہ کیا۔"ان کی طرف سے یہاں کوئی نہیں آیا؟"

"صبح سے دوبار ان کی طرف سے دستے آئے ہیں وہ مزید رسد چاہتے ہیں مگر ایزارٹ نے شاہ معظم کے نام پر انہیں واپس کردیا اور ان سے کہا کہ ان کے پاس جو ہے اسی میں گزارہ کریں۔"

"بہترین جواب دیا ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔"ان میں مایوسی پھیلے گی۔کسی فوج کے لیے اس سے زیادہ خوفناک صورت حال اور کوئی نہیں ہوتی ہے کہ عقب سے اسے رسد ملنا بند ہوجائے۔"

"دو تین بار انہیں یہی جواب ملے گا تو وہ سوچیں گے کہ کس کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہیں۔"

میں قلعے کے سامنے اور اس کے آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا۔دائیں طرف قلعے کے ساتھ ساتھ فصل والا حصہ تھا جو اب جل کر خالی ہو چکا تھا اور کوئی ایک میل کے بعد باغات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔اسی جگہ کہیں وہ خفیہ راستہ نکلتا تھا جو براہِ راست شاہی محل تک جاتا تھا اور کیرٹ نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔مگر اس نے راستے کی بالکل بھی نشان دہی نہیں کی تھی صرف اتنا کہا تھا کہ اسے اندر

سے ہی کھولا جا سکتا تھا۔ اب اندر سے کھولنے کے لیے لازم تھا کہ پہلے شاہی محل جایا جاتا اور پھر وہاں سے اس راستے کے آخر میں آ کر خفیہ دروازہ کھولا جاتا تب ہم شاہی محل میں داخل ہو سکتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا ایسا ہی کرنا پڑے گا؟ مگر اس سے پہلے ضروری تھا کہ فصیل کا باہر سے معائنہ کیا جائے۔ میں نے ایرٹ کی طرف دیکھا۔ "ابھی اندھیرا ہونے کے بعد ہم باہر جائیں گے۔ تم ربیک اور اپنے خاص ساتھیوں کو تیار کر لو۔ ہم سرمئی وردی میں ہوں گے۔"

ایرٹ فوری نیچے اتر گیا۔ مجھے اس کی یہ بات پسند تھی کہ وہ سوالات میں وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جلد یا بدیر صورت حال سامنے آ جائے گی۔ پہلے میں سوچ رہا تھا کہ ہم دروازے سے نکل کر جائیں گے مگر جب میں نے فصیل کا معائنہ کیا تو مجھے بہتر یہی لگا کہ ہم فصیل سے ہوتے ہوئے باغات تک پہنچیں اور وہاں رسی کی سیڑھی سے نیچے اتریں اس طرح ہمارا کسی کی نظروں میں آنے کا امکان کم رہے گا۔ ایرٹ واپس آیا تو میں نے اسے رسی کی سیڑھیوں کا بندوبست کرنے کو بھی کہا۔ وہ دوبارہ چلا گیا۔ اوپر سورج رفتہ رفتہ ڈھل رہا تھا۔ اسی لحاظ سے یہاں روشنی کم ہو رہی تھی۔ آج کا دن گرم رہا تھا اور شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ اچانک ہی بارش شروع ہو گئی۔ پہلے ہلکی بوندیں گریں اور پھر تیزی کے ساتھ بڑی بوندیں گرنا شروع ہو گئیں۔ میں مینار سے اتر آیا ہمارے ساتھی بارش سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بارش تاریکی چھانے تک جاری رہی۔ اس دوران میں میں ایزارٹ کے پاس بیٹھا اس سے آنے والے ممکنہ حالات اور ان سے نمٹنے کی تدابیر پر غور کرتا رہا۔۔۔۔ میں نے ایزارٹ کو بھی ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں بتایا۔ وہ فکر مند ہو گیا خاص طور سے باسو کے بارے میں سن کر۔

"یہ عفریت ہے اس سے کیسے نمٹیں گے؟"

"یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔" میں نے گہری سانس لی۔ "دیکھا جائے تو وہ خود مظلوم ہے کیونکہ اسے زبردستی ایسا بنایا گیا ہے اور وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہے گا۔"

"مگر ہمارے لیے تو وہ موت بن جائے گا۔"

ایزارٹ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ "تم آرگون سے باہر جا رہے ہو؟"

میں نے سر ہلایا۔ "کیرٹ نے مجھے بتایا تھا کہ فصیل کے مشرقی حصے میں ایک خفیہ راستہ ہے جو براہِ راست شاہی محل تک جاتا ہے مگر اسے اندر سے ہی کھولا جا سکتا ہے۔"

"اگر اسے اندر سے ہی کھولا جا سکتا ہے تو پھر باہر سے دیکھنے کا فائدہ؟"

"ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ راستہ کہاں کھلے گا۔"

"ہاں یہ معلوم ہونا ضروری ہے۔" ایزارٹ قائل ہوا۔

"میں اسی لیے جا رہا ہوں۔"

"کیا میں ساتھ چلوں؟"

"نہیں تمہارا یہاں ہونا ضروری ہے جس طرح تم سب سنبھال رہے ہو اور اپنے آدمیوں کی رہنمائی کر رہے ہو اس طرح کوئی دوسرا نہیں کر سکتا ہے۔ کاش کہ تم ہی آرکیو کی جگہ پہلے سربراہ ہو جاتے۔"

میں باہر آیا تو بارش رک گئی تھی اور فضا میں نباتات کی مخصوص مہک پھیلی ہوئی تھی۔ جو بارش کے بعد آتی ہے لیکن یہ خوشبو یہاں بہت واضح تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ شہروں میں اب بارش کے بعد یہ خوشبو نہیں آتی ہے۔ اسلام آباد جیسے ہرے بھرے شہر میں بھی اب خوشبو نہیں آتی۔ یہ گاؤں دیہات میں رہ گئی۔ جب میں حویلی جاتا اور بارش ہوتی تب یہ خوشبو آتی تھی۔ آلودگی نے فطری چیزوں کو ختم کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہاں آنے والی خوشبو اس سے کہیں تیز تھی۔ شاید اس لیے کہ یہ خطہ دنیا کی آلودگیوں سے محفوظ تھا۔ ایرٹ، ربیک اور قلعوں سے آنے والے دوسرے نوجوان تیار تھے۔ ان میں شاٹ، ایمار اور مارٹ بھی تھے۔ راٹون اب ایزارٹ کے ساتھ تھا۔ انہوں نے ہتھیار باندھ لیے تھے اور ایرٹ نے تین عدد رسی اور لکڑی سے بنی سیڑھیاں بھی لے لی تھیں۔ رات کی مناسبت سے مشعلیں بھی تھیں مگر فی الحال انہیں جلایا نہیں تھا۔

جیسے ہی تاریکی مکمل ہوئی ہم روانہ ہو گئے۔ عام طور سے فصیل پر تیز روشنی والی مشعلیں جلتی تھیں۔ جب تک ریناٹ کے سپاہی یہاں تھے مگر آج وہ نہیں تھے اور اب یہاں مشعلیں روشن نہیں تھیں۔ البتہ ایزارٹ کے آدمیوں نے اندر مشعلیں جلا لی تھیں۔ مرکزی شاہراہ کے ساتھ دوسری شاہراہوں کی مشعلیں بھی نہیں جلی تھیں کیونکہ آج کوئی جلانے نہیں آیا تھا۔ میں نے فصیل سے آرگون شہر دیکھا جہاں اب تاریکی چھا چکی تھی اور یہ کسمپرسی میں لپٹا ہوا بے بس سا شہر نظر آیا۔ حادثات اور جنگیں کیسے آبادیوں کو بے رونق بنا دیتی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جہاں ریناٹ جیسے خود غرض حکمران ہوں وہاں ایسی ہی بے رونقی ہوتی ہے۔ چاہے جنگ یا حادثہ بھی پیش نہ آئے۔ اچھے حکمران

ویرانوں کو بھی گلزار بنا دیتے ہیں اور برے حکمران ہنستی بستی آبادیوں کو اجاڑ دیتے ہیں۔ شروع میں ہم محتاط رہے۔ ذرا جھک کر دیوار کی آڑ میں چلتے رہے۔ مگر تاریکی میں آتے ہی ہم تیز رفتاری سے سفر کرنے لگے تھے۔

ہلکی رفتار سے دوڑتے ہوئے ہم تقریباً پندرہ منٹ میں باغات تک پہنچ گئے۔ یہاں فصیل تنگ تھی اور اب اس پر ایک وقت میں ایک ہی آدمی چل سکتا تھا۔ ابھی ہم نیچے اترنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ ہم نے مشعلیں نہیں جلائی تھیں کہ ان کی روشنی دور سے نظر آتی۔ ہم نے سیڑھیاں لٹکائیں اور نیچے اترنے لگے۔ باغات کے نزدیک تاریکی زیادہ اور مکمل تھی۔ یہاں روشنی کی ضرورت تھی مگر جب تک بارش برستی ہم مشعلیں نہیں جلا سکتے تھے اور روشنی کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے اس لیے درختوں کے نیچے آ گئے۔ قطرے یہاں بھی گر رہے تھے مگر بارش کے مقابلے میں کم تھے۔ میں نے سب کو خبردار کر دیا تھا کہ غیر ضروری آواز نہیں نکالنی ہے اور نہ ہی کوئی حرکت کرنی ہے۔ بعض اوقات یہی معمولی سی بے احتیاطی آدمی کو مروا دیتی ہے۔ میرے ساتھی اس ہدایت پر مکمل عمل کر رہے تھے اور اس وقت ہم فصیل سے کوئی تیس گز دور تھے یہاں سے فصیل کسی قدر خم کھا کر شمال کی طرف مڑ رہی تھی یعنی ہم آرگون کے ایک کونے پر تھے۔

بارش ہلکی ہوئی تھی مگر ایک مسلسل رفتار سے جاری تھی۔ میں نے سوچا کہ وقت ضائع کرنے کے بجائے اگر میں فصیل کے نزدیک جا کر دیکھوں تو شاید کوئی سرا ہاتھ آئے۔ اب تاریکی مکمل بھی نہیں تھی نزدیک سے تھوڑا بہت نظر آ ہی رہا تھا۔ میں نے ربیک سے کہا کہ وہ میرے ساتھ آئے اور ہم فصیل کی طرف بڑھے تھے۔ ہم اس جگہ تک آئے جہاں سے فصیل مڑ رہی تھی۔ یہاں فصیل کی اونچائی کوئی تیس فٹ تھی۔ نیچے کسی قدر خم تھا لیکن چھ سات فٹ کے بعد یہ بالکل سیدھی ہو گئی تھی۔ اوپر کہیں ایسے کگرے یا کوئی چیز نہیں تھی جس میں کمند پھنسائی جا سکتی۔ اس کے باوجود وہاں سپاہی لازمی موجود ہوتے اگر آرگون کو حملے کا سامنا کرنا ہوتا۔ مگر آرگون کی سپاہ خود حملہ آور تھی۔ اوپر سیدھی دیوار تھی جو پہرے پر معمور سپاہیوں کی حفاظت کے لیے تھی۔ ہم نے بڑی مشکل سے سیڑھیاں لٹکائی تھیں۔

”کیا خیال ہے جناب آگے چل کر دیکھیں؟“ ربیک نے کہا۔

میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ میں اور ربیک دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ جیسے ہی ہم دیوار سے گھومے مجھے لگا جیسے نزدیک کہیں ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی ہو اور زمین میں اس کا ارتعاش محسوس ہوا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا جیسے زلزلہ آ رہا ہو مگر فوراً ہی ذرا آگے روشنی کی جھلک آئی اور میں تیزی سے واپس آیا تھا۔ روشنی فصیل میں ایک دراڑ سے جھلک رہی تھی۔ ربیک نے بھی دیکھ لیا تھا اور اس کے ذہن میں بھی وہی خیال آیا جو میرے ذہن میں آیا تھا اس نے میرے کان میں کہا۔ ”خفیہ راستہ۔“

”پیچھے ہٹو۔“ میں نے سرگوشی میں کہا اور ہم دیوار سے لگے لگے پیچھے ہٹنے لگے۔ فصیل کے خم سے اس طرف آتے ہی ہم تیزی سے درختوں کی طرف آئے اور اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کر کے میں ربیک کے ساتھ درختوں میں ہوتا ہوا فصیل کے اس حصے کی طرف جانے لگا جہاں سوراخ موجود تھا۔ درخت یہاں فصیل سے فاصلے پر تھے۔ ہم اس جگہ کے سامنے پہنچے تو وہاں اب نصف درجن مسلح سپاہی نظر آ رہے تھے اور انہوں نے سرمئی وردی پہن رکھی تھی۔ فصیل میں تقریباً ڈھائی فٹ چوڑا اور پانچ فٹ اونچا خلا تھا۔ اندر سے مسلح سپاہی مسلسل برآمد ہو رہے تھے اور جب تقریباً ایک درجن افراد باہر آئے تو آخری فرد نے خلا میں جھک کر کچھ کہا اور فوراً ہی خلا بند ہونے لگا۔ دروازہ بند ہونے سے گڑگڑاہٹ کی ہلکی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ شاید پتھر کا یہ بھاری دروازہ کسی میکنزم پر تھا۔ چند لمحے کے اندر وہاں سوائے دیوار کے اور کچھ نہیں تھا۔ ابھی تو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ دن میں نزدیک سے دیکھنے پر بھی کسی کو شبہ نہیں ہوگا کہ یہاں کوئی دروازہ ہے۔ یہ تھا وہ خفیہ دروازہ جس کے بارے میں کیرٹ نے مجھے بتایا تھا مگر اس کا جائے وقوع نہیں بتایا تھا۔ میں نے سرگوشی میں ربیک سے کہا۔

”ایسا لگ رہا ہے کہ ریناٹ کو فصیل اور دروازے پر ہمارے قبضے کا پتا چل گیا ہے اور اس نے شاید فوج کو پیغام دینے کے لیے ان لوگوں کو اس خفیہ راستے سے بھیجا ہے۔“

ربیک مضطرب ہو گیا۔ ”اس صورت میں ہمیں ان لوگوں کو جانے نہیں دینا چاہیے۔“

یہی خیال میرا بھی تھا۔ ”میں متفق ہوں لیکن ان سب کو مارنا ..... مناسب نہیں ہوگا۔ کچھ افراد کا زندہ پکڑنا لازمی ہے۔“

آنے والے اب چلنا شروع ہو گئے تھے اور وقت بالکل نہیں تھا۔ میں اور ربیک ہر ممکن تیزی سے واپس آئے۔ بارش کا ہلکا سا شور ایسا تھا کہ اس میں چھوٹی موٹی

آہٹیں پاس سے بھی نہ سنائی دیتیں۔ ربیک نے آتے ہی سب کو ہوشیار کر دیا۔ میں نے تین تین افراد پر مشتمل دستے بنائے۔ ان کے لیے سمتوں کا تعین کیا اور ان سے کہا۔ ''تم ان کو چاروں طرف سے گھیرو گے۔ جیسے ہی اشارہ ملے تم حملہ کرو گے مگر جسم کے نچلے حصوں کو نشانہ بنانا۔ ہمیں کچھ افراد کو زندہ پکڑنا ہے۔ مگر یاد رکھنا کوئی فرار نہ ہونے پائے اس صورت میں تم مارنے کے لیے وار کرو گے۔''

سب نے سر ہلایا اور طے شدہ سمتوں میں غائب ہونے لگے۔ فصیل سے باہر آنے والوں کو اس طرف سے ہو کر جانا تھا۔ وہ کچھ ہی دیر بعد نمودار ہوئے۔ رازداری کے لیے انہوں نے بھی مشعلیں نہیں جلائی تھیں اور تاریکی میں سفر کر رہے تھے اس لیے ان کی رفتار کم تھی۔ میرے ساتھ رائٹون اور ایرٹ تھے۔ ہم ریناٹ کے آدمیوں کے دائیں طرف تھے۔ حملے کا آغاز ایرٹ کی طرف سے پرندے کی آواز نکالنے پر کیا جاتا۔ یہاں باغ ذرا گھنا تھا اور درختوں کے درمیان جگہیں کم تھیں۔ میں کسی ایسی جگہ ان پر حملہ چاہتا تھا جہاں جگہ زیادہ ہو اور وہاں ان کے فرار کا امکان کم رہے۔ میرے ساتھی پوزیشن لے چکے تھے اور ہم نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ مگر وہ بے خبر تھے۔ وہ اپنی بھاری ڈھالیں سامنے کیے چل رہے تھے مگر ان کی پشت اور پہلو غیر محفوظ تھے۔ انہوں نے لکڑی کی جو زرہ پہنی ہوئی تھی وہ تیر روکنے میں ناکام رہتی تھی اس کا میں نے مشاہدہ کر لیا تھا۔

بالآخر وہ ایسی جگہ پہنچے جہاں تقریباً بیس گز کے دائرے میں کوئی درخت نہیں تھا اور میرے اشارے پر ایرٹ نے پرندے کی آواز نکالی۔ تیر کمانوں پر ہم پہلے ہی چڑھا چکے تھے۔ بیک وقت درجن تیر سنسناتے ہوئے چار سمتوں سے آئے اور کم سے کم نصف دستہ نشانہ بنا۔ نچلے جسم کا نشانہ لینے میں یہ احتیاط بھی تھی کہ کوئی تیر خطا ہو کر دوسری طرف موجود اپنے ہی کسی ساتھی کو نہ جا لگے اور نیچے تیر لگنے کی صورت میں زندہ بچنے کا امکان زیادہ ہو جاتا۔ زخمیوں کی چیخیں بہت بلند تھیں مگر وہ ریناٹ کی فوج کے پڑاؤ تک بہرحال نہیں جا سکتی تھیں۔ وہ یہاں سے بہت فاصلے پر تھا۔ تربیت یافتہ سپاہیوں نے پہلے حملے کے بعد ڈھالیں آگے کر کے دائرہ بنا لیا اور اس میں ان کے زخمی ساتھی بھی آ گئے تھے۔ انہوں نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی اور یہ اچھی بات تھی۔ ایرٹ نے میرے اشارے پر بلند آواز سے کہا۔

''تم چاروں طرف سے گھر چکے ہو۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہتھیار پھینک دو۔ ہم تمہیں مارنا نہیں چاہتے ورنہ پیروں کا نشانہ نہ لیتے۔''

''ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔'' ان میں سے کوئی چلایا۔ اس دوران میں ہم دوبارہ کمانوں پر تیر چڑھا چکے تھے۔ انکار سنتے ہی سب نے پھر تیر چلائے اور اس بار بھی نیچے کا نشانہ لیا۔ دو چیخیں اور گونجیں۔ مسلسل مشق سے میرا نشانہ بھی خاصا بہتر ہو گیا تھا اور مجھے لگا کہ تیر نشانے پر لگا ہے۔ ایرٹ نے پھر کہا۔

''آخری بار کہا جا رہا ہے ہتھیار ڈال دو ورنہ سب مارے جاؤ گے۔ کیوں ریناٹ جیسے خود غرض آدمی کے لیے جان دیتے ہو۔''

دوسرے حملے اور مزید دو افراد کے زخمی ہونے سے ان کے حوصلے پست ہو گئے تھے اور انہوں نے ہتھیار ڈال دینا ہی مناسب سمجھا۔ پہلے انہوں نے اپنے ہتھیار پھینکے۔ ایرٹ نے للکار کر کہا کہ وہ ڈھالیں بھی پھینک دیں۔ وہ ڈھالیں پھینکتے ہوئے ڈر رہے تھے کہ ہم تیروں سے نشانہ بنائیں گے۔ مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا اس لیے انہوں نے بادل ناخواستہ ڈھالیں بھی پھینک دیں۔ سات زخمی پہلے ہی لیٹے ہوئے تھے باقی پانچ جو ٹھیک تھے وہ بھی اوندھے منہ زمین پر لیٹ گئے۔ زخمیوں کو ٹانگوں میں تیر لگے تھے۔ البتہ ایک کو کولہے میں لگا تھا۔ میرے ساتھی ان کی تلاشی لینے لگے اور ان کے تمام ہتھیار قبضے میں کر لیے۔ ربیک نے پوچھا۔ ''تمہارا سربراہ کون ہے؟''

''میں ہوں۔'' ایک صحیح سلامت نوجوان بولا۔

''کھڑے ہو جاؤ۔'' ربیک نے حکم دیا تو وہ کھڑا ہو گیا۔ تلاشی کے بعد اس کے پاس سے ایک چھڑی نکلی تھی۔ یہ یقیناً ریناٹ کے حکم کے ساتھ تھی اسے دیکھ کر فوج یقین کر لیتی کہ حکم ریناٹ کی طرف سے آیا ہے۔ چھڑی میں نے اپنے قبضے میں کر لی اور ربیک کے توسط سے پوچھا۔ ''تم کیا حکم لے کر جا رہے تھے؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ''شاہ معظم نے فوج کے لیے واپسی کا حکم روانہ کیا ہے۔ لیکن تم نے ہمیں روک لیا اور روک کر اچھا نہیں کیا۔''

میں چونکا۔ ''کیوں؟''

''کیونکہ فوج کسی وقت بھی سامیرا کے قلعوں پر حملہ کرنے والی ہے۔'' اس نے جواب دیا تو میرے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔

(جاری ہے)

(ناعمہ تحریم کراچی کا جواب)

محمد فیضان..........کراچی

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

عباس علی جوکھیو..........لاڑکانہ

محسوس جو قربِ رگِ جاں ہو نہیں سکتا
یہ غم وہ ہے جس غم کا بیاں ہو نہیں سکتا

عنبرین رضوی..........سکھر

میں نے تو ہر حال میں لوگو بچے زخم چھپائے دنیا سے
میرا رنگ اڑانے والی یادوں کی پروائی تھی

زینت خورشید..........لاہور

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گئی

(نازش احمد لاہور کا جواب)

ناہید سلطانہ..........لاہور

مسافر تھک گیا دن ڈھل گیا اب شام ہوتی ہے
نظر آئے گا اس عالم میں رستے کا نشاں کب تک

احمد توفیق..........حیدرآباد

میری نظروں کی تمنا ہے مسلسل انتظار
سب کی نظروں کا تقاضا ہے کہ جلوا چاہیے

محمد فیضان بخاری..........ملتان

محسوس جو قربِ رگِ جاں ہو نہیں سکتا
یہ غم وہ ہے جس غم کا بیاں ہو نہیں سکتا

(ظفر علی خان گجرات کا جواب)

ناہید ادریس..........ٹورنٹو کینیڈا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

(عشرت صدیقی کراچی کا جواب)

شائستہ جبیں..........میر پور خاص

زندگی نعمت سے اب کفرانِ نعمت بن جائے
ڈر رہا ہوں اپنے جینے سے نہ اکتا جاؤں

تبریز احمد..........کوٹ ادو

زندگی کی سنگ باری سے نہ گھبرا جاؤں میں
زخم کھاتا جاؤں پھر بھی مسکراتا جاؤں میں

عارف ممتاز..........ساہیوال

زباں سے ہجر کی شب جلد کٹنے کی دعا کی تھی
اسی سے وصل کی شب کی طوالت کی دعا کی ہے

(ہادیہ ایمان ہارون آباد کا جواب)

نجمی رحمٰن..........یو ایس اے

یہی آس تھی ہمیں دم بدم کہ بہار دیکھیں گے اب کے ہم
جوں ہی چھوٹے قیدِ قفس سے ہم تو سنا خزاں کے دن آ گئے

(سیف اللہ ملک وال کا جواب)

عارف روحیلہ..........کراچی

یوں فروزاں ہے وہ چہرہ مجھ میں
جیسے خود عکس ہو میرا مجھ میں

(شائستہ جبیں میر پور خاص کا جواب)

احمد سعید..........میر پور خاص

جانِ جاناں ترا سفینۂ حسن
میرے دریائے جاں میں ڈوب گیا

عشرت ہانی..........کراچی

جس میں اک آس ترے قرب کی تھی
کتنا پھیلا ہے وہ لمحہ مجھ میں

اکبر علی صدیق..........سیالکوٹ

جو لوگ تباہی کے دوراہے پہ کھڑے ہیں
مسموم ہواؤں میں بھی وہ زندہ رہے ہیں

(اشرف علی خان کراچی کا جواب)

نعیم ابرار..........خان پور

اک جرعہ بھی بہت ہے تشنگی کے واسطے
وہ تو پیاسا ہی رہے گا جس کو دریا چاہیے

اصغر حسین.........بہاولپور

آبرو مند ہم ایسے کہ نہ جرعہ مانگیں
اور سمندر ہیں کہ ترسائے چلے جاتے ہیں

واصف ترمذی.........ملتان

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پر کتنا غرور تھا

نوشین جعفری.........سرگودھا

اعتبارِ شوق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن میں خفا مجھ پر ہوا

(کائنات گل کا جواب)

محمد احمد رضا انصاری.........کوٹ ادو

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ آتے گئے کارواں بنتا گیا

(نیلم کراچی کا جواب)

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان.........ہارون آباد

آؤ اک سجدہ کریں عالم مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

نزہت رحیم.........رحیم یار خان

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ ارباب وفا ہو جانا

(ناز فن لاہور کا جواب)

منظر علی خان.........لاہور

میں کسی صورت نہیں توڑوں گا پیمانِ وفا
تجھ سے جو کچھ اے ستمگر ہو سکے کر دیکھنا

(عشرت صدیقی کراچی کا جواب)

نشی عزیز ے.........لندن

زمانے کی مصروفیت تھم گئی ہے
وہ بیٹھے ہیں اور آئینہ روبرو ہے

(عارف حسن کا جواب)

نجمی رحمٰن.........برٹ لیٹ یو ایس اے

بڑا ہی خوب صورت شہر ہے یہ لوگ کہتے ہیں
یہاں پر ہیں ہزاروں گھر گھروں میں لوگ رہتے ہیں

(محمد فیضان بخاری ملتان کا جواب)

مرزا حمزہ بیگ.........لطیف آباد

در و دیوار کا نقشہ نہیں دیکھا جاتا
ان کے آتے ہی بدل جاتی ہے گھر کی صورت

عبدالحکیم ثمر.........کراچی

دل رہے قابو میں تو دلدار کی ایسی تیسی
کون پڑے جھنجٹ میں اس یار کی ایسی تیسی

ناصر فرشوری.........کراچی

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں جس کا تقاضہ کرتے

(ارشد محمود کراچی کا جواب)

فہیم الدین صدیقی.........کراچی

قاضی شہر نے کیا حکم سنایا لوگو
شاہ مجرم ہے اسے پابند سلاسل کر دو

(عبدالحکیم ثمر کا جواب)

ایم عمران جونانی.........کراچی

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

(عطیہ عباسی لاڑکانہ کا جواب)

سیف اللہ.........ملک وال

یہ الگ بات کہ تقدیر پلٹ کر روئی
ورنہ بازو تو تجھے دیکھ کے پھیلائے تھے

شیر نواز گل.........اوڑ پایان پشاور

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

(اشفاق محسن راولپنڈی کا جواب)

فلک شیر ملک.........رحیم یار خان

نہ جانے کیا ہے کسی کی اداس آنکھوں میں
وہ منہ چھپا کے بھی جائے تو بے وفا نہ لگے

(ندیم مرزا اسلام آباد کا جواب)

عائشہ اعوان.........رحیم یار خان

شجر تو اگلے برس پھر ہرے ہوئے ہوں گے
مگر وہ پنچھی جو آندھیوں میں گھر نہیں لوٹے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش
121
30 دسمبر 2015ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ✓ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 دسمبر 2015ء تک علمی آزمائش 121 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کر لیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے)
81

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش۔ 121

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپردڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 دسمبر 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

22 مئی 1906ء میں پیدا ہوئے۔ والد اردو ادب میں بہت اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ خود بھی نثر نگاری میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے بعد دہلی سے پاکستان ہجرت کی۔ ایک بڑے ادبی رسالے کے مدیر رہے۔ جوش ملیح آبادی سے قلمی جنگ چلی تو ایک پورا خاص نمبر جوش کے رد میں نکال دیا۔

علمی آزمائش 119 کا جواب

اسرار الحق مجاز لکھنوی 1911ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امین آباد ہائی اسکول لکھنو سے اور ایف اے سینٹ جانسن کالج آگرہ سے کیا اور بی اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے۔ پھر وہ لکھنو یونیورسٹی سے ایم اے کرنے لگے مگر کر نہ پائے۔ غضب کی شاعری کرتے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل کے ماحول میں بھی وہ لڑکیوں کے پسندیدہ شاعر کہلاتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے لیے قیام پاکستان سے قبل ترانہ لکھا تھا۔ 5 دسمبر 1955ء کو انتقال کر گئے۔

انعام یافتگان

1۔ زینت جہاں، لاہور 2۔ عابد لاشاری، حیدرآباد 3۔ فرخ حیات، ملتان

4۔ ارشاد چنگیزی، کوئٹہ 5۔ انیس احمد، سرگودھا

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے سید توفیق، امداد امام رضوی، مسز زبیدہ خاتون، یحییٰ کادوانی، سید عزیز الدین، فرزانہ پروین، آفتاب جعفری، نوشین اختر، واحد علی صابری، احسن علی، کامران تقوی، احمد حسن پلیجو، ذیشان صدیقی، رسول بخش پلیجو، اسرار احمد، کلیم

صدیقی، زاہد حیات، عنبرین احمد باسط فاروقی، یاسین خان، کاوش ارشد، انعام حیات، علی زبیر، نعمت گل، عنایت گجر، مختار بٹ، صدف فاطمہ، نذر حسن، مولا بخش بٹ، نعمت گل، حکیم اختر علی نظیر، اکبر حسین، سبطین سید، غلام حسن، نبیل احمد، عنبرین احمد، فرحت عباس نقوی، نیاز احسن، اشرف اللہ، طفیل احمد، الیاس محمد، توصیف انصاری، عنایت مسیح، صباحت مرزا، سہیل احمد کھتری۔ لاہور سے مسرت اسلم ملک، عبدالجبار رومی انصاری، فیضان بٹ، تاثیر احسن، فہیم احمد، عباس علی سید، اشرف علی، رحیم بخش، علی مصطفی، ناہید اختر، فرقان مجید ضیائی، نور احمد نور، خلیق حسن، چوہدری فیصل، ملک سرفراز، قیصر ایاز، الطاف حسین۔ ملتان سے نوید احسن، محمد بلال اقبالی، محمد سعید چشتی، نورین افشاں، ایاز سومرو، زندان خان، کلیم اللہ چغتائی، ذیشان ملک، فرحت مغیر، قدوس بخش، سعیدہ جلال، فاضل خان اچکزئی، لبنیٰ ظہیر، رضوانہ اختر، اللہ دتہ، محمد عتیق، فرزانہ ملک، زینب چوہان، قدوس بخش۔ جہلم سے ارباز خان، ملک سرفراز، ندیم امتیاز۔ فیصل آباد سے محمد زاہد، ماسٹر عبدالعزیز (سمندری)۔ جھنگ سے عطا المصطفی۔ گوجرانوالے سے الف اے کھوکھر۔ چکوال سے رمضان وٹو، ارشاد حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک۔ منڈی بہاؤ الدین سے خرم جہانزیب۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ) ایم شفیق قدی (مسلم بازار)۔ کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، خاقان چنگیزی، راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، قتیل سید پوری، تقی چنگیزی، نگارث، صالح بشیر، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزماں، عظمی اکملی ٹوانہ، خلیق الزماں، خضر حیات۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، فہیم اللہ، نصیر جتوئی۔ خانیوال سے طارق شہزاد، سید ابشام اشرف مشہدی۔ حیدرآباد سے احمد انصاری، بابر خان، طٰہٰ یاسین، دعا زہرا۔ میر پور خاص سے مجاہد علی ایس جسی۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ پاک پتن سے علی محمد (حسن پورہ)۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔ چیچہ بره زئی سے ذوالفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ حاصل پور سے نعمان ادریس۔ ڈی جی خان سے موسیٰ خان۔ بہاولپور سے قاضی عدنان احمد، حمیرا کوکب واسطی، آمنہ ملک، یاسین خان، صدیق الرضی، اشرف خان، اسلم حیات، صنوبر عطاری، ظہیر الدین بابر، انیس احمد، مہوش نیازی، کاظم علی زیدی، مظہر حسین، نوازش صدیقی، فرحت اعجاز زیدی، نیاز الدین، فصیح الدین۔ راولپنڈی سے نوید الحق، استراج خان، ظفر اسماعیل، احمد جاوید، سراج حسن خان، اشعر حسین، اطہر علی سید، وفا جونپوری، نادر بیگ مرزا، کاشف عباس زیدی، نیابت خان، کلثوم پروین، احمد حمید چوہان، زاہد علی زاہد، فاروق محمود۔ اسلام آباد سے سید سلطان احمد، سیف الرحمن خان، انور یوسف زئی، نیلوفر شاہین۔ پشاور سے شیر نواز گل (بارو خیل)، نصر من اللہ (حیات آباد)۔ کوئٹہ سے انیس بٹ، کشمیر خان، زاہد بخش، کاظم چنگیزی، محمد صالح، ارباز خان، شاہد اسلام، حیات محمد رند، غیاث الدین، فتح یاب سردار، نوشین فاطمہ کاظمی۔ حیدرآباد سے بابر خان، احمد انصاری، طٰہٰ یاسین، سرفراز احمد، ثناء بتول، فرقان احمد، زاہد الاسلام شیخ، نعمت خان اچکزئی، نیہا فاطمہ، ظہیر حسن خان، اشرف صدیقی، کلثوم انصاری۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، اشرف علی، محمد ممتاز۔ ہارون آباد سے سلیم کامریڈ۔ چکوال سے ملک طارق رشید (تلہ گنگ)، احمد جاوید، سلمیٰ ممتاز۔ جھنگ سے عطا المصطفی (گوجرہ روڈ)، کائنات فاطمہ، وقار علی، التماس عباس، نورین ملک۔ ہری پور سے خضر اسحاق، ناہید علی سید (کھاریٹ)، نعیم اللہ ولد عبدالغفور، معراج محبوب عباسی (جی ٹی روڈ)۔ وہاڑی سے منشی محمد عزیز مٹے، انیس احمد۔ کوٹری سے نازنین۔ ڈیرہ غازی خان سے رفیق احمد ناز، یونس احمد، نذر علی سید، نصیر علی۔ خیر پور میرس سے نورین اصغر، احمد علی زیدی، قیام الدین۔ گجرات سے محمد طاہر، خاقان بٹ، واثق علی، ارشاد زیدی، نعمان فاروق۔ خانیوال سے ارشاد علی، عباد سلطان، محمد فضیلت، عمر حیات خان۔ ڈی آئی خان سے زاہد علی، اللہ بخش، سلمان اشرفی۔ شجاع آباد سے غلام پنجتن۔ سرگودھا سے صادق بٹ، انعام حسین، محمد یامین، ارشد علی، نوید خان۔ بھکر سے فرقان حسین، صدف حسین، عنبرین ممتاز۔ فیصل آباد سے عتیق احمد، نصرت جہاں، خاقان خان ڈرائیور، کاشف عرفان مروت، زیب علی، ملک محمد یاسین، شازیہ احسن۔ رحیم یار خان سے زیبو، ملک شیر ملک (ترنڈہ سوائے خان)، عائشہ اعوان، کاشان لاشاری، نصرت اسماعیل، امتیاز احمد، عمار یاسر، زیب النساء، کیف سرمدی۔ بدین سے شاہد علی، قصور سے نیاز احمد، وردہ عباسی، شاہد احسن، سائیں شاہ۔ بہاولپور سے شاہ کوثر، رحیم داد چوہدری، فیضان۔

بیرون پاکستان سے احمد علی (الینواس یو ایس اے)، فرقان خان (ابوظہبی)، اشفاق مرچنٹ (ممباسا افریقا)، محمد توحید خان (ایتھنز)۔

درست غلط فیصلہ

محترم مدیر
السلام علیکم
میں اپنی آپ بیتی اسپتال کے بیڈ پر لکھ رہی ہوں۔ یہ ایک مرتی ہوئی عورت کا اعتراف نامہ ہے۔ پلیز اسے ڈسٹ بن میں مت ڈال دیجیے گا۔ اگر تحریر میں خامی نظر آئے تو اسے درست کرا لیجیے گا۔ پلیز اسے شائع ضرور کیجیے گا۔ مجھے اندازہ ہے جب تک یہ شائع ہو گی میں منوں مٹی تلے سو چکی ہوں گی۔ اپنے ان گناہوں کا اعتراف کر کے شاید مجھے سکون مل جائے اسی لیے لکھا ہے لیکن اپنا نام تبدیل کردیا ہے کیونکہ سرگزشت میرے گھر میں آتا ہے۔ میرے بچے کنوینٹ کے پڑھے ہوئے ہیں پھر بھی وہ سرگزشت پڑھتے ہیں ان کی وجہ سے اپنا، اپنے شوہر اور باس کا نام تبدیل کرنا پڑا ہے۔

رومانہ شعیب
(کراچی)

میری آنکھ کھلی تو نیچے سے بچوں کے شور مچانے کی آواز آرہی تھی۔ حسبِ معمول مشال اور اریب میں لڑائی ہو رہی تھی۔ دونوں اوپر تلے کے تھے۔ مشال چودہ برس کی تھی اور اریب اس سے ایک سال چھوٹا تھا۔ ان دونوں سے زیادہ سنجیدہ شاہ زیب تھا۔ وہ دس سال کا تھا مگر ان دونوں سے زیادہ ذہین اور سنجیدہ تھا۔ اکثر مجھے مشال اور اریب کو شاہ زیب کی مثال دینی پڑتی تھی کہ اسی کو دیکھ لیں اپنی عمر سے بڑا لگتا ہے اور وہ ابھی تک بچے بنے ہوئے ہیں مگر توبہ کریں جوان پر ذرا بھی اثر ہو۔ شعیب واش روم میں تھا اور تیار ہو رہا تھا۔ گھر میں وہ سب سے پہلے اٹھتا تھا کیونکہ صائمہ آجاتی تھی۔ صائمہ ملازمہ تھی وہ کھانا بنانے سے لے کر گھر کی صفائی اور کپڑے دھونے تک سارے کام کرتی تھی۔ وہ صبح ہمارے جانے سے پہلے آتی اور شام کو جاتی تھی۔ صبح آ کر وہ سب سے پہلے ناشتہ بناتی تھی۔ شعیب اٹھ کر دروازہ کھولتا اور پھر بچوں کو اٹھاتا۔ میں سب سے آخر میں اٹھتی تھی، البتہ مشال اور اریب کے شور سے میری آنکھ پہلے ہی کھل جاتی تھی۔

شعیب کچھ دیر بعد واش روم سے نکلا تو نہا دھو کر تیار تھا۔ اس نے شیو کر لی تھی اور اس کے پاس سے آفٹر شیو کی مدھری خوشبو آرہی تھی۔ چالیس سال کی عمر میں بھی اس کی سرخ و سفید جلد بے داغ تھی اور بال صرف قلموں کے پاس سے سفید ہوئے تھے اور یہ بھی اس کی وجاہت میں اضافہ کرتے تھے۔ شعیب نے ایم بی اے کیا تھا اور وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں منیجر کے عہدے پر تھا۔ تنخواہ اچھی تھی اور گاڑی بھی ملی ہوئی تھی۔ اسلام آباد کی ایک پوش آبادی میں ہمارا اپنا گھر تھا۔ اسے کوٹھی تو نہیں کہہ سکتے تھے مگر سات کنال پر بنا ہوا یہ دو منزلہ مکان ہمارے لیے بہت تھا۔ اوپر تین بیڈ روم تھے۔ ایک میرا اور شعیب کا تھا۔ دوسرا مشال اور تیسرا اریب اور شاہ زیب کا تھا۔ نیچے بڑا سا لاؤنج جس کے ساتھ ہی کچن اور ڈائننگ ایریا تھا۔ ایک نشست گاہ، ایک گیسٹ روم اور شعیب نے اپنے لیے چھوٹی سی اسٹڈی بنا رکھی تھی۔ مکان کے آگے پیچھے کھلا حصہ تھا جسے ہم نے پھولدار پودوں اور خوش رنگ بیلوں سے سجا رکھا تھا۔ سامنے پورچ میں اتنی گنجائش تھی کہ شعیب کی ایکسل آئی کے ساتھ میری شیوی کار بھی آرام سے آجاتی تھی۔

''اٹھ جاؤ۔'' شعیب نے آئینے کے سامنے ٹائی باندھتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ اکیلے ناشتہ کرو گی۔''

''اکثر اکیلے ہی کرتی ہوں۔'' میں نے کروٹ لی۔ ''آپ بیڈ روم کا دروازہ نہ کھلا چھوڑا کریں۔ میں صرف نائٹی میں ہوتی ہوں اور بچے دیکھ سکتے ہیں۔''

اس نے لاپروائی سے کہا۔ ''چادر تلے کیا پتا چلتا ہے کہ تم نے کیا پہنا ہے۔''

"چادر ہٹ بھی جاتی ہے۔"
میں نے اٹھ کر واش روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔"اب لاک کر کے جائیے گا۔ میں باہر آ کر ڈریس اپ ہوں گی۔"

جب تک میں شاور لے کر باہر آئی شعیب نیچے جا چکا تھا۔ میں نے کپڑے پہنے اور تیار ہو کر نیچے آئی تو بچے اسکول کے لیے جا چکے تھے۔ مشال او لیول کر رہی تھی اور پڑھنے میں بہت تیز تھی۔ چودہ سال کی عمر میں اس میں تبدیلیاں آنے لگی تھیں اور لڑکپن کی معصومیت میں نوجوانی کی دلکشی بھی شامل ہو چکی تھی۔ مشال کا قد لمبا اور جسم نازک تھا۔ چند سال بعد وہ بہت حسین نوجوان لڑکی بن جاتی۔ اریب مشال سے ایک سال چھوٹا تھا مگر اس کا قد ابھی سے مشال سے اوپر جا رہا تھا۔ اس کی صحت بھی اچھی تھی اس لیے مشال سے بڑا لگتا تھا اور اکثر ان دونوں کی لڑائی اسی بات پر ہوتی تھی۔ وہ آٹھویں گریڈ میں تھا۔ پڑھنے میں مشال کی طرح تیز نہیں تھا مگر وہ بھی اچھا طالب علم تھا۔ صورت شکل میں وہ بالکل باپ پر گیا تھا۔ شاہ زیب ابھی پانچویں گریڈ میں تھا۔ ذہانت میں وہ مشال سے آگے تھا مگر اس کا دل پڑھنے میں مشکل سے لگتا تھا۔ اسے کمپیوٹر کا شوق تھا اور اسکول سے آنے کے بعد وہ زیادہ تر اپنے کمپیوٹر میں لگا رہتا تھا۔ تینوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے اور وین میں آتے جاتے تھے۔ یہ ایک اعلیٰ درجے کا اسکول تھا جس کی فیس خاصی تھی اور ہمیں بھی یہ زیادہ لگتی تھی مگر بچوں کے اچھے مستقبل کی خاطر ادا کر رہے تھے۔ شعیب ناشتہ کر رہا تھا۔ وہ ساتھ ہی اخبار بھی دیکھ رہا تھا۔ میں نے ناشتے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔"شاید آج مجھے دیر ہو جائے۔"

شعیب نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے جواب دیا۔"پروجیکٹ وزٹ ہے۔"

"تمہارے مزے ہیں۔" شعیب مسکرایا۔"آرام سے جاتی ہو اور جلدی واپس آ جاتی ہو۔ ہفتے میں ایک دو بار لیٹ ہوتی ہو اور تنخواہ تقریباً میرے برابر لیتی ہو۔ میں صبح جلدی جاتا ہوں اور واپسی کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔"

"اتنے مزے بھی نہیں ہیں۔ پروجیکٹس پر بہت سر کھپانا پڑتا ہے۔ کم وقت کے لیے جاتی ہوں مگر ایک منٹ بھی سکون کا نہیں ملتا ہے، آپ گوروں کو جانتے ہیں کس طرح کام کرتے اور لیتے ہیں۔"

جب تک میں نے اپنی براؤن بریڈ اور بوائل ایگ ختم کیا۔ صائمہ نے اورنج جوس کا گلاس میرے سامنے رکھ دیا۔ شعیب چائے پی رہا تھا مگر میں صبح چائے نہیں لیتی تھی۔ میرا ناشتہ بس یہی ہوتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے چھتیس سال کی عمر اور شادی کے پندرہ سال بعد تین بچوں کی ماں بننے کے باوجود

میرا بدن متناسب اور جاذب نظر تھا۔ لائٹ براؤن بال، اسی رنگ کی آنکھیں اور دلکش نقوش کے ساتھ میں تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ شادی کے چند سال بعد میں خود سے بہت بے پروا ہو گئی تھی۔ خاص طور سے اریب کی پیدائش کے بعد میرا وزن تیزی سے بڑھا تھا اور میں ایٹی فائیو کے جی تک چلی گئی تھی۔ جب کہ فائیو فائیو قد کے ساتھ میرا وزن ساٹھ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ پھر شاہ زیب کی پیدائش کے بعد میں نے اپنا خیال رکھنا شروع کیا۔ یہ خیال کیسے آیا یہ میں آپ کو آگے بتاؤں گی۔

وزن کم کرنے کے لیے میں نے کھانے پینے میں احتیاط کے ساتھ ایکسرسائز شروع کی اور ایک لیڈیز کلب جوائن کر لیا۔ وہاں جم کے ساتھ سوئمنگ پول بھی تھا اور میں نے یہیں تیراکی سیکھی تھی۔ ایک سال سے بھی کم وقت میں میرا اضافی وزن ختم ہو گیا اور میرا جسم شیپ میں آ گیا۔ شروع میں، میں ہفتے میں دو سے تین بار جم جاتی تھی کیونکہ اس وقت جاب نہیں کرتی تھی۔ مگر اب میں ایک بار جاتی تھی اور وہ بھی چھٹی کے دن کیونکہ باقی دنوں میں مصروفیت ایسی ہوتی تھی کہ چند گھنٹے کے لیے کہیں جانا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ اب ایک بار جانا بھی کافی ہوتا تھا۔ میں اورنج جوس لے رہی تھی اور ساتھ ہی اپنے موبائل پر فیس بک چیک کر رہی تھی۔ شعیب نے کپ رکھا اور کھڑا ہو گیا۔ ”او کے میں چلتا ہوں۔“

میں اسے باہر تک چھوڑنے آئی۔ میری گاڑی آگے تھی اس لیے اسے اپنی کار نکالنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ میں پہلے آتی تھی اور میری گاڑی پورچ میں آگے ہی ہوتی تھی۔ واپس آ کر میں نے صائمہ کو ہدایات دیں۔ ایک طرح سے سارا گھر اس کے سپرد تھا مگر وہ برسوں سے ہمارے ہاں کام کر رہی تھی اور اب ہمارے لیے گھر کے ایک فرد کی طرح تھی۔ میرے جانے کے بعد وہ کچن اور صفائی سے فارغ ہو کر دوپہر کا کھانا بناتی جو صرف بچوں کے لیے ہوتا تھا۔ وہ پہلے ہی بتا دیتے تھے کہ انہیں لنچ میں کیا کیا چاہیے۔ میں اسی لحاظ سے صائمہ کو بتاتی اور پھر اسے رات کے کھانے کے بارے میں سمجھاتی۔ لنچ کے بعد وہ لانڈری لگا لیتی تھی۔ شام میں میرے آنے تک چھوٹے موٹے کام نمٹاتی اور جب میں آ جاتی تب وہ چھٹی کرتی تھی۔ اگر کبھی میں دیر سے آتی تو اسے دیر تک رکنے کے اضافی پیسے دیتی تھی اس لیے وہ ہنسی خوشی دیر تک رک جاتی تھی۔ صائمہ میٹرک تک پڑھی ہوئی تھی اور اسے طریقہ سلیقہ بھی تھا۔ وہ دس سال سے یہاں کام کر رہی تھی اور اب مجھ سے زیادہ اسے پتا تھا کہ گھر کیسے چلانا ہے؟ گھر میں کس چیز کی ضرورت ہے؟

میں ایک غیر ملکی این جی او میں جاب کرتی تھی جو غریب اور کم پڑھی لکھی عورتوں کے روزگار کے لیے کام کرتی تھی۔ این جی او تربیت سے لے کر مالی وسائل تک کئی شعبوں میں عورتوں کی مدد کرتی تھی۔ میں این جی او میں پروجیکٹ ڈیزائنر کے طور پر کام کرتی تھی۔ کیونکہ غیر ملکی این جی او تھی اور باہر سے خاصی امداد آتی تھی اس لیے ملازمین کو اچھی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ اسلام آباد کے بلیو ایریا میں ایک بڑی سی کوٹھی میں اس کا دفتر تھا۔ میں عام طور سے دس بجے روانہ ہوتی اور ساڑھے دس بجے تک دفتر پہنچ جاتی تھی۔ شام چار بجے میں آف کر کے نکل آتی۔ ہاں اگر کوئی میٹنگ ہوتی یا کسی پروجیکٹ کا وزٹ ہوتا تو میں دیر سے گھر پہنچتی تھی۔ اس دن بھی میں کوئی سوا دس بجے روانہ ہوئی۔ آج گرمی خاصی تھی میں نے اسی مناسبت سے لان کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ آفس پہنچی تو وہاں سام سے سامنا ہوا۔ سام کا تعلق برطانیہ سے تھا اور وہ کوآرڈی نیٹر تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”تم پاکستانی عورتیں کتنے کلرفل لباس پہنتی ہو۔“

میں مسکرائی۔ ”کیونکہ ہمارے ہاں ایسے ہی پسند کیے جاتے ہیں۔“

”کیا تم میری بیوی کے لیے ایسا سوٹ منگوا کر دے سکتی ہو؟“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن وہ شاید اسے پسند نہ کرے۔ تمہارے ہاں خواتین اتنا سارا لباس پہننا پسند نہیں کرتی ہیں۔“

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”تم نے ٹھیک کہا۔ اس کا بس چلے تو گرمیوں میں جو پہنتی ہے وہ بھی نہ پہنے۔“

میں اپنے کمرے میں آئی اور کمپیوٹر آن کر کے آج کا ڈے ورک چیک کیا۔ اسی مناسبت سے کام میں لگ گئی تھی۔ میں نے شعیب سے غلط نہیں کہا تھا۔ بے شک میرا آفس ٹائم کم تھا مگر مجھے اس میں فرصت کے لمحات بہت کم ملتے تھے۔ شعیب جو ویسے تو ٹھیک نو بجے یا اس سے بھی ذرا پہلے دفتر پہنچ جاتا تھا۔ مگر اس کے بعد وہ ساڑھے دس بجے تک اپنے کمرے میں کمپیوٹر پر اخبارات دیکھتا یا پھر سوشل سائٹس پر پایا جاتا تھا۔ یہاں یہ حال تھا کہ لنچ کے لیے بھی

اکثر کوئی دوسرا مجھے یاد دلاتا تھا۔ اس دن بھی نغمی نے اندر جھانک کر کہا۔ ”کیا بات ہے آج لنچ کا ارادہ نہیں ہے۔“
تب میں نے وقت دیکھا تو ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں نے کمپیوٹر آف کرتے ہوئے کہا۔ ”کیوں نہیں آج مینو کیا ہے؟“
”پلاؤ کے ساتھ شامی کباب ہیں۔“
”تو بچ کلوریز۔“ میں نے کہا۔ ”میں ملک شیک لے لوں گی۔“
”کم آن کبھی کبھی آدمی کو بد پرہیزی کر لینی چاہیے۔“ نغمی شام نے کہا۔ وہ یہاں ایڈمن کی جاب کرتا تھا اور مقامی افراد میں سب سے نائس وہی تھا۔ ورنہ باقی جو پاکستانی این جی او میں کام کرتے تھے وہ صرف تعلیم کی حد تک آگے تھے ورنہ عورتوں کے معاملے میں تقریباً سب کی وہی مخصوص ذہنیت تھی۔ اس لیے میں سوائے نغمی کے اور کسی سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ میرا میس تک جانے کا ارادہ نہیں تھا کیونکہ آج میں نے جو سوٹ پہنا ہوا تھا وہ کسی قدر فٹنگ کا تھا اور مجھے معلوم تھا جب تک میں وہاں رہوں گی ایک درجن سے زیادہ نظریں مجھ پر جمی رہیں گی۔ میں نے نغمی سے کہا۔
”سوری میں کبھی کبھی کی قائل بھی نہیں ہوں۔ پلیز اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو میرے لیے شیک یہیں بھجوا دو۔“
وہ سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اپنا اسمارٹ فون نکالا اور واٹس اپ آن کر کے ایک وائس میسج کیا۔ ”میں شام ساڑھے چار تک آؤں گی تم موجود رہنا۔“
چند منٹ بعد ٹیکسٹ میں جواب آیا۔ ”او کے۔“
میں واش روم گئی اور فریش ہو کر آئی تو ملک شیک آ گیا تھا۔ یہ بڑا گلاس تھا اور میرے لیے کافی تھا۔ گلاس ختم کر کے میں نے کمپیوٹر آن کیا اور اپنے کام میں لگ گئی۔ چار بجے میں نے کمپیوٹر آف کیا۔ اپنی چیزیں سمیٹیں اور باہر آئی۔ اتفاق سے پھر سام سے سامنا ہو گیا اور اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”تم بہت کم اس طرح کے لباس پہنتی ہو ورنہ اکثر تم بھی سادہ لباس میں آتی ہو۔“
”شاید اب ہم میں بھی مغربی عورتوں کا اثر آتا جا رہا ہے۔“ میں نے جواب دیا اور باہر آ گئی۔ گرمی ایسی تھی کہ کار تک آتے آتے مجھے پسینا آ گیا۔ میں نے انجن اسٹارٹ کر کے پہلے اے سی آن کیا اور جب خنکی نے پسینا خشک کیا تو میں نے جلدی سے باڈی اسپرے نکال کر خود پر اسپرے کیا اور گاڑی آگے بڑھائی۔ کچھ دیر بعد میں فیصل مسجد جانے والی سڑک پر تھی اور ساڑھے چار سے ذرا پہلے میں نے کار ایک چھوٹی کوٹھی کے سامنے روکی۔ ہارن کے جواب میں اس کا آٹو میٹک سیاہ گیٹ خود بہ خود کھلنے لگا۔ میں کار اندر لے آئی۔ کوٹھی ایک کنال پر تھی۔ پورچ میں ایک اعلیٰ درجے کی لگژری کار کھڑی تھی۔ کمال احمد کوئی چیز بھی کم معیار کی استعمال نہیں کرتا تھا۔ پچاس لاکھ کی یہ گاڑی اس کی ایک مثال تھی۔ گیٹ کی طرح کوٹھی کا داخلی دروازہ بھی خود بہ خود کھل گیا اور کمال احمد کی گہری آواز آئی۔
”چلی آؤ جانِ من، تمہارا پیاسا تمہارا منتظر ہے۔“
کمال احمد کی آواز سن کر ہی میرے بدن میں سنسنی کی لہری دوڑ گئی تھی۔ وہ ایسا جادوگر تھا جس نے مجھ پر نہ جانے کیسا جادو کیا تھا کہ میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کی دیوانی تھی اور دیوانوں کی طرح اس سے ملنے کو بے تاب رہا کرتی تھی۔ کوٹھی کے اندر خوشبو آمیز خنکی تھی اور پوری کوٹھی سینٹرلی اے سی تھی۔ میرے اندر آتے ہی دروازہ خود بہ خود بند ہو گیا۔ کمال نے پھر کہا۔ ”اوپر آتے ہوئے حسن پوشیدہ کو بے حجاب کرتی آنا۔ جب میرے سامنے آؤ تو میری آنکھوں اور تمہارے حسن کے بیچ کوئی حجاب نہ ہو۔“
یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہتا اور میں ماننے سے انکار کر دیتی۔ میں اس کی مرضی کے عین مطابق اور پری طور پر واقع اس پر تعیش ہال نما خواب گاہ تک پہنچی جس کے وسط میں بڑا سا گول ڈبل بیڈ تھا اور یہ میکنزم پر گھومتا تھا۔ وہاں دیواروں پر ایسی تصاویر اور ہال میں جابہ جا ایسے مجسمے تھے کہ شروع میں میرے لیے نظر اٹھانا محال ہو جاتا تھا مگر اب میں عادی ہو گئی تھی۔ بیڈ پر کمال موجود تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں جام تھا اور اس نے دوسرا ہاتھ میری طرف بڑھایا تو میں کھنچی چلی گئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد میں اس کے سینے پر سر رکھے لیٹی تھی اور اس کی انگلیاں میری زلفوں کو سہلا رہی تھیں۔ میں اٹھنے لگی تو اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ”پلیز روما کچھ دیر اور رک جاؤ۔“
”مجھے ساڑھے چھ بجے تک گھر پہنچنا ہے۔“ میں نے کسمسا کر کہا۔
”تم سے دل نہیں بھرتا۔“
”جھوٹ۔“ میں نے شوخی سے کہا۔ ”تمہاری بیوی مجھ سے کہیں زیادہ حسین ہے۔“

"وہ صرف حسین ہے۔" کمال نے سنجیدگی سے کہا۔
"مگر اس کی قربت میں کوئی مزہ نہیں ہے۔ سمجھ لو میں ایسے ہی اس کے پاس جاتا ہوں جیسے دفتر جاتا ہوں۔ روٹین ورک کہہ لو۔"
"وہ دفتری روٹین ہے اور میں۔" میں نے اپنے سینے پر انگلی رکھی۔ "میں کیا ہوں؟"
"تم میرے لیے سکون اور راحت کا وہ لمحہ ہو جو مجھے بہت کم نصیب ہوتا ہے۔" کمال نے میرا بازو سہلاتے ہوئے کہا۔ "کاش کہ تم ہمیشہ میرے پاس رہو۔"
میں نے بیڈ سے اترتے ہوئے کہا۔ "تب تو میں بھی روٹین ورک بن جاؤں گی۔"
کمال احمد چھریرے لیکن ورزشی جسم کا خوبرو اور چھا جانے والا مرد تھا۔ اس سے میری پہلی ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی۔ یہ آج سے نو سال پہلے کی بات ہے اس وقت میں اریب کی پیدائش کے بعد مزید اوور ویٹ ہو گئی تھی۔ اس پر میں شعیب کی فرمائش پر ساڑی پہن کر گئی تھی اور پارٹی میں خود کو عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ ان ہی دنوں شعیب نے جاب بدلی تھی اور اس ملٹی نیشنل کمپنی میں آئے تھے۔ جو کھانے سے لے کر دواؤں اور کیمیکلز کی کئی طرح کی پروڈکٹس تیار کرتی تھی۔ اس وقت ملٹی نیشنل نے یہاں نیا کام شروع کیا تھا اور ملازمین کو مارکیٹ سے اچھی تنخواہیں دے رہی تھی اس لیے شعیب نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور یہاں آ گئے۔ یہ پارٹی ایک طرح سے کمپنی ڈائریکٹرز اور افسران کا اجتماع تھی۔ تقریباً تمام ہی عورتیں اور لڑکیاں جو اس پارٹی میں شامل تھیں خوب صورت اور متناسب جسامت والی تھیں صرف ایک میں اوور ویٹ تھی اور ساڑی میں میرا وزن زیادہ ہی نمایاں ہو رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں نے کسی سے بات کرنے کی کوشش کی تو بات گھوم پھر کر میرے وزن پر آئے گی۔ اس لیے میں ایک طرف الگ تھلگ بیٹھی تھی۔ یہاں چھوٹے صوفے تھے۔ اچانک ہی کوئی سامنے والے صوفے پر بیٹھا تو میں نے گڑبڑا کر دیکھا تو سامنے جمے ہوئے اور پیچھے کی طرف بنے بالوں والا خوبرو شخص مجھے سراہنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
"سوری میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے کمال احمد کہتے ہیں۔"
"رومانہ شعیب۔" میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔ "میرے شوہر شعیب انور۔" میں نے اشارہ کیا تو اس نے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔
"میں جانتا ہوں۔ شعیب میرے ڈیپارٹمنٹ میں ہوتے ہیں۔"
میں نروس ہو رہی تھی کیونکہ وہ مجھے مسلسل سراہنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک عورت ہونے کے ناطے میں اپنی طرف اٹھنے والی نظر اور نیت سے اچھی طرح واقف ہوتی تھی۔ جب کہ اس وقت میں اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ کوئی مرد مجھے سراہنے والی نظروں سے دیکھتا۔ اضافی وزن نے میرے جسم کو ہی نہیں چہرے کو بھی متاثر کیا تھا۔ مگر اس کی نظریں بھی جھوٹی نہیں تھیں۔ پھر اس نے الفاظ سے بھی کہہ دیا۔ "آپ بہت حسین ہیں۔"
میں زبردستی مسکرائی۔ "اب آپ مجھ سے ہمدردی کر رہے ہیں۔"
"اگر چاند پر بدلی آ جائے تو چاند کا حسن ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ اس طرح اگر حسین عورت بے ڈول ہو جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ بدصورت ہو گئی ہے۔ آپ کا حسن آپ کے پاس ہے۔ بس ذرا بدلی کو ہٹنے دیں پھر دیکھیے گا۔"
اگرچہ میں عام گھریلو عورت نہیں تھی اور نہ ہی اجنبی مردوں سے بات کرتے ہوئے جھجکتی تھی۔ میں نے ایک کو ایجوکیشن یونیورسٹی سے ماسٹر کیا تھا اور فیملی بیک گراؤنڈ بھی دبا ہوا نہیں تھا۔ مگر کسی مرد نے آج تک میری یوں بھی تعریف نہیں کی تھی۔ اگر کمال کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید میں اسے مہذب شٹ اپ کہتی۔ مگر اس میں نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ میں اسے کچھ نہ کہہ سکی بلکہ اس کے الفاظ نے جیسے مجھ پر جادو کر دیا۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ وہ جو کہہ رہا تھا میرے جسمانی حسن کے حوالے سے کہہ رہا تھا مگر مجھے ذرا بھی برا نہیں لگا اور میں نے بے یقینی سے کہا۔ "سچ سچ کیا میں خود کو ٹھیک کر سکتی ہوں؟"
"مجھے اپنا نمبر دیں۔" اس نے موبائل نکالتے ہوئے کہا۔ میں نے بلا جھجک اسے اپنا نمبر دے دیا۔ وہ ذرا آگے جھکا۔ "میں آپ کو کال کروں گا، پلیز انتظار کیجیے گا۔"
اس نے کہا اور میں دل و جان سے انتظار کرنے لگی۔
وہ پارٹی میں زیادہ دیر نہیں رکا تھا۔ میں نے اس دوران میں اس کی بیوی کو بھی دیکھا۔ وہ حسن و جوانی کا ایک ایسا مجسمہ تھی کہ وہاں موجود ہر مرد اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے لباس بھی ایسا پہنا ہوا تھا جس میں اس کے حسن کی نمائش ہو رہی

تھی۔ اگر پارٹی میں کوئی مرد اسے نہیں دیکھ رہا تھا تو وہ اس کا اپنا شوہر کمال احمد تھا۔ جب تک وہ پارٹی میں رہا اس کی نظریں مجھ پر مرکوز رہی تھیں۔ ان نظروں میں ایسی تاثیر تھی کہ میں اندر ہی اندر پگھلی جا رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا ورنہ میں ڈر رہی تھی کہ کوئی اس کی دلچسپی محسوس نہ کر لے مگر میں اس پارٹی کی سب سے کم قابلِ توجہ شے تھی اس لیے کسی نے محسوس نہیں کیا۔ جب میں شعیب کے ساتھ واپس آ رہی تھی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''میں کیسی لگ رہی تھی؟''

''ٹھیک لگ رہی تھیں۔'' اس نے روایتی سا جواب دیا۔

''میں اوور ویٹ لگ رہی تھی۔''

''تو شادی کے پانچ سال بعد اور تین بچوں کی ماں بن کر تمہیں اوور ویٹ ہی ہونا ہے۔''

''آپ نے کبھی مجھ سے نہیں کہا کہ میں اپنا ویٹ کم کر لوں۔'' میں نے شکوہ کیا۔

''کیا ضرورت ہے۔ تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے نا اگر بندہ بیمار ہو تو پھر اس قسم کی احتیاطیں کرتا اچھا بھی لگتا ہے۔''

یہ حقیقت ہے کہ شعیب نے کبھی میرے حسن کو نہیں سراہا۔ قربت کے لمحات میں اس کا رویہ ایسا ہوتا تھا جیسے وہ ذمے داری پوری کر رہا ہو۔ الفاظ سے تعریف کرنا جیسے اسے آتا ہی نہیں تھا۔ بچوں کے بعد میں موٹی ہونے لگی تو اسے کوئی تشویش نہیں تھی اور نہ ہی اس نے مجھے وزن پر قابو رکھنے کو کہا۔ شاید یہ اس کی فطری بے پروائی تھی جس نے میرے اندر ایک خلا پیدا کر دیا تھا اور اس خلا کو آج کمال نے پورا کیا تھا۔ شعیب نے کمال کو میرے پاس نہیں دیکھا تھا یا اگر دیکھا تھا تو اس کے نزدیک یہ کوئی قابلِ ذکر بات نہیں تھی۔ میں نے بھی اسے کمال کے بارے میں نہیں بتایا لیکن چند دن بعد وہ پارٹی کی البم لے کر آیا اور مجھے دکھا رہا تھا تو میں نے اس سے کمال کے بارے میں پوچھا۔ ''یہ کون صاحب ہیں۔ ان کی بیوی بہت حسین تھی۔ سب سے الگ نظر آ رہی تھی۔''

''یہ میرے شعبے کے ڈائریکٹر کمال صاحب ہیں۔ کمپنی کے... مالکان میں بھی شامل ہیں۔ انہوں نے خاصی بڑی سرمایہ کاری کر رکھی ہے مگر ڈائریکٹر کا عہدہ انہیں ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے ملا ہے۔ نوکری کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پیسا بے حساب ہے۔ سمجھ لو کہ وقت گزاری کے لیے جاب کرتے ہیں۔'' شعیب نے تفصیل سے بتایا۔

''آپ کو بھی البم ملے گا؟''

''نہیں لیکن کمپیوٹر میں تصاویر ہیں۔ میرے ای میل پر پڑی ہیں وہاں سے اتار لینا۔''

میں نے اگلے دن یہی کام کیا۔ ابھی میں تصویریں دیکھ رہی تھی کہ میرے موبائل کی بیل بجی۔ اجنبی نمبر آ رہا تھا مگر میرے دل نے کہا کہ کمال کی کال ہے۔ میں نے ریسیو کی اور مرتعش لہجے میں بولی۔ ''ہیلو۔''

''میں بات کر رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے کمال کی گہری آواز آئی۔ اس بار میں خود کانپ اٹھی تھی۔

''آپ...... ابھی میں آپ کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔''

''میں نے اسی لیے شعیب کو البم دیا تھا۔'' وہ ہنسا۔ ''آپ کیسی ہیں؟''

''محوِ انتظار۔'' میں نے بے ساختہ کہا اور پھر شرما گئی۔

''لیکن مجھ سے زیادہ محوِ انتظار نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سوچا کہ پہلے وہ کام نمٹا لوں جو آپ کے حوالے سے میرے ذہن میں آیا تھا اس کے بعد آپ کو کال کروں گا۔''

''کیسا کام؟''

''آپ کی رہائش کے نزدیک ہی ایک لیڈیز فٹنس کلب ہے۔ آپ وہاں جائیں گی اور اپنا تعارف کرائیں گی تو اس کے بعد ساری ذمے داری ان کی ہوگی۔ ایک سال میں آپ بالکل فٹ ہو جائیں گی۔''

میں پریشان ہوئی۔ ''میں چلی تو جاؤں لیکن شعیب سے کیا کہوں گی؟''

''یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے تم کہہ سکتی ہو کہ تمہیں ڈاکٹر نے ایڈوائس کیا ہے۔'' وہ آپ سے تم پر آ گیا اور مجھے بالکل برا نہیں لگا بلکہ اچھا لگا تھا۔ ''میں نے تمہاری ایک سال کی فیس سب منٹ کر دی ہے۔''

''آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

''تم جانتی ہو۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''پتا نوٹ کر لو۔''

اس نے لیڈیز کلب کا پتا بتایا۔ یہ سچ مچ یہاں سے بہت نزدیک تھا میں پیدل جا سکتی تھی۔ میں اگلے دن ہی وہاں پہنچ گئی۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کا لیڈیز فٹنس کلب تھا۔ یہاں ماہر انسٹرکٹرز کے ساتھ جدید ترین مشینیں اور وزن کم

کرنے کے طریقے تھے۔ باقاعدہ لیڈی ڈاکٹر تھی جو مشورہ دیتی اور کسی بھی صورت میں طبی مدد دیتی تھی۔ میں نے وہاں صرف اپنا تعارف کرایا تھا کہ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور کلب کی مالکہ مسز محمود نے مجھے بتایا کہ میں ان کی وی آئی پی ممبر تھی۔ مجھے ہر سہولت استعمال کرنے کی اجازت تھی اور اس کی مجھ سے کوئی اضافی فیس نہیں لی جاتی۔ یہ سب اس پیشگی فیس کا کمال تھا جو کمال نے جمع کرائی تھی۔ میرے لیے الگ سے خاص ٹرینر تھی۔ صوفیہ نامی یہ عورت ویسے تو چالیس سے اوپر کی تھی مگر اس نے خود کو اتنا سنبھال کر رکھا تھا کہ تیس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے میرا باقاعدہ انٹرویو کیا اور جب اسے پتا چلا کہ میرا سوا سال کا بیٹا ہے جسے میں فیڈ کراتی ہوں تو اس نے کہا۔ ”فیڈ روک دیں یہ آپ کے نسوانی حسن کو تباہ کردے گا۔“

”مگر کیسے؟“ میں نے پوچھا۔ میں خود بھی اب اس سلسلے کو روکنا چاہتی تھی۔ کیونکہ شاہ زیب اب اوپری خوراک لے رہا تھا اور اس نے فیڈ لینا کم کردی تھی جس سے مجھے تکلیف ہوتی تھی۔ اس لیے میں مسئلے کا حل چاہتی تھی۔ صوفیہ نے مجھے تسلی دی۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے آپ ڈاکٹر شبانہ کے پاس چلی جائیں وہ آپ کو گائیڈ کردیں گی۔“

ڈاکٹر شبانہ نے مجھے ایک ٹیب لیٹ دی۔ ”اسے دن میں ایک بار لینا ہے۔ صبح ناشتے سے پہلے۔“

میں فکرمند ہوگئی۔ ”ڈاکٹر اس کے سائیڈ ایفکٹ تو نہیں ہیں؟“

”آپ بے فکر ہو کر لیں۔“ اس نے اطمینان دلایا۔ ”ہمارے ہاں اکثر عورتیں دودھ روکنے کے لیے اسے یوز کرتی ہیں۔“

ایک ہفتے میں میرا مسئلہ حل ہوگیا۔ شعیب کو میں نے بتایا تھا کہ میں وزن کم کرنے کے لیے جم جارہی ہوں۔ اس نے زیادہ نہیں پوچھا کہ کہاں جارہی ہوں اور نہ ہی فیس اور دوسرے معاملات کا پوچھا۔ شعیب مجھے ہر مہینے اچھی خاصی پاکٹ منی دیتا تھا اور پھر تمام اخراجات بھی وہی پورے کرتا تھا۔ اس لیے میری رقم زیادہ تر پڑی رہ جاتی تھی۔ اس کے باوجود مجھے ضرورت ہوتی تو میں اس سے کہتی تھی اور وہ مجھے مزید رقم دے دیتا تھا۔ اسے باپ کی طرف سے وراثت میں بھی اچھا خاصا ملا تھا۔ یہ گھر اس نے اسی وراثت سے لیا تھا۔ اس کے علاوہ دو فلیٹ بھی تھے جن سے ماہانہ کرایہ آتا تھا۔ پھر اس کی تنخواہ اچھی تھی اس لیے مالی لحاظ سے ہم آسودہ تھے۔ میں نے شاہ زیب کو اوپر کا دودھ لگا دیا تھا۔

شروع میں صوفیہ نے مجھے ہفتے میں پانچ دن آنے کو کہا۔ اس دوران میں اس نے مجھے ہلکی پھلکی ایکسرسائز اور تھراپی کرائی اور مجھے تیراکی سکھائی۔ سوئمنگ پول بڑا سا تھا۔ بہت سی عورتیں اور لڑکیاں تیراکی کرتی تھیں کہ اس سے وزن تیزی سے کم ہوتا ہے۔ میں اور اکثر عورتیں چست لانگ نیکر جو گھٹنوں تک آتی تھی اور چھوٹی سلیو کی ٹی شرٹ میں تیراکی کرتی تھیں مگر کچھ ایسی تھیں جو مغربی طرز کے بکنی سوٹ پہن کر پول میں آتی تھیں۔ اگرچہ میرا تعلق بھی اوپری متوسط طبقے سے تھا لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہماری اپر کلاس آزادی میں اتنی آگے نکل گئی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ مجھے اس کلب میں آنے کے بعد ہوا۔ صرف تیراکی ہی نہیں بلکہ عام ایکسرسائز بھی بہت مختصر لباس میں کی جاتی تھی۔ ایک ہفتے میں، میں اچھی خاصی تیراکی سیکھ گئی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ میرا وزن کم ہو رہا تھا۔

جب میں سوئمنگ کرکے آتی تو صوفیہ اپنے ڈیجیٹل کیمرے سے میری تصویر لیتی تھی۔ وجہ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یوں اسے اندازہ رہے گا کہ میرا وزن کم ہونے کی رفتار کیا ہے اور میں پہلے کے مقابلے میں کیسی لگ رہی ہوں۔ حالانکہ وہ تیسرے دن وزن بھی کرتی تھی۔ یہ سب میری فائل میں درج ہوتا تھا۔ سوئمنگ کے چست لباس میں میرے فگرز نمایاں ہوتے تھے۔ ممکن ہے شعیب میری ایسی کوئی تصویر لینا چاہتا تو میں اسے اجازت نہ دیتی۔ مگر یہاں میں نے زیادہ توجہ نہیں دی اور اسے معمول کا حصہ سمجھا۔ ایک ہفتے بعد جب میں جم میں تھی اور ایکسرسائز کرکے لاکر روم میں تیراکی کا لباس پہننے سے پہلے سانس درست کر رہی تھی کہ کمال کی کال آئی۔ اس نے دوسری بار کال کی تھی جبکہ میں روز توقع کرتی تھی کہ اس کی کال آئے گی اور وہ نہیں آتی تھی۔

”روما کیسی ہو؟“ اس نے مخصوص آواز میں پوچھا تو میرا دل تیز دھڑکنے لگا تھا۔ میں نے بہ مشکل جواب دیا۔

”ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ ہنسا۔ ”کم آن تم کسی ٹین ایج گرل کی طرح کانپ رہی ہو۔“

مجھے حیرت ہوئی کیونکہ میں سچ مچ کانپ رہی تھی۔ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”آپ کو کیسے پتا چلا؟“

''رومانم سے صرف ایک بار ملا ہوں لیکن مجھے لگتا ہے میں تمہارے بارے میں سب جان گیا ہوں۔ تمہیں اتنی شدت سے سوچتا ہوں کہ تم مجھے اپنے پاس لگتی ہو۔ بالکل پاس...... بہت ہی پاس۔''

اچھے خاصے خنک اے سی میں بھی مجھے پسینا آ گیا تھا۔''ہائے آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔''

''اگر تمہیں پسند نہیں ہیں تو دوسری بات کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ جم کیسا جا رہا ہے؟''

میں اسے کہنا چاہتی تھی کہ مجھے اس کی باتیں پسند ہیں مگر نہ کہہ سکی۔ اس کی بجائے میں اسے جم کی مصروفیات اور نتیجے کے بارے میں بتانے لگی ۔''مجھے بہت مزہ آ رہا ہے۔''

''جلد تم بدل جاؤ گی۔''

اس بار میں نے ہمت کر کے پوچھا۔''کیا میں آپ کو بدلی ہوئی اچھی لگوں گی؟''

''تم مجھے ہر حال میں اچھی لگتی ہو۔ یہ سب تو میں نے صرف اس لیے کیا ہے کہ تم پارٹی میں جس طرح اداس الگ بیٹھی تھیں وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ تمہاری ذرا سی اداسی مجھ سے برداشت نہیں ہوگی۔''

''سچ کہہ رہے ہیں۔''میں خوش ہوگئی۔

''ہاں صرف زبانی نہیں میں اسے ثابت بھی کرسکتا ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''مجھ سے ملوگی؟''

''ہاں مگر کیسے؟''میں بے تاب ہوگئی۔

''کل جم سے تمہاری آف ہے لیکن تم جم کا کہہ کر آنا میں جم کے پاس سے تمہیں پک کرلوں گا۔''

میرا خیال تھا کہ ہم کہیں باہر ملیں گے۔ میں اس روز اہتمام سے تیار ہو کر نکلی تھی۔ کچھ عرصے پہلے ہی صائمہ میرے پاس ملازم ہوئی تھی اور اب میں گھر اور بچے اس پر چھوڑ کر جاسکتی تھی۔ میں نے مردانہ اسٹائل کا کرتہ اور ٹراؤزر پہنا تھا جو ظاہر ہے کہ مجھے فٹ تھا اس لیے میں نے اوپر چادر لے لی۔ کمال کی شاندار کار میں نہیں پہچان پاتی اگر وہ خود کار کے باہر نہ کھڑا ہوتا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی آئی تھی اور مجھے شرم آنے لگی۔ اس نے میرے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ میرے بیٹھنے کے بعد خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں شادی شدہ عورت تھی اور اپنی شوہر کی لاعلمی میں اس وقت ایک اجنبی کے ساتھ اس کی کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر کمال مجھے اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ اس وقت میں نے شعیب کے بارے میں سوچا تو وہ مجھے اجنبی لگا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''کمال نے پوچھا۔

''یہی کہ میں یہ کیا کررہی ہوں۔''

''مت سوچو۔''اس نے مشورہ دیا۔

''آپ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں کہ میں کیسی عورت ہوں۔ جس کا شوہر اور تین بچے ہیں اور میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

''میں صرف تمہارے بارے میں سوچتا ہوں۔''

''کیا سوچتے ہیں؟''

''جو ایک مرد کسی عورت کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔''

میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔''آپ بہت بے باک ہیں۔''

''ہاں کیونکہ میں مرد ہوں اور مرد کو بے باک ہونا چاہیے۔ سچ کہو تمہیں میری بے باکی پسند ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس دوران میں گاڑی کہاں جا رہی تھی میرا دھیان اس طرف نہیں تھا۔ میری ساری حسیات کمال کی طرف متوجہ تھیں۔ اس لیے جب گاڑی کوٹھی کے سیاہ گیٹ کے سامنے رکی تو میں چونکی۔

''آپ کہاں لائے ہیں؟''

اس نے ڈیش بورڈ پر لگے ایک آلے کا بٹن دبایا تو سیاہ گیٹ خود بہ خود کھلنے لگا اور وہ گاڑی اندر لے گیا۔''یہ میرا گھر ہے۔''

میں گھبرا گئی۔''یہاں تو آپ کی بیوی ہوگی۔''

''تم نے غور نہیں کیا میں نے کہا ہے یہ میرا گھر ہے اور یہاں صرف میں ہوتا ہوں۔''

اس بار میں زیادہ گھبرائی تھی۔''کوئی اور نہیں ہے۔''

''ہے۔''اس نے کہا اور اتر کر دروازہ کھولا۔ میں نیچے آئی تو پہلی بار اس نے مجھے چھوا اور میرا ہاتھ تھام کر داخلی دروازے تک آیا۔ اس نے الیکٹرونک لاک میں کارڈ داخل کیا تو وہ کھل گیا۔ ہم اندر آئے تو مجھے لگا کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔

''آپ کہہ رہے تھے یہاں کوئی ہے؟''

''ہاں تم ہو۔''کمال نے جواب دیا۔

''صرف میں اور آپ۔'' اس بار میں گھبرائی نہیں تھی مگر کیفیت عجیب سی ہونے لگی تھی۔ اس نے نرمی سے میرا ہاتھ سہلایا۔

''گھبراؤ نہیں۔ تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے اور یقین کرو میں ایک قدم بھی تمہاری مرضی کے بغیر نہیں اٹھاؤں گا۔'' اس نے کہا اور لاؤنج میں رکھے فریج کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے میرے لیے کولڈ ڈرنک کا ٹن نکالا اور اپنے لیے بیئر کا ٹن۔ وہ میری طرف آیا اور ٹن مجھے دیا تو میں نے جھجک کر پوچھا۔

''آپ پیتے ہیں؟''

وہ مسکرایا۔ ''مجھ جیسے ہی تو پیتے ہیں۔''

اے سی کی خنکی کے باوجود میرا گلا خشک ہو رہا تھا اور میں نے چند گھونٹ میں ٹن خالی کر دیا۔ کمال نے میرا ہاتھ تھام لیا اور سیڑھیوں کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ ''اب میں تمہیں اس کوٹھی میں اپنا خاص کمرا دکھاؤں گا۔''

جب وہ مجھے ہال نما کمرے میں لایا تو میرا حال پھر سے برا ہو گیا۔ وہاں موجود تصویریں اور مجسمے دیکھ کر میری نظریں جھک گئی تھیں۔ ''اف یہ سب کیا ہے؟''

''زندگی کے حقائق۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''ہر انسان ان حقیقتوں سے آشنا ہوتا ہے۔''

''مگر ان کا یوں کھل کر اظہار کون کرتا ہے۔''

''میں کرتا ہوں کیونکہ میں منافق نہیں ہوں جیسا اندر سے ہوں ویسا ہی باہر سے بھی ہوں۔ جب تم اچھی لگیں تو کھل کر کہہ دیا۔ باخدا اگر وہاں شعیب ہوتا تو میں اس کے سامنے بھی کہہ دیتا۔''

''نہیں آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔''

''اچھا نہیں کروں گا۔'' وہ میرے پاس آیا اور ذرا جھک کر بولا۔ ''تم جانتی ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں؟''

اس دوران میں، میں نے خود کو کسی قدر سنبھال لیا تھا۔

''ہاں میں جانتی ہوں۔''

اس نے میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کہا۔ ''کمال آج تک کسی عورت کے آگے نہیں جھکا مگر آج وہ تم سے تمہیں مانگتا ہے۔''

میں پہلے ہی راضی تھی۔ اگر راضی نہ ہوتی تو یہاں تک کیوں آتی۔ بلکہ پہلے ہی دن کمال کو جھڑک کیوں نہ دیتی۔ عورت ایک ہی نظر میں خود کو ہار جاتی ہے اور ایسا ہی میرے ساتھ ہوا تھا۔ میں پہلی نظر میں اس کی ہو گئی تھی اس کے بعد صرف عملی طور پر ہونا باقی رہ گیا تھا تو وہ اس دن ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد جب کمال مجھے واپس چھوڑنے جا رہا تھا تو میں بہت خوش اور مسرور تھی۔ مجھے ذرا بھی شرمندگی نہیں تھی کہ میں اپنے شوہر کی امانت میں خیانت کر کے آ رہی ہوں۔ بلکہ مجھے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ شعیب کی بجائے کمال میرا شوہر کیوں نہیں ہے۔ اب تک وہ میری تصویروں سے خود کو بہلا رہا تھا جو صوفیہ اسے ای میل کرتی تھی۔ شعیب سے مجھے محبت نہیں رہی تھی۔ مگر ہمارے درمیان اختلافات بھی نہیں تھے اور کوئی پریشانی یا مسئلہ بھی نہیں تھا اس لیے زندگی کی گاڑی سکون سے چل رہی تھی۔ مگر اب مجھے شعیب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جب کمال نے مجھے کلب کے پاس اتارا تو اس نے حسرت سے کہا۔ ''کاش کہ مہوش کی جگہ تم ہوتیں۔''

''یہی میں بھی سوچ رہی تھی۔'' میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''مگر قدرت نے ہمارے راستے جدا رکھے۔''

''اس کے باوجود ہمیں ایک بھی کر دیا۔''

''ہاں مگر ہمیشہ کے لیے نہیں۔''

میں گھر آئی اور میں نے اپنے بچوں کو دیکھا تب مجھے احساس ہوا کہ میں کیا کر کے آئی تھی اور شاور لیتے ہوئے میں بہت روئی تھی۔ اس کے باوجود کمال سے پیچھے ہٹنے یا اسے چھوڑنے کا خیال تک ذہن میں نہیں آیا تھا۔ اب ہماری ملاقات یوں ہونے لگی کہ ہفتے میں ایک بار کمال مجھے کلب کے نزدیک کسی جگہ سے پک کر لیتا تھا۔ ہماری ملاقات اس کی کوٹھی میں ہوتی تھی اور وہ ایک یا ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے واپس چھوڑ دیتا تھا۔ چھ مہینے بعد صوفیہ نے مجھے ہفتے میں تین دن بلانا شروع کیا تو میرے لیے مشکل ہو گیا کہ اب میں چوتھے دن جایا کروں۔ پھر کلب ہمارے علاقے میں ہی تھا اور اس کا خطرہ تھا کہ کوئی پڑوسی یا جاننے والا مجھے کمال کے ساتھ آتے جاتے نہ دیکھ لے۔ اگرچہ کمال اور میں پک اینڈ ڈراپ کی جگہ بدلتے رہتے تھے اس کے باوجود خطرہ تو تھا۔

ان چھ مہینوں میں میری شیپ ہی بدل گئی تھی۔ وزن گھٹ کر پینسٹھ کلوگرام ہو گیا تھا، اگرچہ یہ اب بھی زیادہ تھا مگر میرا جسم متناسب نظر آنے لگا تھا۔ صوفیہ نے کہا کہ میں باقی اضافی وزن عجلت میں کم نہ کروں اس سے میں غیر متناسب بھی ہو سکتی ہوں اور یہ بات مجھے کسی صورت گوارہ نہیں تھی کیونکہ میں جان گئی تھی کہ کمال مجھے کس طرح سے دیکھنا پسند کرتا ہے۔ وزن کم ہوا تو مجھے کاموں میں بھی آسانی ہوئی تھی۔ پہلے میرے لیے چلنا ہی بہت مشکل کام تھا۔

ذرا چل کر ہانپ جاتی تھی۔ گھر کے کاموں کے لیے کل وقتی ملازمہ بھی اسی وجہ سے لگائی تھی۔ مگر جم جانے اور وزن کم ہونے سے اب میں سب کام باآسانی کر لیتی تھی۔ میرا بہت سا وقت بالکل فارغ گزرتا تھا۔ مجھے خیال آیا تھا مگر اسے پیش کمال نے کیا۔ میں اس کی کوٹھی اور بیڈروم میں تھی تو اس نے کہا۔ ''روما تم جاب کیوں نہیں کر لیتیں۔ ماسٹر کیا ہوا ہے۔''

''ہاں لیکن جاب تلاش کرنا مشکل کام ہے۔''

''بالکل میرے ہوتے ہوئے کیا مشکل ہے؟'' اس نے کہا اور دوسرے ہی دن مجھے اس این جی او کا پتا اور ای میل دے کر کہا۔ ''یہاں اپنی سی وی بھیج دو۔''

میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کمال اتنی جلدی کمال دکھائے گا۔ ''لیکن میں نے ابھی شعیب سے اجازت نہیں لی ہے۔''

''تو لو نا جانِ من، اگر تم جاب کر لو گی تو ہمارے ملنے میں بہت آسانی ہو جائے گی اور تم فکر مت کرو تمہیں معمولی جاب نہیں ملے گی۔ تمہاری سیلری شعیب سے کم نہیں ہو گی اور گاڑی بھی ملے گی۔''

''میں اجازت لے لوں گی۔'' میں نے کہا اور پھر شعیب سے بات کی۔ وہ راضی نہیں تھا مگر میں نے اسے منا لیا۔ اگرچہ اس کے لیے مجھے خود پر جبر کرنا پڑا تھا۔ شادی کے بعد وہ میرے پاس کم آتا تھا۔ اگرچہ یہ بہت کم بھی نہیں تھا مگر مجھے محسوس ہوتا تھا اور کئی بار مجھے خود اسے متوجہ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن جب کمال میری زندگی میں آیا تو شعیب کی قربت مجھے بوجھ لگنے لگی تھی اور میں اس سے کترانے لگی۔ جب اس کا موڈ ہوتا تو کوئی بہانہ کر دیتی۔ وہ میری بات کا یقین کر لیتا تھا۔ شاید وہ تشنہ تھا مگر اس کا اظہار نہیں کرتا تھا اس لیے جب میں خود اس کی طرف گئی تو اس سے اپنی بات منوانے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ وہ سن کر حیران ہوا تھا کہ اس جاب میں نہ صرف بہت اچھی سیلری تھی بلکہ گاڑی بھی ملتی۔

''ہمارے ہاں ایسا کہاں ہوتا ہے۔''

''یہ غیر ملکی این جی او ہے اور اسے اچھا خاصا پیسا ملتا ہو گا اس لیے ملازمین کو اچھی تنخواہیں اور مراعات دے رہی ہے۔''

''تب تو اچھی بات ہے تم اپلائی کر دو۔''

سی وی میں پہلے ہی بھیج چکی تھی۔ اتفاق سے میں نے ماسٹر کے لیے سوشیالوجی لی تھی اور یہ این جی او سے متعلق مضمون تھا۔ دو دن بعد مجھے کال آئی اور انٹرویو کے لیے بلا لیا گیا۔ اس وقت وہاں پروجیکٹ منیجر صبیح صاحب تھے اور مجھے ان کی اسسٹنٹ مقرر کیا گیا تھا۔ سب پہلے سے طے تھا اور انٹرویو و باقی مراحل صرف فارملٹیز تھے۔ ایک ہفتے بعد مجھے اپائنٹ منٹ لیٹر مل گیا اور میں نے جاب شروع کر دی مگر این جی او میں بھی کسی کو نہیں معلوم تھا کہ مجھے یہ جاب کس طرح ملی ہے۔ سب اسے تھرو پراپر چینل سمجھ رہے تھے اور صرف میں یا اوپر کے کچھ بڑے جانتے تھے کہ جاب مجھے کمال احمد کی وجہ سے ملی ہے۔ شروع میں تنخواہ زیادہ نہیں تھی اور گاڑی بھی نہیں ملی تھی البتہ مجھے پک اینڈ ڈراپ دیا ہوا تھا۔ چھ مہینے اور اس کے مزید چھ مہینے بعد میری تنخواہ میں اچھا خاصا اضافہ ہوا اور ایک سال بعد مجھے گاڑی مل گئی تھی، اگرچہ ذرا پرانے ماڈل کی تھی مگر میرے لیے ٹھیک تھی۔ شیوی کار مجھے دو سال پہلے ملی تھی۔

اب میں اور کمال ہفتے میں ایک بار ملتے تھے۔ کمال پہلے اپنی کوٹھی پہنچ جاتا جو اس نے شاید اسی کام کے لیے رکھی ہوئی تھی کیونکہ وہاں نہ تو کوئی رہتا تھا اور نہ ہی کبھی مجھے تیسرا فرد نظر آیا۔ کوٹھی سینٹرلی اے سی اور چاروں طرف سے بند تھی اس لیے مہینے میں ایک بار اس کی صفائی کافی ہوتی تھی۔ کمال کے مخصوص ملازمین ہفتے میں ایک بار وہاں جا کر باہر کی اور مہینے میں ایک بار اندر کی صفائی کرتے تھے۔ اس لیے کوٹھی خالی ہونے کے باوجود بالکل صاف ستھری ہوتی تھی اور ہم وہاں جاتے تھے تو ہمیں ایک منٹ کے لیے بھی کوئی زحمت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ جیسے ہی میری گاڑی وہاں پہنچتی کمال کیمرے میں دیکھ کر گیٹ کھول دیتا اور داخلی دروازے کا الیکٹرونک لاک بھی وہ اوپر بیٹھے ہوئے ریموٹ سے کھول دیتا تھا۔ جاب اور کمال سے ملاقات ایک روٹین سی بن گئی تھی۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں عادی ہو گئی تھی۔ اب بھی کمال سے ملنا اور اس کے پاس جانا میرے لیے سنسنی خیز عمل تھا۔ اس کے لیے میری چاہت اور طلب میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ یہی حال کمال کا تھا، ہر بار وہ مجھے ایک نئی چاہ اور طلب کے ساتھ ملتا تھا۔ کتنی بار اس نے کہا کہ وہ میرا ہمیشہ کا ساتھ چاہتا ہے۔ مگر ہم دونوں جانتے تھے کہ یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ بھی شادی شدہ تھا اور بچوں والا تھا۔ میں بھی شادی شدہ اور بچوں والی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ سکتا تھا مگر بچوں کو نہیں اور میں بھی اپنے بچے نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس

لیے ہماری خواہش صرف خواہش ہی رہتی تھی۔ شاید یہ ملاقات کا جذباتی ابال تھا جو ہمیں اس خواہش پر اکساتا تھا۔ جب میں کمال سے مل کر آتی تو شعیب مجھے بہت برا لگتا تھا اور مجھے خیال آتا کہ اگر وہ مر جائے تو میں کمال سے شادی کے لیے آزاد ہو جاؤں گی مگر جب جذبات سے ہٹ کر سوچتی تو مجھے اپنی سوچ پر شرم آتی تھی۔ شعیب میرا شوہر تھا اور اگر وہ شوہر نہ بھی ہوتا تب بھی مجھے اس کے بارے میں ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا یہ اس پر دوہرا ظلم ہوتا۔

ایک سال بعد میری کلب کی ممبر شپ ختم ہونے والی تھی مگر کمال نے مجھے بتائے بغیر ہی اسے رینیو کرا دیا۔ وہ مجبور تھا مجھے تحفے نہیں دے سکتا تھا کہ میں شعیب کو ان کے بارے میں کیا بتاتی۔ کبھی کبھی وہ مجھے ایسا سوٹ یا کوئی اور چیز گفٹ کر دیتا تھا جو میں خود بھی لے سکتی تھی اور شعیب کو میں یہی بتاتی کہ میں نے یہ خود لیا ہے۔ وہ جو قیمتی سوٹ لاتا تھا وہ اسی کوٹھی کے وارڈ روب میں جمع ہوتے گئے۔ اسی طرح جوتے، سینڈلز، پرفیوم، میک اپ کا سامان۔ حد یہ کہ نائٹیز بھی لایا تھا۔ اگرچہ ان سب چیزوں کو استعمال کرنے کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ کمال میرے لیے ڈائمنڈ سیٹ بھی لایا تھا اور وہ کوٹھی میں رکھا تھا۔ جب اس کا موڈ ہوتا اور وہ کہتا تو میں اسے وہیں اسے پہن کر دکھاتی تھی۔ اس کے نیکلس میں درجنوں چھوٹے بڑے ہیرے لگے تھے۔ ٹاپس اور انگوٹھی بھی بہت خوبصورت تھی۔ کمال نے یہ سیٹ خاص طور سے دبئی سے میرے لیے منگوایا تھا۔

جب میں اسے اس کی کوئی لائی چیز پہن کر یا استعمال کر کے دکھاتی تو اس کی مسرت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ شعیب بھی میرے لیے چیزیں لاتا تھا مگر اس نے آج تک غور نہیں کیا کہ میں انہیں پہنتی یا استعمال کرتی ہوں تو کیسی لگتی ہوں اور نہ ہی اس نے کبھی فرمائش کی کہ میں اس کے لیے کچھ کروں۔ اگر میں پہلے ہی مردوں کی طرف متوجہ ہونے والی ہوتی تو سمجھتی کہ شاید شعیب کی اسی بے رخی نے مجھے کمال کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن میں جانتی تھی کہ ایسا نہیں تھا۔ کمال سے مجھے محبت ہوئی تھی اور اسی وجہ میں ہر چیز سے بے پروا ہو کر اس کی طرف بڑھی تھی۔ مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ اگر میرے اور کمال کے تعلق کا بھانڈا پھوٹ گیا تو میرا گھر کیسے برباد ہوگا۔ صرف میں ہی نہیں میرا شوہر اور بچے بھی برباد ہوں گے وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔

کمال جب بلاتا میں چلی جاتی۔ اگرچہ میں زیادہ دیر نہیں رکتی تھی مگر مجھے محسوس ہوتا کہ کمال میرا ساتھ چاہتا ہے تو میں رک بھی جاتی تھی۔ لیکن وہ میری مجبوری سمجھتا تھا اس لیے ہر بار ایسا نہیں ہوتا تھا۔ میں مشکل سے ڈیڑھ گھنٹے رکتی تھی اور پھر وہاں سے نکل آتی۔ بہت کم ایسا ہوا کہ میں کمال کے پاس ہوں اور شعیب یا کسی اور کی کال آجائے۔ میں نے گھر اور دفتر کے معاملات بالکل الگ رکھے تھے۔ شعیب کے پاس میرے کسی کولیگ کا نمبر نہیں تھا۔ اس کے پاس صرف دفتر کے لائن نمبر تھے۔ اسی طرح میرے کسی کولیگ کے پاس شعیب کا نمبر نہیں تھا اور میرے گھر لائن فون نہیں تھا۔ اس لیے دونوں طرف سے اگر کال آتی تو مجھے ہی آتی تھی۔ اگرچہ میری اس حکمتِ عملی کی وجہ سے میری اور کمال کی یہ ملاقات خفیہ رہی۔ اس کے باوجود اتنے عرصے تک اس کا چھپے رہنا حیرت انگیز ہی تھا۔

☆☆☆

میں نے بیڈ سے اٹھ کر ایک طرف شیشے کی دیوار پر لگا ہوا پردہ سرکایا تو دور مارگلہ کی پہاڑیوں پر ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے کمال کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ ان سات سالوں میں میں سر سے پاؤں تک اس کی پسند میں ڈھل گئی تھی۔ جب میں نے کمال سے کہا کہ اگر میں اس کی زندگی میں مستقل آگئی تو میں بھی روٹین ورک ہو کر رہ جاؤں گی تو اس نے پورے یقین سے جواب دیا۔ ”ایسا نہیں ہوگا۔ تم میں اور مہوش میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تم خود دیکھو کہ ہمارے تعلق کو کتنے سال بیت گئے ہیں کیا تم نے میری دیوانگی میں کوئی کمی دیکھی۔“

”نہیں۔“

”یہ حقیقت ہے کہ ناجائز تعلقات کے جذبات بہت جلد ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں اور دنیا کے خوف حاوی آجاتے ہیں، کیا تمہیں دنیا کا خوف آیا؟“

”نہیں۔“ اس بار میں نے اعترافاً کہا۔

”تب خود سوچو اگر ہم ہمیشہ کے لیے بھی ساتھ ہوں تو ممکن ہے کہ قربت کے جذبات کچھ سرد ہو جائیں مگر محبت کے جذبات بھی سرد نہیں ہوں گے۔ ہماری چھوٹی سی قربت ہمیں کتنی خوشی دیتی ہے تو ساری عمر کی قربت کتنی زیادہ خوشی دے گی۔“

میں پردہ برابر کر کے پلٹ آئی۔ ”لیکن تم جانتے ہو یہ ممکن نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ اس نے اصرار کیا۔

''نہ تمہاری بیوی تمہیں چھوڑے گی اور نہ شعیب مجھے چھوڑے گا۔''

''مہوش کا مسئلہ نہیں۔'' کمال نے کہا۔''مرد دو شادیاں کرسکتا ہے۔ میں اسے طلاق بھی دے سکتا ہوں۔ مسئلہ شعیب کا ہے۔''

''تم چاہتے ہو میں اس سے طلاق لے لوں؟''

''میں چاہتا ہوں کہ اب تم بلاخوف وخطر میرے پاس رہو چاہے تمہیں اس کے لیے طلاق لینی پڑے یا کچھ اور کرنا پڑے۔''

''کچھ اور کیا مطلب؟''

''یہ تم سوچو۔'' کمال نے کہا اور اس دن میں گھر آتے ہوئے یہی سوچتی رہی کہ شعیب سے الگ ہونے کی اور کیا صورت ہوسکتی ہے۔ مگر میرے ذہن میں سوائے طلاق کے اور کوئی راستہ نہیں آرہا تھا اور یہ بھی آسان نہیں تھا۔ میں گھر آئی تو اتفاق سے شعیب آچکا تھا۔ وہ بچوں کے ساتھ بیٹھا ان سے خوش گپیاں کررہا تھا۔ مجھ سے وہ بے پروا سہی لیکن اپنے بچوں سے بہت قریب تھا۔ ان کی ایک ایک چیز کا خیال رکھتا۔ ان سے دوستوں کی طرح پیش آتا تھا اور چھٹی والے دن تینوں باپ بیٹے مل کر کرکٹ کھیلتے تھے۔ تینوں کرکٹ کے دیوانے تھے اور اگر ٹی وی پر میچ آرہا ہو اور وہ گھر میں ہوں تو مجال ہے جو ٹی وی کے آگے سے سرک جائیں۔ شاہ زیب دوڑ کر آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

''ماما آپ نے دیر کردی۔''

میں نے جھک کر اسے پیار کیا۔''میری جان کام سے جانا تھا؟''

''کیسا رہا تمہارا پروجیکٹ وزٹ؟'' شعیب نے پوچھا مگر اس کی نظریں ٹی وی پر مرکوز تھیں۔

''ٹھیک رہا۔'' میں نے کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ صائمہ نے رات کا کھانا تیار کرلیا اور اسے چھٹی دے کر میں نے پہلے شاور لیا اور پھر اپنے لیے چائے بنائی۔ بچے اپنا ہوم ورک کرنے چلے گئے تھے۔ شعیب بدستور ٹی وی کے آگے تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھی۔''آج آپ جلدی آگئے؟''

''ہاں کمال صاحب آج جلدی چلے گئے تھے اور کام بھی خاص نہیں تھا اس لیے میں جلدی آگیا۔''

کمال کے نام پر میری دھڑکن بڑھی تھی۔''کمال صاحب کیسے ہیں؟''

شعیب نے شانے اچکائے۔''انہیں کیا ہونا ہے۔ مزے کرنے والے آدمی ہیں۔ ہر فکر اور ذمے داری سے آزاد ہیں۔''

''بیوی بچے ہیں اور ڈائریکٹر شپ بھی ہے تو آزاد کیسے ہوئے؟''

''یہ سب ان کی وقت گزاری کے طریقے ہیں۔ ورنہ اصل میں وہ آزاد ہی ہیں۔ عورتوں اور پینے پلانے کے شوقین۔''

''سارے بڑے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

''ان کو عام بڑا آدمی مت سمجھو۔ دوسرے بڑے پہلے گھر، بیوی بچوں، بزنس اور دوست احباب کو دیکھتے ہیں اس کے بعد عیاشی کرتے ہیں۔ کمال صاحب کی ترجیح عیاشی ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بیوی بچے اور کاروبار بھی کر رکھا ہے۔''

میں بے یقینی سے ہنسی۔''یہ تو بہت عجیب بات ہے۔''

شعیب نے شانے اچکائے۔''واقعی عجیب بات ہے مگر ان کے بارے میں ایسی ہی باتیں مشہور ہیں اور مزے کی بات ہے وہ خود بھی اپنے بارے میں یہی کہتے ہیں کہ اوپر والے نے انہیں دنیا میں مزے کرنے بھیجا ہے۔ آخرت کا عذاب تو پکا ہے اس لیے کیوں نہ دنیا میں جی بھر کر مزے کرلوں۔''

کمال نے آج تک میرے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی شاید اس لیے کہ میرے سامنے وہ میری ہی بات کرتا تھا۔ اسے میرے سوا کچھ سوجھتا نہیں تھا۔ شعیب کمال کے بارے میں بتا کر خاموش ہوگیا۔ وہ اپنے بارے میں کم بتاتا تھا جیسے اپنی دفتری مصروفیات یا باہر کے بارے میں۔ میں ٹی وی دیکھتے ہوئے چائے پی رہی تھی کہ اس نے اچانک کہا۔''آج اللہ نے بچت کردی۔''

''کیا مطلب؟''

''ایک سگنل پر جیسے ہی گاڑی آگے بڑھائی سائیڈ سے ایک بڑا ٹرک تیزی سے گزرا اگر میں بروقت بریک نہ مارتا تو ٹرک کار پر چڑھ ہی جاتا۔''

میرے جسم میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس لیے نہیں کہ شعیب حادثے سے بال بال بچا تھا بلکہ یہ سوچ کر کہ اگر وہ حادثے کا شکار ہوجاتا تو اس وقت میں بیوہ اور آزاد ہوتی۔ میری سمجھ میں آگیا کہ شعیب سے الگ ہونے کا طلاق کے علاوہ کیا طریقہ ہوسکتا تھا اور کمال کا اشارہ اسی

طرف تھا۔ اس نے مجھے سوچنے کو کہا تھا نا۔ مگر اس نے ایسا کیوں کہا تھا؟ میں اس سوچ میں ایسی گم ہوئی کہ شعیب نے مجھے دوسری یا تیسری بار پکارا تب مجھے سنائی دیا۔ میں چونکی اور جھرجھری لے کر کہا۔ ”شکر ہے خدا کا۔“

شعیب مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ”کہاں گم ہوگئی تھیں تم میں اتنی دیر سے پکار رہا تھا۔“

”پتا نہیں میرا ذہن کہاں چلا گیا تھا؟“

☆☆☆

”تم نے ایسا کیوں کہا تھا؟“ میں نے کمال سے پوچھا۔ آج میں پورے دس دن بعد اس کے پاس آئی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں دس صدیوں بعد آئی ہوں۔ کمال نے سگریٹ سلگالیا تھا۔ اس نے سکون سے جواب دیا۔

”اگر شعیب تمہیں نہیں چھوڑتا تو ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔“

میں کانپ اٹھی۔ ”پلیز کمال تم کیا کہہ رہے ہو۔“

اس نے ذرا اٹھ کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”کیا لوگ مرتے نہیں ہیں۔ جوانی میں، بیوی بچوں کے ہوتے ہوئے، کسی بیماری سے۔“

”شعیب کو کوئی بیماری نہیں ہے۔“

”انسان حادثے میں بھی تو مر سکتا ہے۔“ کمال نے معنی خیز انداز میں کہا تو مجھے شعیب کی بات یاد آئی وہ حادثے سے بچا تھا ایک گز کے فرق نے اسے موت سے بچا لیا تھا۔ اگر وہ مرجاتا تو...... اس خیال نے مجھے لرزا دیا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”خدا کے لیے تم بھی ایسا مت سوچو۔“

”میں اب سے نہیں بہت عرصے سے سوچ رہا ہوں۔“ اس نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم سے کہہ نہیں پا رہا تھا۔“

”اب تم کہہ رہے ہو کیوں؟“

”کیونکہ اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔“ اس کا لہجہ تیز ہوگیا۔ ”میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔“

کمال کی بات نے مجھے سہا دیا تھا میں اس کے نزدیک آئی اور محبوبانہ انداز میں کہا۔ ”تم سے دور کہاں ہوں پاس تو ہوں۔“

اس نے میرے دونوں بازو پکڑ لیے اور کسی قدر ہیجانی انداز میں بولا۔ ”تم ہفتہ دس دن میں ایک دو گھنٹے کے

لیے پاس آتی ہو۔ میں تمہیں ہمہ وقت اپنے پاس چاہتا ہوں۔''

اس کا ہیجان کم کرنے کے لیے میں زبردستی ہنسی۔ ''اگر تمہارے پاس ہوتی تب بھی تم ہر وقت میرے پاس کہاں ہوتے؟''

''لیکن جب چاہتا تب تو تمہارے پاس ہوتا لیکن یہاں تو انتظار کرنا پڑتا ہے، ترسنا پڑتا ہے۔'' کمال کا انداز اور لہجہ نرم ہوگیا۔ ''پلیز روما سمجھنے کی کوشش کرو میں صرف تمہاری قربت نہیں تمہارا ساتھ چاہتا ہوں۔ ہم ہر جگہ ساتھ ساتھ ہوں۔ گھر میں گھر کے باہر، ساری دنیا گھومیں اور ہمیں کسی کا خوف نہ ہو۔ روما میں چاہتا ہوں کہ ہمارے بچے ہوں۔''

میں ہنسی۔ ''اس عمر میں؟''

''پاگل ہو تم عورتیں تو چالیس پینتالیس سال کی عمر میں بچے پیدا کرتی ہیں اور تم چھتیس کی ہوئی ہو۔ دیکھنے میں چھتیس کی بھی نہیں لگتیں۔ ہم ماں باپ بن سکتے ہیں۔''

جب سے میں کمال سے مل رہی تھی۔ احتیاطی تدابیر پر عمل کر رہی تھی کیونکہ میں ایسا کوئی بچہ پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی جو میرے شوہر کا نہ ہو۔ کمال کی بات نے مجھے کچھ دیر کے لیے اپنے سحر میں لے لیا تھا۔ اگر میں اس کی ہو جاتی اور ہمیں کسی کا خوف نہ ہوتا تو ہم زندگی کو کتنا انجوائے کرتے۔ ابھی تو ہماری ساری تفریح اس واحد ملاقات تک محدود تھی جو ہفتے عشرے میں ایک بار ہوتی تھی۔ مگر جب میں سحر سے نکلی تو مجھے احساس ہوا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ کمال مجھے غور سے دیکھ رہا تھا وہ میری سوچ بھانپ گیا۔ اس نے کہا۔ ''سب ممکن ہے، بس آدمی کو ارادہ اور عمل کی ہمت کرنا ہوتی ہے۔''

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں اپنے شوہر کو قتل کرنے کا ارادہ اور ہمت کروں؟''

''ہاں میں یہی کہہ رہا ہوں۔'' کمال نے بلا جھجک کہا۔ ''اگر تم یہ کام نہیں کرو گی تو میں کر گزروں گا چاہے میں اس الزام میں پکڑا جاؤں اور مجھے سزا ہو جائے۔''

میں گھبرا گئی۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اگر تمہیں کچھ ہوا تو میں کیسے زندہ رہوں گی۔''

''تب تم اس پر سوچو اور غور کرو۔ تم نہیں جانتیں کہ جب دفتر میں شعیب میرے سامنے آتا ہے تو میں کتنی مشکل سے خود پر قابو پاتا ہوں۔ کبھی میرا دل کرتا ہے کہ پیپر نائف اٹھا کر اس کے سینے میں گھونپ دوں اور پیپر ویٹ سے اس کا سر کچل دینے کا خیال آتا ہے۔ میں کوشش کر کے تھک جاتا ہوں کہ میرے اندرونی جذبات کا اثر میرے چہرے پر نہ آئے۔''

اب مجھے احساس ہوا کہ کمال کس آزمائش سے گزر رہا تھا۔ وہ سارا دن اپنے رقیب کے ساتھ رہتا تھا اور اس کے لیے خود پر قابو رکھنا دشوار کام تھا۔ شاید اب یہ کام دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔ کمال نے اس سے پہلے کبھی اس طرح کے جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ آج وہ بولا تو جیسے پھٹ پڑا تھا اور چند لمحے کے لیے میں حیران رہ گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''آج تک تم نے اس طرح سے نہیں کہا۔''

''میں نے کہا نا کہ اب میری برداشت سے باہر ہوگیا ہے۔ اگر میں نے شعیب کو کچھ نہ بھی کہا تو میں اسے کمپنی سے نکلوا دوں گا اور میں ایسا بھی نہیں چاہتا۔''

''اگر تم اسے کمپنی سے نکلوا دو تو میں اس سے طلاق کا کہہ سکوں گی کہ وہ بے روزگار ہو جائے گا۔''

کمال نے انکار کیا۔ ''اس معیار کا پروفیشنل زیادہ عرصے بے روزگار نہیں رہ سکتا۔ چند مہینے میں اسے دوسری جاب مل جائے گی اور ممکن ہے زیادہ اچھی جاب مل جائے۔ روما اس مسئلے کا حل وہی ہے جو میں نے بتایا ہے اس پر غور کرو اور یہ سوچ کر غور کرو کہ یہ ہماری زندگی کا سوال ہے اور شاید موت کا بھی ہے۔''

کمال نے میرا سر چکرا دیا تھا اور جب میں گھر آئی تو پریشانی میں راستے میں دو بار مجھ سے ایکسی ڈینٹ ہوتے ہوتے بچا۔ گھر آ کر بھی میں اتنی پریشان ضرور تھی کہ بچوں اور پھر شعیب نے محسوس کر لیا اور انہوں نے پوچھا بھی مگر میں نے ٹال دیا۔ خاص طور سے شعیب سے میرا بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا اور وہ اس وقت مجھے زہر لگ رہا تھا جو میری اور کمال کی خوشیوں کے درمیان دیوار بنا ہوا تھا۔ اگرچہ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ میرا کسی اور مرد سے تعلق ہے مگر اس کے باوجود وہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس رات میں جلدی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ میں نے طبیعت خرابی کا بہانہ کیا تھا۔ اگلی صبح میں اس وقت تک بستر پر لیٹی رہی جب تک شعیب دفتر کے لیے نہیں نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نیچے آئی، آج میرا آفس جانے کا موڈ نہیں تھا اس لیے میں نے کال کر کے طبیعت خرابی کا کہہ کر چھٹی لے لی۔

میں کم ہی چھٹی کرتی تھی اس لیے میری میڈیکل لیو بھی جمع ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ تین چار دن دفتر

نہیں جاؤں گی۔ میں آرام کرنا اور سوچنا چاہتی تھی۔اس لیے میں نے موبائل بھی آف کر دیا۔کمال اور میں ایک دوسرے کو بلاضرورت کال نہیں کرتے تھے۔اس لیے مجھے اس کی فکر نہیں تھی کہ وہ کال کرے گا اور اسے میرا موبائل بند ملے گا۔گھر میں ایک موبائل سب کے لیے تھا یہ لاؤنج میں رکھا ہوتا تھا اور اگر کسی کا موبائل بند ہوتا تو اس پر کال کی جاتی تھی عام طور سے صائمہ کال ریسیو کرتی تھی۔دوپہر میں شعیب کی کال آئی تو صائمہ نے اسے بتادیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔اس نے مجھ سے بات کرانے کو کہا۔ میں نے بہ مشکل اس سے بات کی اور آرام کا کہہ کر کال کاٹ دی۔میں دن میں سوتی رہی اور شاید اسی وجہ سے شام تک میری طبیعت بہتر ہوئی تھی۔میں بچوں کے ساتھ بیٹھی بات کر رہی تھی کہ شعیب آگیا اور اسے دیکھ کر میرا موڈ پھر خراب ہو گیا۔اس نے بھی یہ بات محسوس کی تھی اور رات جب ہم اپنے کمرے میں آئے تو اس نے پوچھ لیا۔

''کیا بات ہے تم مجھ سے اکھڑی سی ہو رہی ہو کوئی بات ہے کیا؟''

''کوئی بات نہیں ہے۔''

''پھر مجھے دیکھ کر تمہارا منہ کیوں سوج گیا تھا؟''

''یہ بات تم خود سوچو۔'' میں نے کچھ دیر بعد کہا کیونکہ میری سمجھ میں کوئی معقول بہانہ نہیں آرہا تھا۔اس لیے میں نے بات اس پر ڈال دی۔

''میں کیا سوچوں جب کہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔''

''جو تمہاری مرضی۔'' میں کروٹ لے کر لیٹ گئی مگر اس نے ایک جھٹکے سے مجھے اپنی طرف موڑ لیا۔میرا بازو مڑ گیا تھا۔

''اس طرح بات ختم نہیں ہوگی۔''

''جنگلی میرا بازو چھوڑو۔'' میں نے بلبلا کر کہا تو اسے میری تکلیف کا احساس ہوا اور اس نے بازو چھوڑتے ہوئے کہا۔

''سوری مجھے غصہ آگیا تھا۔''

اس وقت میرے دل میں اس کے لیے نفرت کی لہر اٹھی تھی اور میں نے تلخی سے کہا۔''میری دو دن کی بے رخی اتنی بری لگی اور میں جو پندرہ سال سے برداشت کر رہی ہوں۔تم نے کبھی خود پر غور کیا۔ایک بیوی کو شوہر کے پیار اور توجہ کی ضرورت بھی ہوتی ہے تم نے مجھے کیا دیا؟''

''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' اس نے کسی قدر ندامت سے کہا۔شاید اسے بھی احساس ہوا تھا۔مگر میری نفرت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اچھا یہ میرے لیے انکشاف ہے ورنہ میں تو سمجھتی تھی کہ ہمارے درمیان بس ایک قانونی رشتہ ہے۔میرا فرض ہے کہ تمہاری جسمانی اور فطری ضروریات پوری کروں۔ تمہارے بچے پیدا کروں اور پھر ان کو پالوں۔ جہاں تک میری ضروریات ہیں تو وہ بس کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے تک محدود ہیں۔''

''میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا،تم میری بیوی ہو۔''

''صرف بیوی۔'' میں نے کہا اور دوبارہ کروٹ لے لی۔اس رات مجھے کمال کی تجویز کا خیال آیا تھا۔مگر میں اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہی تھی کہ ایک انسان کو قتل کرنے کا سوچوں۔اس پر عمل کرنا تو دور کی بات تھی اور انسان بھی وہ جس کے ساتھ میں نے پندرہ سال گزارے تھے اور اس کے تین بچوں کی ماں تھی۔مگر مجھے یہ خیال ضرور آیا کہ کاش کسی طرح سے شعیب مر جائے اور میں آزاد ہو جاؤں۔یہ خیال میرے ذہن پر اس حد تک حاوی تھا کہ میں نے رات خواب میں کئی بار شعیب کو مختلف وجوہات سے مرتے دیکھا۔کبھی سیڑھیوں پر اس کا پاؤں پھسل جاتا اور کبھی وہ کسی گاڑی تلے آکر مر جاتا۔کبھی اسے کوئی جان لیوا بیماری ہو جاتی تھی۔مگر جب صبح میری آنکھ کھلی تو وہ حسب معمول واش روم میں تھا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔اس صبح بھی میں جان بوجھ کر لیٹی رہی اور جب شعیب چلا گیا تو نیچے آئی تھی۔صائمہ کچن صاف کر رہی تھی اس نے مجھ سے ناشتے کا پوچھا مگر میں میرا موڈ نہیں تھا۔

''میرے لیے بس چائے بنادو۔''

چائے لے کر میں اپنے کمرے میں آگئی اور دوپہر کے وقت مجھے خیال آیا کہ میں فارغ ہوں کیوں نہ آج کمال سے مل لوں۔ میں نے اسے کال کی اور اس نے ریسیو کی۔''کیا حال ہیں جانِ من؟''

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔''آج آسکتے ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔''آج میں بیوی بچوں کے ساتھ ناردرن ایریا جا رہا ہوں۔''

میں مرجھا گئی۔''کتنے دن کے لیے؟''

''ایک ہفتہ تو لگے گا۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے بائے۔''

''بائے...... میں آ کر تمہیں کال کروں گا۔'' اس نے کال کاٹنے سے پہلے کہا۔ میں نے اپنا موبائل بستر پر پٹخ دیا تھا۔ چند لمحے تک کمال سے ملاقات کے خیال سے میرا خوشگوار موڈ اب خراب ہو گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر میں کمال کی بیوی ہوتی تو آج اس کے ساتھ میں بھی جا رہی ہوتی۔ مگر میری قسمت کہ میں شعیب کی بیوی تھی جسے کبھی بھولے سے بھی خیال نہیں آتا تھا کہ بیوی کو بھی کہیں گھمانے لے جائے۔ اسے بس بچوں کی فرمائشیں پوری کرنے کی پڑی رہتی تھی۔ وہ جتنی بار بھی شہر سے کہیں باہر گیا بچوں کے کہنے پر گیا تھا۔ یہ ایک ہفتہ میں نے کیسے گزارا یہ میں ہی جانتی ہوں۔ اتفاق سے شعیب نے اتوار کو مری جانے کا پروگرام بنایا۔ بچے کہہ رہے تھے کہ گرمیاں ختم ہونے سے پہلے انہیں ایک بار مری گھمالائے۔ شعیب نے اچانک ہی پروگرام بنایا۔ میں نے جانے سے انکار کیا تھا۔ مگر بچوں نے مجھے منالیا اور صرف ان کی خاطر میں بادل ناخواستہ تیار ہو گئی۔

اس روز اتفاق سے موسم ہلکا سا ابر آلود اور بہت خوب صورت تھا۔ ہم میدانی علاقے سے نکل کر ذرا بلندی پر آئے تو موسم بھی خوشگوار ہو گیا اور بچوں نے گاڑی کے شیشے نیچے کر لیے۔ کچھ دیر بعد ہم مری میں تھے۔ یہاں آ کر میرا موڈ بھی اچھا ہو گیا تھا اور میں کم سے کم بچوں کے ساتھ ہنس بول رہی تھی۔ دوپہر کا لنچ ہم نے ایک فاسٹ فوڈ ریستوران میں کیا۔ ابھی ہم لنچ کر رہے تھے کہ اچانک کمال کی آواز آئی۔ ''آہا کیا اتفاق ہے کہ یہاں تم لوگ موجود ہو۔''

کمال ہماری میز کے پاس کھڑا تھا۔ شعیب نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور میں نے بھی یوں سلام کیا جیسے وہ صرف شعیب کا باس ہو۔ شعیب نے اسے لنچ کی دعوت دی مگر اس نے انکار کر دیا۔ ''میں دو گھنٹے پہلے ہی ناشتا کر کے نکلا ہوں یہاں تک آتے آتے کافی کی خواہش ہوئی تو رک گیا۔''

شعیب نے اس کے لیے کافی منگوائی۔ وہ بچوں سے گپ شپ کرتا رہا اور کبھی کبھی مجھ سے بات کرتا تو میں جواب دے دیتی تھی۔ پھر شاید اس نے مجھے بتانے کے لیے کہا۔ ''بہت تھکن ہو گئی ہے۔ سات دن سے بیوی بچوں کے ساتھ پہاڑوں پر گھوم رہا تھا اب انہیں وہیں چھوڑ کر آیا ہوں ایک ہفتے میں کچھ کام نمٹانے ہیں لیکن اس سے پہلے دو دن آرام کروں گا۔''

وہ کافی پی کر اٹھ گیا۔ میں کچھ دیر پہلے تک انجوائے کر رہی تھی مگر کمال کے جانے کے بعد مجھے اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ میں نے فوری تو نہیں کہا مگر دو گھنٹے بعد شعیب سے واپس چلنے کو کہا۔ بچے ابھی کچھ دیر اور رکنا چاہتے تھے لیکن جب میں نے زیادہ ہی کہا تو مجبوراً شعیب نے انہیں راضی کیا اور ہم واپس روانہ ہوئے۔ اگلے دن میں نے دفتر سے کمال کو واٹس اپ کیا۔ ''آج ارادہ ہے؟''

''ہاں، میں بھی تڑپ رہا ہوں۔''

سچ تو یہ ہے میں تڑپ نہیں رہی تھی بلکہ مجھے لگ رہا تھا کہ کمال کے بغیر میری سانس رک گئی ہے اور میں جان کنی کی کیفیت میں ہوں۔ میں چار بجتے ہی آفس سے نکل گئی اور معمول سے تیز ڈرائیو کرتے ہوئے پندرہ منٹ میں کوٹھی تک پہنچ گئی تھی۔ ہارن کے جواب میں کوٹھی کا گیٹ کھلا اور میں اندر آئی۔ داخلی دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا۔ میں اوپر آئی تو کمال میرا منتظر تھا۔ وہ یوں ٹوٹ کر ملا جیسے پہلی بار مل رہا ہو۔ میں بھی کم پیاسی نہیں تھی۔ ڈیڑھ گھنٹا کیسے گزرا ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ پھر مجھے ہوش آیا اور میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ میں پریشان ہو گئی۔

''کمال بہت دیر ہو گئی ہے آج تو میں نے گھر میں بتایا بھی نہیں ہے۔''

کمال کے چہرے پر التجا تھی مگر آج میں بہت دیر رک گئی تھی۔ اس سے زیادہ رکنا ممکن نہیں تھا اس لیے میں جانے کو تیار ہوئی۔ کمال مایوس ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں تمہارے لیے واپس آیا ہوں۔ ایک ہفتے بعد واپس جاؤں گا۔''

''لیکن میں روز نہیں آ سکتی۔''

''اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ اس سے چھٹکارا حاصل کر لو۔'' کمال سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے۔''

''ویسے میں چاہوں تو یہ کام کسی اور سے بھی لے سکتا ہوں لیکن اس میں خطرہ ہے۔ آدمی کبھی نہ کبھی پکڑا جاتا ہے اور سب بک دیتا ہے۔ لگ رہا ہے یہ کام مجھے ہی کرنا پڑے گا۔''

میں سہم گئی۔ ''نہیں اگر تم پکڑے گئے تو......''

''تم فکر مت کرو میں بے وقوف نہیں ہوں۔ جو کروں گا سوچ سمجھ کر کروں گا۔ ممکن ہے شعیب کی موت ایک حادثہ نظر آئے۔''

مجھے شعیب کی ذرا بھی فکر نہیں تھی۔ اس لیے میں نے سکون کا سانس لیا۔ "تب ٹھیک ہے۔"

کمال خوش نظر آنے لگا۔ "اس کا مطلب ہے تم راضی ہو؟"

میں نے سر ہلایا۔ "اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ بے شک ہمارا تعلق اتنے سالوں پوشیدہ رہا ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ یہ آیندہ بھی پوشیدہ رہے۔ میں اپنی بدنامی گوارہ کرسکتی ہوں لیکن میری وجہ سے میرے بچوں پر کوئی انگلی اٹھائے یہ مجھے برداشت نہیں ہوگا۔"

"تم پھر کب آؤ گی؟"

"شاید پرسوں لیکن وعدہ نہیں کرسکتی۔" میں نے کہا اور کوٹھی سے نکل آئی۔ میں نے کمال کی بات مان تو لی تھی مگر اب میں سوچ رہی تھی کہ یہ میں نے کیا کیا؟ گھر پہنچتے پہنچتے کئی بار میری ذہنی رو بدلی تھی کبھی مجھے بالکل ٹھیک لگتا تھا اور کبھی لگتا کہ میں اور کمال بہت غلط کام کرنے جارہے ہیں۔ شاید کمال کی طرح میری قوت برداشت بھی اب جواب دے گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں صحیح اور غلط کی تمیز بھی کھو چکی تھی۔ مگر اسی روز شعیب نے ایک ایسی حرکت کی کہ میں کمال سے بالکل متفق اور شعیب کو دنیا سے رخصت کرنے کے ارادے پر پختہ ہوگئی تھی۔ اس نے شادی کے بعد پہلی مرتبہ مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس نے پھر مجھ سے بے رخی کی شکایت کی اور جب میں نے زبان چلائی تو اس نے اچانک ہی مجھے تھپڑ مار دیا۔ میں تو ششدر رہ گئی تھی۔ وہ بھی حیران رہ گیا اور کمرے سے چلا گیا۔ میرا غصے سے برا حال تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے ابھی قتل کردوں۔ اس وقت میں نے سوچ لیا کہ اگر کمال نے پھر مجھ سے یہ کام کرنے کو کہا تو میں کر گزروں گی۔

اگلے دن میں نے اسے دفتر سے کال کی۔ "میں آج آؤں گی۔"

"سچ۔" وہ خوش ہوگیا۔ "لیکن تم کہہ رہی تھیں۔"

"فور گیٹ اٹ۔" میں نے کہا۔

شام کو میں کوٹھی پہنچی تو کمال اپنے موڈ کے ساتھ میرا منتظر تھا مگر میرا موڈ کچھ اور تھا۔ میں نے کہا۔ "کمال میں تم سے متفق ہوگئی ہوں اور آج میں اسی موضوع پر بات کرنے آئی ہوں۔"

میرا موڈ دیکھ کر کمال بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ "خیریت تم بہت غصے میں لگ رہی ہو؟"

"ہاں کیونکہ اس ذلیل شخص نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔"

یہ سن کر کمال کو بھی غصہ آگیا تھا۔ "تب میں اسے اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔"

"نہیں وہ اس قابل نہیں ہے کہ ہم میں سے کوئی اس کی خاطر چھوٹی سی سزا بھی کاٹے۔ کام ایسے کرنا ہے کہ کسی کو شک نہ ہو۔"

"میں نے سوچ لیا ہے۔" کمال مسکرانے لگا۔ "کام بھی ہوجائے گا اور کسی کو شک بھی نہیں ہوگا۔"

"کیسے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"اس کی گاڑی کی بریک فیل ہوجائے گی اور وہ حادثے کا شکار ہوگی۔"

"ضروری نہیں ہے کہ وہ حادثے میں مرجائے۔"

"ہاں ضروری نہیں ہے لیکن ہم ایک ٹرائی کریں گے اور اگر وہ بچ گیا تو پھر دوسری کوشش کریں گے۔" کمال نے سکون سے جواب دیا۔ "لیکن مجھے امید ہے ہماری پہلی کوشش ہی کامیاب رہے گی۔"

"بریک کیسے فیل ہوں گی اور اگر شعیب کو شروع میں احساس ہوگیا کہ بریک کام نہیں کررہا تو وہ سڑک پر آئے گا ہی نہیں۔"

"یہ کام ایسے ہوگا کہ اسے فوری پتا نہیں چلے گا۔" کمال نے کہا۔ "آؤ میں تمہیں عملی طور پر دکھاتا ہوں کہ یہ کام کیسے ہوگا۔ میں اسی مقصد کے لیے بریک سسٹم لایا ہوں۔"

وہ مجھے کوٹھی کے گیراج میں لایا۔ اس نے نہ جانے کہاں سے شعیب کی کار کا بریک سسٹم منگوا لیا تھا۔ یہ جدید ہائیڈرولک ڈسک بریک تھی۔ اس نے مجھے پپ دکھایا۔ "اس میں بریک آئل بھرا ہوتا ہے۔ جب بریک پیڈل پر دباؤ ڈالا جائے تو یہی آئل دباؤ کو زیادہ قوت کے ساتھ بریک ڈسک تک لے جاتا یعنی اس میں تار وغیرہ نہیں ہوتے ہیں۔ اب اگر آئل لائن میں ہلکا سا سوراخ کردیا جائے۔ میں تمہیں کرکے دکھاتا ہوں۔" اس نے ایک چھوٹی سی اسٹیل آری اٹھائی اور پپ سے ڈسک تک دباؤ لے جانے والے پتلے لیکن بہت مضبوط پائپ کو آری سے ہلکا سا رگڑا۔ اس نے چند بار آری کو آگے پیچھے کیا تو پائپ پر ہلکا سا کٹ آگیا۔ پھر اس نے پپ پر دباؤ ڈالا تو کٹ سے آئل قطرہ قطرہ کرکے گرنے لگا۔ "آئل خاصا ہوتا ہے اور اس

طرح اسے خارج ہونے میں وقت لگتا ہے تب تک آدمی عام طور سے کسی تیز رفتار ہائی وے پر آجاتا ہے اور یہاں رفتار بڑھانے کے بعد جب بھی اسے کم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو بریک آئل خاصا نکل چکا ہوتا ہے۔ پھر وہ بریک لگانے کے لیے جتنی زور سے پیڈل دباتا ہے بریک آئل اتنا ہی نکلتا جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے جب بریک بالکل ہی کام نہیں کرتی ہے اور حادثہ لازمی ہوجاتا ہے۔"

میں نے تجسس سے پوچھا۔" یہ گاڑی میں کہاں ہوتا ہے۔"

" تقریباً ہر گاڑی میں نیچے ہوتا ہے۔" کمال مجھے اپنی کار تک لایا۔ اس نے نیچے جھک کر بریک آئل لائن کی نشان دہی کی تھی۔" مجھے معلوم ہے کہ شعیب کی گاڑی میں یہ لائن کہاں ہوتی ہے مجھے صرف ایک منٹ لگے گا اسے کٹ لگانے میں اور یہ کام میں چھٹی سے کچھ پہلے کروں گا۔"

" کل؟"

" نہیں۔" اس نے جواب دیا۔" جمعے کی شام میں واپس ناردرن ایریا جاؤں گا اور دفتر سے نکلوں گا۔ وہاں سے نکلتے ہوئے یہ کام کرتا جاؤں گا۔ اتفاق سے شعیب کی گاڑی آفیسرز پارکنگ میں ہوتی ہے اور وہاں عام طور سے سناٹا ہوتا ہے۔ مجھے کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔"

مجھے ذرا مایوسی ہوئی میں سوچ رہی تھی کہ وہ کل ہی یہ کام کرگزرے گا۔ جب ہم نے فیصلہ کرہی لیا تھا تو اس پر جلد از جلد عمل کرنا ہی ہمارے لیے بہتر تھا۔ میرے لیے آنے والے تین دن بہت اذیت ناک بن جاتے جو مجھے شعیب کے ساتھ گزارنے پڑتے اور اس سوچ کے ساتھ کہ عنقریب وہ دنیا سے گزر جائے گا۔ اس کی موت میں میرا اور کمال کا ہاتھ ہوگا۔ میں نے کمال سے یہ بات کی تو اس نے کہا۔" صبر کرنا مناسب ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ جب یہ کام ہو تو میں شہر میں نہ ہوں۔ اس طرح مجھ پر کسی کا شک نہیں جائے گا۔"

" تم پر کیوں شک جائے گا؟"

" تم بھول رہی ہو شعیب کی موت کے بعد تم میری ہوگی اور تب کسی کا شک جا سکتا ہے۔ شعیب کے خاندان والے کیس کرسکتے ہیں۔"

میں قائل ہوگئی۔" تم ٹھیک کہہ رہے ہو واقعی ایسا ہو سکتا ہے۔ ہمیں ہر پہلو سے محتاط رہنا چاہیے۔"

" اب تم مجھ سے نہیں ملوگی۔ ممکن ہے کہ شعیب یا کوئی اور اتفاق سے دیکھ لے اور ہمارا منصوبہ خاک ہوجائے۔"

کہاں تو میں بات کرنے کے ارادے سے آئی تھی اور سارا وقت اسی میں گزر گیا تھا مگر جب کمال نے نہ ملنے کا کہا تو مجھے بے تابی ہونے لگی۔ مگر میں اس سے کہہ نہ سکی۔ دل مسوس کر کے رہ گئی۔ البتہ جب اس کی کوٹھی سے نکلی تو مطمئن تھی کہ اب بس کچھ عرصے کی بات ہے اور ہمیں اس طرح چھپ کر ملنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میں گھر آئی تو شعیب کی صورت دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر اتفاق کی بات ہے گیٹ کھلتے ہی اس کی صورت دکھائی دی۔ آج بھی وہ مجھ سے پہلے آگیا تھا۔ گیٹ اسی نے کھولا تھا۔ میں نے کار پورچ میں روکی اور اس کی طرف دیکھے بغیر اندر آگئی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آیا تھا بچے اپنے کمروں میں تھے۔ شعیب نے دروازہ بند کیا تھا کہ میں نے کہا۔" اگر تم مجھ سے بات کرنا چاہتے تو بیکار ہے میں نہ تمہاری کوئی بات سنوں گی اور نہ ہی کسی بات کا جواب دوں گی۔"

" میں تم سے صرف سوری کرنا چاہتا ہوں۔"

" مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں۔" میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا اور واش روم چلی گئی۔ میرا پرس اور موبائل وہیں تھا مگر مجھے اس کی فکر نہیں تھی۔ اول تو اس پر سیکیورٹی لاک تھا جسے میں ہر تیسرے دن بدل لیتی تھی۔ دوسرے میرے موبائل میں کوئی گھستا نہیں تھا۔ شعیب کی عادت نہیں تھی اور بچے جانتے تھے کہ مجھے یہ بات سخت ناپسند ہے۔ میں واش روم سے نکلی تو لاؤنج میں بچوں کے پاس آگئی۔ اریب اور شاہ زیب باہر سے کھیل کر آئے تھے۔ جب کہ مشال اپنے ٹیب کے ساتھ مصروف تھی۔ صائمہ چھٹی کر کے جا چکی تھی۔ میں بچوں کے ساتھ مگن ہوگئی۔ اچانک مشال نے کہا۔

" ماما کیا آپ کی پاپا سے لڑائی ہے؟"

میں نے اسے گھور کر دیکھا۔" تم سے کس نے کہا اور تم نے مجھ سے کیوں پوچھا؟"

" سوری ماما اگر آپ کو برا لگا ہو تو لیکن میں نے فیل کیا۔ پاپا بہت پریشان ہیں۔"

" تمہیں صرف اپنے باپ کی فکر ہے؟" میں نے چڑ کر کہا۔

" آپ کی بھی ہے تب ہی تو آپ سے پوچھ رہی ہوں۔"

میں کہنا چاہتی تھی کہ وہ جا کر اپنے باپ سے پوچھے مگر

سیاہ سنگیت

موسیقی میں بڑی طاقت ہوتی ہے مہدی حسن تو کہتے ہیں کہ سرطان کا علاج سر تان سے کیا جاسکتا ہے استاد روشن خان نے خلیج کی جنگ کے دوران بیان دیا تھا کہ یہ جنگ راگوں کو بے وقت چھیڑنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ یہ بات ہمیں اس لیے درست لگتی ہے کہ ہمارے ہاں بھی اکثر لڑائیاں راگوں کے بے وقت چھیڑنے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

ان دنوں استاد نے کہا تھا کہ اگر مجھے موقع دیا جائے تو میں ایسا راگ چھیڑوں گا کہ عراق کویت خالی کر دے گا اور اگرچہ اس میں یہ بھی ڈر تھا کہ استاد جی کا راگ پر ہاتھ ذرا سخت پڑ گیا تو کویت ہی کویت خالی نہ کر دیں۔

ہمارے ایک شاعر نے اپنے گھر محفل موسیقی پر استاد جی کو بلایا۔

انہوں نے پوچھا کیا گاؤں؟ تو اہل خانہ نے کہا کہ استاد جی جو مرضی سنا دیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں تو ساتھ والا مکان ہی خالی کرانا ہے۔ وہ کہتے ہیں "خلیج کی جنگ میں نے راگوں سے بند کرائی" واقعی جس دن ریاض بند ہوا محلے والوں کو لگا واقعی جنگ بند ہوگئی۔

میں نہ کہہ سکی۔ میں اور شعیب اپنے مسئلے بچوں سے دور رکھتے تھے اور وہ بھی ان میں دخل نہیں دیتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی بچے نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ میں نے کہا۔ "جھگڑا ہے لیکن تم فکر مت کرو جلد ختم ہو جائے گا۔"

مشال مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ "ماما آپ مجھے بدلی ہوئی لگ رہی ہیں۔"

"پلیز مشال میں تمہاری ماں ہوں تم میری ماں مت بنو۔" میں نے تیز لہجے میں کہا اور وہاں سے اٹھ گئی۔ بیڈ روم میں شعیب تھا اس لیے میں چھت پر آگئی۔ دن گرم تھا لیکن سورج ڈھلنے کے بعد موسم اچھا ہو گیا تھا۔ میں اوپر ٹہلتی رہی اور ڈنر کے وقت نیچے آئی۔ اس کے بعد اس وقت تک لاؤنج میں ٹی وی کے آگے بیٹھی رہی جب تک مجھے شعیب کے سو جانے کا یقین نہیں ہو گیا تھا۔ بچے دس بجے تک بستر پر چلے جاتے تھے۔ شعیب اور میں بھی گیارہ بجے تک لیٹ جاتے تھے مگر اس رات میں بارہ بجے بیڈ پر گئی۔ شعیب سو گیا تھا یا سونے کی اداکاری کر رہا تھا۔ میں اس کی طرف سے کروٹ لے کر لیٹ گئی اور کچھ دیر میں میری آنکھ لگ گئی تھی۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو میرے سرہانے سائیڈ دراز پر ایک سرخ گلاب کی کلی اور ایک چھوٹا سا کارڈ رکھا ہوا تھا۔ شعیب واش روم میں تھا۔ میں نے کارڈ اٹھا کر دیکھا تو اس پر سوری لکھا ہوا تھا۔

میں نے کارڈ اور کلی دونوں اٹھا کر شعیب والی دراز پر رکھ دیئے اور دوبارہ آنکھ بند کر کے لیٹ گئی۔ شعیب واش روم سے نکلا اس نے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نیچے آئی۔ ناشتا کرتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ اب دو دن کی بات ہے۔ بہتر ہے میں شعیب سے اپنا رویہ بدل لوں ایسا نہ ہو کہ میرے رویے سے کسی کو شک ہو جائے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں شام کو اس کے آنے پر اپنا موڈ ٹھیک کر لوں گی۔ وہ شام کو دفتر سے آیا تو میں اس سے ٹھیک سے ملی۔ وہ ذرا حیران ہوا تھا پھر خوش نظر آنے لگا۔ اگرچہ مجھے دل پر جبر کرنا پڑا تھا مگر میں اچھی بنی رہی۔ اگلے دن جمعرات تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ کل کمال چلا جائے گا اور نہ جانے کب اس سے ملنا نصیب ہو اس لیے کیوں میں آج اس سے مل لوں۔

☆☆☆

میں خلافِ معمول جلدی اٹھ گئی تھی۔ شعیب کے ساتھ بچے بھی حیران ہوئے تھے۔ بچوں کے اسکول جانے کے بعد میں نے شعیب سے کہا۔ "آج اپنی گاڑی مجھے دے دو۔"

وہ چونکا۔ "تمہاری گاڑی کو کیا ہوا ہے؟"

"پتا نہیں کل اس نے بہت تنگ کیا تھا۔ کل چھٹی ہے تم اسے مکینک کو دکھا دینا۔ آج مجھے اپنی گاڑی دے دو۔"

اس نے سر ہلایا اور چابیاں میری طرف بڑھا دیں۔ "ٹھیک ہے میں ٹیکسی لے لوں گا۔"

شعیب کے جانے کے بعد میں اس کی گاڑی میں گھر سے نکلی اور شام کو واپس آئی تھی۔ شعیب کیونکہ ٹیکسی میں آیا تھا اس لیے کسی قدر تاخیر سے آیا۔ ہفتے کے دن ہم سب کی چھٹی ہوتی تھی۔ اس دن اور اتوار کو تقریباً سب ساتھ ہی ناشتا کرتے تھے۔ میں تاخیر سے آتی تھی مگر اس دن میں جلدی آگئی تھی۔ شعیب اخبار پڑھ رہا تھا کہ چونکا۔ "میرے خدا یہ کیا ہوا؟"

''کیا ہوا؟''

''کمال صاحب کی گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی۔ وہ نارودن ایریا اپنے بیوی بچوں کے پاس جا رہے تھے۔''

''اوہ۔'' میں نے عام سے انداز میں کہا۔ ''افسوس ہوا سن کر۔''

مگر چند گھنٹے بعد واش روم میں شاور کے نیچے میں بے تحاشہ روئی اور کمال کا سوگ منایا۔ اگرچہ میں نے اسے قتل کیا تھا مگر میرے دل میں اس کی محبت ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس کی گاڑی کی بریک آئل لائن اسی طرح کاٹی جیسے اس نے بتائی تھی۔ یہ کام میرے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ میں شعیب کی گاڑی میں آرام سے دفتر کی پارکنگ میں پہنچ گئی اور وہاں کمال کی گاڑی کے پاس رکی تھی۔ مشکل سے پانچ منٹ میں اپنا کام کر کے میں وہاں سے نکل آئی تھی۔ میں پینٹ اور شرٹ میں گئی تھی۔ سر پر پی کیپ لگائی ہوئی تھی۔ اس لیے گیٹ کیپر کو شک بھی نہیں ہوا کہ میں عورت ہوں۔ پی کیپ اور اسٹیل آری میں نے راستے میں ایک مارکیٹ سے لی تھی اور کام کر کے دونوں چیزیں ایک ڈسٹ بن میں پھینک دیں۔

آپ حیران ہوں گے کہ کہاں تو میں شعیب کو اس دنیا سے رخصت کرنے کے لیے بے تاب تھی اور کہاں میں نے اپنے محبوب کمال کو ہی مار دیا۔ میں نے کمال کو اس لیے نہیں مارا تھا کہ میرے اندر شعیب کے لیے کوئی محبت یا کوئی احساس جاگ اٹھا تھا۔ بلکہ میں نے کمال کو اس لیے قتل کیا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ مجھ سے بھی بے وفائی کر رہا تھا۔ میں جمعرات کے دن پہلی بار اسے بتائے بغیر کوٹھی گئی تھی۔ میرا ارادہ اسے سرپرائز دینے کا تھا۔ مگر جب میں گلی میں داخل ہوئی تو میں نے ایک کار کو اس کی کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھا اور اس میں ایک حسین عورت تھی۔ وہ تقریباً دو گھنٹے کمال کی کوٹھی میں رہی اور یہ سمجھنے کے لیے ذہن پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ اور کمال کیا کرتے رہے تھے۔ جب سے میں کمال سے مل رہی تھی میرے ذہن میں ایک لمحے کو خیال نہیں آیا کہ اس کے میرے علاوہ کسی اور عورت سے تعلقات ہوں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے مجھے پانے کے لیے جو کہا اور جو کرنے جا رہا تھا اس میں کتنی سچائی تھی۔ شاید وہ سچ مچ مجھ سے شادی کرتا لیکن میرے لیے یہ ناقابلِ برداشت تھا کہ وہ میرے علاوہ کسی اور عورت سے تعلق رکھے۔ گھر واپس آتے ہوئے میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے وہی کیا۔

☆☆☆

رپورٹ میرے ہاتھ میں تھی اور شعیب ڈاکٹر سے پوچھ رہا تھا۔ ''ڈاکٹر صاحب علاج ممکن ہے۔''

ڈاکٹر جو شہر کا نامور کینسر کا ماہر بھی تھا اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''کوشش کریں گے۔ سب سے پہلے سرجری کرنا ہوگی۔''

اس لمحے میں نے جان لیا کہ میرا وقت آ گیا ہے۔ چند ہفتے پہلے میرے سینے میں ہلکا سا درد شروع ہوا اور پھر یہ بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ گٹھلیاں نمودار ہوئیں اور میں نے ہراساں ہو کر ایک لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا اس نے مجھے فوری کسی کینسر اسپیشلسٹ سے ملنے کا مشورہ دیا۔ شعیب مجھے اس ڈاکٹر کے پاس لے آیا۔ اس نے مختلف ٹیسٹ کرائے اور آج تصدیق ہو گئی تھی کہ مجھے بریسٹ کینسر ہو گیا ہے۔ دوران ٹیسٹ ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے کبھی بریسٹ سے متعلق کوئی دوائی کھائی یا علاج کرایا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ دودھ خشک کرنے والی دوا لی تھی اور جب اس نے دوا کا نام سنا تو ٹھنڈی سانس لے کر بتایا کہ یہ دوا بین ہے کیونکہ اس کے سائیڈ ایفیکٹس بہت زیادہ ہیں اور ان میں سے ایک بریسٹ کینسر بھی ہو سکتا ہے۔ امکان یہی تھا کہ میں اس دوا کی وجہ سے کینسر میں مبتلا ہوئی تھی۔

مگر میں جانتی ہوں اس کی وجہ دوا نہیں۔ میرے گناہ ہیں۔ میں نے اپنے شوہر اور اپنے بچوں کو دھوکا دیا۔ ان کو دھوکا دے کر جس شخص سے نو سال تک ملتی رہی۔ میں نے اسے بھی قتل کیا جو اللہ کے نزدیک کفر اور شرک کے بعد سب سے عظیم گناہ ہے۔ میری سزا کا وقت شروع ہو گیا تھا۔ کمال کو یقین تھا کہ اس دنیا کے بعد اس کے لیے جہنم ہے۔ ایسا ہی یقین مجھے بھی ہے اس کے باوجود ایک ہلکا سا گمان ہے کہ اگر اس دنیا میں سزا بھگت لوں تو شاید آگے معافی مل جائے۔ میں نے سب بہت کھل کر لکھا کہ انسان کا نفس اسے کس طرح اپنی مرضی پر چلاتا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ شاید کسی دل میں غلط راہوں سے بچنے کا خیال آ جائے، شاید کسی کے ہونٹوں پر میرے لیے دعا آ جائے۔ جب تک یہ تحریر چھپے گی شاید میں اس دنیا میں نہیں رہوں گی۔ کیونکہ میرا آپریشن ہوا اور حسبِ توقع ناکام رہا۔ کینسر اب میرے پورے جسم میں پھیل گیا ہے۔

صلہ رحمی

محترم مدیر

السلام علیکم

اس بار کی تحریر ذرا مختلف ہے۔ یہ میرے دورۂ پاکستان کی یادگار ہے۔ اگر آپ صاحبِ دل ہیں تو یقیناً اس سچ بیانی کا اثر محسوس کریں گے۔ وہ ملک جو مسلمانوں کے لیے عطیہ خداوندی ہے۔ عین شب قدر میں ہمیں عطا ہوا لیکن اس نعمتِ خداوندی پر ہم رب العالمین کے شکر گزار نہیں۔ الٹا اپنی حرکتوں سے ثابت کررہے ہیں کہ ہم یہودیوں کی طرح ناشکرے ہیں کہ اللہ نے من وسلویٰ دیا تو وہ کہنے لگے کہ اے موسیٰ یہ غذا تیرے اللہ نے بھیج تو دی اب اسے کھانے کی زحمت کون کرے، ہمارے منہ تک بھی پہنچنا چاہیے۔ بالکل اسی طرح ہم ان چھوٹے چھوٹے احکامات جو دینِ اسلام کے اساس ہیں ان سے بھی روگردانی کررہے ہیں اور پھر شکوہ کناں ہیں کہ ہمارے ملک کی حالت ایسی کیوں ہے؟ اگر ایک شخص نے بھی اس واقعے سے سبق حاصل کرلیا تو میری محنت وصول ہے۔

امین صدر الدین بھایانی

(اٹلانٹا۔ یو ایس اے)

جمعتہ المبارک ہونے کے سبب مسجد میں کافی بھیڑ تھی۔ کچھ ہی دیر میں خطبہ شروع ہوا چاہتا تھا۔ وضو کرنے کی جگہ پر نمازیوں کا ایک اژدہام تھا۔ رحمت خان کابلی اسی انتظار میں تھا کہ جیسے ہی اس کی باری آئے تو وہ وضو کر کے خطبے کے شروع ہونے سے قبل چار رکعات سنت پڑھ لے۔ باری آنے پر وضو کیا اور جلدی سے صفیں باندھتے نمازیوں میں

شامل ہوگیا۔ آنکھیں بند کیں۔ بسم اللہ پڑھ کر نیت باندھی۔ تکبیر پڑھ کر رکعت ادا کرنا شروع کردی۔ ابھی شاید دو ہی رکعات پڑھی ہوں گی کہ ذہن پر خیالات کی یلغار ہونا شروع ہوگئی۔ اس نے پوری کوشش کے ساتھ ان خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹکنا چاہا لیکن اس کے لیے اپنی سوچوں پر قابو پانا بے حد مشکل ہورہا تھا۔ اسی اثنا میں اسے یہ خیال آیا کہ ان خیالات اور سوچوں کے درمیان وہ یہ تو بھول ہی گیا کہ اب تک کتنی رکعات مکمل کرچکا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی جاری رکعت کے جس مقام پر تھا، وہ بھی اس کے ذہن سے نکل گیا۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس نے قیام کے دوران سورۃ الفاتحہ پڑھی اور اگر پڑھی تو اس کے بعد کوئی دوسری سورۃ پڑھی بھی یا نہیں۔ وہ رکوع میں بھی گیا کہ اپنے خیالات کے دھاروں میں بہتا ہوا سیدھا سجدے میں ہی چلا گیا تھا۔ اپنے سر کو جھٹک کر اس نے پھر سے رکعت کا آغاز کیا لیکن وہی اِدھر اُدھر کے خیالات اور سوچیں دماغ کو گھیرے رہیں۔ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ نیت کے مطابق اب تک وہ چار رکعات مکمل کرچکا ہے یا ایک آدھ مزید پڑھنی ہے۔

ابھی اسی کشمکش میں تھا کہ اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کے سارے جسم پر چونٹیاں سی رینگ رہی ہوں۔ اپنے ماتھے اور بغلوں سے پسینے کے قطرے بہتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ گو کہ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ ایسا محسوس کررہا تھا کہ مسجد میں موجود ہر ذی روح کی نظریں جیسے اسی پر گڑی ہوئی ہوں۔ وہ کچھ نہ دیکھتے ہوئے بھی اپنے جسم پر بیشمار گھورتی آنکھوں کی تپش محسوس کرنے لگا۔ گھبراہٹ میں آنکھیں وا ہوئیں تو دیکھا کہ کوئی بھی تو اس کی جانب متوجہ نہیں۔ ہر کوئی اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔

اچانک خطبے کا اعلان ہوا۔ اس نے جلدی جلدی ایک رکعت پڑھی اور پھر خطبہ میں شامل ہوگیا۔ لیکن یہاں بھی وہی صورتِ حال تھی۔ ابھی بمشکل امام صاحب کی کہی چند باتیں اس کے خشک ذہن میں جذب ہونے بھی نہ پائی تھیں کہ اس نے ایک بار پھر سوچوں اور خیالوں کے گھنے جنگل میں خود کو تنہا پایا۔ نہ معلوم کب خطبہ تمام ہوگیا۔ باجماعت نماز کا آغاز ہوا تو اس دوران بھی وہ خیالات کے طومار سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ کب اور کیسے نماز ادا ہوئی وہ تو بس رحمت خان کا ملی کا خدا ہی جانے۔

مسجد سے باہر آکر اس نے چہرے سے ٹکراتی اور بالوں کو اڑاتی تیز ہوا میں کئی گہرے گہرے سانس لیے۔ سردیوں کا موسم تو نہ تھا لیکن ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ ہوا کو اپنے پھیپڑوں میں اتارتے ہوئے خود کو قدرے پرسکون سا محسوس کیا۔ اس نے مڑکر مسجد کی طرف دیکھا۔ نمازی تیزی کے ساتھ مسجد محبت خان کے بڑے دروازے سے برآمد ہورہے تھے۔ ان کے چہروں سے تازگی، طمانیت، خوشی اور سکون جھلک رہا تھا۔

''یارب العالمین……! آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟ اب سے کچھ عرصے قبل تک تو میری نمازوں میں خوب سرشاریاں تھیں۔ اطمینان قلب تھا۔ میری توجہ نماز پر مرکوز رہتی تھی۔ لیکن اب یہ کیا ہورہا ہے۔ نہ میری توجہ نماز میں مرکوز ہو پاتی ہے اور نہ ہی میں وہ پہلے سا اطمینان و سکون قلب حاصل کر پارہا ہوں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک عجب سی بے کلی و بے چینی ہر لحظہ مجھے گھیرے رہتی ہے۔ ایک نامعلوم سا خوف ہمہ وقت دل و جاں پر سوار رہتا ہے۔ جتنے ہی جتن کیوں نہ کرلوں میرا دھیان دورانِ نماز بٹ ہی جاتا ہے۔ یہ آخر مجھے کیا ہوگیا ہے؟'' رحمت خان کا ملی یوں بڑبڑاتا ہوا چلا جارہا تھا جیسے خود سے باتیں کررہا ہو۔

تھوڑا سا آگے بڑھا تو اسے پھل فروشوں کی ریڑھیاں نظر آئیں۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ گھر سے نکلا تھا تو بیوی نے تاکید کی تھی۔ ''خان جی، یاد سے پھل فروٹ لیتے آیئے گا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ بچے کس شوق سے پھل کھاتے ہیں۔ دو دن پہلے آپ جو پھل لائے تھے وہ تو یہ سارے اسی روز ہی چٹ کرگئے تھے۔''

اس نے بنا کسی بھاؤ تاؤ کے ہمہ اقسام پھل درجہ اوّل بڑے بڑے تھیلوں میں بندھوایا۔ پھل فروش نے پاس ہی منتظر کھڑے ایک بچے کو اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی وہ پانچ سات سالہ بچہ تیزی سے آگے بڑھا اور بھاری بھرکم تھیلیاں اپنے دونوں کاندھوں پر ننگے تنکوں سے بنے بڑے بڑے تھیلوں میں بھرلیں۔ انہیں اپنے کاندھوں پر لٹکا کر بدقت تمام چلتے ہوئے گاڑی تک پہنچ پایا۔ رحمت خان نے گاڑی کی ڈکی کھولی۔ بچے نے سارے تھیلے اندر رکھ دیئے اور سلام کرکے جانے لگا تو رحمت خان نے فوراً اپنی جیب سے ایک بیس روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر دھر دیا۔ بیس روپے کا نوٹ پاکر تو جیسے بچے کی عید ہی ہوگئی ہو۔ اس کی تو باچھیں ہی کھل گئیں۔ اس نے ایک بار پھر اسے سلام کیا۔ لیکن اس بار کے سلام اور پہلے والے سلام میں ایک واضح فرق تھا۔ بچے کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑرہی تھی۔ رحمت

خان یہ منظر بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ بچے کے خوشی سے دمکتے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر رحمت خان کے چہرے پر بھی ایک بے ساختہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اسے ایسا لگا کہ جیسے اس مسکراہٹ کا آغاز تو اس معصوم سے بچے کے ہونٹوں سے ہوا لیکن وہ سیدھی جا کر اس کے دل میں اتر گئی ہو۔

ایک نہ معلوم اور عجب موہوم سا سکون اور احساس مسرت لیے وہ اپنی گاڑی میں داخل ہوا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے اپنے گھر واقع حیات آباد کے نئے اور خوبصورت ترین فیز سات جس کا شمار پشاور شہر کے متمول ترین علاقوں میں ہوتا ہے کی جانب رواں دواں ہوگیا۔ اپنے دس مرلے کے انتہائی خوبصورت سے ڈبل اسٹوری بنگلے کے آہنی دروازے پر پہنچ کر گاڑی کا ہارن بجایا۔ فوراً ہی مسلح چوکیدار نے آہنی دروازے کا ایک پٹ کھول دیا۔ رحمت خان نے کھڑکی کا خودکار شیشہ نیچے کر کے چوکیدار شیر خان کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور اس کے نزدیک آتے ہی بولا۔

”سنو شیر خان، گاڑی کی ڈکی سے پھل اتار لو اور بیگم صاحبہ کو دے کر کہنا کہ صاحب چلے گئے۔ ان کو دیر ہو رہی تھی۔“

رحمت خان نے گاڑی کے اندر ہی سے ایک کل دبا کر ڈکی کھول دی۔ شیر خان نے پھرتی کے ساتھ ساری تھیلیاں ڈکی سے نکال کر ڈکی بند کی اور تھیلیاں اٹھا کر اندر چلا گیا۔

رحمت خان نے گاڑی ریورس کی اور کچھ ہی دیر میں وہ پشاور کے مشہور تاریخی قصہ خوانی بازار کے اپنے چوبیس گھنٹے کھلے رہنے والے ”کابلی ریسٹورینٹ“ کی جانب گامزن تھا۔ گھر اور ریسٹورینٹ کے درمیان کم و بیش کوئی بیس بائیس کلومیٹر کا فاصلہ تھا اور عموماً سارا راستہ اسے کافی بھیڑ بھاڑ کا سامنا کرنا پڑتا لیکن اس روز خوش قسمتی سے اسے بہت زیادہ ٹریفک نہ ملی۔ گاڑی بڑی سبک رفتاری کے ساتھ پہلے فیز 7 روڈ اور پھر فیز 2 روڈ سے ہوتی ہوئی پشاور رنگ روڈ میں داخل ہوئی اور کوئی بارہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے بائیں طرف والے موڑ سے کوہاٹ روڈ میں داخل ہوگئی جو کوئی آگے چار ایک کلومیٹر کے بعد سینما روڈ میں تبدیل ہو گئی۔ چند سو میٹر کے فاصلے کے بعد رحمت خان نے گاڑی کو دائیں طرف موڑ کر قصہ خوانی بازار میں داخل کر دیا۔ یہ رحمت خان کا روز ہی کا راستہ تھا۔ اسے پتا ہی نہ چلتا تھا کہ کب اس نے گاڑی کو کس سڑک پر ڈالا اور کون سا موڑ کاٹا۔ بس یہ سب کچھ تو خود بخود ہی ہوتا چلا جاتا اور وہ اپنے گھر سے یہاں پہنچ جاتا۔ ہاں البتہ اگر ٹریفک جام ملے جو کہ اکثر ملتا تو اس صورت میں اس کی پریشانی دیدنی ہوتی ہے۔

یہ ہوٹل اس کے مرحوم دادا نے اس وقت بنایا تھا جب وہ ایک کڑیل جوان تھے۔ کابلی پٹھانوں کا یہ خاندان رحمت خان کے دادا اور پڑدادا کے زمانے میں جب پاک و ہند پر انگریز سرکار کی عملداری تھی کابل سے بسلسلہ روزگار ہجرت کر کے پشاور آ بسا تھا اور پھر اس وقت سے یہ ہی ان کا وطن ٹھہرا۔ رحمت خان کے دادا ولایت خان کابلی نے اپنی نوجوانی میں ”کابل ہوٹل“ کے نام سے اس کی داغ بیل ڈالی اور وہ ان ہی کے زمانے میں اپنے خوش ذائقہ کھانوں اور خالص پشاوری دودھ پتی چائے کے لیے مشہور ہو چکا تھا۔ ولایت خان کابلی کے بعد اس کے چھوٹے بیٹے کفایت خان کابلی نے اس کا انتظام و انصرام سنبھالا اور پھر جب آج سے کچھ بیس بائیس سال قبل رحمت خان کابلی نے پشاور یونیورسٹی سے بی اے مکمل کیا تو اس کے والد نے اپنے بوڑھے کاندھوں کا بوجھ اس کے جوان کاندھوں پر لاد دیا۔ رحمت خان نے اس کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کر کے اسے ”کابلی ریسٹورینٹ“ کا نام دیا اور روایتی شہرت کو برقرار رکھا بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان میں چار چاند لگا دیئے۔ پانچ سال قبل کوئی 65 سال کی عمر میں اس کے والد کا اچانک انتقال ہوگیا۔ حالانکہ انہیں کوئی ایسی خاص بیماری بھی لاحق نہ تھی۔ ڈاکٹر ہارٹ فیلیور کا کیس بتاتے تھے۔

رحمت خان اپنی مخصوص جگہ پر گاڑی پارک کر کے پیچھے والے دروازے سے ہوٹل میں داخل ہوا۔ ابھی وہ ہوٹل کے پیچھے بنے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہی ہوا تھا کہ اسے دیکھ کر کریم خان جو کہ ہوٹل کے تمام بیروں اور باورچیوں پر نگراں مقرر تھا دوڑتا ہوا آیا۔ ”خان جی کہاں رہ گئے تھے آپ؟ ہم کتنی دیر سے آپ کے موبائل پر کال کر رہا تھا لیکن وہ مسلسل بند ہی آ رہا۔“ اس کی آواز سے پریشانی متحرش تھی۔

”اوہ ہاں، اسے تو میں نے مسجد میں داخل ہونے سے قبل ہی بند کر دیا تھا اور پھر آن کرنا یاد نہ رہا۔“ رحمت اپنی جیب سے موبائل نکال کر آن کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن بات کیا ہے تم اتنے پریشان کیوں ہو؟“

”جی خان جی وہ شاہ بابا آئے تھے......!“

”اف خدایا، میں کس قدر بھلکو ہوتا جا رہا ہوں۔

انہوں نے خود ہی تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ بعد نماز جمعہ ہوٹل کا چکر لگائیں گے۔ تم نے انہیں بیٹھایا کیوں نہیں؟ ان کی کوئی خاطر تواضع بھی کی یا وہ ویسے ہی چلے گئے؟ تم نے انہیں روکا کیوں نہیں؟'' رحمت خان نے سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

''جی وہ...... ! خان جی...... وہ...... ! خان جی...... ! وہ وہ......!'' کریم خان کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن بس ہکلا کر ہی رہ گیا۔ ''یہ کیا خان جی اور وہ وہ کی رٹ لگا رکھی ہے؟'' رحمت خان غصے میں چلایا۔

''جی خان جی وہ بات یہ ہے کہ ہم نے تو بوتل شوتل چائے شائے دونوں کا پوچھا تھا لیکن انہوں نے ہی انکار کردیا اور کچھ دیر ہوٹل میں اِدھر اُدھر چکر لگایا اور پھر بیروں میروں سے بات شات کرتے رہے۔ پھر ہم اپنے کام میں مصروف ہوگیا کہ اچانک ان کی زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سُنی۔ ہم اس وقت کاونٹر پر تھا۔ ان کی آواز کچن سے آرہی تھی۔ ہم دوڑ کر کچن میں گیا تو شاہ بابا کا چہرہ شدید غصے سے لال ہو رہا تھا۔ ہم کو دیکھتے ہی چلّا کر بولے۔ ''کہہ دینا رحمت خان سے میں آیا تھا۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے وہاں ایک کونے میں کھڑے تھر تھر کانپتے ضابطہ خان کا ہاتھ پکڑا اور چلے گئے۔ ہم پوچھتا ہی رہ گیا کہ شاہ بابا آخر بات کیا ہے جو آپ اتنا غصہ کھا رہا ہیں۔ لیکن وہ تو تیزی کے ساتھ باہر نکلے اور اپنی گاڑی جس میں ڈرائیور تیار بیٹھا تھا۔ اپنے ساتھ ضابطہ خان کو سوار کر کے روانہ ہوگئے۔''

رحمت خان مارے حیرت کے بس منہ کھولے سنتا رہا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی اور پھر جیسے یکدم اسے ہوش آ گیا ہو۔ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے موبائل فون پر شاہ بابا کا نمبر تلاش کرنا شروع کردیا لیکن فوراً اپنا ارادہ بدل دیا اور یہ کہتا ہوا باہر کی جانب دوڑا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس وقت انہیں فون کرنا غیر مناسب ہوگا۔ میں خود ہی ان کے گھر جا کر ان کے غصہ کی وجہ معلوم کرتا ہوں۔''

رحمت خان گاڑی میں سوار ہو کر شاہ بابا کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ پشاور شہر کی سڑکوں پر تیزی سے دوڑتی ہوئی گاڑی کی طرح سے اس کے ذہن کی رگ رگ میں سوچیں ڈورتی پھر رہی تھیں۔ شاہ بابا کا غصہ تو سارے خاندان میں مشہور تھا۔ مرحوم والد کے بڑے بھائی اور خاندان کے سب سے معمر بزرگ ہونے کے ناطے وہ ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔ تھے تو وہ اس کے تایا اور نام ان کا کرامت خان کابلی تھا۔ لیکن اس سمیت سارا خاندان انہیں شاہ بابا شاہ بابا کہہ کر ہی پکارتا تھا۔ دورِ جوانی ہی سے مذہب میں اپنی خصوصی رغبت اور پھر اپنی مشت بھر داڑھی کے سبب شاہ جی شاہ جی کہلاتے تھے اور پھر اب پچھتر سال کی عمر میں جب سر، داڑھی، مونچھوں حتیٰ کہ پلکوں اور بھوؤں تک کا ایک ایک بال سفید ہو چکا تھا۔ خاندان بھر کے لوگ باگ اور دوست احباب عرصہ ہوا ان کا اصل نام تک بھول گئے اور انہیں شاہ بابا شاہ بابا کہہ کر پکارنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ نام ان کی بارعب شخصیت سے بہت ہی میل کھاتا تھا۔

رحمت خان افسوس کر رہا تھا کہ وہ یہ کیسے بھول گیا کہ ابھی پچھلے اتوار جب وہ ان کے گھر اپنا مسئلہ لے کر ان سے ملنے گیا تو انہوں نے اس کی بات بغور سننے کے بعد کچھ دیر سوچ کر صرف اتنا کہا تھا۔ ''میں بعد از نماز جمعہ تمھارے ہوٹل پر آؤں گا اور اللہ نے چاہا تو انشاء اللہ تم کو تمھارے مسئلے کا حل بھی ضرور بتاؤں گا۔''

ویسے تو وہ کئی ماہ سے یہی سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے مسئلے کا ذکر شاہ بابا سے کرے لیکن بس کچھ ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ اسے سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیسے شاہ بابا کو بتائے کہ پچھلے ڈیڑھ ایک برس سے اس کے ساتھ کچھ عجیب سی صورتحال درپیش ہے۔ گوکہ کاروبار و آمدنی میں تو کوئی خاص کمی تو نہ آئی تھی لیکن یہ سچ تھا کہ آمدنی میں سے برکت اٹھ سی گئی تھی۔ کہاں وہ پہلے اپنے گھریلو اخراجات کے بعد اپنی آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ پس انداز کرلیا کرتا تھا۔ اب آئے دن کے ناگہانی اخراجات میں اس کی غیر معمولی آمدنی اس غریب کی محدود پونجی سی بن کر رہ گئی تھی کہ جس کے دروازے پر ہر پہلی کو قرض خواہوں کی قطار لگ جاتی ہے۔

خیر رحمت خان پر کسی کا کوئی قرض تو نہ تھا نہ ہی قرض کی وصولیابی کے تقاضے اور نہ ہی اندیشہ نان شبینہ۔ لیکن یہ آئے دن کے اخراجات جو نہ جانے کیوں اور کیسے یکے بعد دیگرے منہ اٹھائے چلے آتے، اس نے اس کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔

آئے دن اس کے چھ بچوں میں سے کوئی نہ کوئی بیمار پڑ جاتا تھا۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی تھی کہ ان چھ میں سے چار آگے پیچھے اسپتال تک ہو آئے تھے۔

تین ماہ قبل اچانک پارکنگ میں کھڑی اس کی نئی نویلی تیس لاکھ کی گاڑی نے نہ جانے کب اور کیسے آگ پکڑ لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ رحمت خان نے انشورنس کی رقم بچا کر اس وقت تو اپنے من ہی من خود کو عقلمند

گردانا تھا لیکن اس حادثے کے بعد تو اسے ایسی عقل آئی کہ نئی تو نئی دیگر دو پرانی گاڑیوں کی انشورنس بھی کروالی اور تو اور اپنی دس مرلے کی کوٹھی اور ہوٹل کا بھی مکمل انشورنش حاصل کرلیا۔

وہیں حیات آباد ہی میں ایک بڑا سا پلاٹ جو کہ کئی برس پہلے یہ سوچ کر خریدا تھا کہ اس پر کوئی خوبصورت اور بڑا سا گھر تعمیر کروا کر خود وہاں اٹھ جائے گا اور موجودہ کوٹھی کو اچھے داموں فروخت یا کرائے پر چڑھا دے گا۔ کافی تلاش بسیار کے بعد ایک ٹھیکیدار ایسا مل ہی گیا جس نے ایک کروڑ روپے میں یہ پروجیکٹ مکمل کرنے کی ہامی بھر لی۔ حالانکہ یہ سوا ڈیڑھ کروڑ سے کم کا پروجیکٹ تو کسی طور بھی نہ تھا۔ نصف رقم ایڈوانس اور نصف کی ادائیگی تکمیل پر ہونا قرار پائی۔ رحمت خان نے پچاس لاکھ کا چیک ٹھیکیدار کے نام لکھ دیا جو اس نے اسی دن کیش کروالیا اور پھر اس روز سے رحمت خان اپنے کیش اور ٹھیکیدار دونوں ہی کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ پولیس میں رپٹ بھی درج کروائی گئی اور متعلقہ تھانیدار کو رقم کی وصولیابی کی صورت میں دس فیصد رقم بطور ''انعام'' دینے کی بھی یقین دہانی کروائی گئی۔ تھانیدار کے بے حد اور بھرپور اصرار و مطالبے پر ''انعامی رقم'' کا نصف حصہ یعنی مبلغ ڈھائی لاکھ روپیا پیشگی بھی دے دیا گیا لیکن آج اس بات کو بھی کئی ماہ ہو گئے تھے۔ نہ ہی ٹھیکیدار کا کچھ پتا چل سکا اور نہ اس کے ضمانت دار کا الٹے ڈھائی لاکھ کی چپت اور لگ گئی۔

سونے پہ سہاگا رحمت خان نے گزشتہ کئی سالوں سے جن کمپنیوں کے حصص میں اپنا ہاتھ اور دل دونوں ہی کھول کر سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسٹاک مارکیٹ میں ان کا بھاؤ کچھ یوں گرتا چلا گیا کہ اصل مالیت گھٹ گھٹا کر صرف بیس پچیس فیصد ہی رہ گئی تھی اور اب انہیں فروخت کرنے کی بھی اسے یہ سوچ کر ہمت نہ ہوتی کہ شاید بھاؤ پھر سے بڑھ جائیں تو نقصان پورا ہوسکے۔

ابھی انہی صدمات کا غم غلط نہ ہوا تھا کہ گذشتہ ماہ رات دیر گئے ایک شادی کی تقریب سے گھر آتے ہوئے سرخ بتی والے اسٹاپ پر موٹر سائیکل سوار دو نوجوانوں نے پستول کے زور پر زبردستی گاڑی کا شیشہ کھلوا کر اس کی بیوی کا سارا زیور جو کہ اس وقت پہن رکھا تھا، اتروا کر یہ جا وہ جا ہو گئے۔ وہاں موجود لوگ فقط تماشا دیکھتے رہ گئے۔

مذہب کی جانب نماز و روزہ کی حد تک تو اس کی رغبت شروع ہی سے تھی اور زکوۃ صدقات سے بھی چوکنے والوں میں سے نہ تھا۔ لیکن پچھلے کچھ سال بھر سے یہ حال ہو چلا تھا کہ نمازوں میں اس کا دھیان لگتا ہی نہ تھا۔ وہی نمازیں جو اسے خوشی اور سکون دیا کرتی تھیں اب بس ایک ایسے فریضے کے طور پر ادا ہونے لگی تھیں جیسے کوئی بس گنتی پوری کر رہا ہو۔ ہر وقت ذہن کسی ایسی بے مقصد ادھیڑ بن میں مشغول رہتا کہ جس کا کوئی بھی سرا اس کے ہاتھ نہ آتا۔ بس ایک بے چینی و بے کلی جس کا حاصل ہوتی۔ ہر لحہ ایک نامعلوم سا خوف ذہن کے نہاں خانوں میں ایک چھپکلی کی طرح رینگتا رہتا۔ ایک بے نام سی اداسی ہر لحظہ دل و دماغ پر سوار رہتی۔

بہت سوچنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ شاہ بابا کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کر کے ان کی رائے اور حل دریافت کرے گا۔ پچھلے اتوار جب وہ ان کے گھر گیا تو کھل کر تمام صورتِ حال اور اپنی ذہنی و دماغی کیفیات کا شاہ بابا سے ذکر کیا۔ پہلے تو وہ کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر اتنا ہی کہہ کر باتوں کا رخ دوسری طرف موڑ دیا کہ وہ جمعہ والے روز بعد نماز اس کے ہوٹل آ کر اس سے ملیں گے اور انشاء اللہ وہیں اپنی رائے کا بھی اظہار کر کے اس کا کوئی مناسب سا حل بھی تجویز کریں گے۔

خیالات کے پُرپیچ بھنور میں ڈوب کر گاڑی چلاتے ہوئے اسے یہ بھی نہ پتا چلا کہ کب قصہ خوانی بازار سے نکل کر چرچ روڈ پر آ گیا اور پھر چوک یادگار سے ہوتا ہوا کریم پورہ بازار اور گنج بازار روڈ سے ہوتا ہوا گنج آباد روڈ کراس کر کے گلبہار روڈ سے شاہ بابا کی دس مرلے پر بنی گلبہار نمبر 3 میں واقع کوٹھی تک آ پہنچا۔ ہارن دینے پر کوٹھی کے آہنی گیٹ پر نصب چھوٹی سی ایک کھڑکی میں سے چوکیدار نے باہر جھانکا اور پھر فوری کوٹھی کا بڑا آہنی دروازہ کھول دیا۔

چند ہی لمحے کے بعد وہ شاہ بابا کی بیٹھک میں لگے گاؤ تکیوں سے مزین ایک چوڑے سے صوفے پر براجمان ایک بار پھر اپنی سوچوں میں گم تھا۔ ملازم اسے وہاں بیٹھا کر شاہ بابا کو اطلاع دینے کا کہہ کر جا چکا تھا۔ شاہ بابا کے آنے سے پہلے اس کی خاطر تواضع کے لیے لوازمات کی آمد ہو چکی تھی۔ ملازم نے گرما گرم چائے اور فواکہات سے لبریز ٹرالی کو سرکا کر اس کے قریب لا کھڑا کیا۔ لیکن رحمت خان تو سب چیزوں سے ایسا بے نیاز بنا بیٹھا تھا جیسے اسے زندگی میں کبھی ان چیزوں سے کوئی دلچسپی رہی ہی نہ ہو۔

ابھی وہ اپنی بے ربط سی سوچوں ہی میں گم تھا کہ

بیٹھک کے دروازے سے شاہ بابا اندر داخل ہوئے۔ رحمت خان فوراً ہی احتراماً کھڑا ہو گیا۔ ''السلام علیکم......!''

''وعلیکم السلام......!'' رحمت خان شاہ بابا کی آواز میں موجود گرم جوشی اور چہرے پر پھیلی بھرپور خیر مقدمی مسکراہٹ کو دیکھ کر چونک سا گیا۔ وہ تو شاہ بابا کے چہرے پر غیض و غضب اور آواز میں ناراضگی اور گھن گرج کی توقع کر رہا تھا۔ لیکن انہیں دیکھ کر یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کچھ دیر قبل وہ بے حد غصے میں لال بھبوکا ہو کر ہوٹل سے نکلے ہوں گے۔ بلکہ لگ تو کچھ یوں رہا تھا کہ جیسے وہ بہت ہی اچھے موڈ میں ہیں۔ بے اختیار رحمت خان کے دل سے یہ صدا اٹھی۔ ''آخر شاہ بابا کو کیوں اور کس بات پر غصہ آیا تھا اور اگر آیا تھا تو اترا کیوں کر اور اب یہ اتنے اچھے موڈ میں کیسے دکھائی دے رہے ہیں؟''

''آؤ آؤ رحمت بچے ......! ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔'' شاہ بابا کی بارعب مگر شفقت آمیز آواز نے اسے ایک بار پھر چونکا دیا۔ ''ارے رحمت بچے تم کھڑا کیوں ہے۔ بیٹھو بیٹھو۔ کچھ کھایا پیا بھی یا بس یونہی......!'' شاہ بابا بچپن ہی سے اسے ''رحمت بچے'' کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ البتہ غصے یا پھر ناراضگی کی صورت میں صرف رحمت کہہ کر پکارتے۔ ''تو شاہ بابا کو اندازہ تھا کہ میں جب ان کے غصے اور ناراضگی کے بارے میں سنوں گا تو دوڑا دوڑا یہاں چلا آؤں گا۔ لیکن شاہ بابا تو بالکل بھی غصے میں اور ناراض دکھائی نہیں دیتے۔ یہ آخر چکر کیا ہے؟ کہیں کریم خان کو کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی تھی'' شاہ بابا کا یہ رویہ دیکھ کر رحمت خان سوچ میں پڑ گیا تھا۔

''رحمت بچے......! کن سوچوں میں گم ہو۔ یہ دیکھو تمہاری چائے تک پڑی پڑی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔'' شاہ بابا نے اس کے سامنے پڑے چائے کے کپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی بس یونہی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ویسے ہی میں نے سوچا کہ جب آپ آئیں گے تو ہم ساتھ ہی چائے پئیں گے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں کیوں نہیں۔ میں ابھی عمر دراز کو کہہ کر تمہارے لیے دوبارہ نئی تازہ چائے منگواتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے اپنے ملازم عمر دراز کو صدا دی اور جیسے ہی وہ بیٹھک میں داخل ہوا شاہ بابا بڑے ہی دھیمے اور انتہائی مشفقانہ لہجے میں مخاطب ہوئے ''بیٹا عمر دراز! ہمارے لیے تازہ چائے گرما گرم تیار کر کے لے آؤ اور ہاں کسی سے کہہ کر میرا یہ حقہ بھی تازہ کروا دو۔''

''جی شاہ بابا، جو حکم......!'' عمر دراز نے قدرے جھک کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر احتراماً کہا۔

رحمت خان جب بھی شاہ بابا کے گھر آتا تو وہ ان کا اپنے ملازمین سے حسن سلوک دیکھ کر بہت متاثر ہوتا۔ ان کا برتاؤ اپنے ملازمین کے ساتھ اپنے گھر کے فرد سا ہی تھا اور وہ سب بھی ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

''ارے رحمت بچے بار بار کہاں گم ہو جاتے ہو؟'' شاہ بابا کی آواز نے اسے پھر چونکا دیا۔

''جی نہیں بس میں تو آپ کا اپنے ملازمین کے ساتھ شفقت بھرا برتاؤ دیکھ رہا تھا۔''

''رحمت بچے......نہ یہ میرے ملازمین ہیں اور نہ ہی کبھی میں نے انہیں اپنا ملازم سمجھا ہے۔ یہ سب بھی میرے بچوں ہی جیسے تو ہیں۔ ہاں یہ اور بات ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے رزق کا وسیلہ مجھے بنا دیا ہے تو یہ اس پاک پروردگار کا مجھ ناچیز پر بڑا اکرم ہے۔''

''شاہ بابا میں بے حد شرمندہ ہوں۔ مجھے علم تھا کہ آپ بعد نماز جمعہ ہوٹل پر آنے والے ہیں لیکن وہ دراصل میں نماز کے بعد بچوں کے لیے کچھ پھل فروٹ لے کر گھر دینے چلا گیا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ میرے ذہن میں یہ بات بھی نہ رہی کہ آپ آنے والے ہیں۔''

''ارے رحمت بچے کوئی بات نہیں۔ وہ کہتے ہیں نہ کہ ہر بات میں اللہ کی کوئی مصلحت ہوا کرتی ہے تو تمہارے بھول جانے اور پھر دیر سے ہوٹل پہنچنے میں بھی پاک پروردگار کی ضرور کوئی نہ کوئی اچھائی ہی رہی ہوگی۔ تم فکر نہ کرو۔ ہاں کیا کہہ رہے تھے تم کہ نماز کے بعد پھل فروٹ لینے رک گئے تھے۔ کیا کچھ لے ڈالا؟''

وہ شاہ بابا کا سوال سن کر حیران رہ گیا کیونکہ آج تک شاہ بابا نے اس سے اس قسم کا سوال پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ ''جی شاہ بابا وہ بس کچھ تھوڑا بہت پھل فروٹ بچوں کے لیے لے لیا اور بس۔''

''اندازاً کتنے کچھ روپوں کا؟'' شاہ بابا کی کرید نے اسے مزید حیرت میں مبتلا کر دیا۔

''بس یہ ہی کچھ ڈھائی تین ہزار کا۔''

''اوہ اچھا، پھر تو اتنا سارا پھل دکاندار خود ہی تمہاری گاڑی تک چھوڑنے آیا ہوگا؟'' شاہ بابا کے بعد دیگرے

عجیب سے سوالات کیئے چلے جارہے تھے۔

''نہیں شاہ بابا، اس پھل فروش کے پاس چھوٹا سا چھ سات برس کا ایک لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ ویسا ہی جیسا کہ عموماً بازاروں میں ایسے غریب بچے ٹکوں کے تھیلے لیے پھرتے رہتے ہیں۔ وہ ہی سارا پھل اپنے تھیلیوں میں بھر کر گاڑی کی ڈگی میں ڈال گیا تھا۔''

''اوہ اچھا اچھا......!'' شاہ بابا سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''تو تم نے اس غریب بچے کو کچھ انعام شنام دیا کہ نہیں؟''

''جی شاہ بابا مجھے اس پر بہت ترس آیا اور میں نے اسے بیس روپے کا نوٹ دیا تو اس کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ مسکراہٹ اس کے چہرے سے پھوٹی پڑتی تھی۔'' رحمت خان کو اس بچے کا مسکراہٹ سے دمکتا چہرہ پھر یاد آ گیا اور وہ شاہ بابا کو جواب دیتے ہوئے خود بھی مسکرا دیا۔

''بہت اچھے...... ، یہ تم نے اچھا کام کیا۔ یہ بتاؤ تمھارے خیال میں وہ بچہ دن میں کتنا کمالیتا ہوگا؟''

رحمت خان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر آج شاہ بابا کو ہوا کیا ہے۔ ڈرتے ڈرتے ان کے پاس جھاڑ سننے کے خوف سے آیا تھا اور یہ ہیں کہ نہ جانے کیسے کیسے عجیب سے سوالات پر سوالات پوچھے چلے جارہے ہیں۔ ''میرا خیال ہے کہ کچھ نہیں تو کم از کم سو جتنے تو دن بھر میں کما ہی لیتا ہوگا۔ کیا خیال ہے تمھارا؟'' اس سے پہلے کہ رحمت خان کچھ بولتا، شاہ بابا نے اپنے سوال کا از خود ہی جواب دے ڈالا۔

''جی ہاں جی ہاں......، کیوں نہیں کیوں نہیں......''

رحمت خان بے اختیار بول اٹھا۔

''تو اس حساب سے تین ہزار کے لگ بھگ ماہوار تو کما ہی لیتا ہوگا۔'' شاہ بابا رحمت خان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔

''جی ہاں شاید......!'' رحمت خان نرم سی آواز میں بولا۔ ''اچھا چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ کہ ضابطہ خان تمھارے پاس کب سے کام کر رہا ہے؟'' شاہ بابا نے یکدم موضوع سخن تبدیل کرتے ہوئے ایک نیا سوال داغ دیا۔

''یہی کوئی سال بھر سے۔''

''ویسے یہ ہے کون اور تمھارے پاس کہاں سے آیا؟'' شاہ بابا تو جیسے کوئی انکوائری کمیشن کھول کر بیٹھے۔

''آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال قصہ خوانی بازار میں بم

نظامِ گنجوی

1140-1210ء

فارسی شاعر، حکیم ابو محمد الیاس بن یوسف ذکی بن صوبہ۔ ولادت شہر گنجہ (سمرقند) میں ہوئی۔ جلد ہی ماں باپ کا سایہ شفقت سر سے اٹھ گیا۔ تعلیم و تربیت ماموں کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ مختلف بادشاہ و وزراء نے انعام و کرام سے نوازا۔ لیکن براہ راست کسی دربار سے منسلک نہ رہے۔ شعر و شاعری کے علاوہ تاریخ، ادب، ہیئت اور نجوم سے بھی شغف رہا۔ باعثِ شہرت پانچ مثنویاں (مخزن اسرار، شعرو شیریں، لیلیٰ مجنوں، سکندر نامہ، ہفت پیکر) ہیں۔ تعداد میں پانچ ہونے کی وجہ سے یہ تصانیف پنج گنج اور خمسہ نظامی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کا مقبرہ بکو اور گنجہ کے درمیان ویران سے مقام پر ہے۔ 1913ء میں روسیوں نے ان کے جسد خاکی کو لے جانے کی کوشش کی۔ وہاں دو قبریں دستیاب ہوئیں۔ گمان ہوا کہ ایک آفاق کی ہوگی، چنانچہ دونوں کو یکجا کر کے دفن کر دیا گیا۔ یہ آج بھی اسی حالت میں موجود ہے۔

مرسلہ: نظام الدین شیخ، چنوٹ

دھماکا ہوا تھا اور اس وقت ہمارے ہوٹل کا ایک باہر والا بیرا فرشتہ خان جو کہ بازار میں موجود دکانوں سے موصول شدہ آرڈروں کی تکمیل کیا کرتا تھا۔ ایک دکان پر کھانا دینے گیا کہ وہاں دھماکا ہوا اور وہ موقعہ پر ہی ہلاک ہو گیا۔ چونکہ وہ اپنے گھر کا واحد کفیل تھا تو میں نے اس کی بیوہ کی درخواست پر اس کے چھ سالہ لڑکے ضابطہ خان کو اپنے پاس ملازمت پر رکھ لیا۔ یہ وہاں صبح سے شام تک میزوں اور برتنوں کی صفائی کے ساتھ ساتھ گاہکوں کے چھوٹے موٹے آرڈر چائے بوتل وغیرہ بھی بھگتا لیا کرتا ہے۔''

''کتنی تنخواہ دیتے ہو اسے؟'' شاہ بابا کی آواز اس بار کچھ بدلی بدلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ ''جی تین سو روپے۔''

''تین سو روپے روز یا ہفتہ وار......!'' شاہ بابا کی آواز رحمت خان کو کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''جی نہیں شاہ بابا...... تین سو روپے ماہوار۔''

"کیا......؟" اس بار شاہ بابا کی آواز اتنی بلند تھی کہ رحمت خان کو اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔

کچھ دیر فضا پر ایک بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ اس خاموشی کو شاہ بابا کی آواز جو کہ خلافِ توقع دھیمی تھی نے ہی توڑا۔ "میں یہ ساری باتیں ضابطہ خان کی زبانی سن چکا ہوں۔ جب اس نے مجھے تین سو روپے ماہوار تنخواہ کا بتایا تو میں نے سوچا کہ بچہ ہے شاید اسے اپنی تنخواہ کا ٹھیک سے پتا نہ ہو۔ تم اسے تین سو روپے ہفتہ وار دیتے ہو اور یہ شاید غلطی سے اسے ماہوار بتا رہا ہے۔ لیکن جب میں نے تمہارے منہ سے بھی یہ سنا تو مجھے یقین نہ آیا اور میں خود پر قابو نہ رکھ سکا......! رحمت خانا، مجھے تم سے یہ امید نہ تھی......!"

رحمت خان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ ابھی وہ یہ ہی سوچ رہا تھا کہ شاہ بابا پھر گویا ہوئے۔ "تم نے اس بوجھ ڈھونے والے بچے کو صرف چند منٹوں کی محنت پر بیس روپے دیئے یعنی اگر تم اس سے روز یہ کام لو اور روز ہی اسے بیس روپے دو تو یہ بنتے ہیں چھ سو روپے ماہوار۔ ضابطہ خان جو کہ تمہارے لیے سارا سارا دن کام کرتا ہے تم اسے صرف تین سو روپے ماہوار دیتے ہو۔ تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ اس معصوم کی عمر اسکول جانے اور کھیلنے کودنے کی ہے۔ کیا تمہیں اس کے چہرے کی معصومیت اور رویئیں رویئیں سے ٹپکتا ہوا بھولپن نظر نہ آیا۔ کیا تمہیں اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں سے جھلکتے روشن مستقبل کے سپنے امنڈتے نظر نہ آئے۔ تم اس قدر سنگدل ہو گئے ہو کہ تمہیں یہ کچھ بھی نہ نظر آ سکا اور تم اس سے سارا سارا دن کام کرواتے ہو اور معاوضہ کے نام پر صرف تین سو روپے جیسی شرمناک رقم دیتے ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہیے، رحمت خانا......!" شاہ بابا کی آواز تلخی سے لبریز تھی۔ "بجائے ہوٹل میں اس سے بیگار لینے کے، تمہیں اسے کسی اسکول میں داخل کروا کر اس کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرنا چاہیے تھا۔ تم تین تین ہزار کا پھل فروٹ اپنے بچوں کے لیے بلاتردد خرید لیتے ہو۔ لیکن اس چھوٹے سے بچے کو اپنے ہوٹل میں کام کروا کر اس کو اس قدر حقیر اور شرمناک معاوضہ دیتے ہو۔ رحمت خانا...... تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے......!"

رحمت خان کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو قطرہ خون نہ نکلے۔ زبان گنگ اور حلق تنگ۔ "سچ ہی تو کہہ رہے تھے شاہ بابا" اس نے سوچا۔ "شاہ بابا، میں نے تو اس بارے اب تک کبھی کچھ سوچا ہی نہیں۔ میں نے تو اسے اپنا کاروباری معاملہ گردانا اور یہ فیصلہ کرتے ہوئے اسے نوکری پر رکھ لیا اور پھر دوبارہ اس بارے میں سوچا تک نہیں۔"

شاہ بابا کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے۔ "کیا اب بھی تمہیں نماز میں اپنی عدم دلچسپی، بے چینی و بے کلی اور تمہارے ذہن پر سوار خوف اور اداسی کا سبب سمجھ میں آ رہا ہے کہ نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کر رکھا ہے اور تم اس معصوم سے بچے کے ساتھ یہ ناانصافی کر کے ان نعمتوں کی ناشکری کے مرتکب ہو رہے ہو۔ ان جیسے معصوم ضابطہ خان ملک بھر میں نہ جانے کتنے تم جیسے رحمت خان کے ہاتھوں ایسی کتنی ہی ناانصافیوں اور مظالم کا شکار ہو رہے ہیں اور شاید یہ ہی وجہ ہے کہ ہمارے اس وطن میں جو بنا تو اسلام کے نام پر تھا آج چہار سو خوف اور بے برکتی کا دور دورہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ایک ایسی بستی کی مثال بیان فرماتا ہے کہ وہ ہر طرح امن و چین کی بستی تھی۔ ہر طرف سے رزق بافراغت چلا آتا تھا مگر ان لوگوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی تو خدا نے ان کے اعمال کے سبب ان کو بھوک اور خوف کا لباس پہنا کر ناشکری کا مزہ چکھا دیا۔"

"شاہ بابا مجھے معاف کر دیں، شاید میں اندھا ہو گیا تھا۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنی اس غلطی کا مداوا کروں گا اور ضابطہ خان کی تعلیم اور اس کے گھر والوں کی نگہداشت کا ہر ممکن طور بندوبست کروں گا......!" رحمت خان کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو اور آواز میں شرمندگی کا لرزہ نمایاں تھا۔

"نہیں رحمت خانا...... ! ضابطہ خان والے معاملے میں تو تم سے کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب ضابطہ خان میرے پاس ہی رہے گا۔ اس کی تعلیم اور نگہداشت اب میری نگرانی میں ہو گی۔ لیکن ہمارے اس شہر میں ضابطہ خان جیسے بچوں کی کوئی کمی نہیں۔ ہر گلی میں نہ جانے کتنے ضابطہ خان خاک اور دھول اڑاتے پھر رہے ہیں اور ہر موڑ پر کوئی رحمت خان کھڑا ان کا استحصال کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔"

رحمت خان میں اب شاہ بابا کی باتیں سننے کا قطعاً حوصلہ نہ تھا۔ وہ مزید کچھ کہے بنا اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ شاہ بابا بس اسے پکارتے ہی رہ گئے۔ لیکن وہ کچھ یوں تیزی سے گم صم سا ان کی کوٹھی سے نکل کھڑا ہوا کہ بقول فیض

جیسے دونوں جہاں ہار نے کے بعد اب وہ جا رہا ہے شب غم گزار کے......!

اونچے خواب

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

سرگزشت میں عبرت بھری کہانیوں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ یہ سرگزشت بڑی پُردرد ہے اسی لیے میں نے سرگزشت کو ارسال کی ہے۔ اُمید ہے قارئین سے بھرپور پذیرائی ملے گی۔

ناظم بخاری
(لودھراں)

اگر مجھے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ وہاں مجھے ایسا کوئی منظر دیکھنا پڑے گا، یا ایسی کسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا تو میں کبھی بھی وحید کے ساتھ وہاں نہ جاتا۔ مجھے فرانس آئے ہوئے چار ماہ ہوگئے تھے اور یہاں آتے ہی میری جس سے سب سے پہلے دوستی ہوئی تھی، وہ وحید ہی تھا۔ فرانس میں اتوار کا دن ہم پردیسیوں کے لیے کسی حد تک تفریح کا دن ہوتا تھا۔ وہاں آنے کے چند ہفتوں بعد میں نے نوٹ کیا تھا کہ ہر سنڈے کو روم کے آدھے سے زیادہ افراد بن ٹھن کر کہیں

جاتے ہیں۔ کہاں جاتے ہیں؟ اس کا اندازہ مجھے اس دن ہوا تھا، جس دن وحید نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا۔ ''آج تو بھی میرے ساتھ چل رہا ہے۔''
''کہاں؟''
''جہاں حسین پریاں رقص کرتی ہیں۔''
''مطلب؟''
اور جب اس نے مجھے مطلب سمجھایا تھا تو مرد ہونے کے باوجود میں جھینپ گیا تھا۔
''جہاں جانا ہے جاؤ، میں تمہارے ساتھ نہیں آنے والا۔''
اور وہ مسکراتے ہوئے رخصت ہو گیا تھا مگر جب چار ماہ گزرنے کے بعد بھی میں 'کہیں' نہیں گیا تو ایک دن وحید تنہائی میں میرے پاس آ دھمکا۔
''یار ایک بات سچ سچ بتاؤ، کیا تمہیں سچ میں وہ طلب نہیں ہوتی جو ہمیں ہوتی ہے؟'' اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔
''نہیں!''
''کھاؤ قسم۔''
''اس فضول سی بات کے لیے مجھے قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔''
''اس کا مطلب ہے، تمہیں بھی کچھ کچھ ہوتا ہے۔ بس تم اس کچھ کچھ کا کچھ کرتے نہیں ہو۔''
''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''
''ایسی ہی بات ہے۔''
وحید کے ساتھ میں بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ میرا لہجہ کمزور ہے۔ میرا کمزور لہجہ بھانپ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔
''بس آج تم میرے ساتھ چل رہے ہو۔'' اس نے فیصلہ سنا دیا۔ ''آج میں تمہیں ایسی جگہ لے جاؤں گا، جو تھوڑی مہنگی تو ہے، مگر وہاں جا کر دل خوش ہو جاتا ہے۔'' اور پھر وہ سچ میں مجھے ایک پرستان نما سی جگہ پر لے آیا تھا۔ تمام مراحل سے نمٹنے کے بعد وہ مجھے ایک دس منزلہ عمارت کے ساتویں فلور پر لے آیا۔ سامنے ایک گیلری تھی جس کے ساتھ کئی کمروں کی قطاریں جا رہی تھیں۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔
''جا یار عیش کر۔ بس اتنا خیال رہے، ہمارا ٹائم صرف ایک گھنٹے کا ہے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر واپس آ جانا ٹھیک ہیں تو۔''
اس نے آنکھ ماری اور سامنے والے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے مطلوبہ دروازے پر ناک کیا۔
''کم ان۔''
میں اندر داخل ہوا تو ایک خوبصورت لڑکی اپنے موبائل میں بزی تھی۔ اس کا آدھا چہرہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اور آدھا نظر آ رہا تھا۔ اور اس آدھے چہرے سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کافی خوبصورت ہے۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کے مکمل چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے ایک زبردست شاک لگا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ میری آنکھیں دھوکا کھا جائیں...... میری آنکھوں کے سامنے گوشی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بھی حیرت سے گنگ رہ گئی تھی۔ اس کی حالت بھی مجھ سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ اچانک میں نے اس کی آنکھوں میں نمی کا ایک طوفان امڈتے ہوئے دیکھا، جسے چھپانے کے لیے اس نے اپنی گردن بے اختیار جھکا لی تھی۔

☆☆☆

گوشی اور میں ایک ہی گاؤں میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے تھے۔ وہ ہمارے گاؤں کی سب سے خوبصورت، دلکش اور حسین لڑکی تھی۔ حسین اور خوبصورت تو اور بھی بہت سی لڑکیاں ہوتی ہیں مگر وہ اس کے ساتھ ساتھ بہت شوخ و شریر اور بے باک بھی تھی۔ گاؤں کے لڑکوں کی اکثریت اس پر فدا تھی اور سچ بات تو یہ ہے کہ ان لڑکوں میں میرا شمار بھی تھا۔ اس کی صورت ایسی نہیں تھی کہ ایک بار دیکھنے کے بعد نظر انداز کر دی جاتی ..... بلکہ وہ تو ایسی تھی کہ جس نے بھی ایک بار دیکھا، اس کا چین و قرار لٹ گیا۔ وہ ہمارے گاؤں کے بابا فرید کی بیٹی تھی۔ بابا فرید بہت خوبصورت اور خوب سیرت انسان تھے۔ مگر افسوس کہ ایک حادثے میں اپنی آنکھوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان کی بی بی ایک سیدھی سادی عورت تھی۔ ان کی صرف دو اولاد تھیں۔ ایک گوشی اور دوسرا اس کا بھائی قدیم۔ قدیم گوشی سے سات سال اور مجھ سے دو سال بڑا تھا۔ گھر کی ساری ذمہ داری اسی کے کاندھوں پر تھی اور وہ روزگار کے سلسلے میں شہر میں مقیم تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ گوشی کو کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ گاؤں کے آدھا درجن سے زائد افراد سے اس کی دعا سلام تھی اور ایک درجن سے زائد تعداد اس کے عاشقوں کی تھی۔ ہمارا گاؤں بہت چھوٹا سا تھا۔ گاؤں کیا تھا، تیس، چالیس گھرانوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی، جہاں سب لوگوں کی حیثیت برابر تھی۔ اس بستی

میں کوئی جاگیردار یا چوہدری ٹائپ شخصیت نہیں تھی۔ اسی لیے یہاں کسی کو کوئی بڑی پریشانی بھی نہیں تھی اور اس کی ایک وجہ بھی تھی۔ وہ یہ کہ ہماری بستی کا پانی کڑوا تھا۔ ہم لوگ تو خیر عادی تھے مگر جب ہماری بستی کا پانی کوئی اجنبی پی لیتا تو وہ رفع حاجت کے لیے ایک گھنٹے میں کم از کم چار بار ضرور جاتا تھا۔
بستی کی فضا بہت معصوم تھی۔ لڑکے، لڑکیاں ایک دوسرے کو پسند ضرور کرتے تھے، چاہتے بھی تھے مگر یہ پسند یا چاہت ایک حد تک رہتی تھی۔ اسی لیے گوشی کے معاشقے بھی یہیں تک تھے، آگے تک نہیں بڑھے تھے۔ کسی نے اظہارِ محبت کے لیے اسے کوئی خوشبو کی شیشی دی تھی تو کسی نے رنگ گورا کرنے والی کریم (وہ الگ بات کہ اس کا رنگ قدرتی طور پر ہی سفید تھا) کسی نے رومال دیا تھا تو کسی نے لکس صابن۔ کسی نے لپ اسٹک دی تھی کسی نے شیمپو کی بوتل۔ ان چیزوں کی، اس وقت ہمارے ہاں بہت زیادہ اہمیت تھی۔ لوگ یہ معمولی معمولی مگر ضرورت کی چیزیں دے کر سمجھتے تھے کہ انہوں نے اظہارِ محبت کے ساتھ ساتھ اپنی محبت کی قیمت بھی ادا کر دی ہے اور اب ان کا اپنے محبوب پر مکمل حق ہے۔ مگر گوشی کے معاملے میں یہ سب خیال، خیال خام ہی رہے۔ وہ بہت عجیب و غریب فطرت کی لڑکی تھی۔ اس نے کبھی اپنے کسی عاشق کا دل نہیں توڑا تھا۔ جس نے جو کہا، جو تحفہ دیا، اس نے ہنستے ہوئے قبول کر لیا۔ یہ الگ بات کہ ان کے استعمال کی نوبت کبھی نہیں آتی تھی۔
ہماری بستی میں خیاری کی ایک چھوٹی سی دکان تھی، جہاں سے عاشق حضرات یہ چیزیں خریدا کرتے تھے اور گوشی کو تحفے میں دیتے تھے۔ گوشی یہ چیزیں لیتی اور خیاری والے کو آدھی قیمت پر فروخت کر دیتی۔ خیاری والے کو سب پتا تھا۔ وہ سب جانتا تھا مگر اس نے جان بوجھ کر خاموشی اختیار کی ہوئی تھی۔ اسے جو چیز شہر سے دس کی ملتی تھی، وہ یہیں پانچ کی مل جاتی تھی شہر آنے جانے کا خرچا الگ تھا اور وقت کی بربادی الگ۔ اسے اس میں فائدہ تھا اور وہ اسی میں خوش تھا۔ اور یہ بات صرف یہیں تک نہیں تھی کہ صرف خیاری والے کو اس کا پتا تھا، نہیں، بلکہ گوشی کے تمام عاشق بھی یہ بات جانتے تھے کہ گوشی ان سے لی ہوئی تمام چیزیں خیاری والے کو فروخت کر جاتی ہے۔ پر اس کے باوجود بھی یہ تحائف دینے کا سلسلہ جاری تھا۔ سب اسی اُمید پر وقت گزار رہے تھے کہ کبھی تو شب و روز کی محنت رنگ لائے گی اور انہیں گوشی سے اس کے پیار کی صورت اپنے تحائف کی قیمت وصول ہوگی۔ ان عاشقوں کی فہرست میں، میں بھی شامل تھا۔ میرا دل بھی کرتا کہ میں بھی گوشی کو اپنے پیار کے اظہار کے لیے کوئی خوشبو کی شیشی، کوئی رومال یا چھوٹا سا آئینہ دوں، مگر نا جانے کیوں میں ہمیشہ سوچ کر ہی رہ جاتا۔ میرے اندر سے کوئی مجھے ہمیشہ روک دیتا کہ یہ ایک معیوب اور عامیانہ سوچ اور طریقہ ہے۔ اگر میرے دل میں حقیقی جذبوں کا وجود ہے تو اس کی خبر نہ صرف گوشی کو ہو جائے گی، بلکہ اس پر ان کا اثر بھی ہوگا۔ اور یہی سوچ سوچ کر میں نے خود کو ہمیشہ اس قدم سے باز رکھا تھا۔ گوشی کے سات، آٹھ عاشقوں میں سے ایک عاشق ڈھولن بھی تھا، جسے سب ڈھولو کہہ کر بلاتے تھے۔ ڈھولو ہماری بستی کا ایک عام سا شخص تھا۔
وہ ذات کا میراثی تھا اور سچ میں مراثیوں والے کام کرتا تھا۔ ہر طرح کی شادی خوشی میں اس کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ اس کے پاس ایک ڈھول بھی تھا، جسے وہ کچھ ایسے ترنم سے سات سروں میں بجاتا تھا کہ بوڑھے سے بوڑھا دل بھی جھوم اٹھتا تھا۔ کسی بچے کا ختنہ ہوتا، کسی کی بیٹی یا بیٹے کی شادی ہوتی، سارا بھاگ دوڑ کا کام اسی کے سپرد ہوتا۔ خوشی تو خوشی، وہ غمی کے موقع پر بھی سب کے کام آتا تھا۔ یہ الگ بات کہ اسے ان سب کا معاوضہ نہ ہونے کے برابر ملتا تھا۔ مگر وہ پھر بھی خوش تھا۔ وہ اپنوں کا اپنا اور یاروں کا حقیقی یار تھا۔ ہمارے گاؤں میں وہ کچھ سال پہلے آیا تھا اور اسے حفیظ ہٹی والا اپنے ساتھ لایا تھا۔ ڈھولو کے ماں باپ دنیا میں نہیں تھے اور حفیظ چاچا کی کوئی اولاد نہیں تھی، سو ڈھولو ان کے پاس ان کی اولاد کی طرح رہنے لگا۔ اس نے ذرا ہوش سنبھالا تو چچا حفیظ کی ہٹی بھی اس نے سنبھال لی۔ وقت کے ساتھ ساتھ چچا حفیظ اور اس کی بیوی دنیا سے رخصت ہو گئے اور وہ مکان اور دکان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ڈھولو کے نام ہو گئے۔ ڈھولو میں بہت ساری خوبیاں تھیں، مگر خامی صرف ایک تھی۔ وہ خوبصورت نہیں تھا۔ نین نقش تو خیر قبول صورت تھے مگر رنگ کافی کالا تھا۔ اور اسی رنگت کی وجہ سے لوگوں نے اس کا ایک اور نام بھی رکھا ہوا تھا، کالو...... مگر زیادہ تر لوگ اسے ڈھولو ہی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اور ڈھولو نے اپنے دونوں ناموں میں سے کسی ایک نام کا بھی، کبھی برا نہیں مانا تھا۔ ایک دن گوشی اس کی ہٹی پر آئی تو ڈھولو نے بڑی دیدہ دلیری سے اس سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ اس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے اور کسی تمہید کے گوشی سے کہا تھا۔
”تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو گوشی! دوسروں کی طرح میں بھی تمہیں چاہتا ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ میری اتنی اوقات نہیں ہے اور نہ ہی میں اس قابل ہوں کہ تم سے یہ بات کر سکوں، مگر

میرے دل میں جو کچھ ہے، وہ میں نے آج تمہیں کہہ دیا ہے۔ میں اپنے اس پیار کے بدلے کبھی بھی تم سے کچھ نہیں مانگوں گا مجھے صرف ایک اجازت دے دو، میں ہمیشہ تمہیں یونہی پیار کرتا رہوں......"

گوشی اس کی بات سن کر مسکرائی تھی، بلکہ کھل کھلا کر ہنس دی تھی اور پھر وہاں سے چلی گئی تھی۔ اگلی بار وہ ہٹی پر آئی تو ڈھولو نے پوچھا تھا

"اس دن جواب نہیں دیا تھا تم نے؟"

"کس چیز کا؟"

"میری بات کا۔"

"کون سی بات؟"

"کیا میں اسی طرح ہمیشہ تمہیں پیار کرتا رہ سکتا ہوں؟"

اس بار گوشی زور سے ہنس پڑی تھی

"تم پیار کرو یا نفرت، مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

"پر مجھے تو پڑتا ہے۔ میں جس دن تمہیں نہ سوچوں خود کو ادھورا سا محسوس کرتا ہوں۔"

"اچھا، چلو ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی......"

"تو کیا میں تمہیں چاہ سکتا ہوں، ہمیشہ کے لیے؟"

ڈھولو کے لہجے میں ایک التجا سی تھی اور گوشی یہ محسوس کر کے ہنس پڑی تھی۔ "اچھا...... چلو ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے۔"

ڈھولو کو کچھ مزید حوصلہ ہوا۔ "میری ایک اور خواہش بھی ہے، اگر وہ مان لو تو...... گھر سے باہر والے جتنے بھی تمہارے کام ہیں، وہ سب میں کرنا چاہتا ہوں...... میں تمہارے آس پاس، تمہارے گھر کے باہر ہر وقت رہنا چاہتا ہوں تاکہ تمہیں کوئی کام بھی ہو تو تم مجھے فوراً آواز دے کر بلالو۔ میں تمہارے ہونٹوں سے نکلی ہر بات پوری کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور اس کے بدلے تم مجھ سے وہ محبت مانگو گے، جو تم چاہتے ہو۔"

"نہیں، میں کبھی تم سے کچھ نہیں مانگوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔ میں صرف اپنے دلی سکون کے لیے تمہارا ہر کہا ماننا چاہتا ہوں......"

"چلو ٹھیک ہے...... پر ایک بات یاد رکھنا، اگر تم نے کبھی بھولے سے بھی ایسی ویسی کوئی بات کی، تو میں تمہیں ذلیل کر کے وہاں سے دفع کر دوں گی......"

"مجھے منظور ہے، پر ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" ڈھولو کے لہجے میں ایک انجانی سی خوشی تھی اور اس دن سے ہم نے نوٹ کیا تھا کہ ڈھولو غیر محسوس طریقے سے نہ صرف گوشی کے گھر کے آس پاس رہنے لگا ہے، بلکہ اس کے کام بھی آنے لگا ہے۔ گوشی کے گھر میں ایک بھینس اور دو بکریاں تھیں، جن کے چارے کا بندوبست وہ خود کیا کرتی تھی۔ گرمیوں کے دنوں میں پہلے پہر، جب وہ گھاس کاٹ کر گھاس والی جگہ پر کھڑی ہوتی تھی تو اس کے دودھ جیسے سفید چہرے پر یہاں وہاں کئی بوندیں ابھری ہوئی ہوتی تھیں۔ اس وقت وہ دلکش نظارہ ناقابلِ بیان حد تک حسین ہوتا۔ پسینے کے وہ قطرے یوں دکھائی دیتے، جیسے صبح سویرے گلاب کے کسی پھول پر شبنم کے موتی ٹکے ہوں۔ شاید ایسا ہی کوئی نظارہ تھا جس نے مجھے اس کا گرویدہ کیا تھا۔ پر اس سے بڑھ کر قیامت کا وہ نظارہ ہوتا تھا، جب وہ کٹے ہوئے گھاس کی گٹھری اٹھا کر چلتی تھی اور اس نظارے کو دیکھنے کے لیے اکثر اس کے کئی عاشق اس کے رستے میں کھڑے ہوتے تھے۔

ڈھولو کو وہ نظارہ یا شاید دوسروں کا گوشی کو اس طرح دیکھنا گوارا نہیں تھا۔ شاید کچھ اس وجہ سے بھی اس نے گوشی کے کام آنے کا سوچا تھا۔ اس دن کے بعد پھر کبھی گوشی کا وہ قیامت بھرا نظارہ کسی کو نصیب نہ ہوا...... گوشی کے تمام عاشقوں میں ڈھولو وہ پہلا اور واحد عاشق تھا، جس نے گوشی سے براہِ راست اظہارِ عشق کیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ ایسی بات کرتا...... ڈھولو گوشی کے قریب کیا ہوا دوسروں نے بھی ڈھولو کے ذریعے گوشی تک اپنا حالِ دل اور تحفے پہنچانے شروع کر دیے۔ ڈھولو بڑے کھلے دل کا مالک تھا۔ اس نے اس بات کی بھی پروا نہیں کی تھی کہ کون کون گوشی کو چاہتا ہے۔ اس کے لیے یہی بات کافی تھی کہ وہ گوشی کو چاہتا تھا، اس کے قریب تھا اور گوشی اسے دوسروں پر ترجیح دیتی تھی۔

جس دن عاشقوں نے گوشی کی بجائے گھاس کی گٹھری ڈھولو کے سر پر دیکھی، تو وہ سب اپنا دل تھام کر رہ گئے تھے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ ڈھولو بازی لے گیا ہے۔ اس کے بعد ایک دو اور عاشقوں نے بھی گوشی کے کام آنے کی کوشش کی تھی مگر گوشی نے بڑی خوبصورتی سے سب کو ٹال دیا تھا۔ اس بات سے ڈھولو کا سینہ مزید چوڑا ہو گیا تھا۔ پر گوشی کی ڈھولو پر یہ خصوصی نوازش دوسروں کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ایک ایسا شخص، جس پر مرد بھی دوسری نظر ڈالنا گوارہ نہ کرے، وہ کیسے بستی کی سب سے حسین لڑکی کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا؟ ڈھولو ہر وقت گوشی کے گھر کی بیک سیڈ پر رہتا تھا۔ گوشی جونہی اسے پکارتی وہ کسی جن کی طرح حاضر ہو جاتا تھا یا پھر کسی عاشق نامراد کا کوئی تحفہ پہنچانا ہوتا تو وہ حاضر ہوتا۔ اس دوران اس نے اپنی ہٹی کھولنے کے اوقات بہت مختصر کر دیے تھے۔ صرف ایک گھنٹا صبح اور ایک گھنٹا شام۔

اور اس کے بعد وہ سارا دن گوشی کے گھر کے آس پاس ہوتا۔
انہی دنوں حاجی شفیق کا لڑکا، جو بستی کا پہلا لڑکا تھا، جس نے کالج میں تعلیم حاصل کی تھی اور شہر میں سرکاری نوکری حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا، گھر لوٹا تھا۔ نوکری پانے کی خوشی میں اس کے ہاتھ میں لڈوؤں کا ایک کافی بڑا شاپر تھا اور گاؤں کے لوگوں کے لیے چھوٹے موٹے کئی تحفے تھے۔ گوشی کے چاہنے والوں میں وہ بھی شامل تھا۔ وہ اس کے لیے بھی ایک تحفہ لے کر آیا تھا۔ سب سے مہنگا اور قیمتی تحفہ۔ وہ گوشی کے لیے ایک بہت ہی خوبصورت لباس لایا تھا، جو پورے دو ہزار کا تھا۔ وہ اتنی چمک دمک اور خوبصورتی والا لباس تھا کہ بس اسے نظروں کے سامنے رکھ کر دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا، پہننے کو نہیں۔ ڈھولو کے توسط سے وہ لباس گوشی تک پہنچ گیا اور ایک پیغام بھی کہ وسیم اس سے ملنا چاہتا ہے، تنہائی میں۔ گوشی نے سب کی طرح اس تحفے کو بھی قبول کر لیا مگر ملنے والی بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دی۔ کچھ دن بعد وسیم کا پھر پیغام ملا۔

''مجھ سے اکیلے میں کہیں ملو۔''

گوشی نے اس بار بھی توجہ نہیں کی۔ گوشی کی اس بے پروائی سے وہ کچھ زیادہ ہی چڑ گیا تھا۔ دوسروں کے چھوٹے موٹے تحائف کی بات الگ تھی، مگر اس نے تو پورے دو ہزار کا تحفہ دیا تھا۔ گوشی نے پھر بھی اسے لفٹ نہیں کرائی تھی۔ اگر وہ سوٹ کسی اور عورت یا لڑکی کو ملا ہوتا تو وہ شاید اپنا پورا وجود ہی اسے سونپ دیتی اور ایک یہ گوشی تھی کہ...... ایک دن وسیم نے اسے بیچ رستے میں جا لیا۔

''سوہنیو، مانا کہ بہت سوہنے ہو مگر اتنی بھی بے نیازی اچھی نہیں ہوتی۔ کچھ ہمارا بھی خیال کر لو، ہم نے آخر اتنا قیمتی تحفہ دیا ہے جی...... زیادہ نہیں تو ایک بار شکریہ ہی ادا کر دو۔''

''بہت شکریہ، اتنا قیمتی تحفہ دینے کا۔''

''ارے ایسا نہیں بھئی۔''

''تو پھر کیسے......؟''

اور جب وسیم نے اپنا کیسے والا شکریہ اسے بتایا تو گوشی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''اب اگر ایک لفظ بھی کہا تو تمہارا وہ حال کروں گی کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔ اب ایک طرف ہٹو تمہارا سوٹ تمہیں مل جائے گا۔''

گھر جاتے ہی اس نے ڈھولو کے ہاتھ وہ لباس وسیم کو واپس بھجوا دیا اور ڈھولو کے پوچھنے پر اسے وجہ بھی بتا دی۔ ڈھولو لباس لے کر گیا اور ایک گھنٹے بعد ہی واپس آ گیا۔ وہی لباس ہنوز اس کے ہاتھوں میں تھا۔ لباس پر نظر پڑتے ہی گوشی نے پرشکن نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں نے کہا تھا کہ یہ لباس اس کمینے کو دے کر ہی آنا، واپس مت لانا، پھر کیوں لے آئے ہو؟''

''اب اس لباس کا مالک وہ کمینہ نہیں، بلکہ میں ہوں۔''

''مطلب؟''

''میں نے اس لباس کی قیمت اسے ادا کر دی ہے اور اب یہ میں تمہارے لیے لے آیا ہوں۔''

''کیا......! اس لباس کی قیمت ادا کی ہے؟ اتنا مہنگا لباس...... اتنے پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟''

''میں نے اپنی ہٹی بیچ دی۔''

''کیا...... اپنی ہٹی بیچ دی؟ بے وقوف انسان! کماؤ گے کیا اور کھاؤ گے کہاں سے؟''

''خدا ہے نا، وہ کسی کو بھوکا نہیں مرنے دیتا...... میں ساری عمر تمہارے گھر کا نوکر بن کر رہوں گا، مجھے دو وقت کا کھانا بھی نہیں ملے گا یہاں سے؟''

''اف میرے خدا اب میں کیا کہوں تم سے، میں یہ لباس نہیں رکھ سکتی۔''

اچانک ڈھولو کی آنکھوں میں ایک التجا سی در آئی۔ گوشی کے لیے اس سے نظریں چرانا مشکل ہو گیا۔

''اچھا دو مجھے، رکھ لیتی ہوں۔''

گوشی نے ایک گہری سانس لی۔ ڈھولو نے لباس کے ساتھ کچھ پیسے بھی اس کی طرف بڑھائے۔

''ارے...... اب یہ پیسے...... یہ کیا ہے؟''

''میں نے پانچ ہزار میں ہٹی بیچی ہے۔ یہ تین ہزار بچ گئے ہیں، یہ بھی تم رکھ لو کسی کام آ جائیں گے۔''

''میں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی انہیں۔''

''اچھا امانت سمجھ کر رکھ لو، ضرورت پڑے گی تو لے لوں گا۔'' گوشی نے ایک گہری سانس لے کر وہ پیسے رکھ لیے۔

اس واقعے کے دو دن بعد ہی وسیم اور اس کے کچھ ساتھیوں نے گوشی کو اکیلا پا کر گھیر لیا۔ وسیم تیڑھی انگلیوں سے گھی نکالنا چاہتا تھا۔ ان کے ارادے بہت خراب تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ گوشی کو کسی غلط ارادے سے ہاتھ لگاتے، اچانک وہاں پر نجانے کہاں سے ڈھولو آ گیا۔ ڈھولو اور ان میں پہلے تو، تکرار ہوئی اور پھر ہاتھا پائی۔ گوشی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر فوراً گھر آ گئی تھی۔ اگلے دن پتا چلا کہ اس لڑائی جھگڑے میں ڈھولو کا سر پھٹ گیا تھا۔ اس نے خود ہی کہیں سے پٹی کرا لی

تھی۔ وسیم اور اس کا ایک ساتھی اچھے خاصے زخمی ہوئے تھے اور ایک کا بازو ٹوٹ گیا تھا، وسیم اور اس کے ساتھی بدنامی کے ڈر سے اور بات بڑھنے کے خوف سے عارضی طور پر گاؤں سے روپوش ہو گئے تھے۔ ڈھولو تین دن بعد اس دن گوشی سے ملا جس دن اس کے سر سے پٹی اتر چکی تھی۔ ان سب باتوں میں سے کچھ باتیں مجھے خود معلوم ہوئی تھیں اور کچھ مجھے گوشی نے بتائی تھیں۔ ان واقعات کے دو دن بعد ڈھولو مجھ سے ملا اور اس نے مجھے گوشی کا ایک پیغام دیا تھا، اس نے جو پیغام دیا تھا، اس پیغام نے مجھے حیران کر ڈالا تھا۔ ڈھولو نے مجھے بتایا تھا کہ گوشی مجھ سے پیار کرتی ہے اور کل دو پہر کو، شاہ کے کھیتوں میں مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ یہ میرے لیے یقین نہ کرنے والی ایک حیران کن بات تھی۔ آج تک کسی کو گوشی نے ایسا پیغام نہیں بھیجا تھا۔ اگرچہ میں اسے چاہتا تھا مگر میں نے آج تک اس کے سامنے اپنی چاہت کا اظہار نہیں کیا تھا اور میں کبھی اندازہ بھی نہیں کر سکا تھا کہ وہ بھی مجھ سے پیار کرتی ہے...... اور کل دو پہر کو شاہ کے کھیتوں میں مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ ڈھولو مجھے یہ پیغام دے کر رخصت ہو گیا تھا اور دوسرے دن صبح سویرے ہی اطلاع ملی کہ ڈھولو نے خود کشی کر لی ہے۔ یہ اطلاع صرف میرے لیے ہی نہیں بستی کے تمام افراد کے لیے بھی حیران کن تھی کہ ڈھولو نے خود کشی کر لی ہے۔ وہ تو ایک سیدھا سادا اور یار باش بندہ تھا بہت ہنس مکھ، خوش اخلاق، یاروں کا یار۔ گاؤں کا کوئی فرد بھی یہ گتھی نہ سلجھا سکا کہ اس نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟ اس کی موت پر ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر گھر سوگوار...... سب نے اس کی آخری رسومات ادا کیں اور اسے اس کی آخری آرام گاہ تک چھوڑ آئے۔ ڈھولو کی خود کشی کی وجہ مجھے اس دن معلوم ہوئی، جس دن گوشی مجھ سے ملی تھی۔ اس نے سسکتے ہوئے کہا تھا بلکہ بڑبڑا رہی تھی۔

''ہائے یہ تم نے کیا کر دیا ڈھولو...... یہ تم نے کیا کر دیا...... کاش میں نے تمہاری بات مان لی ہوتی...... میں تمہاری مجرم ہوں...... میں تمہاری قاتل ہوں، خدا مجھے کبھی معاف نہ کرے......''

وہ اس دن پہلی بار میرے سینے سے لگی تھی۔ میرے دل میں پھول سے کھل اٹھے تھے، مگر وہ جس طرح روتے ہوئے سسک رہی تھی اور ڈھولو کی بات کر رہی تھی، اس سے میں بے چین ہو گیا تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔

''یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ کیوں ڈھولو کی موت کا الزام اپنے سر لے رہی ہو؟'' میری بات سن کر وہ اور بھی شدت سے رونے لگی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے سینے پر کوئی بوجھ ہے اور یہ بوجھ صرف رونے سے ہی کم ہو سکتا ہے۔ اس بار میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ چپ چاپ رونے دیا۔ کچھ دیر تک وہ شدت سے روتی رہی، پھر اس کے رونے میں کمی آ گئی۔ کچھ پل تک وہ سسکیاں بھرتی رہی اور پھر بالکل ہی خاموش ہو گئی۔ ''ہاں اب بتاؤ، کیا بات ہے؟ کیوں ڈھولو کی موت کا الزام خود کو دے رہی ہو؟''

اس نے ایک گہری سانس لی ''اب کیا رہ گیا ہے کہنے کو؟''

''پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔'' اس نے مجھے ڈھولو کی وہاں تک ہر بات بتا دی، جب ڈھولو میرے پاس اس کا پیغام لے کر آیا تھا۔ وہ مزید کہنے لگی ''تم سے ملنے کے بعد وہ سیدھا میرے پاس آیا تھا اور اس نے مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ کیا تم سچ میں اس سے پیار کرتی ہو؟

''ہوں۔''

''اس کے علاوہ کیا کسی اور سے......؟''

''نہیں۔''

''تھوڑا ابہت؟''

''بالکل نہیں۔''

اس نے ایک گہری سانس لی تھی۔ ''اچھا میرے لیے تمہارے دل میں ایسا کوئی خیال؟''

''میں اس کی بات سن کر مسکرا دی تھی......''

''ایسی باتیں کبھی ممکن نہیں ہوتیں۔''

اچانک وہ کچھ سنجیدہ ہو گیا۔ ''اچھا میری ایک بات مانو گی، صرف ایک بات؟ میں اس کے بعد تم سے، تمہارے گھر سے اور تمہاری زندگی سے ہمیشہ کے لیے دور چلا جاؤں گا۔''

''کیسی بات؟''

''میں چاہتا ہوں، تم ایک گھنٹے کے لیے میرے گھر میں مہمان بن کر آؤ...... میں تمہاری دعوت کرنا چاہتا ہوں اور اس کے بعد، میں تمہارے سامنے بیٹھ کر تمہیں بہت دیر تک دیکھنا چاہتا ہوں۔ بس پھر میں تمہاری زندگی سے چلا جاؤں گا ہمیشہ کے لیے...... میں اس کی بات سن کر مسکرائی تھی، بلکہ ہنس پڑی تھی۔''

''تمہاری دعوت قبول کر لوں؟ تمہارے گھر میں اکیلی آ جاؤں؟ اور تم بہت دیر تک مجھے دیکھتے رہو؟''

''ہاں......''

"شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں اپنی ؟ بے وقوف انسان! اگر تمہیں مجنوں بننے کا شوق ہے تو ہوتا رہے، مگر مجھے لیلیٰ بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اور تمہارے گھر میں آنے اور اکیلی آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟"

"کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔"

اچانک اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ "خدا کی قسم میں تمہیں ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ میری اوقات کیا ہے، میں اپنی اوقات سے آگے نہیں بڑھوں گا۔ میں تمہیں صرف جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ بس یہی میری ایک بات مان لو۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"صرف ایک بار۔"

"بس...... اب بحث مت کرنا۔ جو بات ناممکن ہے وہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتی، اب اگر تم نے اس موضوع پر ایک لفظ بھی کہا تو میں تم سے دوسری طرح پیش آؤں گی۔"

اس نے ایک گہری سانس لی تھی۔ "پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے یہ بستی چھوڑ جاؤں گا، مگر اب...... اب تو لگتا ہے یہ دنیا ہی چھوڑنی پڑے گی، کیا تم مرنے والے کی آخری خواہش بھی پوری نہیں کرو گی؟"

"کیا تم دنیا چھوڑ رہے ہو؟" نہ چاہنے کے باوجود بھی میں بہت کھل کر ہنسی تھی۔ "اچھا میں بھی دیکھتی ہوں تمہاری بات میں کتنی سچائی ہے۔"

"اسے مذاق مت سمجھنا، میں سنجیدہ ہوں۔ میں سچ میں کل کچھ کر گزروں گا۔"

"ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گی۔"

"وہ اس نے مجھے نہایت حسرت بھری نگاہ سے دیکھا تھا اور...... میں اب سوچتی ہوں تو دل خون روتا ہے...... کیسی اذیت اور دکھ تھا اس کی آنکھوں میں۔ اس نے جاتے ہوئے کہا تھا۔ "میں صرف اس امید پر تمہارے ساتھ لگا ہوا تھا کہ شاید کسی نا کسی دن میں اپنے خلوص سے تمہارے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاؤں گا، مگر افسوس، میرا سارا خلوص بیکار گیا۔"

اس کے بعد وہ بغیر ایک لفظ کہے وہاں سے چلا گیا تھا اور اس سے اگلے دن............

وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ "کاش مجھے پتا ہوتا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے تو شاید شاید میں اس کی بات مان لیتی، کیا کچھ نہیں کیا تھا اس نے میرے لیے اور ایک میں تھی کہ......" اس کے آنسو ایک بار پھر رواں ہو گئے۔ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ اور پھر میں کہتا بھی تو کیا؟ وہ ہماری پہلی ملاقات تھی اور پہلی ملاقات بے حد افسردہ اور سوگوار رہی تھی۔ ہم دونوں بوجھل دل کے ساتھ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تھے۔ دوسری ملاقات ہماری ایک ہفتے بعد ہوئی تھی اور تیسری اس سے ایک ہفتے بعد۔

ہماری ابتدائی ملاقاتیں کچھ افسردہ سی رہیں تھیں۔ ہماری باتوں میں زیادہ تر ذکر ڈھولو کا ہی ہوتا تھا۔ ہم ہفتہ پندرہ دنوں بعد ملتے رہے اور وقت گزرتا رہا اور پھر اتنا وقت گزرا کہ جس نے ڈھولو کی یاد یکسر ہمارے دل سے مٹادی۔ سچ کہتے ہیں، مرنے والے کے ساتھ کوئی نہیں مرتا۔ اس دوران میں اور گوشی کافی حد تک بے تکلف ہو گئے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے، پیار کرتے تھے، مگر ہمارا یہ پیار ایک حد تک ہی رہتا اور ہم دونوں نے کبھی اس حد کو توڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے کہا "ہم آخر کب تک یوں چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے؟ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں اب ایک ہو جائیں۔ شادی کر لیں اگر تم کہو تو میں اپنے گھر والوں کو تمہارے گھر بھیجوں؟"

میری بات سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ وہ ہنستی بہت تھی۔

"شادی اور تم سے؟ پاگل تو نہیں ہو گئے ہو تم؟"

مجھے اس کی بات سن کر بے حد حیرت ہوئی "اس میں پاگلوں والی کیا بات ہے؟"

وہ مسکراتے ہوئے سنجیدہ ہو گئی "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے شادی کے بارے میں کیسے خواب دیکھ رکھے ہیں، اس کے باوجود تم ایسی بات کر رہے ہو؟ دیکھو، برا مت ماننا، تم مجھے وہ سب نہیں دے سکتے، جو میں چاہتی ہوں۔ بنگلا، گاڑی، بینک بیلنس، نوکر چاکر...... میں نے بڑے بڑے خواب دیکھ رکھے ہیں اور مجھے ان کی تعبیر ہر حال میں حاصل کرنی ہے۔ میں ایک غربت زدہ ماحول سے نکل کر ویسے ماحول میں نہیں جانا چاہتی۔"

"پر تمہیں اتنا پتا ہے کہ کچھ لوگ یہ سب کچھ پا کر بھی خوش نہیں ہوتے اور کچھ نہ پا کر بھی خوش ہوتے ہیں، میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا۔ کسی قسم کی کوئی کمی نہیں آنے دوں گا...... کسی شے کی بھی۔"

"اس کے باوجود میں اپنے ارادے پر قائم ہوں، میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔"

"کیا یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے۔"

"ہاں بالکل آخری"

میں چپ چاپ وہاں سے واپس آ گیا تھا اور کئی دنوں تک اس سے نہیں ملا تھا۔ جب اس کی میرے ساتھ ایک ہونے کی خواہش ہی نہیں تھی تو پھر اس سے ملنے کا فائدہ؟ مجھے اس کے ایک دو پیغام بھی ملے کہ میں اس سے ملوں، مگر میں اس سے کنارہ کشی ہی اختیار کیے رہا۔ میں اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ جب کچھ دنوں کی جدائی گوارا نہیں ہو رہی تو ہمیشہ کی جدائی کیسے گوارا ہوگی؟ انہی دنوں اڑتی اڑتی خبر ملی کہ اس کے رشتے کی کہیں بات چل رہی ہے۔ اس دوران پھر مجھے اس کے دو تین پیغام ملے کہ میں اس سے لازمی ملوں، ورنہ وہ کچھ کر گزرے گی۔ ہمیں ملے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ میرا دل بھی اب اس سے ملنے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے ملنے کا ارادہ کر لیا۔ ہم کئی روز کے بچھڑے ہوئے جب ملے تو بے قرار وجود میں قرار اترتا چلا گیا۔ کئی دن کی پیاس تھی من میں، بجھتی رہی اور پھر گوشی نے اس مقرر کی ہوئی حد کو توڑنے کی کوشش کی، جو ہم دونوں نے اپنے درمیان طے کی ہوئی تھی۔ "یہ...... یہ کیا کر رہی ہو؟"

"پیار کر رہی ہوں۔"

"یہ...... یہ پیار ہے......؟ یہ غلط ہے!"

"کچھ غلط نہیں ہے۔ آج مجھے مت روکو۔ پتا نہیں آج کے بعد پھر کبھی ہم ملیں نہ ملیں، یہ ملن پھر ہو نہ ہو، تمہیں پتا ہے، میری منگنی ہو گئی ہے؟ دس دن بعد میری شادی ہے۔"

"کیا......؟" میں حیرت سے چلایا اور اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے "کس سے؟"

"اس سے، جس کے میں نے خواب دیکھے تھے۔ وہ ہمارا دور پرے کا رشتے دار ہے۔ ماں، باپ، بہن، بھائی کوئی نہیں ہے۔ اکیلا ہے، فرانس میں رہتا ہے اور بہت پیسے کما رہا ہے وہاں۔ بنگلا، گاڑی، نوکر، چاکر سب کچھ ہے اس کے پاس۔ اف...... خدا نے آخر سن لی میری، مجھے وہ سب مل رہا ہے جو میں نے چاہا تھا۔ میں اتنی خوش ہوں کہ بتا نہیں سکتی۔"

میرے دل میں کوئی نوکدار چیز پوری قوت سے چبھی۔ وہ خوش تھی مگر میرا دل اندر سے ذرّوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اچانک میرے لفظوں میں زمانے بھر کی اذیت سمٹ آئی۔ "تم جانتی ہو کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔"

"کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا۔"

"مرتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ڈھولو.........."

اس نے تڑپ کر میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔ میں خوش ہوں، میری خوشی برباد مت کرو۔ اگر تم مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو تو بس خاموش ہو جاؤ۔ اب اس موضوع پر ایک لفظ بھی نہیں کہنا۔ بس مجھے ٹوٹ کر پیار کرو اور کرنے دو۔ ایسا پیار، جو ہمیشہ میرے دل میں رہے۔ میری روح میں بسا رہے۔" اور پھر اچانک ایک کلی میرے ہونٹوں سے آ لگی۔

پر میرا دل اندر سے بوجھل ہو چکا تھا۔ میں نے اسے روک دیا۔ "اب تو اتنا پیار بھی نہیں ہوگا، جتنا ہم پہلے کرتے تھے۔ میں صرف یہ جان کر اور اس اُمید پر تمہیں پیار کرتا تھا کہ ایک نہ ایک دن تم میری بنوگی مگر اب، جب کہ تم نے کسی اور کا ہونے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا اگر ہماری قسمت میں جدائی ہی لکھی ہے تو پھر جدائی ہی سہی" میں نے نرمی سے اس سے اپنا آپ جدا کیا اور آنکھوں میں نمی لیے گھر لوٹ آیا تھا۔

کئی دنوں تک میں بہت بجھا بجھا سا رہا تھا۔ خاص کر اس دن، جس دن گوشی ہمارے گاؤں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئی تھی۔ وہ چلی گئی تھی اور اپنے پیچھے ایک ایسا خلا چھوڑ گئی تھی، جسے بھرنے کے لیے میں نے شہر کا رخ کر لیا تھا۔

☆☆☆

اور آج وہی گوشی میرے سامنے تھی۔ میری طرح اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا اور ایک دوسرے کو پہچان کر ہم دونوں ہی ایک پل کو سناٹے میں رہ گئے تھے۔ گوشی کو وہاں دیکھ کر میرے دل میں اذیت کی انگنت لہریں اتر گئی تھیں۔ گوشی، جس نے بہت اونچے خواب دیکھے تھے۔ جس نے بنگلا، گاڑی، بینک بیلنس اور نوکروں چاکروں کے خواب دیکھے تھے، اسے اپنے خوابوں کی یہ تعبیر ملی تھی کہ وہ اس امیر ترین ملک کی قبیح ترین جگہ پر جسم فروشی کر رہی تھی۔ کیا یہی تھی اس کے خوابوں کی تعبیر؟ اس کی منزل؟ اس کی قسمت؟ میں جتنا چاہ رہا تھا کہ میں اس کے متعلق نہ سوچوں، اس کے انجام کی اتنی ہی تلخ اور پُراذیت سوچیں میرے ذہن میں آ رہی تھیں۔

میں اپنی جگہ بے حس و حرکت تھا اور وہ اپنی جگہ اور پھر وہ اچانک تڑپ کر اٹھی اور میرے پتھرائے ہوئے وجود سے لپٹ کر، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میری نگاہوں میں وہ لمحہ ابھر آیا، جب ڈھولو کا پہلی بار ذکر کرتے ہوئے وہ مجھ سے لپٹ کر روئی تھی۔ اس وقت اس کی جو حالت ہوئی تھی، وہی حالت اس وقت مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ بے بسی، بے چارگی کی

انجاؤں کو لیے ہوئے وہ میرے وجود سے لپٹی پوری شدت
سے رو رہی تھی اور میں...... میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں
خود بھی اس کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر رودوں یا اسے دلاسہ
دوں؟ میری آنکھوں میں بہت کچھ چبھ رہا تھا مگر میں خود پر جبر
کیے ہوئے تھا۔ خود کو پتھر کرنے کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب
رہی تھی؟ اس کا مجھے خود بھی پتا نہیں تھا۔ معلوم نہیں وہ ایک پل
تھا، ایک لمحہ تھا، یا ایک صدی تھی، جب ہم دونوں ایک دوسرے
سے لگے دکھ کے سمندر میں غرق رہے۔ پتا نہیں کب تک موسم
نم رہا اور بارش ہوتی رہی۔ پھر بارش تھم گئی اور موسم صاف ہو
گیا۔ ہم دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کے روبرو بیٹھ
گئے۔ بہت دیر تک خاموشی کی چادر ہم دونوں کے درمیان تنی
رہی اور پھر میں نے ہی اسے چاک کرنے کی کوشش کی۔

''تمہیں یہاں دیکھ کر میں جس اذیت سے گزر رہا ہوں وہ
صرف میں جانتا ہوں، مگر مجھے یہ سمجھ نہیں آرہا کہ تم یہاں پہنچی کیسے
......؟ تمہاری تو غالباً کسی رئیس آدمی سے شادی ہوئی تھی؟''

''بس یہ ساری قسمت کی بات ہے'' اس نے ایک گہری
سانس لی تھی'' میں جو دوسروں کے جذبات کے ساتھ کھیلتی رہتی
تھی، تقدیر اس بار میرے ساتھ کھیل گئی۔''

''تم تو کسی ایسے شخص کے پاس بیاہ کر گئی تھیں نا جس
کے پاس......''

''بہت دولت، بینک بیلنس، اور نوکر چاکر تھے؟ مگر
افسوس ایسا کچھ نہیں تھا۔ گھر والوں نے میری جس شخص کے
ساتھ شادی کی تھی، وہ کوئی دولت مند شخص نہیں تھا، بلکہ یہاں کا
ایک دلال تھا، جو اپنے آپ کو بزنس مین کہتا تھا۔ اس کا تعلق
پاکستان سے تھا اور اس کا کام ہی یہی تھا کہ وہ وہاں کی بھولی
بھالی لڑکیوں کو پھسلا کر، اور ان کے ماں باپ کو جھوٹے سچے
خواب دکھا کر یہاں لاتا تھا اور لا کر بیچ دیتا تھا۔ میری اس سے
شادی ضرور ہوئی تھی، مگر اس نے کبھی مجھے ہاتھ نہیں لگایا
تھا۔ اس نے، یہاں پہلے سے ہی ان لوگوں سے بات کر رکھی
تھی۔ یہاں میں نے صرف پہلی رات تنہا گزاری تھی، پھر
میری کوئی رات کبھی تنہا نہیں گزری۔ اس دن مجھے روم میں چند
اجنبی دکھائی دیے تھے۔ ان کے ہاتھ میں میرے اسی نام نہاد
مجازی خدا کا خط تھا، جس نے میرے ساتھ کوئی تعلق قائم
کرنے سے پہلے ہی مجھے ان لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیا
تھا۔ اس خط میں ہر بات تفصیل سے لکھی ہوئی تھی۔ اس نے
کھل کر اپنی کمینگی کا اعتراف کیا تھا کہ اس نے کیسے بے غیرتی
سے مجھے ان لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ اس نے لکھا

☆ پکانے کے دوران میں سبزیوں کے اہم معدنی
غذائی اجزاء ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کچی سبزیوں کی
سلاد اور فروٹس کو اپنی غذا میں ہمیشہ شامل رکھیں۔ سبزیوں
میں شامل وٹامن سی، فولک ایسڈ اور معدنیات ہمارے
جسمانی نظام کے لیے بہت ضروری ہیں۔ ان اجزاء کی کمی
سے ہم مٹاپے اور قوت مدافعت کی کمی کا شکار ہو سکتے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ کچی سبزیوں کا استعمال آپ کو صحت مند اور
فٹ رکھ سکتا ہے۔

.....☆.....☆.....

☆ نمک ہمارے جسمانی نظام کے لیے ضروری ہے
لیکن بہت کم، اس کی زیادہ مقدار دل کے مسائل، ہائپر ٹینشن،
آرتھرائٹس، اوسٹیوپوروسس اور مٹاپے جیسی بیماریوں کا باعث
بنتی ہے۔ عام طور سے دن بھر میں ہمارے جسم کو نمک کی
1500 ملی گرام مقدار کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم عموماً اس
سے دس گنا زیادہ مقدار استعمال کر لیتے ہیں۔ اب سوال یہ
پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ ہم نمک کی زیادہ مقدار کھانے کے عادی
ہو چکے ہیں لہٰذا کم نمک والے کھانے کیسے کھائیں؟ تو اس کا
حل یہ ہے کہ ذائقہ بڑھانے کے لیے کھانے میں لیموں کا
رس شامل کر دیں اور کھانے کو پالک، گاجر یا ٹماٹر کے جوس میں
پکائیں۔ مزید یہ کہ کھانے میں نمک کی مقدار بتدریج کم کرتی
جائیں، کچھ ہی عرصے میں آپ اس کی عادی ہو جائیں گے۔

.....☆.....☆.....

اچھی نیند ہماری صحت کے لیے ضروری ہے۔ نیند کے
دوران میں ایک خود کار نظام کے ذریعے ہمارے جسم کے اندر
صفائی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جتنا کچرا ہم پورے دن میں
اپنے اندر جمع کرتے ہیں اسے ہمارا جسم نیند کے دوران میں ہی
ٹھکانے لگاتا ہے۔ ناکافی نیند کے سبب آپ نے محسوس کیا ہوگا
کہ آپ چڑچڑاہٹ کا شکار رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیند
کی کمی کے باعث ہمارے ہارمونز کا توازن بگڑ جاتا ہے اور
میٹابولزم کا عمل سست پڑ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ پھر ہمارا وزن بڑھنے
لگتا ہے۔ لہٰذا بھرپور نیند کو اپنا معمول بنائیں لیکن اس کا یہ
مطلب نہیں کہ آپ اتنی دیر سے اٹھیں کہ سارے کام آپ کے
منتظر رہ جائیں۔ تازہ ترین ریسرچ سے معلوم ہوا کہ نو گھنٹے سے
زیادہ سونے سے ہر رات ذیابطیس کا خطرہ پچاس فیصد تک بڑھ
جاتا ہے۔ سو آپ جلدی سونے اور جلدی اٹھنے والے اصول پر
عمل کریں اور اسمارٹ نظر آئیں۔

مرسلہ: اسحٰی اسماعیل۔ کراچی

تھا کہ گو شادی وغیرہ سب ڈراما تھا تاہم میری تسلی کے لیے وہ طلاق کے کاغذ بھی بجھوا رہا ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ میری اس وقت کیا حالت ہوئی تھی۔ مجھے ایسے لگا تھا جیسے کسی نے میرے سر پر آسمان گرا دیا ہے، میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہے یا پھر...... میں کئی دنوں تک اپنے آپ سے بے خبر رہی مجھے ان لوگوں نے اسی روم میں قید رکھا تھا۔ مجھ پر بار بار بیہوشی کے دورے پڑنے لگے تھے اور نہ چاہنے کے باوجود بھی میں جی بھر کر چیختی، چلاتی اور یہاں سے رہا ہونے کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ میں اکثر چیخ چیخ کر آن دیکھے لوگوں کو اپنی مدد کے لیے بلاتی، مگر میری صدائیں ان دیواروں سے ٹکرا کر واپس لوٹ آتیں اور کہیں سے کوئی مدد کرنے والا نہ آتا۔ چند دنوں بعد ان لوگوں نے مجھ پر ظلم ڈھانے شروع کر دیے۔ وہ مجھے طرح طرح کی اذیتیں دیتے اور جسم فروشی کے لیے مجبور کرتے۔ وہ چاہے مجھ پر جتنا مرضی ظلم کر لیتے مگر میں یہ بیچ کام کبھی نہیں کرنے والی تھی۔ مجھے مرنا گوارہ تھا مگر یہ بیچ کام کرنا گوارہ نہیں تھا۔ میں خودخوشی کے موقع کی تلاش میں رہنے لگی کہ مجھے ایسا کوئی ایک موقع ملے اور میں...... مگر افسوس مجھے یہ موقع بھی کبھی نہ ملا۔ انہوں نے مجھے اتنی اذیتیں دیں کہ میں ذہنی طور پر تھک کر نڈھال ہو گئی۔ پھر ایک دن انہوں نے مجھے ایک خط دیا۔ وہ خط پاکستان سے آیا تھا اور میرے شوہر کے پتے پر پوسٹ کیا گیا تھا۔ وہ میرے گھر والوں کا خط تھا۔ انہوں نے سلام کیا تھا، دعا دی تھی، خیریت پوچھی تھی اور شرمسار سے لفظوں میں...... کچھ مدد مانگی تھی۔ اس بار بارشیں بہت تیز ہوئی تھیں اور ان کے کچی اینٹوں سے بنے دونوں کمرے زمیں بوس ہو گئے تھے۔ انہوں نے سر چھپانے کے لیے نئے کمرے بنانے تھے اور...... اور اس دن مجبور ہو کر میں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اپنے آپ کو اس راہ پر ڈال دیا تھا، جس کا انجام اذیتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے ان لوگوں سے کچھ رقم لے کر گھر بھیج دی تھی اور...... میں نے گھر والوں کو لکھا تھا کہ میں بہت خوش ہوں اور میرے ''وہ'' بھی بہت خوش ہیں۔ اگلا خط گھر والوں کا کچھ عرصے بعد آیا جو کہ خوشیوں بھرا تھا۔ کچی اینٹوں کی بجائے پکی اینٹوں سے کمرے بن گئے تھے اور کچھ عرصے بعد، بھائی کی شادی ہونے والی تھی...... اس دن میں جی بھر کر روئی بھی تھی اور ہنسی بھی۔ گھر والوں کو خوش دیکھ کر دل خوش تھا اور اپنے آپ کو بیچ دینے کا غم بھی۔ بس اس دن سے آج تک میں انہی اذیتوں میں دن رات گزار رہی ہوں...... اچانک وہ چپ ہو گئی۔ جیسے اس کے پاس کہنے کو کچھ اور نہ بچا ہو۔

''اگر تم کہو تو میں باہر جا کر تمہاری کوئی مدد کروں؟''

''کیسی مدد؟''

''تمہیں یہاں سے نکالنے کی۔''

وہ مسکرائی۔ ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ ''یہ ایک ناممکن ترین کام ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ یہ لوگ کتنے طاقتور ہیں۔ اور اگر میں یہاں سے آزاد ہو بھی گئی تو کیا کروں گی؟ کہاں جاؤں گی؟ کون اپنائے گا مجھے؟ اور پاک دھرتی پر اپنے ناپاک وجود کے ساتھ رہنا مجھے ہرگز گوارہ نہیں ہے۔ مجھے جس دن یہاں سے نکلنے کا موقع ملا، میں اسی دن خودکشی کر لوں گی مگر میں فی الحال ایسا کرنا نہیں چاہتی جن خوابوں کی تعبیر میرے نصیب میں نہیں تھی، میں وہ تعبیر اپنے گھر والوں کو ضرور دینا چاہوں گی۔''

اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور ہماری نظریں بیک وقت دیوار گیر گھڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ پورا ایک گھنٹا ہو چکا تھا اور اب ہمیں بچھڑنا تھا۔ میں نے اس سے کہا ''میں آج بھی اول دن کی طرح تمہیں چاہتا ہوں...... میں اب بھی تمہیں اپنانے کو تیار ہوں، ہم ایک ہو جائیں گے......'' اس کے لبوں پر ایک بوجھل سی مسکراہٹ اتر آئی...... ''میں نے کہا نا یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ یہ لوگ بہت طاقتور ہیں۔ یہاں سے باہر نکلنا کسی طور ممکن نہیں۔ اور پھر میں اپنے گناہوں کی سزا تمہیں کیوں دوں؟ تم آج بھی میرے دل میں ایک الگ مقام رکھتے ہو اور ہمیشہ رکھو گے......'' وہ نرمی سے میرے قریب ہو گئی ''ہم تقدیر سے نہیں لڑ سکتے اور تقدیر میں، ہم دونوں کا ملاپ ممکن نہیں......'' اچانک اس کی آواز بھیگ گئی۔ دو گرم گرم آنسو میرے سینے پر آ گرے۔ ''مجھے معاف کر دو کامی! میں سب سے زیادہ تمہاری مجرم ہوں۔ اگر میں اس دن تمہاری بات مان لیتی تو شاید آج مجھے یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ میں نے تمہارے خلوص کی قدر نہیں کی اور آج......''

اچانک دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ میرے پاس اسے کہنے کو، کچھ دینے کو نہیں تھا۔ میں نے اس کی اشکوں بھری آنکھوں میں دیکھا۔ معلوم نہیں وہاں کیسی اذیتیں، دعائیں اور التجائیں سسک رہی تھیں۔ کاش میں ان آنکھوں کے کسی کام آ سکتا۔ ان آنکھوں میں مزید دیکھنا میرے لیے ممکن نہ رہا۔ میں نے نرمی سے اس کی دونوں آنکھوں کو چوما اور خود کو اس کے بازوؤں سے آزاد کرا کر باہر نکل آیا۔

’’خبردار! میرے بھیا کو نظر مت لگانا۔‘‘ میں نے ہنستے ہوئے اپنی سہیلی انیلہ سے کہا جو میرے کمرے میں رکھی ہوئی بھیا کی تصویر کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

’’تمہارا بھیا ہو یا کسی اور کا بھیا۔‘‘ انیلہ نے بے باکی سے جواب دیا۔ ’’اگر اتنا شاندار ہوگا تو میں تو ضرور اس کو نظر لگاؤں گی۔‘‘

انیلہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ ہم دونوں بی اے کے پہلے سال میں ہم جماعت تھے۔ ہماری دوستی کو

محترم معراج رسول
سلام تہنیت

ارسال کردہ سرگزشت اس بندے کی ہے جس نے گویا بیس سال اندھیرے میں گزار دیئے۔ سقوط مشرقی پاکستان کا درد ہم بھولتے جارہے ہیں اسی لیے میں نے ایک گمنام سپاہی کی ذرا مختلف سی حالات زندگی احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے کیونکہ اس کی زندگی بہت حد تک فلمی ہے۔ ایک اچھی فلم کا پلاٹ ہے۔ فلمیں اور ناولوں کی بنیاد ایسے ہی واقعات پر رکھی جاتی ہے۔ آپ کو 1965ء کا سپاہی مقبول حسین تو یاد ہوگا جو بھارتی مظالم سہہ سہہ کر دماغی توازن کھو بیٹھا تھا اور جب دو ہزار کی دہائی میں اس جری کو رہا کیا گیا تو واہگہ پار کرتے ہی اسے سب کچھ یاد آگیا اس کردار کی بھی کہانی کچھ ایسی ہی ہے۔

حسن رزاقی
(ایبٹ آباد)

صرف چند ماہ ہوئے تھے۔ میں شروع سے ہی اس کالج میں پڑھ رہی تھی۔ انیلہ نے اسی سال داخلہ لیا تھا۔ اس سے پہلے وہ لاہور میں پڑھائی کر رہی تھی۔ اس کے والد سرکاری ملازم ہیں ان کا تبادلہ لاہور سے کراچی ہو گیا تو انیلہ نے ہمارے کالج میں داخلہ لے لیا۔

انیلہ کو اللہ تعالیٰ نے حسن وصورت اور حسن سیرت کے ساتھ ساتھ ذہانت سے بھی مالا مال کیا تھا مگر اس کی ایک عادت تھی جس سے اکثر لوگ انیلہ سے نالاں یا خائف رہتے تھے۔ یہ تھی اس کی بے باکی۔ اس کو کوئی بات کہنے میں کوئی لاگ نہ تھا۔ وہ ہر چیز کو بے لاگ اور کھرے کھرے انداز میں کہہ جاتی تھی۔ اس میں کوئی بدتمیزی یا کسی کو نیچا دکھانے کا جذبہ نہ تھا۔ صرف اتنی سی بات تھی کہ جو کچھ اس کے دل میں ہوتا وہی اس کی زبان پر ہوتا۔ وہ حکومتوں اور دوسرے اداروں کی طرح ''نظریۂ ضرورت'' کی قائل نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے میرے بھیا کے متعلق کہے ہوئے جملے کا کھرا کھرا جواب دیا تھا۔

بھیا نے پچھلے سال ہی اپنی ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کی تھی اور آج کل لاہور کے گنگا رام اسپتال میں ہاؤس جاب کر رہے تھے۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ انیلہ لاہور سے کراچی آئی تھی اور بھیا کراچی سے ہاؤس جاب کرنے لاہور گئے تھے۔ آج کل بھیا ایک ہفتے کی چھٹی پر کراچی آئے ہوئے تھے۔

انیلہ کالج سے واپسی پر میرے ساتھ ہی میرے گھر آ گئی تھی۔ ہم دونوں اپنے کمرے میں باتیں کر رہے تھے کہ اچانک بھیا آ گئے۔ وہ انیلہ کو دیکھ کر واپس جانے لگے مگر انیلہ جھٹ اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر اپنا ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بھیا کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔ ''آپ مجھ سے شادی کریں گے؟''

بھیا ٹپٹا گئے۔ ہکلانے لگے۔ مجھے انیلہ کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ لاکھ بے باک اور منہ پھٹ سہی مگر ایسی بھی کیا بے باکی۔ بے شرمی۔ میں نے اپنی ناگواری کا اظہار کرنا چاہا مگر بھیا سنبھل چکے تھے ان کی شوخی عود کر آئی تھی۔ ''اگر میں شادی کر لوں تو اس کے بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟'' انہوں نے کہا۔

''دل اور جان دونوں آپ کے حوالے کر دوں گی۔'' انیلہ نے بھی شوخی سے جواب دیا۔

''نہیں بھئی۔'' بھیا نے مایوسی کے سے انداز میں کہا۔ ''صرف دل اور جان کے عوض میں ساری زندگی کا سودا نہیں کر سکتا۔''

وہ ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ بھیا کے باہر نکلتے ہی میں نے انیلہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا گم صم رہی پھر چند منٹ بعد اپنے گھر چلی گئی۔

اگلے روز شام میں بھیا میرے کمرے میں آ گئے۔ پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر پوچھنے لگے۔ ''کل جو تمہاری سہیلی آئی تھی کیا نام تھا اس کا؟''

''انیلہ۔'' میں نے جواب دیا۔ پھر معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''بھیا آپ اس کی کسی بات کا برا مت منایئے گا۔ اچھی لڑکی ہے مگر حد درجہ بے باک اور منہ پھٹ اس کو کسی بات کے کہنے میں کوئی لاگ نہیں ہوتا۔ جھوٹ تو بالکل نہیں برداشت کر سکتی۔''

''میں نے تو کسی بات کا برا نہیں مانا۔ سچ بولنا تو اچھی بات ہے۔'' بھیا نظریں چرا رہے تھے۔

''بھیا میری طرف دیکھیے کہیں آپ دل تو نہیں ہار بیٹھے؟'' میں نے شوخی سے پوچھا۔

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ بتاؤ تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟'' بھیا نے ٹاپک بدلنا چاہا۔

''بھیا! موضوع مت بدلیے۔ اڑنے کی کوشش بے کار ہے اگر آپ میری مٹھی گرم کریں تو آپ کا کام بن سکتا ہے۔ میں امی سے بات کروں گی۔''

''اچھا!'' بھیا کھلنے لگے تھے۔ ''تمہاری مٹھی کتنے میں گرم ہو گی؟''

''زیادہ نہیں بس نیگ میں مجھے اپنی آج تک کی کمائی پکڑا دیجیے گا۔''

بھیا ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں نے امی کے کمرے کا رخ کیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں امی فوراً راضی ہو گئیں۔ انیلہ کے لیے ان کے دل میں ویسے ہی نرم گوشہ تھا۔ میں نے انیلہ کو فون کیا پھر اگلے ہی دن میں اور امی انیلہ کے گھر پہنچ گئے۔ آج پہلی بار میں نے انیلہ کو لجاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگلے مہینے بھیا کی اور انیلہ کی منگنی ہو گئی۔ انیلہ کا ہمارے گھر آنا جانا بند ہو چکا تھا۔ بھیا ویک اینڈ کے لیے کراچی آئے ہوئے تھے۔

''سچو، انیلہ تم سے ملنے نہیں آئے گی؟'' بھیا نے کچھ حسرت کچھ اُمید سے پوچھا۔

''بھیا اب وہ یہاں پکی پکی صرف ایک بار آئے گی

جب آپ سہرا باندھ کر ہاتھ میں تلوار لے کر اور گھوڑے پر بیٹھ کر اس کو بیاہنے جائیں گے۔''
''اس سے پہلے ملنے کی کوئی ترکیب نہیں ہوسکتی؟'' بھیا نے سوال کیا۔
''ہو تو سکتی تھی مگر آپ میری مٹھی کیسے گرم کریں گے ساری کمائی تو آپ نیگ میں ہار چکے ہیں۔''
''ابھی اگلے سال کی کمائی باقی ہے۔''
''ہاں پھر کوئی ترکیب سوچی جاسکتی ہے۔''
میں نے انیلہ کی امی کو کپڑے دیکھنے کے بہانے انیلہ کو ساتھ لے جانے کی اجازت لے لی۔ بازار میں بھائی پہلے سے موجود تھے۔ تھوڑی دیر بوتیک میں وقت گزارنے کے بعد ہم لوگ گھومنے نکل گئے۔
کافی وقت گزار کر گھر پہنچے تو امی منتظر تھیں ان کو پتا چل چکا تھا ہم دونوں بھائی بہن کو ان کی ڈانٹ سننا پڑی۔
چند مہینے اور گزر گئے اس دوران بھیا آرمی کی میڈیکل کور میں بھرتی ہو چکے تھے۔ انیلہ نے بہت مخالفت کی مگر بھیا اپنے مؤقف پر جمے رہے۔
شادی کے دن نزدیک آرہے تھے۔ پھر وہ دن بھی آگیا کہ انیلہ دلہن بن کر ہمارے گھر میں اور بھیا کی زندگی میں داخل ہوگئی۔
گھر میں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ بھیا اور انیلہ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ چند ماہ بعد مشرقی پاکستان کی لڑائی شروع ہوگئی۔ بھیا کو ڈھاکا بھیج دیا گیا۔ انیلہ نے رو رو کر اپنا برا حال کرلیا۔
''روتی کیوں ہو انیلہ، فوجیوں کی بیویاں اپنے شوہروں کو ہنسی خوشی رخصت کرتی ہیں۔'' بھیا نے انیلہ کو سمجھایا۔
''ضرور کرتی ہیں۔'' انیلہ نے اقرار کیا۔ ''مگر میرا دل کہتا ہے کہ ہم آج کے بعد کبھی نہیں مل پائیں گے۔''
بھیا نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''یوں نہ کہو انیلہ۔ انشاء اللہ ہم ضرور ملیں گے۔ آنے والی زندگی کا خیال رکھنا۔''
انیلہ اُمید سے تھی۔ بھیا رخصت ہو گئے۔ وہ آنسو پونچھتی رہ گئی۔
لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ مشرقی پاکستان کا نیا نام بنگلہ دیش رکھا جا چکا تھا۔ بھیا کا نام گم شدہ فوجیوں کی فہرست میں شامل تھا۔ انیلہ کی گود میں بھیا کی نشانی آچکی تھی۔ انیلہ نے اس کا نام بھیا کے نام پر ارسلان رکھ دیا۔ یہ ارسلان جونیئر تھا۔ ہم سب گھر والے اس کو جونیئر کے نام سے پکارنے لگے۔
جونیئر کی ذمہ داری امی نے سنبھال لی۔ انیلہ نے کالج میں دوبارہ داخلہ لے لیا۔ بی اے کیا پھر بی ایڈ کرلیا اور ایک اسکول میں پڑھانے لگی۔
اس اثناء میں میری شادی ہوگئی۔ میں بیاہ کے اسلام آباد آگئی۔ دو سال بعد امی بھی اس دنیا سے سدھار گئیں۔ میں نے انیلہ کو اسلام آباد بلالیا۔
بھیا سے جدائی کا غم انیلہ کو اندر ہی اندر کھائے جارہا تھا۔ وہ مجھ سے اکثر کہتی۔
''ساجی میں نے تیرے بھیا کو نظر لگادی۔ کاش کہ تیرا بھیا اتنا شاندار نہ ہوتا۔ اب میں اس کو کبھی نہیں دیکھ پاؤں گی۔'' میرے سمجھانے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا اس کی ایک ہی رٹ ہوتی۔ ''اب میں تیرے بھیا کو کبھی نہیں دیکھ پاؤں گی۔ اس کو میری نظر نے کھالیا۔'' وہ سسکیاں لینے لگتی۔ پھر اس کی بات سچ ہوگئی..... وہ بھیا سے ملے بغیر ان کو دیکھے بغیر ہم سب کو روتا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ جونیئر اکیلا رہ گیا تھا۔ میں اس کو اپنے گھر لے آئی۔

☆......☆

''نہ معلوم کون بدتمیز تھا مسلسل گھنٹی بجائے جارہا تھا۔ آرہی ہوں صبر کرو۔'' میں نے بیرونی دروازے کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔ باہر سے جونیئر کی آواز آئی۔ ''جلدی کریں.....جلدی سے دروازہ کھولیں۔''
میں نے دروازہ کھولا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ جونیئر کے ساتھ ساتھ بھیا بھی دروازے پر کھڑے تھے۔ حالانکہ وہ بہت دبلے ہو چکے تھے اور عجیب سے حلیے میں تھے بنگالیوں جیسے لباس میں۔ تہبند اور کرتے میں ملبوس مگر میں نے اپنے بھیا کو ایک ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ ''بھیا'' کہہ کر میں ان سے لپٹنے کو بڑھی تو انہوں نے مجھے خالی خالی نظروں سے گھورا اور بجائے مجھے گلے سے لگانے کے مجھ سے کترا کر دور ہٹ گئے۔ جونیئر نے مجھے آنکھوں آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بھیا کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہوگیا۔ بھیا کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد اس نے مجھے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا پھر وہ بھی میرے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوگیا۔
جونیئر نے مجھ سے سوال کیا۔ ''پھپھو کیا یہ ہی میرے بابا ہیں؟ آپ نے ان کو پہچان لیا۔''

"ہاں میری جان۔" میں نے جونیئر کو یقین دلایا۔

"یہی تمہارے بابا ہیں میں نے تو اپنے بھیا کو ایک سیکنڈ میں ہی پہچان لیا تھا مگر وہ مجھ سے دور کیوں ہوئے جارہے تھے؟"

"خدا معلوم کیا وجہ ہے کہ وہ کسی کو نہیں پہچانتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی نہیں۔ ان کو یہ بھی یاد نہیں ہے کہ ان کا نام کیا ہے۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ ہیں کون؟" جونیئر نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ پھر میرے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر التجا کی۔ "پھپھو خدا کے واسطے آپ بابا کو یاد دلانے کی کوشش کریں کہ وہ کون ہیں۔ یہ میری کیسی قسمت ہے کہ برسوں بعد میں نے پہلی بار اپنے باپ کو دیکھا اور اس حال میں کہ ان کی یادداشت بالکل ختم ہو چکی ہے۔"

"مگر بیٹا تم کو تمہارے بابا ملے کیسے۔" میں نے بے چینی سے معلوم کرنا چاہا۔

"یہ لمبی کہانی ہے بعد میں بتاؤں گا۔ آپ خدارا کوشش کیجیے کہ ان کی یادداشت کسی طرح واپس آجائے۔ ورنہ میں اپنا سر پھوڑ لوں گا۔ میں اس اذیت کو برداشت نہیں کرسکتا کہ میرا باپ میری آنکھوں کے سامنے ہے اور مجھے پہچانتا تک نہیں۔"

"خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے ہیں جونیئر۔ میں پوری کوشش کروں گی کہ بھیا کی یادداشت واپس آجائے۔"

میں نے تمام جتن کر ڈالے مگر بھیا کو کسی قسم کی کوئی بھی بات یاد نہ دلا سکی۔ اس ناکامی پر میں بھی اسی اذیت کا شکار ہوگئی جس کا شکار جونیئر ہو رہا تھا کہ میرا بھائی برسوں کے بعد مجھے ملا بھی تو اس حال میں کہ مجھے پہچانتا تک نہیں۔ میں روہانسی ہو کر صوفے پر گر گئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو زندگی میں کبھی اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے بے اختیار آنسوؤں سے رونا شروع کردیا۔ بھیا مجھے روتا دیکھ کر گھبرا گئے اور مجھے تسلی دینے کے لیے میری طرف بڑھے۔

بعض اوقات ایسے ڈرامائی حالات رونما ہو جاتے ہیں جن کی توجیح مشکل ہے۔ ہم اکثر ناول کہانیوں میں پڑھتے ہیں۔ فلموں، ڈراموں میں دیکھتے ہیں۔ ہوا یہ کہ مجھے روتے دیکھ کر بھیا اپنی جگہ سے اٹھے۔ "بی بی روتی کیوں ہو، کیا ہوگیا؟"

ان کی اس بات نے میرے غصے کو ہوا دے دی۔ جھلا کر میں نے انہیں نادانستگی میں دھکا دے دیا۔ وہ لڑکھڑا کر صوفے کے چوبی دستے پر گرے۔ صوفے کا دستہ ان کی کنپٹی سے ٹکرایا اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے پھر جب اٹھے تو جیسے ساری التجائیں، ساری دعائیں قبول ہوگئیں۔ میرے صوفے کے ساتھ رکھی ہوئی میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھیا نے پوچھا۔

"جمیلہ، یہ میری اور انیلہ کی شادی کی تصویر یہاں کیسے آگئی یہ تو میرے بیڈروم میں رکھی رہتی تھی۔"

ایک لمحہ میں بھیا کی یادداشت واپس آچکی تھی۔ میں صوفے سے اچھل کر کھڑی ہوگئی اور اپنا سر بھیا کے سینے سے لگا دیا۔ مگر فوراً ہی جیسے تمام خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ بھیا نے سوال کیا۔ "انیلہ کہاں ہے؟"

میں خاموش رہی۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ بھیا کو بتاتی کہ انیلہ کہاں ہے۔ میری خاموشی بھیا کو ناگوار گزری۔ انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔ "مجھے بتاؤ جمیلہ، انیلہ کہاں ہے؟ تم خاموش کیوں ہو؟"

میں نے جونیئر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھیا سے کہا۔ "بھیا یہ ارسلان جونیئر ہے۔ آپ کا اور انیلہ کا بیٹا۔"

بھیا سمجھ چکے تھے کہ میں ان کو کیا بتانا چاہ رہی تھی۔ ان کی آنکھوں کی چمک یکلخت غائب ہوگئی۔ انہوں نے اپنی اور انیلہ کی تصویر کو مخاطب کیا۔ "انیلہ اگر تم کو مجھ سے نہیں ملنا تھا تو میرے خوابوں میں آکر مجھے یہاں کیوں بلایا تھا۔ میں تو اپنی بھول کی دنیا میں جیسا بھی تھا گزارا کر رہا تھا۔ اس آگہی کی دنیا میں.... تمہارے بغیر میں کیسے جیوں گا۔"

بھیا کی اذیت اور کرب مجھ سے نہیں دیکھا جا رہا تھا۔ میں اپنے آنسو دوپٹے سے پونچھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

باہر آکر میں سوچنے لگی کہ بھیا کو ان کے دیرینہ، پریشان کن اور اذیت ناک سوال کا جواب مل تو چکا تھا۔ "میں کون ہوں؟" مگر کس قیمت پر؟ میں اپنی ان ہی سوچوں میں گم تھی۔ بھیا جونیئر کے ساتھ قبرستان جا چکے تھے اور میں ان کے سامان کی تلاشی لینے لگی جو پہلے بھی کئی بار لے چکی تھی کہ یہ پتا کرسکوں کہ وہ کیوں ہم لوگوں کو بھول گئے۔ لیکن اس بار کی تلاشی میں ایک اہم چیز ہاتھ آگئی۔ وہ ان کی ڈائری تھی جسے وہ ہر وقت ساتھ رکھتے تھے۔ اس میں درج مندرجات کو میں کہانی کی شکل میں بتا رہی ہوں پھر اپنی طرف سے ملاحظہ

☆......☆

میری شادی میری بہن جمیلہ کی دوست انیلہ سے ہو چکی تھی۔ ہماری شادی کے چند ماہ بعد ہی میری تعیناتی آرمی میڈیکل کور کے ساتھ ڈھاکا کے نواح میں کردی گئی تھی۔

مشرقی پاکستان کے حالات بہت زیادہ بگڑ چکے تھے۔
جب میں ڈھاکا جانے کے لیے گھر سے روانہ ہونے لگا تو انیلہ کی آنکھیں ... جل تھل تھیں۔ وہ میرے مشرقی پاکستان جانے سے بہت زیادہ دل برداشتہ تھی۔ خدا معلوم کیوں اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ اب ہم دونوں زندگی بھر دوبارہ نہیں مل پائیں گے۔
اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
مشرقی پاکستان کے حالات کا مشاہدہ کر کے میری ذہنی حالت دگرگوں تھی۔ بھارتیوں نے گاؤں گاؤں میں جال بُن دیا۔ وہی بنگالی مسلمان جنہوں نے 1905ء میں مسلم لیگ بنائی تھی۔ جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ وہی بنگالی مسلمان بھارتیوں کے سحر میں آ کر پاکستان سے بغاوت پر آمادہ تھے اور مسلمان مسلمان سے لڑ رہے تھے۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا۔ میں اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ پھر ہمہ وقت اس کے ساتھ ساتھ انیلہ کی روتی ہوئی آنکھیں میرا پیچھا کرتی تھیں۔ غم دوراں اور غم جاناں کے اس سنگم نے مجھے ذہنی طور پر بہت زیادہ پریشان کر رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں پچھلے پندرہ دن سے مستقل دن رات کام کر رہا تھا جس کی وجہ سے میں جسمانی طور پر بھی تھک رہا تھا۔ ان ساری باتوں کا تذکرہ میرے انچارج سے ہوا تو انہوں نے مجھے اپنے تھکے ہوئے ذہن کو آسودگی پہنچانے کا مشورہ دیا۔ کہنے لگے۔ ”تم دو دن کے لیے چٹاگانگ چلے جاؤ تم کو آرام کی ضرورت ہے۔ اگر تم خود مریض بن گئے تو جو واقعتاً مریض ہیں ان کی دیکھ بھال کون کرے گا۔“
شام میں ایک C-130 جہاز سامان لے کر چٹاگانگ جا رہا تھا۔ میں اس میں بیٹھ کر چٹاگانگ کے لیے روانہ ہو گیا۔ چٹاگانگ کی میس میں میری ملاقات میجر سلیم سے ہو گئی۔ انہوں نے مشورہ دیا۔ ”آپ چٹاگانگ ہل ٹریکٹ چلے جائیں بہت خوب صورت اور پُرفضا مقام ہے آپ کو پسند آئے گا۔ وہاں آپ رانگامائی کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہر سکتے ہیں۔“
اگلی صبح میں رانگامائی میں تھا۔ واقعی حسین جگہ تھی۔ میرا شام تک چٹاگانگ واپسی کا ارادہ تھا۔ میرے ساتھ سامان نہیں تھا میں ٹریکنگ کرنے جنگل کی طرف نکل گیا۔ غلطی یہ کی کہ کسی گائیڈ وغیرہ کو اپنے ساتھ نہیں لیا۔ چلتے چلتے دور نکل گیا واپسی کے لیے مڑا تو راستہ بھول چکا تھا۔ ایک پگڈنڈی پر مڑا تو سامنے کچھ فاصلہ پر دو نوجوان دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھ میں بندوقیں تھیں۔ انہوں نے میرے اوپر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ میں نے دوڑ کر درختوں کی آڑ لینی چاہی مگر اس سے پہلے کہ میں درختوں کے جھنڈ تک پہنچتا ایک گولی میرے سر کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ دوسری میرے ہاتھ میں لگی۔ میں چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔
آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو ایک اجنبی کمرے میں بستر پر لیٹے ہوئے پایا۔ آس پاس کچھ لوگ کھڑے تھے۔ اٹھنا چاہا تو اٹھ نہ سکا۔ سر میں اور بائیں ہاتھ میں شدید درد محسوس ہوا۔ آواز آئی۔
”آپ آرام سے لیٹے رہیے۔ اٹھنے کی کوشش نہ کیجیے۔“ یہ ڈاکٹر صاحب کی آواز تھی۔ ”میرا نام ڈاکٹر اختر ہے۔ آپ کو کچھ لوگ رانگامائی سے لا کر یہاں چھوڑ گئے تھے۔ آپ کے سر اور ہاتھ میں گولیاں لگی تھیں۔ جس کے لیے آپ کا آپریشن کرنا پڑا۔ اب آپ ٹھیک ہیں۔“
پھر ڈاکٹر اختر نے زخموں کی تفصیل بتائی۔ ”آپ کے سر میں گولی لگنے سے کوئی زیادہ چوٹ نہیں آئی اس لیے کہ گولی صرف کھوپڑی چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔ ہاں شاید گرنے کی وجہ سے ایک چھوٹا سا نوک دار لکڑی کا ٹکڑا زخم میں پیوست ہو گیا تھا جو ہم نے آسانی سے نکال دیا۔ آپ خوش قسمت ہیں۔ اگر کوئی بڑا زخم ہوتا تو ہمارے پاس کوئی نیورو سرجن نہیں ہے جو آپ کا آپریشن کر سکتا۔ البتہ ہاتھ میں پلاسٹر کرنا پڑا۔“
زخموں کی تفصیل بتانے کے بعد ڈاکٹر اختر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”ہم کو آپ کی جیبوں وغیرہ سے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے آپ کی شناخت ہو سکے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کون ہیں۔“ ڈاکٹر اختر کا لب و لہجہ مشرقی پاکستان کے اردو دانوں جیسا تھا جسے ہم بہاری کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ میں نے اپنے ذہن پر بہت زور ڈالا مگر مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں کون ہوں۔ میرا نام کیا ہے۔ میں کہاں رہتا ہوں۔ کیا کرتا ہوں۔ میں نے لاچارگی سے ڈاکٹر اختر کی طرف دیکھا۔ ”ڈاکٹر صاحب مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں کون ہوں۔“
”کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر اختر نے شفقت سے کہا۔ ”یاد آ جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ میرے برابر والے مریض کے بستر پر جو نوجوان بیٹھا تھا۔ دوڑ کر میرے بستر کی طرف آیا اور ڈاکٹر اختر کا راستہ

روک لیا۔ ''ہم آپ کو بتاتا ہے یہ کون ہے۔ یہ پونزابی (پنجابی) ہے۔ امار سونار بنگلہ لوٹنا کا واسطہ آیا ہے۔'' وہ بپھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اختر نے اس کو ہاتھ سے واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ واپس چلا تو گیا مگر اس کی آنکھوں میں نفرت اور غصہ تھا۔ میں تھک چکا تھا۔ میں نے نقاہت سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

اسپتال میں میرا نام پونزابی پڑ چکا تھا۔ ہر کوئی مجھے پونزابی پکارنے لگا۔

اس نے مجھے ہولے سے آواز دے کر جگایا۔ ''آپ کی دوا کا وقت ہوگیا ہے۔''

''کون سی دوا ہے؟'' میں نے نرس سے پوچھا۔ اس نے مجھے دوا کا نام بتایا۔ حیرت کی بات تھی کہ میرے دماغ میں اس دوا کے بارے میں ساری معلومات تھیں۔ اس کے مرکبات کیا تھے۔ کس مرض کے لیے دی جاتی تھی۔ کس مقدار میں دی جاتی تھی۔ اس کے منفی اثرات کیا تھے۔ میں نے نرس سے درخواست کی کہ وہ مجھے میری تمام دواؤں کا چارٹ دے دے میں اس کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان تمام دواؤں کی تمام تفصیلات بھی میرے ذہن میں موجود تھیں۔ عجیب بات تھی کہ باقی ہر چیز میرے ذہن سے محو ہو چکی تھی سوائے دواؤں کی تفصیلات کے۔ اس کا ذکر میں نے ڈاکٹر اختر سے کیا۔ انہوں نے کہا۔ ''میرے خیال سے آپ کا تعلق کسی ایسے پیشے سے ہے جس میں دواؤں سے ہر روز پالا پڑتا ہے۔ ہوسکتا ہے آپ ڈاکٹر ہوں یا کسی ادویات کی کمپنی میں کام کرتے ہوں۔ کسی کیمسٹ کی دکان پر کام کرتے ہوں۔'' میں نے اپنے ذہن پر بہت زور دیا مگر مجھے کچھ یاد نہیں آرہا تھا کہ میرا تعلق کس پیشے سے تھا۔

مجھے اسپتال میں داخل ہوئے چار پانچ دن ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر اختر مجھے ڈسچارج کرنا چاہتے تھے۔ ''آپ کے ڈسچارج کرنے کا وقت آگیا ہے۔ یہاں سے فارغ ہوکر آپ کہاں جائیں گے؟'' جبکہ ابھی آپ کو مزید دو ہفتہ بستر پر آرام کی ضرورت ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گا۔''

وہ فکرمند ہوگئے۔ کہنے لگے۔ ''جو لوگ آپ کو یہاں چھوڑ گئے تھے میں ان سے رابطہ کرکے آپ کو بتاتا ہوں۔''

اگلے روز ڈاکٹر اختر راؤنڈ پر آئے تو ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے۔ لنگی کرتہ پہنے ہوئے۔ گلے میں تعویذ، پیر میں چپل، ڈاکٹر اختر نے تعارف کروایا۔''

''یہ عبدالجلیل صاحب ہیں یہ اور ان کے دوسرے ساتھی آپ کو یہاں چھوڑ گئے تھے۔ اب یہ آپ کو اپنے ساتھ رانگاماٹی لے جانے آئے ہیں۔''

عبدالجلیل صاحب نے اقرار میں سر ہلایا۔ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ چلنے سے پہلے عبدالجلیل صاحب نے کرتہ کی جیب سے ایک پرس نکال کر میرے حوالے کیا۔ ''یہ آپ کا بٹوا ہے۔'' جب ہم لوگ آپ کو اسپتال لا رہے تھے تو میں نے یہ بٹوا آپ کی جیب سے نکال کر اپنے پاس رکھ لیا تھا کیونکہ اس میں خاصی بڑی رقم موجود تھی۔ آپ بے ہوش تھے۔ اسپتال میں کام کرنے والوں کا کوئی بھروسا نہیں۔ میری ذمہ داری ختم ہوئی کہ آپ کی امانت آپ تک پہنچ گئی۔'' وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بنگلہ لب ولہجہ میں بول رہے تھے۔

میں نے ان کے ہاتھ سے اپنا پرس لے کر اس میں سے تمام چیزیں باہر نکال کر بستر پر پھیلا دیں۔ مجھے پیسوں کی اتنی پروا نہیں تھی۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ اس میں سے کوئی ایسی چیز دستیاب ہو جائے جو میری شناخت مجھے بتا سکے۔ مایوسی ہوئی کوئی کارآمد چیز ہاتھ نہیں آئی۔ میں عبدالجلیل صاحب کے ساتھ رانگاماٹی پہنچ گیا۔ چھوٹا سا گھر تھا جس میں عبدالجلیل صاحب اپنی نوجوان بیٹی عائشہ کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک چھوٹا سا کمرا میرے لیے پہلے سے ہی تیار کردیا گیا تھا۔ میری تمام تر دیکھ بھال عائشہ نے اپنے ذمہ لے لی۔ وہ مجھے بابوجی کہہ کر پکارتی تھی۔ عائشہ نے ہر طرح سے میری دیکھ بھال کی۔ دوا دارو کھانا پینا۔ بستر ٹھیک کرنا کپڑے دھونا وغیرہ وغیرہ۔ دو ہفتے بعد مجھے ڈاکٹر اختر سے معائنہ کروانے چٹاگانگ جانا تھا۔

معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر اختر نے مجھے دو عدد خوش خبریاں سنائیں۔ ایک تو یہ کہ اب میں مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا تھا اور دوسرے یہ کہ وہ میرے لیے اسپتال کی ڈسپنسری میں نوکری کا بندوبست کرسکتے ہیں۔ اگر میں وہاں کام کرنا چاہوں۔ دواؤں پر میری دسترس میرے کام آگئی تھی۔ میں نے ان کی پیشکش قبول کرلی۔ رانگاماٹی سے چٹاگانگ منتقل ہوگیا۔ ڈاکٹر اختر سے میری دوستی بڑھنے لگی۔ پھر بھی چٹاگانگ میں میرا دل نہیں لگا۔ میں رانگاماٹی واپس آکر وہاں کے اسکول میں پڑھانے لگا۔ رہائش کے لیے عبدالجلیل صاحب کا کمرا موجود تھا۔ عائشہ نے ایک دفعہ پھر میری تمام تر ضروریات کا خیال رکھنا اپنے اوپر فرض کرلیا گو

کہ میں اس کو بہت منع کرتا رہا لیکن اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔ ''بابو جی آپ کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔''

میری خدمت کرنا کیسے اس کا فرض بن چکا تھا۔ یہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں تو اس کے اور عبدالجلیل صاحب کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اسی دوران ایک اور بات ہوگئی۔ یہ بہت بڑی تھی لیکن میں نے مطلق اثر نہیں لیا۔ ہوا یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کا نام ختم کرکے بنگلہ دیش کے نام سے نیا ملک بن گیا۔

عبدالجلیل صاحب کا کریانہ اسٹور تھا جس کو وہ خود چلایا کرتے تھے۔ ان کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ اسٹور پر بیٹھنے کے قابل نہ رہے۔ میں نے اسکول کی نوکری چھوڑ دی۔ عبدالجلیل صاحب کا اسٹور سنبھالنے لگا۔ انہوں نے مجھے بہت روکنا چاہا لیکن یہ میرے لیے ایک نادر موقع تھا کہ میں ان کے احسانوں کا کچھ تھوڑا بہت بدلا تو اتار سکوں۔

ایک رات میں اسٹور بند کرنے کے بعد گھر آیا تو عبدالجلیل صاحب کی طبیعت اور زیادہ بگڑ چکی تھی۔ وہ بستر پر لیٹے ہوئے گہری سوچوں میں غرق تھے۔ میرے پوچھنے پر کہنے لگے۔ ''میں اب چند دن کا مہمان ہوں۔ مجھے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ میری بن ماں کی بچی عائشہ کا کیا ہوگا۔ کاش وہ میری آنکھوں کے سامنے ہی اپنے گھر کی ہو جاتی۔ مگر ابھی تو اس کی شادی کی بات بھی نہیں چل رہی ہے۔'' عبدالجلیل صاحب بہت زیادہ فکرمند تھے۔

تھوڑی دیر بعد عائشہ کھانا لے آئی۔ کھانا کھانے کے بعد میں سونے کے ارادے سے چارپائی پر لیٹ گیا مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ عبدالجلیل صاحب کی فکرمندی میرے خیالوں میں گردش کر رہی تھی۔ ''میری بن ماں کی بچی عائشہ کا کیا ہوگا۔'' پھر میں نے ایک فیصلہ کیا اور فیصلہ کرنے کے بعد سو گیا۔ صبح میں نے عبدالجلیل صاحب کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں عائشہ کا ہاتھ تھامنے کے لیے تیار ہوں۔'' عبدالجلیل صاحب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکنے لگے۔ اگلے جمعہ کے دن ہمارا نکاح ہوگیا۔ عائشہ اپنے کمرے سے رخصت ہوکر میرے کمرے میں آگئی۔

ہماری شادی کے چند ہفتے بعد عبدالجلیل صاحب اس دارفانی سے کوچ کرگئے۔

عائشہ سے شادی کے بعد میری بے کیف زندگی میں تبدیلی آنے لگی تھی۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں نے سر ابھارنا شروع کردیا تھا۔ ''بابو جی کی خدمت'' اب عائشہ نے اپنے اوپر اور زیادہ فرض کرلیا تھا۔ مجموعی طور پر ہماری زندگی خوشگوار گزر رہی تھی۔ بس ایک خلش مجھے تنگ کیے رکھتی تھی۔ ''میں کون ہوں۔'' میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

عائشہ بہت سگھڑ لڑکی تھی۔ ہماری کم آمدنی کے باوجود ہمارا گزارہ آسانی کے ساتھ ہو جاتا تھا۔ عائشہ کی ایک خاص عادت تھی وہ مچھلی کبھی بازار سے خرید کر نہیں لاتی تھی۔ ہمیشہ خود دریا سے پکڑ کر لاتی اور اس کو پکاتی تھی۔ پھر بنگال کے ہر باسی کی طرح اس کی مرغوب غذا بھی ماچھ بھات تھی۔ یعنی مچھلی چاول میں بھی مچھلی شوق سے کھاتا تھا۔

دن گزرتے گئے۔ ہماری شادی کو سات آٹھ سال ہو چکے تھے مگر ہم ابھی تک بے اولاد تھے۔ مجھے اس کی وجہ سے کوئی خاص پریشانی نہیں تھی لیکن عائشہ بہت زیادہ فکرمند رہتی تھی۔ ایک دن کہنے لگی۔ ''بابو جی ہماری کوئی اولاد نہیں ہے۔ آپ دوسری شادی کرلیجیے۔''

میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ یہ کیسی عورت ہے جو ہنسی خوشی اپنے اوپر سوتن لانا چاہتی ہے۔ کوئی بھی عورت سوتن کو برداشت نہیں کرسکتی لیکن کیا کرتا کہ بنگالی معاشرے میں دو تین شادیاں کرنا ایک عام سی بات ہے۔

''نہیں میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔ میں تمہارے ساتھ خوش ہوں۔''

''بابو جی پھر آپ کا نام کیسے چلے گا۔'' عائشہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

یہ بھی ایک عجیب قسم کا خدشہ تھا۔ جس آدمی کو یہ ہی نہ معلوم ہو کہ وہ کون ہے اس کا اصل نام کیا ہے اس کو کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کا نام چلے یا نہ چلے۔ میں نے عائشہ کو سختی سے منع کردیا۔

''آئندہ دوسری شادی کا نام بھی مت لینا۔ میں دوسری شادی کبھی نہیں کروں گا۔'' میرے لہجے نے اس کو سہما دیا۔ میں نے اس سے معافی مانگ لی۔

وقت کا دھارا بہتا رہا۔ چند سال اور گزر گئے پھر میری طبیعت میں ایکدم سے بے چینی آگئی۔ میں ہر وقت بے کل سا رہنے لگا۔ عجیب عجیب طرح کے خواب دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر اختر سے رجوع کیا تو کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔ میں نے اس کیفیت کو قبول کرلیا پھر ایک بڑا حادثہ ہوگیا۔ عائشہ حسب معمول دریا پر مچھلیاں پکڑنے گئی تھی اس کا پیر پھسلا وہ دریا میں گرگئی۔ موجوں کا ریلا اس کو بہا کر لے گیا۔ دو دن

بعد اس کی لاش پانی پر تیرتی ہوئی پائی گئی۔ میری زندگی میں اندھیروں نے ایک دفعہ پھر سے بسیرا ڈال دیا۔ بے چینی مزید بڑھ گئی۔ خواب اور پریشان کن ہو گئے۔ ایک خواب کو میں نے بار بار دیکھا۔ میں دیکھتا تھا کہ میں ایک قبرستان سے گزر رہا ہوں۔ چند ایک قبروں کے بعد ایک قبر آتی ہے جس کے پاس ایک لڑکا کھڑا ہوا فاتحہ پڑھ رہا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اس قبرستان کو دیکھ چکا ہوں مگر یادداشت پر بہت زور لگانے کے باوجود مجھے یاد نہ آسکا کہ یہ کون سا قبرستان تھا کس جگہ تھا۔ میں نے ایک دفعہ پھر ڈاکٹر اختر سے رجوع کیا مگر ان کے پاس کوئی خاطر خواہ جواب نہیں تھا۔ ڈاکٹر اختر نے کہا۔ ''آپ ایک بڑے حادثے سے گزرے ہیں۔ اپنا اسٹور چند دن کے لیے بند کر دیجیے اور ایک ہفتہ میرے پاس چٹاگانگ آکر رہیے۔ آپ کو ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔'' میں نے یہ پیشکش قبول کر لی۔

ایک شام میں ڈاکٹر اختر کے گھر ان کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ ٹی وی پر خبریں آرہی تھیں۔ پاکستان کے کسی وزیر وغیرہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ ان کی تدفین کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر تقریباً چلاتے ہوئے ڈاکٹر اختر کو مخاطب کیا۔ ''ڈاکٹر صاحب یہ وہی قبرستان ہے جس کو میں اپنے خواب میں دیکھتا ہوں۔''

''آپ کو مغالطہ ہو رہا ہے۔'' ڈاکٹر اختر نے کہا۔ ''یہ پاکستان کے اسلام آباد کا منظر دکھا رہے ہیں۔''

''مجھے پکا یقین ہے کہ یہ وہی قبرستان ہے۔ میں وہاں ضرور جاؤں گا اور معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔''

''آپ کی مرضی۔'' ڈاکٹر اختر نے مختصر سا جواب دیا۔ پھر سوچ کر کہنے لگے۔ ''نہ آپ کی شناخت ہے نہ آپ کا اصل نام آپ کو معلوم ہے اور نہ ہی آپ کے پاس کوئی پاسپورٹ ہے آپ جائیں گے کیسے؟''

''اس کا حل آپ نکالیں۔'' میں نے کہا۔

اس مسئلے کا حل بھی ڈاکٹر اختر نے نکالا۔ پیسا دنیا میں ہر جگہ وہ کام کر دکھاتا ہے جو عام طور سے ناممکن ہو سکتا ہے۔ میری نئی شناخت پر نیا پاسپورٹ بن چکا تھا۔

چکلالہ ائرپورٹ دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ اتنے بڑے دارالخلافہ کا اتنا معمولی سا ائرپورٹ لیکن میں یہاں ائرپورٹ کا جائزہ لینے نہیں آیا تھا۔ امیگریشن سے فارغ ہو کر میں نے ٹرمینل کی عمارت سے باہر آکر ٹیکسی پکڑی اور اسلام آباد کے قبرستان کے لیے روانہ ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں صرف ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔

قبرستان پہنچ کر میرا سانس رکنے لگا۔ یہ ہو بہو وہی جگہ تھی جس کو میں کئی دفعہ اپنے خواب میں دیکھ چکا تھا۔ میرے ذہن میں صرف ایک سوال تھا۔ ''کیا یہاں پر واقعی وہ قبر بھی موجود ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔'' قبرستان میں کئی چکر لگانے کے بعد مجھے میرا جواب مل گیا۔ وہی قبر نظر آگئی اس قبر کے سامنے ایک نوجوان فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ جب وہ فاتحہ پڑھ چکا تو میں نے اس کو مخاطب کیا۔

''یہ قبر کس کی ہے؟''

''یہ میری ماں کی قبر ہے مگر آپ ہیں کون؟''

پھر وہی سوال۔ ''میں کون ہوں؟'' اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں کون ہوں تو میں اس طرح در در کی ٹھوکریں کیوں کھاتا پھرتا۔

''بیٹا نہ تم میرا مذاق اڑانا اور نہ ہی مجھ کو جھوٹا سمجھنا مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ میں کون ہوں۔'' پھر مجھے جو کچھ اپنے بارے میں یاد تھا وہ سب میں نے اس کو بتا دیا اور یہ بات خاص طور سے جتا دی کہ میں اس قبر کو اپنے خواب میں بار ہا دیکھ چکا ہوں۔ وہ لڑکا کچھ فکر مند سا دکھائی دیا پھر پوچھنے لگا۔

''آپ کا نام ارسلان تو نہیں ہے۔''

''اگر ہے بھی تو مجھے نہیں معلوم۔ میں اپنی یادداشت مکمل طور پر کھو چکا ہوں۔''

''آپ میرے ساتھ ایک جگہ چلیے مجھے یقین ہے کہ وہاں پہنچ کر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کون ہیں۔''

''بیٹا اگر ایسا ہو جائے تو میرے اوپر تمہارا یہ ایک بہت بڑا احسان ہوگا۔'' میں نے کہا۔

جواب ملا۔ ''میں جو کچھ سوچ رہا ہوں اگر وہ سچ ہوا تو یہ احسان آپ پر نہیں بلکہ میری ذات پر ہوگا۔ یا ہو سکتا ہے کہ یہ مشترکہ احسان ہو۔''

اس لڑکے کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی مگر میں اس کے ساتھ کہیں بھی جانے کے لیے تیار تھا۔

''ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں۔'' میں نے معلوم کرنا چاہا۔

''ایک خاص جگہ۔''

وہ خاص جگہ کون سی تھی قارئین سمجھ گئے ہوں گے۔

ٹھکانا

جناب ایڈیٹر سرگزشت
سلامتی
مجھے بچپن سے پڑھنے کا شوق ہے لیکن لکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ پہلی بار اپنی ہی سرگزشت لکھ رہی ہوں۔ مجھے تو اپنی آپ بیتی بہت دردناک لگ رہی ہے، پتا نہیں آپ کو سرگزشت کے معیار کی لگتی ہے یا نہیں۔ میرے شوہر فیکٹری میں لگی آگ میں جل مرے لیکن میں نے ہمت نہ ہاری، پھر بھی لوگوں کو رحم نہ آیا اور کس طرح سر چھپانے کا ٹھکانا دینے کے نام پر مجھے ٹھگا گیا۔ آپ بھی ملاحظہ کریں۔ لیکن اللہ مسبب الاسباب ہے وہ راہ پیدا کر ہی دیتا ہے۔
ہما جوہر
(کراچی)

عورت کا شوہر اگر اس کے سر کا سائبان ہوتا ہے تو اس کا اپنا گھر اس کی زمین ہوتی ہے۔ اگر عورت سے یہ زمین چھن جائے تو اس کے پیروں تلے خلا رہ جاتا ہے اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میرا گھر مجھ سے چھن گیا۔ میں نے ہوش سنبھالا تو خود کو دو بہنوں اور ماں باپ کے درمیان پایا۔ اس وقت مجھے احساس نہیں تھا کہ ہمارا گھر کچا ہے اور کبھی کبھی ہمارے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہوتا تھا اس کے باوجود اس گھر میں سکون اور تحفظ کا احساس

تھا۔ یہاں ہم بہت خوش تھے۔ کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ ہمارے ماں باپ ہمارے لیے جیتے تھے اور ان کی جدوجہد کا مرکز ہم تھے۔ بابا راج مستری تھے۔ کبھی کسی ٹھیکیدار کے ساتھ لگ گئے اور کبھی اپنا کام ملا تو وہ کرنے لگے۔ لگی بندھی روزی نہیں تھی۔ کسی مہینے تو ہم ہفتے میں دو تین بار بھی گوشت کھاتے تھے اور کبھی پورے مہینے میں ایک بار ہی گوشت نصیب ہوتا تھا۔ کسی مہینے اتنا ملتا کہ ہم بہنوں کی صحت نکھر جاتی تھی اور کسی مہینے اتنے فاقے کرنے پڑتے کہ ہماری پسلیاں نکل آتیں۔

اسی سرد و گرم میں میں اس عمر کو پہنچی جب بچے اسکول جاتے ہیں مگر بابا کی اتنی استعداد نہیں تھی کہ ساری بچیوں کو پڑھاتے۔ اس وقت میری دو بڑی بہنیں جیسے تیسے ایک ٹرسٹ اسکول میں پڑھ رہی تھیں۔ اس اسکول کو ایک ٹرسٹ چلاتا تھا مگر اس کے وسائل محدود تھے اس لیے یہاں زیادہ بچیوں کو داخلہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ میری دوسری بہن کو بھی داخلہ نہیں مل رہا تھا۔ مگر سیما باجی کے مقابلے میں نائمہ باجی کو پڑھنے کا زیادہ شوق تھا۔ اس نے اتنا رونا دھونا کیا کہ بابا نے اسکول والوں سے بات کی اور کچھ فیس کے ساتھ اسے اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس کے بعد میری گنجائش نہیں تھی۔ حالانکہ مجھے بھی پڑھنے کا شوق تھا۔ مگر جب بابا کی مالی حالت محسوس کرتی تو اپنا شوق دل میں دبا کر رہ جاتی تھی۔ البتہ میں نے یہ کیا کہ نائمہ باجی جو اسکول سے پڑھ کر آتی وہ اس سے پوچھتی اور اس کی کتابوں سے دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کرتی۔

میری دلچسپی دیکھتے ہوئے نائمہ باجی نے مجھے باقاعدہ پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ جو سیکھتی مجھے بھی بتاتی اور کاپی پر جو کام کرتی وہ مجھے سلیٹ پر کرنا سکھاتی۔ بارہ سال کی عمر تک میں اسکول نہیں گئی مگر اتنا پڑھ لیا کہ جب مجھے اسکول میں داخل کرانے کے لیے لے گئے تو چھٹی میں داخلہ ملا تھا۔ اسکول جانے کا یوں ہوا کہ سیما باجی نے اسی اسکول سے میٹرک کر لیا تھا اور اب اس کا آگے پڑھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ نائمہ باجی نائن میں تھی اور اس نے ابھی سے اپنے آگے پڑھنے کے لیے ٹیوشن پڑھا کر پیسے جمع کرنا شروع کر دیئے تھے۔ وہ اسکول کے بعد کالج میں پڑھنا چاہتی تھی اور میرا تو ابھی ذہن ہی نہیں تھا۔ کیونکہ اسکول جانے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی۔ جب اسکول میں داخلہ ملا تو میں خوشی سے پاگل ہو گئی۔ جس دن صبح اسکول جانا تھا اس ساری رات جاگتی رہی اور سوچتی رہی کہ کل صبح نیا یونیفارم پہن کر اور بستہ لے کر اسکول جاؤں گی۔

یہ عام سا اسکول تھا اور یہاں سارا زور پڑھائی پر ہوتا تھا۔ والدین کی کھال کھینچنے والے چکر یہاں نہیں تھے کیونکہ سارے ہی بچے بہت غریب گھرانوں سے تھے۔ وہ تو فیس اور دوسرے اخراجات بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ زیادہ تر ٹیچر رضا کار تھے اور نوجوان تھے۔ اس لیے بھی شاید وہ بچوں کو بہت محنت سے پڑھاتے تھے۔ اسکول آنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ گھر میں پڑھنے اور اسکول میں پڑھنے میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ انسان جو اسکول میں سیکھتا ہے وہ کہیں اور نہیں سیکھ سکتا چاہے اسے دنیا جہان کی کتابیں، سہولتیں اور استاد مہیا کر دیئے جائیں۔ میں سچ کہتی ہوں کہ میں نے یہاں سے بہت زیادہ سیکھا۔ اسکول میں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی جہاں بچوں کے ساتھ ساتھ کچھ بڑوں کی کتابیں بھی تھیں اور میں نے دو سال میں وہ ساری کی ساری پڑھ ڈالی تھیں۔ اردو تو مجھے اسکول جانے سے پہلے آ گئی تھی مگر مطالعے کا شوق نہیں تھا۔

یہ شوق اسکول میں پروان چڑھا اور آدھی چھٹی میں میں کوئی کتاب یا رسالہ لے کر ایک گوشے میں جا بیٹھتی تھی۔ ہمیں معمولی سا جیب خرچ ملتا تھا۔ جب مطالعے کا شوق ہوا تو میں سارے مہینے پیسے جمع کرتی اور جب اماں مہینے کا سودا لینے بازار جاتی تو میں بھی اس کے ساتھ چلی جاتی اور اپنی جمع پونجی سے کتابیں اور رسالے لے آتی تھی۔ خوش قسمتی سے اماں اور بابا مطالعے کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے ہم بہنوں کو اپنی مرضی کی چیزیں پڑھنے کی اجازت دی ہوئی تھی بلکہ بابا تو حسب توفیق ہمیں رسالے بھی لا کر دیتے تھے۔ انہیں کہیں سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی دکانوں یا کسی کباڑیئے کے پاس سستی کتابیں اور رسالے مل جاتے تو وہ ہمارے لیے لے آتے تھے۔ میں نے بعد میں بہت اچھے اور بہ ظاہر پڑھے لکھے نظر آنے والے گھروں میں دیکھا کہ وہ اپنے بچوں کو ٹی وی کیبل، انٹرنیٹ اور موبائل شوق سے دیتے ہیں مگر جہاں ان کے ہاتھ میں نصاب سے ہٹ کر کوئی کتاب یا رسالہ نظر آیا تو انہیں بچوں کا مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے۔ یعنی پابندی ہوتی ہے تو صرف پڑھنے پر۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آنے والی نسل میں مطالعے کا رجحان نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔

جب میں نائن کلاس میں آئی تو نائمہ باجی نے میٹرک

کر کے ایک کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ میٹرک میں اس کا گریڈ بہت اچھا آیا تھا اور اسے ایک اچھے کالج میں داخلہ ملا تھا مگر سرکاری کالج کے باوجود اس کے خرچے خاصے تھے اور وہ ٹیوشن سے اپنے خرچے پورے نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم جس محلے میں رہتے تھے یہاں سارے ہی غریب آباد تھے۔ وہ اپنے بچوں کو اسکول میں نہیں پڑھا سکتے تھے انہیں ٹیوشن کہاں سے کراتے۔ نائمہ باجی کو چند ایک ہی ٹیوشن ملتی تھیں اور اس کی فیس بھی بہت کم تھی جو بعض اوقات تو ملتی بھی نہیں تھی۔ اس سے نائمہ باجی کے تعلیمی اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے اور بابا تو بس گھر ہی چلا رہے تھے یہی بڑی بات تھی کیونکہ ان کی صحت بھی اچھی نہیں رہی تھی۔ نائمہ باجی مایوس تھی اور لگ رہا تھا کہ اسے تعلیم چھوڑنی پڑے گی۔

مگر ایسے میں سیما باجی نے ہمت کی اور ایک نزدیکی گارمنٹ فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ پہلے اس نے سلائی کا دو ہفتے کا کورس کیا اور اس میں کامیابی کے بعد اسے فیکٹری میں جاب مل گئی۔ اس کی تنخواہ سے گھر کا کچھ حساب بہتر ہوا اور ہمارے تعلیمی اخراجات بھی پورے ہونے لگے۔ بابا پر بوجھ کم ہوا تھا۔ اماں نے اس میں سے سیما باجی کی شادی کے لیے کچھ بچانے کی کوشش کی مگر سیما باجی نے منع کر دیا۔ ”اماں ابھی اسے ضرورت پر خرچ کرو بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“

اس وقت سیما باجی بیس سال کی تھی اور اب تک کوئی مناسب رشتہ نہ آنے کی وجہ سے گھر میں بیٹھی تھی۔ مگر جب اس نے جاب شروع کی تو ایک سال بعد ہی اس کا رشتہ آ گیا۔ عتیق بھائی فیکٹری میں ہی کٹنگ ماسٹر تھے۔ انہوں نے سیما باجی کو پسند کیا اور رشتے کے لیے اپنے گھر والوں کو بھیج دیا۔ عتیق بھائی نہ صرف صورت شکل کے اچھے تھے۔ بلکہ ان کا گھر بھی مالی لحاظ سے ہم سے بہتر تھا۔ اس لیے خوشی سے یہ رشتہ قبول کر لیا گیا۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ سادگی سے شادی کرنے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ تو چاہیے ہوتا ہے۔ کیونکہ عتیق بھائی نے باجی سے جاب جاری رکھنے کو کہا تھا اس لیے اس نے فیکٹری سے کچھ رقم ادھار لے لی جو تنخواہ میں کٹتی اور کچھ بابا نے اپنے ٹھیکیدار سے ادھار لی۔ میں میٹرک میں تھی جب سیما باجی کی شادی ہو گئی اور وہ بیاہ کر اپنے گھر چلی گئی۔

اس کے جانے سے اس سے آنے والی تنخواہ بند ہو گئی۔ ظاہر ہے اب وہ اپنے شوہر کے اختیار میں تھی اور پہلے کی طرح اماں کو تنخواہ نہیں دے سکتی تھی مگر پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ اماں کو دیتی رہتی تھی اور اس سے جیسے تیسے ہمارا گزارہ چلتا رہا۔ چند مہینے بعد میں نے میٹرک کے پیپرز دیئے اور سیما باجی کی فیکٹری میں کام کرنے لگی۔ اس نے بات پہلے ہی کر لی تھی۔ دو ہفتے کی ٹریننگ کے بعد مجھے سلائی کے سیکشن میں بھیج دیا گیا۔ یوں سیما باجی کی تنخواہ کی کمی سے گھر میں جو مشکل آئی تھی اس کا ازالہ ہو گیا۔ نائمہ باجی نے انٹر میں اتنے اچھے نمبر لیے تھے کہ اسے ایک یونیورسٹی میں اسکالر شپ کے ساتھ آنرز میں داخلہ مل گیا۔ اب نائمہ باجی صبح یونیورسٹی جاتی تھی اور شام کے وقت اس نے ایک اچھے کوچنگ سینٹر میں جاب کر لی۔ وہ اپنے اخراجات وہاں سے پورے کرنے لگی اور اسے اماں یا بابا سے پیسے لینے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

میں کیونکہ کام کر رہی تھی اس لیے پڑھائی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے سوچا تھا تو پرائیویٹ پڑھ لوں مگر جب شام کو تھکی ہاری گھر آتی تو کچھ کرنے کی ہمت نہیں رہتی تھی۔ اس لیے ارادے کے باوجود نہ پڑھ سکی۔ پھر ایسا ہوا کہ بابا کی بیماری بڑھ گئی۔ انہیں سانس کا مرض ہو گیا تھا اور اس کے لیے راج مستری کا کام کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ ہفتے میں دو تین دن کام پر جاتا تھا۔ اس سے گزارہ کیسے ہوتا اور پھر رفتہ رفتہ اسے کام ملنا بند ہو گیا۔ یوں بابا مستقل گھر بیٹھ گیا۔ اب گھر میری تنخواہ سے چلنے لگا اور تھوڑا بہت نائمہ کر دیتی تھی۔ سیما باجی کا بیٹا ہوا تو وہ بہت دن تک فیکٹری نہیں جا سکی تھی۔ اس کی تنخواہ کٹی اور دوسرے اخراجات بہت زیادہ ہوئے تھے اس لیے وہ جو اماں کو دیتی تھی نہ دے سکی۔ مشکل دور ایک بار پھر پلٹ آیا تھا۔ نائمہ باجی کا ارادہ ماسٹر کر کے جاب کرنے کا تھا۔ اس نے ماس کمیونیکیشن لی تھی۔ مگر ابھی اسے ماسٹر کرنے میں بھی دو سال تھے۔ اس کے بعد ہی اسے کہیں جاب ملتی۔

میں تنخواہ پر کام کرتی تھی اس لیے آمدنی طے شدہ تھی۔ اگر معاوضہ فی پیس ہوتا تو میں کوشش کر کے زیادہ کما سکتی تھی۔ مجھے سلائی مکمل نہیں آتی تھی کہ گھر میں کپڑے سیتی۔ میں نے کوشش کر کے سیکھنا شروع کر دیا اور چند مہینوں بعد ہاتھ اتنا صاف ہو گیا کہ سادہ سوٹ سی سکتی تھی۔ محلے سے مجھے کام ملنے لگا۔ مگر بات وہی تھی کہ یہاں سارے ہی غریب رہتے تھے اور ان کی جیب اس عیاشی کی اجازت کم دیتی تھی۔ مجھے ہفتے میں ایک دو سوٹ سلنے کو مل جاتے تھے۔

کچھ پرانے کپڑے ٹھیک کرنے کا کام آجاتا۔ اس سے اتنا ہوا کہ گزارہ ہونے لگا۔ نائمہ باجی نے خود پڑھنا ہوتا تھا۔ اس لیے وہ کوچنگ میں بھی ایک حد سے زیادہ نہیں پڑھا سکتی تھیں۔ بابا گھر بیٹھ کر کھانے والے لوگوں میں سے نہیں تھے۔ انہوں نے ساری عمر محنت کی تھی۔ اس لیے جیسے ہی ان کی صحت بہتر ہوئی انہوں نے اپنے ٹھیکیدار سے کچھ رقم ادھار لے کر ایک اچھی جگہ سبزی کی دکان لگا لی۔ جگہ بھی اسی ٹھیکیدار نے دلوائی تھی۔ وہ خود اب بلڈر بن گیا تھا۔

سبزی کا کام... کل چلنے والا ہے۔ ایک مہینے میں بابا کی دکان چل نکلی اور وہ ہر روز اماں کے ہاتھ پر ہزار بارہ سو روپے رکھنے لگا۔ اماں خوش ہو گئیں کیونکہ بابا جب مستری تھا تو کبھی ہزار روپے ہاتھ پر نہیں رکھے تھے۔ کیونکہ بابا کو روز آٹھ سو اور نو سو روپے ملتے تھے۔ اس کام میں زیادہ محنت نہیں تھی جب کام چل نکلا تو بابا نے ایک لڑکا رکھ لیا۔ بابا خود کیش دیکھتا تھا اور لڑکے سے سارا کام لیتا تھا۔ بابا نے دو سال یہ کام کیا اور بہت اچھا کمایا۔ اس کی کمائی سے اماں نے اتنا بچا لیا کہ ہم بہنوں کے جہیز کے لیے بہت کچھ بنا لیا تھا۔ ان دو سالوں میں نائمہ باجی نے ماسٹر کر لیا۔ مجھے پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ اب کالج جا کر پڑھنا ممکن بھی نہیں ہے اس لیے اگر ہو سکا تو پرائیویٹ انٹر اور پھر بی اے کر لوں گی۔ مگر اس کے لیے مجھے ملازمت چھوڑنا پڑتی میں دونوں کام ایک ساتھ نہیں کر سکتی تھی۔

نائمہ باجی بائیس اور میں بیس سال کی ہو رہی تھی۔ اماں اب ہم دونوں کی شادی کر دینا چاہتی تھیں۔ مگر اس سے پہلے کہ میں نوکری چھوڑتی یا اماں ہمارے رشتے کے لیے کچھ کرتی۔ ہماری پُرسکون زندگی میں بھونچال آ گیا۔ بابا کو کچھ عرصے سے بھتے کے لیے پرچیاں مل رہی تھیں اور بابا نے رقم دی بھی تھی مگر مانگنے والوں کے مطالبات بڑھتے چلے گئے۔ بابا کہاں تک دیتے۔ ایک بار انہوں نے انکار کیا اور اسی رات جب وہ دکان بند کر کے آ رہے تھے تو موٹر سائیکل پر آئے دو افراد نے ان پر فائرنگ کی اور بھری مارکیٹ میں با آسانی فرار ہونے میں کامیاب رہے۔ بابا کی لاش گھر آئی تو ہماری دنیا ہی اجڑ گئی تھی۔ کئی دن تک ہم ماں بیٹیوں کو ہوش ہی نہیں رہا۔ جب ہوش آیا تو یہ فکر ہوئی کہ اب گزارہ کیسے ہوگا؟ میری نوکری تھی مگر اصل آمدنی تو بابا کی دکان سے آتی تھی اور اب وہ بند پڑی تھی۔

اس موقع پر سیما باجی کے میاں عتیق بھائی نے چالاکی سے کام لیا اور دکان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ انہوں نے وہاں کسی کو رکھ دیا اور خود صبح شام حساب لینے جاتے تھے مگر اس حساب میں ہمیں کچھ نہیں ملتا تھا۔ شروع میں انہوں نے تھوڑی بہت رقم دی مگر پھر دکان کے خسارے میں جانے کا کہہ کر یہ بھی دینا بند کر دی۔ جب اماں نے دکان بیچنے کو کہا تو انہوں نے جھوٹ بول دیا کہ دکان پر پہلے ہی کوئی قبضہ کر چکا ہے اور اب وہ اپنی دکان چلا رہا ہے۔ اصل میں جگہ قبضے کی تھی اور باقاعدہ دکان بھی نہیں تھی۔ چھپر ڈال کر اس کے نیچے دکان کھولی تھی اس لیے ہم دعویٰ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایسی جگہوں پر جب تک کمانے والا ہو تو کمائی ہوتی ہے ورنہ نہیں ہوتی۔ عتیق بھائی نے یقیناً اسے اونے پونے بیچ دیا ہوگا مگر ہمیں اس رقم میں سے کچھ نہیں ملا۔

مجھے نوکری چھوڑنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ نائمہ باجی جاب کی تلاش میں تھی۔ دو مہینے بعد اسے بھی ایک جگہ ملازمت مل گئی۔ عجیب حالات تھے ہمارے کہ مسلسل اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ نائمہ باجی کی جاب اچھی تھی اور سیلری بھی آغاز سے اچھی تھی اس لیے حالات پھر بہتر ہو گئے۔ ہمارا گھر کرائے کا تھا۔ مگر ہم سب بہنیں اسی گھر میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے۔ اس لیے یہ گھر اپنا ہی لگتا تھا۔ کچھ عرصے بعد نائمہ باجی نے اماں سے کہا۔ ”ہم کہیں اور مکان لے لیتے ہیں۔“

”اس کرائے میں اور کہاں مکان ملے گا؟“ اماں نے اعتراض کیا۔

”زیادہ میں تو ل جائے گا۔ بس اب ہمیں.... اس علاقے میں نہیں رہنا۔“

اماں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”ارے تو اسی علاقے میں پیدا ہوئی ہے اور پلی بڑھی ہے۔“

”تو کیا فرض ہے کہ مروں بھی اسی علاقے میں۔“ نائمہ باجی نے تنگ کر کہا۔ دراصل اس کی ملازمت اچھی تھی اور اب اسے یہاں رہتے ہوئے اور یہاں کے بارے میں اپنے دفتر کے ساتھیوں کو بتاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اس کی ملازمت ایک موبائل کمپنی میں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ کسی اچھے علاقے میں رہنا چاہتی تھی۔ آج کل یہ ہے کہ گھر میں رول اس کا چلتا ہے جو کماتا ہے۔ مگر اماں یہ جگہ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ اماں شادی کے ایک سال بعد ہی اس گھر میں آ گئی تھیں۔ مالک مکان بہت اچھا تھا۔ تین چار سال بعد کرایہ بڑھا دیتا تھا۔ مگر اس نے مکان کبھی خالی نہیں

کرایا۔ مکان تین کمروں کا تھا۔ ایک کمرا اماں اور بابا کا تھا۔ ایک ہم بہنوں کا اور ایک نشست گاہ تھی۔ چھوٹا سا صحن تھا۔ پرانے طرز کے لیٹرین اور غسل خانے تھے مگر اماں مکان کو صاف ستھرا رکھتی تھی اور جب ہم بہنیں بڑی ہوئیں تو یہ کام ہم نے سنبھال لیا۔ البتہ باورچی خانہ اماں نے اپنے ہاتھ میں رکھا اور اس کے سارے کام وہی کرتی تھیں۔ ہمارا عام سا گھر بھی جگمگاتا تھا۔

میں بھی یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا جیسے ہمارے لیے یہی علاقہ مناسب ہے۔ یہاں غریب لوگ تھے۔ گلیاں کچی تھیں۔ پانی اور بجلی کا مسئلہ تھا مگر یہاں سکون تھا۔ چوری چکاری کی وارداتیں کم ہوتی تھیں۔ سڑکوں پر چھینا جھپٹی نہیں ہوتی تھی اور ضروریاتِ زندگی اتنی مہنگی نہیں تھیں۔ جو سوٹ کسی اچھے علاقے میں سات آٹھ سو کا ملتا وہ یہاں پانچ سو میں مل جاتا تھا۔ یہی حال سبزی ترکاری اور پھلوں کا تھا۔ پھر میری فیکٹری بھی یہاں سے قریب تھی۔ ہمارے محلے سے کوئی نصف درجن لڑکیاں اور عورتیں جاتی تھیں اور ہم آرام سے پندرہ بیس منٹ میں پیدل فیکٹری پہنچ جاتے تھے۔ اس لیے میں نے اماں کی تائید کی اور نائمہ باجی سے کہا۔ ''یہاں کیا برائی ہے۔ تم آفس کی وین میں آتی جاتی ہو۔''

''یہی تو برائی ہے۔'' نائمہ باجی نے خفگی سے کہا۔ ''سب لڑکیاں اچھے علاقوں میں رہتی ہیں اور ایک میں ہوں جو اس سڑے ہوئے علاقے میں رہتی ہوں۔''

نائمہ باجی کے ساتھ وہی ہوا تھا جو نچلے طبقے کے زیادہ پڑھ جانے والے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ انہیں اپنا ماحول برا لگنے لگتا ہے اور وہ اسے بدلنا چاہتے ہیں۔ وہ جس آفس میں کام کرتی تھی اور جن لوگوں میں اٹھتی بیٹھتی تھی وہ متوسط اور اوپری طبقے کے تھے۔ اسے احساسِ کمتری ہونے لگا تھا۔ اس لیے وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ اماں بے چاری پرانے وقت کی عورت تھیں وہ خود کو بدل نہیں سکتی تھیں۔ جب ہم اپنے اپنے کاموں پر چلے جاتے تو وہ سارا دن گھر میں اکیلی ہوتی۔ تب محلے والیاں آتی جاتی تھیں یا اماں کہیں چلی جاتی۔ اس کا دل بہل جاتا اور محلے داری کی رسم بھی پوری ہوتی تھی۔ اماں کا کہنا تھا کہ کسی اجنبی جگہ وہ کیا کرے گی۔ کیا سارا دن اکیلی پڑی رہیں گی؟ بابا کے بعد وہ ویسے ہی مرجھا سی گئی تھیں۔ ہم صبح آٹھ بجے نکلتے تو شام چھ سات بجے تک واپسی ہوتی تھی۔ اماں رات آٹھ بجے ہی سو جاتی تھی۔ اس لیے ہم سے بات کرنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔

نائمہ باجی جو یہاں سے جانا چاہتی تھیں اس کا مقصد کچھ اور بھی تھا۔ یعنی اب اس کو صرف یہ جگہ بری نہیں لگ رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ اماں ماننے کو تیار نہیں ہے تو ایک دن اس نے اماں سے کہا کہ وہ دفتر میں کسی کو پسند کرتی ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہے مگر اس آدمی کی شرط یہ ہے کہ ہم اس علاقے سے نکل کر کسی اچھی جگہ رہیں۔ اماں نے حیرت سے کہا۔ ''اس نے تجھ سے شادی کرنی ہے یا علاقے سے۔''

''اماں سمجھا کرو، رشتہ اور بارات لے کر تو یہیں آنا پڑے گا اور وہ پیسے والا خاندان ہے یہاں نہیں آئے گا۔''

''تیرا مطلب ہے تیری شادی کی خاطر میں یہ مکان اور علاقہ چھوڑ کر دوسری جگہ مکان کرائے پر لے لوں۔''

''ہاں۔''

''اس کا کرایہ کون دے گا۔''

''اماں میں کما رہی ہوں میں دوں گی۔''

''جب تیری شادی ہو جائے گی تب کون دے گا۔''

''تب بھی میں......''

''نہ بی بی شادی کے بعد لڑکی اور اس کا پیسا میاں کے قابو میں ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو تمہارے چکر میں ہم اس جگہ سے بھی جائیں۔ اس آدمی سے کہو کہ اگر اس نے تم سے شادی کرنی ہے تو اپنے گھر والوں کو یہاں بھیجے۔ ارے شادی کے لیے تو بادشاہ غریب کے گھر آ جاتا ہے یہ کون سے انوکھے پیسے والے ہیں۔''

اماں چند جماعتیں پڑھی ہوئی تھیں مگر انہیں بولنے کا فن آتا تھا اور ایسی دلیل دیتیں کہ وہ لاجواب ہو جاتا۔ نائمہ باجی نے اصرار کیا تو اماں نے اس سے کہا کہ لڑکے سے کہو وہ آ کر بات کرے۔ ایک چھٹی والے دن نعیم بھائی ہمارے ہاں آئے۔ پہلے تو ہم انہیں دیکھ کر حیران ہوئے۔ بے شک ان کی پرسنالٹی اچھی تھی۔ وہ صحت مند اور خوبرو آدمی تھے مگر ان کی عمر چالیس کے آس پاس تھی یعنی وہ نائمہ باجی سے سولہ سترہ سال بڑے تھے۔ وہ اسی کمپنی میں منیجر کی پوسٹ پر کام کرتے تھے۔ اماں نے ان سے بات کی تو انہوں نے ایک متبادل تجویز پیش کی کہ ہم تین مہینے کے لیے یہاں سے شفٹ ہو جائیں اور یہ مکان بھی نہ چھوڑیں۔ نائمہ باجی کی شادی کے بعد ہم دوبارہ یہاں آ جائیں۔ انہوں نے کہا۔ ''یا خدا مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن میرے گھر والے اس معاملے

میں سخت ہیں۔ وہ یہاں نہیں آئیں گے اور میں نائمہ کو ایسے بیاہ کر نہیں لے جا سکتا۔''

ہونے والا داماد خود آ گیا تھا اور اب درخواست کر رہا تھا اس لیے اماں بادل نا خواستہ راضی ہو گئیں۔ ایک مہینے بعد ہم مکان بند کر کے شہر کے ایک اچھے علاقے میں فلیٹ میں شفٹ ہو گئے۔ یہ اچھے معیار کے فلیٹ تھے اور یہاں اوپری متوسط طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ فلیٹ حیرت انگیز طور پر فرنش تھا اور ہمیں سوائے اپنے ذاتی سامان کے کچھ بھی نہیں لانا پڑا تھا۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کا کرایہ کتنا تھا اور کون ادا کر رہا تھا۔ یہیں نعیم بھائی کے گھر والے آئے تھے۔ اماں بے چاری ایسی گھبرائی ہوئی تھیں کہ ابھی لڑکے والوں نے رشتے کی بات بھی نہیں کی تھی اور انہوں نے کہہ دیا کہ انہیں یہ رشتہ منظور ہے۔ نائمہ باجی نے مجھے بتا دیا تھا کہ ان کی خاطر تواضع کیسے کرنی ہے اور کس طرح پوچھنا ہے میں نے حتیٰ المقدور ایسا ہی کیا۔ اس کے باوجود جب نعیم بھائی کے گھر والے واپس جا رہے تھے تو ان کے موڈ خراب تھے اور ان سے زیادہ نائمہ باجی کا موڈ خراب تھا۔ وہ ان کے جاتے ہی ہم پر برس پڑی تھیں کہ ہم نے کیا کیا غلطیاں کی تھیں۔

''باجی تم بتاؤ ہمیں یہاں آئے ہوئے دو ہفتے ہوئے ہیں ہم اتنے سے وقت میں یہاں کے طریقے کیسے سیکھ سکتے ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''اماں بے چاری تو ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہیں۔''

مگر نائمہ باجی کا موڈ خراب رہا اور وہ کئی دن بڑبڑ کرتی رہی۔ بالآخر اماں نے تنگ آ کر یہاں سے جانے کی دھمکی دی تو وہ چپ ہوئی تھی۔ بہر حال کیونکہ تمام معاملات نعیم بھائی کے ہاتھ میں تھے اس لیے رشتے کی بات تیزی سے آگے بڑھی اور ایک مہینے بعد شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔ نائمہ باجی پہلے ہی شادی کی تیاری کر رہی تھی اور وہ جس طرح پیسا خرچ کر رہی تھی اس سے لگ رہا تھا کہ اس کے پاس بہت کھلا پیسا ہے۔ جب کہ اس کی تنخواہ اتنی زیادہ نہیں تھی۔ یقیناً یہ بھی نعیم بھائی کی طرف سے تھا۔ اماں اور میں یہ سب دیکھ رہے تھے مگر خاموش رہنے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔ شادی میں ہماری طرف سے صرف سیما باجی کو بلایا گیا تھا اور کسی بھی رشتے دار کو نہیں بلایا گیا تھا۔ شادی ہوئی اور نائمہ باجی رخصت ہو کر نعیم بھائی کے ساتھ ان کے نئے بڑے سے لگژری فلیٹ میں چلی گئی۔ اس کے پندرہ دن بعد ہم بھی واپس اپنے پرانے گھر آ گئے۔

اماں سے زیادہ میں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ ایک تو میری فیکٹری سے چھٹیاں بہت ہوئی تھیں اور دوسرے وہاں سے فیکٹری آنا بہت مشکل تھا دو بسیں بدلنا پڑتی تھیں اور ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ وقت بسوں میں گزر جاتا تھا۔ جن دنوں نائمہ باجی کی شادی کا سلسلہ جاری تھا مجھے میرے شعبے کا سپروائزر بنا دیا گیا تھا۔ مجھ پر کام کا بوجھ کم ہوا تھا مگر ذمے داری کا بوجھ بڑھ گیا تھا اور مجھے اب درجن سے زیادہ کاری گروں کی نگرانی اور ان کے کام کے معیار کو دیکھنا پڑتا تھا۔ اس لیے فیکٹری سے نکلنے میں دیر لگتی تھی اور پہلے میں جن عورتوں کے ساتھ آتی تھی وہ مجھ سے پہلے نکل جاتی تھیں۔ اب میں اکیلی آتی تھی اور عام طور سے مجھے گھر آتے ہوئے مغرب کا وقت ہو جاتا تھا۔ بلکہ جب سردی شروع ہوئی تو میں مغرب کے بعد ہی آتی تھی اور اماں پریشان ہوتی تھیں۔

اس دن فیکٹری سے نکلی تو تاریکی کے ساتھ آسمان پر بادل بھی تھے۔ ساتھ ہی بہت تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ راستے گلیاں سنسان تھیں اور میں سہم کر تیز قدموں سے گھر جا رہی تھی کہ دو لڑکے میرے پیچھے آنے لگے۔ وہ بلند آواز میں میرے حوالے سے فضول باتیں کر رہے تھے۔ میں نے قدم تیز کیے مگر ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکی۔ رفتہ رفتہ ان کی گفتگو فحش ہونے لگی۔ جس علاقے سے گزر رہی تھی وہاں بجلی نہیں تھی اور تاریکی تھی۔ ان کی باتوں سے میں اتنا ڈری کہ بھاگنے لگی اور اسی دوران میں ٹھوکر کھا کر گری۔ اس سے پہلے اٹھتی ایک بائیک میرے پاس آ کر رکی اور میں نے گھبرا کر بائیک والے کو دیکھا اس نے ہیلمٹ پہنا ہوا تھا۔ مجھے وہ بھی ان لفنگوں کا ساتھی لگا تھا۔ مگر وہ بولا تو اس کے لہجے میں نرمی تھی۔ ''ہما آپ ٹھیک ہیں؟''

میں چونک کر اٹھی۔ ''آپ کون ہیں؟''

''میں جوہر ہوں۔'' اس نے ہیلمٹ اتارا۔ ''آپ کی فیکٹری میں ایڈمن میں ہوتا ہوں۔''

میں نے اسے پہچان لیا۔ کئی بار اس سے بات ہوئی تھی اور آتے جاتے تو تقریباً روز ہی سامنا ہوتا تھا۔ میں نے پیچھے دیکھا جہاں وہ دونوں لڑکے کچھ فاصلے پر موجود تھے۔ البتہ وہ رک گئے تھے۔ ''یہ مجھے تنگ کر رہے ہیں میرا پیچھا کر رہے ہیں۔''

جوہر نے پلٹ کر انہیں دیکھا اور بولا۔ ''آئیں میرے ساتھ میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دیتا ہوں۔''

عام حالات میں میں کبھی کسی کے ساتھ یوں گھر جانے پر تیار نہ ہوتی چاہے وہ میری فیکٹری میں کام کرنے والا ہی کیوں نہ ہوتا مگر اس وقت میں فوراً مان گئی۔ میں اس کے پیچھے بیٹھی اور جوہر نے بائیک آگے بڑھا دی۔ یہاں سے میرا گھر کچھ ہی دور تھا مگر پیدل چلتے ہوئے مجھے بہت دور لگ رہا تھا۔ میں بار بار پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ جوہر نے گھر کا پوچھا تو میں نے چونک کر اسے اپنی گلی کا بتایا اور پھر اس سے کہا۔ ”مجھے کونے پر اتار دیں۔“

اس نے گھر تک پہنچانے پر اصرار کیا مگر میں نے منع کیا تو اس نے گلی کے سرے پر بائیک روکی۔ میں نے اتر کر اس کا شکریہ ادا کیا اور تیز قدموں سے گھر تک آئی جہاں اماں دروازے سے لگی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ ”اتنی دیر لگا دی۔“

”اماں کیا کروں جب سے سپروائزر بنی ہوں دیر ہو جاتی ہے۔ مگر کل میں جا کر بات کرتی ہوں اب میں سب کے ساتھ ہی آیا کروں گی اکیلے آتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ آج تو راستہ بھی سنسان تھا۔“

میں نے کبھی اماں سے کچھ چھپایا نہیں تھا۔ پہلے تو میں نے اماں کو بتایا نہیں تھا کہ آج راستے میں کیا واقعہ پیش آیا ہے مگر جب رات سونے کے لیے لیٹے تو میں نے اماں کو بتا دیا اور جوہر کے بارے میں بھی بتایا کہ وہ مجھے گلی کے سرے تک چھوڑ کر گیا تھا۔ اماں نے جوہر کو دعا دی تھی۔ شادی کے بعد نائمہ باجی نے برائے نام ہی تعلق رکھا تھا۔ وہ مہینے میں ایک بار نعیم بھائی کے ساتھ بس کھڑے قدموں آتی تھی اور مشکل سے ایک گھنٹا رک کر چلی جاتی۔ سیما باجی نے کچھ عرصے اماں کو رقم بھی دی تھی مگر نائمہ باجی نے اس کا تکلف بھی نہیں کیا۔ ایسا نہیں تھا کہ ہمیں کوئی مشکل تھی۔ میری تنخواہ ہم دو ماں بیٹی کے لیے کافی تھی اور اماں اس میں سے کچھ بچا بھی لیتی تھی مگر انہیں میری شادی کی فکر تھی اور اس لحاظ سے ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ مگر میری دونوں بہنوں کو اس کی پروا نہیں تھی۔ اماں کا کہنا تھا انہوں نے کبھی میری شادی کے بارے میں نہیں پوچھا۔

اگلے دن میں نے اپنے شعبے کے انچارج سے کہا کہ میں اب چھٹی کے وقت ہی جاؤں گی۔ دیر سے نکلتی ہوں تو اکیلی رہ جاتی ہوں اور مجھے اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ انچارج نے اجازت دے دی مگر کہا کہ جو شپ منٹ ہو رہی ہے اس کے مکمل ہونے تک میں اپنا کام کر کے ہی جایا کروں اس کے بعد وہ ایسی سیٹنگ کر دیں گے کہ میں سب کے ساتھ چھٹی کیا کروں۔ اس شپ منٹ کی تیاری مزید ایک ہفتے تک جاری رہتی۔ مجبوری تھی میں مان گئی۔ مگر جب شام کو فیکٹری سے نکلی تو ایک بار پھر سناٹا تھا اور میں سہمے قدموں سے گھر کی طرف جا رہی تھی کہ جوہر کی بائیک آ کر پاس رکی۔ اس نے کہا۔ ”آپ آج پھر دیر سے جا رہی ہیں؟“

”ہاں ایک ہفتے تک شپ منٹ کی مجبوری ہے اس کے بعد میں جلدی چھٹی کر سکوں گی۔“

”میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔“ جوہر نے کہا تو میں ہچکچاتے ہوئے بائیک پر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد آنے والے پورے ہفتے جوہر مجھے گھر تک چھوڑنے آتا رہا۔ دوسری بار میں اسے گھر لے آئی تھی کہ مجھے گلی کے کونے پر اترنا اچھا نہیں لگا۔ میں اسے اماں سے ملوانا چاہتی تھی تاکہ اماں اسے دیکھ لے اور بات کر لے۔ جوہر پہلی ملاقات میں ہی اماں سے بے تکلف ہو گیا اور اسے اماں کہنے لگا۔ جوہر اکیلا تھا اس کی پرورش اس کی نانی نے کی تھی اور وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں رہی تھیں۔ اماں کو وہ پہلی ملاقات میں بھا گیا تھا اور اس کے بعد وہ اسے اصرار کر کے بلانے لگی۔ جوہر خود بھی آنا چاہتا تھا۔ ہم تینوں ہی معاملہ سمجھ گئے تھے مگر بات آگے بڑھاتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ پھر اماں نے ہمت کی اور ایک دن جوہر سے پوچھا کہ اس کا شادی کا کیا ارادہ ہے۔ جوہر نے کہا کہ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے جو اس کا سرپرست بن کر کہیں رشتہ لے کر جائے۔ اماں نے کہا۔ ”اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو مجھے بتاؤ۔“

اس پر جوہر نے جھجکتے ہوئے میرا نام لے لیا اور یوں بات کھل گئی۔ اماں مان گئیں اور جوہر رشتے کے لیے فیکٹری کے منیجر صاحب کو لے آیا اور یوں ہماری بات ہوئی اور چند مہینے کے اندر سادگی سے شادی ہو گئی۔ اس وقت تک جوہر ایک کمرے کے چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ یہ بھی کرائے کا تھا۔ اس نے مکان چھوڑ دیا۔ اماں اور میرے اصرار پر ہمارے ہاں آ گیا۔ مگر وہ گھر داماد بن کر نہیں آیا۔ اس نے آنے سے پہلے شرط رکھ دی تھی کہ کرایہ اور بل وغیرہ وہ ادا کرے گا۔ اس طرح گھر وہ چلائے گا۔ ہماری رضامندی کے بعد وہ یہاں آنے پر راضی ہوا تھا۔ جوہر ایڈمن میں تھا اور اس کی تنخواہ اچھی تھی۔ پھر میری تنخواہ بھی تھی۔ جوہر کے آنے سے بہت فرق پڑا۔ ہمارا سادہ سا

مکان خوب صورت فرنیچر سے آراستہ ہوگیا۔ مکان میں تھوڑا بہت مرمت کا کام تھا۔ وہ کرایا اور جوہر نے خود ہی رنگ لا کر کلر بھی کر لیا تھا۔ نشست گاہ کے لیے وہ بہت اچھا فرنیچر لایا تھا۔ میں بہت خوش تھی کیونکہ میری تو ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میرا گھر سجا ہوا ہو۔

شادی کے دو ہفتے بعد جب ہم سیر و تفریح سے فارغ ہوئے تو میں نے جاب پر جانا شروع کر دیا تھا۔ یہ پہلے ہی طے ہوگیا تھا کہ میں جاب جاری رکھوں گی۔ بے شک جوہر کی تنخواہ اتنی تھی کہ وہ پورے گھر کا خرچ چلا سکتا تھا مگر میری تنخواہ بچا کر اس سے ہم اپنے گھر کا کر سکتے تھے۔ اب ہم صبح ایک ساتھ نکلتے تھے اور شام کو ایک ساتھ واپس آتے۔ گھر کے کام اماں ہی کرتی تھیں مگر اب وہ زیادہ محنت والے کام نہیں کر پاتی تھیں اس لیے صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے ماسی لگوالی تھی۔ جوہر سے شادی کے بعد میری زندگی میں صحیح معنوں میں تبدیلی آئی تھی۔ اس سے پہلے میں خود کو بے سہارا محسوس کرتی تھی۔ بے شک اماں تھیں مگر اکثر یہ خیال دل کو سہا دیتا کہ اگر اماں کو کچھ ہوگیا تو میرا کیا ہوگا۔ بہنوں کا رویہ واضح تھا کہ وہ میرے لیے کچھ نہیں کریں گی۔ شادی کے بعد یہ خوف دل سے مٹ گیا۔

پھر شادی شدہ زندگی کی اپنی خوب صورتی ہوتی ہے۔ ایک چاہنے والا ہم سفر ہوتا ہے۔ جو آپ سے محبت کرتا ہے۔ آپ کی جذباتی ضروریات پوری کرتا ہے۔ دکھ سکھ میں آپ کے کام آتا ہے۔ سب سے بڑھ کر اولاد کی صورت میں عورت کو مکمل کرتا ہے۔ شادی کے بعد اماں تقریباً ہر مہینے ڈھکے چھپے انداز میں مجھ سے اس بارے میں سوال کرتی تھیں۔ ایک بار میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”اماں جب ہونی ہو گی تو اولاد ہو جائے گی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے پر لڑکی شادی کے بعد جتنی جلدی ماں بن جائے اس کے لیے اتنا اچھا ہوتا ہے۔“

بچے کی خواہش مجھے اور جوہر کو بھی تھی مگر ابھی ہماری شادی کو چند مہینے ہی ہوئے تھے اور اس بارے میں اتنی تشویش نہیں تھی۔ شادی کے ساتویں مہینے میری طبیعت خراب ہوئی اور جب اماں کو پتا چلا تو وہ خوش ہو گئیں۔ اسی وقت مجھے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں اور ٹیسٹ رپورٹ نے ان کی امید پوری کر دی۔ ابتدائی طبیعت خرابی کے بعد میں ٹھیک ہو گئی تھی اس لیے جاب جاری رکھی۔ اماں تو کہہ رہی تھیں کہ میں جاب چھوڑ دوں مگر میں نے انکار کر دیا۔ ”اماں اب جاب کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ گھر بیٹھ نہیں سکتی۔ ہاں وقت آنے پر چھٹی لے لوں گی۔“

میں نے ایک مہینے پہلے چھٹی لی تھی۔ کل تین مہینے کی چھٹی تھی تاکہ بچے کے بعد میں اپنی صحت بھی بہتر بنا لوں۔ اللہ نے بیٹا دیا اور اماں نے اس کا نام گوہر رکھا تھا۔ میں اور جوہر بہت خوش تھے۔ ہمارا گھر مکمل ہو گیا تھا۔ گوہر ابھی دو مہینے کا تھا کہ میں نے جاب پر جانا شروع کر دیا۔ چھ مہینے تک تو وہ مکمل میری فیڈ پر تھا اس لیے چار مہینے میں اسے اپنے ساتھ دفتر لے جاتی رہی۔ اس کے بعد اس نے اوپر کی خوراک لینا شروع کی تو میں اسے گھر میں اماں کے پاس چھوڑ کر جانے لگی۔ وہ اماں کے پاس خوش رہتا تھا۔ شادی کے بعد وقت تیزی سے گزرا۔ گوہر کے سوا دو سال بعد اشعر پیدا ہوا اور اس کے دو سال بعد روما پیدا ہوئی۔

اشعر کے بعد ہمارے مالک مکان نے جو اصل میں اس ساری گلی کے مکانوں کے مالک تھے۔ گو کہ یہ مکانات لیز نہیں ہوئے تھے لیکن رہائش کی وجہ سے کے ڈی اے مداخلت بھی نہیں کرتی تھی پھر مالک کی پہنچ بھی تھی۔ اب جب اس نے اچانک ہی تمام مکانات فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ تو سب گھبرا گئے لیکن کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا کیونکہ ان کی ساری اولادیں ملک سے باہر چلی گئی تھیں اور وہ اب انہیں بھی بلا رہی تھیں۔ اس لیے انہوں نے یہاں اپنی ساری پراپرٹی فروخت کر کے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ جو رہ رہے تھے ان سے کہا اگر وہ خرید رہے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ مکان خالی کر دیں۔ یہ آج سے دس سال پہلے کی بات ہے اس وقت زمین اور جائیداد کی قیمت بڑھنا شروع ہوئی تھی مگر یہ اتنی بھی نہیں بڑھی تھی کہ غریبوں کی پہنچ سے نکل جاتی۔ مالک مکان نے جو قیمت لگائی تھی اتنی رقم ہمارے پاس نہیں تھی مگر ہم نے قرض ادھار لے کر اور کمیٹیاں ڈال کر قیمت پوری کر لی اور مکان لے لیا۔ اپنا مکان ہوا تو کرائے سے بچت ہوئی اور آنے والی چند سالوں میں ادھار بھی اتر گیا۔ مکان ہمارا ہوا تو ہم سے زیادہ اماں خوش تھیں کہ ہماری چھت بھی ہو گئی اور وہی مکان لے لیا جس میں اتنے عرصے سے رہتے آئے تھے۔

عمر کے ساتھ اماں کمزور ہوتی گئیں اور اب اکثر بیمار رہنے لگی تھیں۔ ایک بار طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو میں ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی اس نے کہا کہ جگر میں کوئی مسئلہ ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کی خوراک کم ہوئی تھی۔ اس نے کچھ

ٹیسٹ لکھ کر دیے مگر اماں نے انکار کیا اور ہم لوگوں نے بھی سستی دکھائی۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ ٹیسٹ بہت مہنگے تھے اور ہماری مالی حالت اتنی اچھی نہیں تھی۔ ادھار کی قسط اتار کر بہ مشکل مہینا گزرتا تھا۔ بیماری کی حالت میں بھی اماں بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ گوہر اسکول جانے لگا تھا۔ اشعر اور روما گھر میں ہوتے تھے۔ صبح ہم دفتر جاتے ہوئے گوہر کو اسکول چھوڑ جاتے تھے اور دوپہر میں جوہر دفتر سے کچھ وقت کی چھٹی کر کے اسے واپس گھر چھوڑ کر آتا تھا۔ اسے مشکل سے بیس منٹ لگتے تھے۔ ایک دن وہ گوہر کو گھر چھوڑنے آیا تو دروازہ بجانے پر بھی اماں نے دروازہ نہیں کھولا۔ اندر سے اشعر اور روما کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔

پریشان جوہر نے دیوار پھلانگی اور اندر اتر کر کنڈی کھولی۔ گوہر کو اندر لا کر اس نے اماں کو دیکھا تو وہ اپنے کمرے کے فرش پر بے ہوش پڑی تھیں۔ وہ اماں کو لے کر اسپتال بھاگا۔ وہاں ڈاکٹروں نے شبہ ظاہر کیا کہ اماں کا جگر جواب دے گیا ہے اور خون میں ضروری معدنیات کی کمی سے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر یہ سرکاری اسپتال تھا اور یہاں اماں کے علاج کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں فیکٹری سے اسپتال پہنچی سیما اور نائمہ باجی بھی اپنے شوہروں کے ساتھ پہنچ گئیں۔ نائمہ باجی کو کمپنی کی طرف سے میڈیکل ملا ہوا تھا، اس نے اماں کو اپنے پینل کے اسپتال منتقل کرایا۔ یہ اچھا اسپتال تھا اور یہاں فوری طور پر اماں کے ٹیسٹ ہوئے اور انہیں وینٹی لیٹر پر ڈال دیا۔ کیونکہ اماں کے دماغ نے کام چھوڑ دیا تھا اور وہ خود سے سانس بھی نہیں لے رہی تھیں۔

اگلے دن ٹیسٹ ہوتے رہے اور اماں کی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔ اگلی شام ڈاکٹروں نے ہم لوگوں کو بتایا کہ اماں کی موت واقع ہو چکی تھی اور اب وہ بس مشینوں کے سہارے تھیں۔ اشارہ واضح تھا۔ میرے تو ہوش اڑے ہوئے تھے کیونکہ میں ہی اماں کے سب سے زیادہ نزدیک تھی۔ مگر باقی سب ہوش میں تھے اور انہوں نے مل کر فیصلہ کر لیا۔ ڈاکٹروں سے مشین ہٹانے کو کہہ دیا۔ مشین ہٹانے ہی اماں کی بہ ظاہر زندگی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ ہم ان کی لاش لے کر آئے اور اماں کی زندگی میں کی گئی وصیت کے مطابق اگلی صبح کا انتظار کیے بغیر رات میں ہی دفنا دیا تھا۔ بہنیں ایک رات رکیں اور اگلے دن اپنے گھر چلی گئیں۔ ہم نے بھی تین دن سوگ منایا اور زندگی پھر سے اپنے معمول پر آگئی۔ آدمی کتنی جلدی قصہ پارینہ بن جاتا ہے یہ مجھے اماں کی موت پر پتا چلا۔ دکھ کی شدت کم ہوتی گئی اور ہم اپنے معمولات میں لگ کر اماں کو بھولتے چلے گئے۔

اماں کے بعد بچوں کے معاملے میں مجھے بہت دشواری پیش آنے لگی تھی۔ اشعر ابھی چھوٹا تھا مگر اسے بھی اسکول میں داخل کرا دیا اور روما کو میں اپنے ساتھ دفتر لے جانے لگی۔ مگر وہ چلنے پھرنے والی ہو گئی تھی اور ٹک کر ایک جگہ نہیں بیٹھتی تھی۔ اس سے بڑی مشکل ہونے لگی تھی۔ اس کی وجہ سے مجھے اپنے کام پر توجہ دینے میں دشواری پیش آتی تھی۔ مجبوراً مجھے محلے کی ایک خاتون سے بات کرنا پڑی۔ ان کے دو بیٹے تھے جو ملک سے باہر تھے اور وہ یہاں اکیلی ہوتی تھیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ روما اور بچوں کی شام تک دیکھ بھال کر لیا کریں۔ خوش قسمتی سے وہ مان گئیں اور اب میں روما کو گھر چھوڑ کر آتی تھی۔ وہ روتی اور مچلتی تھی مگر مجھے دل پر پتھر رکھنا پڑتا تھا کیونکہ میں ملازمت نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ جب تک کہ ہمارا قرض نہیں اتر جاتا مجھے ملازمت کرنا ہی تھی۔

ان خاتون نے شروع میں بچوں کو ٹھیک سے دیکھا مگر پھر وہ بے پروا ہو گئیں۔ اکثر تو دیکھنے آتی ہی نہیں تھیں اور بچے گھر میں اکیلے ہوتے تھے۔ گوہر اب بڑا اور سمجھدار ہو رہا تھا وہ اسکول سے آتا تو بہن بھائی اور گھر کی دیکھ بھال کر لیتا تھا۔ جوہر نے مجھ سے کہا کہ جیسے ہی قرض اترے میں جاب چھوڑ دوں اور اپنی پوری توجہ بچوں اور گھر پر دوں۔ ہمارے بچے اس عمر میں تھے جہاں انہیں سب سے زیادہ ماں کی توجہ کی ضرورت تھی۔ خدا خدا کر کے قرض اترا اور میں نے جاب چھوڑ دی۔ جس دن میں بچوں کے ساتھ گھر میں رہی اس دن میں تو خوش تھی مگر بچوں کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ میرا خیال تھا کہ جاب چھوڑنے کے بعد میں بہت سا وقت فارغ گزاروں گی اور میں نے اس دوران میں گھر میں سلائی کا سوچا تھا کہ کچھ پیسے ہاتھ میں آتے رہیں۔

مگر مجھے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ صبح اٹھ کر پہلے جوہر اور بچوں کا ناشتا بناتی۔ جوہر جاتے ہوئے گوہر اور اشعر کو اسکول چھوڑ جاتے۔ ان کے جانے کے بعد میں سارے گھر کی صفائی کرتی۔ پھر روما کو نہلا دھلا کر صاف کپڑے پہناتی۔ دوپہر اور رات کے لیے ایک ساتھ کھانا بناتی تھی۔ اس دوران میں اسکول کی چھٹی کا وقت ہو جاتا تو اسکول جا کر دونوں بچوں کو لاتی تھی اسی دوران میں گھر کے لیے روزمرہ کی ضروری چیزیں بھی خریدتی تھی۔ بچوں کو

اسکول سے لا کر انہیں کھانا دے کر سلاتی اور کچھ دیر ان کے ساتھ آرام کرتی پھر اٹھ کر کپڑے دھوتی اور شام ہوتی تو خود بھی تیار ہو جاتی کہ جوہر آنے والا ہوتا تھا۔ بچے کھیل کود میں لگ جاتے۔ ہم میاں بیوی چائے کے کپ پر گپ شپ کرتے۔ ٹی وی دیکھتے اور پھر رات کے کھانے کا وقت ہو جاتا۔ کھانا کھا کر کچن صاف کر کے اور چیزیں سمیٹنے میں ہی دس بج جاتے تھے۔ اس دوران میں بچے سونے کے لیے اپنے بستروں پر جا چکے ہوتے تھے۔

گوہر اور اشعر کے لیے اماں والا کمرا سیٹ کر دیا تھا۔ روما ابھی ہمارے ساتھ سوتی تھی۔ تھک کر لیٹتی تو آنکھیں خود بہ خود بند ہو جاتی تھیں۔ یہ عام معمول تھا۔ جس دن کہیں باہر جانا ہوتا۔ کوئی تقریب ہوتی۔ شاپنگ کرنی ہوتی تو اس مصروفیت میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ ایسے میں مجھے سلائی کا وقت کہاں ملتا تھا بلکہ میں اپنی اور روما کی سلائی کے لیے بھی بہ مشکل وقت نکال پاتی تھی۔ چند سال گزرے تو میں بھول ہی گئی کہ میں نے کبھی جاب بھی کی تھی۔ اب میں مکمل گھریلو عورت تھی جس کی زندگی کا محور اس کا گھر، بچے اور شوہر ہوتا ہے۔ روما بھی اسکول جانے لگی تھی۔ میں تینوں بچوں کو خود پڑھاتی تھی۔ اب اسکول سے آکر کھانا کھانے کے بعد ان کے لیے ہوم ورک لازمی ہوتا تھا اس کے بعد ہی وہ آرام کرتے یا انہیں کھیلنے کی اجازت ملتی تھی۔ اس علاقے میں اسکولوں کا معیار بہت اچھا نہیں تھا مگر فیس بھی زیادہ نہیں تھی اور سچی بات ہے ہم اس سے زیادہ فیس افورڈ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

جوہر کچھ عرصے بعد مکان میں کچھ نہ کچھ کام کراتے تھے۔ انہوں نے تھوڑی تھوڑی کر کے اوپری منزل کی دیواریں کھڑی کرائیں اور پھر ان پر ٹائل بیم کی چھت ڈلوا لی۔ کچھ پیسے بچا کر پلاسٹر کروا لیا۔ پھر کھڑکیاں دروازے لگوا لیے۔ میں پوچھتی تو وہ کہتے کہ اچھا ہے بچوں کے کام آئے گا اور جب تک اسے کرائے پر دے دیں گے تو کچھ آمدنی ہو جائے گی۔ اوپری منزل مکمل ہو چکی تھی اور صرف اس کا زینہ الگ کرنے کے لیے چھوٹا گیٹ لگوانا تھا۔ ایک دن جوہر فیکٹری گئے ہوئے تھے۔ شام کے وقت جب جوہر کے آنے کا وقت ہو رہا تھا تو میں تیار ہوئی اور وقت گزاری کے لیے ٹی وی لگایا تو اس میں کسی فیکٹری میں آتشزدگی کی خبر تھی اور جب میں نے فیکٹری دیکھی تو میرا سر گھوم گیا۔ یہ جوہر کی فیکٹری تھی۔ میں نے اسے کال کی مگر وہ کال ریسیو نہیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اس کی خود کال آئی۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور پوچھا۔

”آپ کہاں ہیں فیکٹری میں آگ لگی ہے بہت سے لوگ اندر ہیں۔“

”میں بھی اندر ہوں اور دوسروں کے ساتھ پھنسا ہوا ہوں۔“ جوہر نے کہا تو میرا سکون پھر سے غارت ہو گیا۔

”آپ باہر آجائیں بہت خوفناک آگ لگی ہے۔“

”کیسے آجاؤں یہاں باہر آنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا ہے یہاں بھی دھواں بھر رہا ہے۔“

پیچھے سے شور اور لوگوں کے چلّانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں رونے لگی۔ ”یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔“

”حوصلہ رکھو، شاید ہمیں بچا لیا جائے۔“

مگر میں ٹی وی پر آگ کے جو مناظر دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت خوفناک تھے اور اس آگ سے کسی کا بچ نکلنا مشکل نظر آرہا تھا۔ میں جوہر سے بات کر رہی تھی کہ اچانک کال کٹ گئی میں نے دوبارہ ملانا چاہا تو ریکارڈڈ آواز آئی کہ آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔ میں پاگلوں کی طرح کال ملاتی رہی پھر بچوں کو گھر میں چھوڑ کر خود فیکٹری پہنچ گئی جہاں میری طرح کتنی عورتیں اور دوسرے لوگ اپنے پیاروں کے لیے جمع تھے اور ان کے بارے میں جاننا چاہ رہے تھے مگر ان کی سننے اور ان کی مدد کرنے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ میڈیا آگیا تھا ہم اس کے سامنے اپنے دکھڑے رو رہے تھے۔ مگر میڈیا بھی صرف خبر چلا سکتا تھا وہ اندر آگ میں گھر جانے والوں کی کوئی عملی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ آگ تھی کہ اب اس نے تقریباً پوری فیکٹری کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور اندر موجود کسی فرد کے بچنے کا امکان نظر نہیں آرہا تھا۔

میں اس امید پر بار بار جوہر کا نمبر ملا رہی تھی کہ شاید اس سے بات ہو سکے۔ وہ زندہ ہو اور بچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر اس کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا۔ پھر ہمارے سامنے فیکٹری کی دو منزلہ عمارت خوفناک دھماکے سے منہدم ہو گئی اور شعلے دور دور تک پھیل گئے۔ جو لوگ پاس کھڑے تھے وہ ڈر کر دور بھاگے۔ مجھ سمیت ساری ہی عورتیں اور وہ لوگ جن کے پیارے اندر تھے بلند آواز سے رونے لگے۔ اب کسی کے زندہ رہنے کا امکان بہت ہی کم رہ گیا تھا۔ ہم ساری رات وہاں کھڑے رہے اور کچھ پتا نہیں چلا۔ فائر بریگیڈ والوں نے کوشش کر کے آگ تو بجھا دی تھی مگر ملبے

میں اتنی تپش تھی کہ وہ اس کے پاس بھی نہیں جا پا رہے تھے۔ اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے مسلسل پانی ڈالا جا رہا تھا۔ پھر پولیس نے سب کو وہاں سے ہٹا دیا۔ نعیم اور عتیق بھائی آ گئے تھے وہ مجھے زبردستی گھر لے آئے۔ میں جوہر کے بغیر آنے کو تیار نہیں تھی۔ سیما اور نائمہ باجی بھی آ گئی تھیں۔ وہ گھر اور بچوں کے ساتھ مجھے بھی دیکھ رہی تھیں کیونکہ مجھے اپنا ہی ہوش نہیں تھا۔

دوسرے دن فیکٹری کا ملبہ ہٹایا گیا تو اندر سے جلی ہوئی اور بعض تو بالکل راکھ ہو جانے والی لاشیں نکلنا شروع ہوئیں۔ ان میں سے کوئی بھی شناخت کے قابل نہیں تھیں۔ نہ جانے کتنے گھروں کے چراغ بجھ گئے تھے۔ مرنے والوں میں جوہر بھی شامل تھا۔ اس کی لاش ایک ہفتے بعد ڈی این اے سے شناخت کی گئی اور وہ بھی بالکل جل چکی تھی۔ ہم نے آخری دیدار بھی نہیں کیا اور لاش جس طرح پیک آئی تھی اسی طرح دفنا دی گئی۔ اب تک میں حال سے بے حال تھی مگر جیسے ہی جوہر کی تدفین ہوئی۔ میں چونک کر ہوش میں آ گئی کیونکہ اب اپنے بچوں کا مجھے ہی کرنا تھا۔ بہنوں اور بہنوئیوں سے امید نہ پہلے تھی اور نہ میں نے اب لگائی۔ جوہر کی تدفین کے ایک ہفتے بعد میں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ اگرچہ میں گھر میں بھی کپڑے سی سکتی تھی۔ مگر یہ ہوائی روزی ہوتی اور میں اس سے اپنے بچوں کی پرورش نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے ایک لگی بندھی آمدنی کی ضرورت تھی بے شک وہ کم ہوتی۔

گوہر ماشا اللہ گیارہ سال کا ہو چکا تھا۔ اشعر نو سال اور روما سات سال کی تھی۔ میں گھر اور بہن بھائیوں کو گوہر پر چھوڑ سکتی تھی۔ کوشش سے تو خدا مل جاتا ہے مجھے ملازمت کیسے نہ ملتی۔ اس دوران میں جوہر کے واجبات اور انشورنس کے لیے فیکٹری مالکان کے پاس چکر کاٹتی رہی۔ حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ مرنے والوں کے لواحقین کو معاوضہ دیا جائے گا مگر یہ اعلان صرف اعلان رہا۔ ہمیں آج تک کچھ نہیں ملا۔ فیکٹری مالکان نے سب کو ایک ایک لاکھ دیے تھے مگر اس سے کیا ہوتا۔ میں نے اس رقم سے اوپر والے حصے کا گیٹ الگ کروا کے اسے کرائے پر دے دیا۔ یہ چھوٹی اور جان پہچان والی فیملی تھی۔ اس کے آنے سے مجھے بچوں کی طرف سے بھی اطمینان ہوا تھا۔ نوکری ملی تو میں نے ذرا سکون محسوس کیا کیونکہ پیسے سے ہی زندگی کی گاڑی چلتی ہے پیسا نہ ہو تو یہ گاڑی رک جاتی ہے اور پھر صرف دھکوں سے کھسکتی رہتی ہے۔

مجھے ایک گارمنٹ فیکٹری میں ہی ورکر کی جاب ملی تھی۔ تنخواہ بس گزارے لائق تھی۔ یہاں بھی تنخواہ کا حساب تھا۔ میں صبح آٹھ بجے بچوں کو اسکول بھیج کر نکلتی اور فیکٹری جاتی۔ یہ ذرا دور تھی اور مجھے چنگ چی رکشے سے جانا پڑتا تھا۔ اس لیے میں صبح بچوں کو اسکول بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ دوپہر میں وہ تینوں ساتھ واپس آتے اور میں ان کا دوپہر کا کھانا بنا کر جاتی تھی۔ شام چھ بجے چھٹی ملتی تو گھر آتے آتے ساڑھے چھ پونے سات بج جاتے تھے۔ عام طور سے اسی وقت خریداری بھی کرتی آتی۔ بچے میرے انتظار میں ہوتے تھے۔ گوہر بڑا ہو گیا تھا مگر بہن بھائی کی خاطر وہ کھیلنے باہر نہیں جاتا تھا۔ جس دن چھٹی ہوتی بس اسی دن نکلتا تھا۔ میں بھی اپنے سارے کام چھٹی والے دن ہی نمٹاتی کیونکہ فیکٹری سے تھکی ہاری آ کر بہ مشکل کھانا اور کچن کی صفائی ہی کر پاتی تھی۔ تفصیلی صفائی اور کپڑے دھونا صرف چھٹی والے دن ہی ممکن تھا۔

روما چھوٹی سی عمر میں میرا ہاتھ بٹانے لگی۔ وہ چھوٹی موٹی صفائی کر دیتی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے برتن دھو دیتی۔ گوہر اسکول سے آنے کے بعد ان دونوں کو پڑھاتا بھی تھا۔ شروع میں میں ان کے لیے پریشان رہی مگر رفتہ رفتہ عادی ہوتی چلی گئی۔ جیسے جیسے بچے بڑے اور سمجھدار ہو رہے تھے میری پریشانی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اوپر والے کرائے دار بھی خیال رکھتے تھے۔ یوں زندگی ایک بار پھر الٹ پلٹ کر دوبارہ اسی راستے پر آ گئی تھی اور اب میں اس کی عادی ہو چکی تھی۔ بچپن سے اتنی اونچ نیچ دیکھ لی تھی کہ اب کسی چیز کا خوف نہیں رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ اگر میں نہ رہی تو میرے بچوں کا کیا ہوگا۔ میں اللہ سے دعا کرتی کہ مجھے اتنی عمر ضرور دے کہ میں اپنے بچوں کو سمجھدار اور اپنے پیروں پر کھڑا ہوتے دیکھ لوں۔ تینوں بچے پڑھ رہے تھے اور مہنگائی الگ دن کے حساب سے بڑھنے لگی تھی اس لیے تنخواہ کے ساتھ ساتھ کرائے کی رقم بھی ناکافی ہونے لگی تھی۔ پہلے میں اس میں سے کچھ بچا لیتی تھی تو اب وہ بھی ممکن نہیں رہا۔ اس کے باوجود یہ اطمینان تھا کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں پڑتا۔

☆☆☆

”تم لوگوں کو یہ جگہ خالی کرنی ہوگی۔“ سفاک تاثرات اور مسلح شخص کہہ رہا تھا اس نے ہاتھ میں پستول تھام

رکھا تھا۔ ہم احتجاج کرنے لگے کہ ہم کیوں یہ جگہ خالی کریں۔ اس نے کہا۔ "کیونکہ یہ جگہ...... صاحب کی ملکیت ہے۔ تم لوگ بنا کسی کاغذ اور اجازت کے یہاں آکر بیٹھ گئے ہو۔"

اس کے ساتھ کوئی نصف درجن مسلح لڑکے تھے اور اس نے جس صاحب کا نام لیا تھا وہ ایک سیاسی پارٹی کے ایم پی اے تھے۔ اس علاقے میں اس پارٹی کی حکومت تھی اور اس کی مرضی کے بغیر یہاں کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہم ان لڑکوں اور ان کے سرغنہ کو بھی جانتے تھے۔ وہ نامی گرامی بدمعاش اور قاتل تھا۔ اس پر قتل کے کتنے ہی مقدمات تھے اور وہ کئی بار جیل جا چکا تھا مگر ہر بار چھوٹ کر آجاتا کیونکہ گواہ اسے شناخت کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ پولیس اس کا کیس ہلکا کر دیتی تھی۔ اس بار وہ قبضہ مافیا بن کر آیا تھا۔ ٹھیک ہے یہاں لوگ بنا کسی کاغذ کے رہ رہے تھے مگر یہ زمین سرکاری تھی نہ کہ ایم پی اے کی۔ اصل بات یہ تھی کہ نزدیک ہی ایک بڑی شاہراہ بننے سے یہ علاقہ اچانک بہت قیمتی ہو گیا تھا اور ایم پی اے کی اس پر رال ٹپک رہی تھی۔ اطلاعات تو بہت عرصے سے تھیں لیکن انہوں نے اب کھل کر سامنے آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

چھٹی کے دن اچانک ہی یہ لوگ وارد ہوئے اور سب لوگوں کو گھروں سے نکال کر ایک مہینے کی وارننگ دی کہ اپنے مکانات خالی کر دیں اور ایسا نہ کرنے والوں کو قبرستان میں قبر ملنے کی نوید سنائی گئی۔ یہاں بسنے والے سب ہی غریب لوگ تھے جن کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ اگر ہم یہاں سے اٹھ جاتے تو کہاں جاتے۔ ان کے جانے کے بعد سب محلے والے جمع ہوئے اور فیصلہ کیا کہ پارٹی کے مرکزی دفتر جا کر احتجاج کریں۔ اگلے دن سب وہاں گئے اور احتجاج بھی کیا۔ وہاں ہمیں یقین دلایا گیا کہ ہمیں کوئی نہیں اٹھائے گا۔ مگر اسی رات وہ بدمعاش زیادہ لڑکوں کے ساتھ آیا اور انہوں نے ان لوگوں کو گھروں سے نکال کر گلی میں جمع کیا جو احتجاج میں آگے تھے اور پھر انہیں ڈنڈوں سے بے دریغ مارنے لگے۔ جو بچانے کے لیے آگے جاتا اسے بھی مار پڑتی۔ مار مار کر انہوں نے سب کی ہڈی پسلی ایک کر دی اور جاتے سے پہلے دھمکی دی کہ اگلی بار ڈنڈوں کا نہیں پستول کا استعمال ہوگا۔

لوگوں کا برا حال تھا مگر سب نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے مکانات نہیں چھوڑیں گے۔ میڈیا کا دور ہے کسی طریقے سے میڈیا تک خبر پہنچائی گئی اور ایم پی اے کا نام پارٹی کے ساتھ آیا تو اسی دن شام کو وہی ایم پی اے اور پارٹی کے دوسرے لوگ آئے اور انہوں نے لوگوں کو یقین دلایا کہ انہیں یہاں سے کوئی زبردستی نہیں اٹھائے گا۔ مگر لوگ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ دیکھ چکے تھے یہ اپنے وعدے سے پھر جانے والے سیاست داں تھے۔ مگر اس بار انہوں نے دوسری حکمت عملی سے کام لیا۔ انہوں نے پہلے کمزور اور ڈر جانے والے لوگوں کو گھیرا۔ ان کے مکانات کی قیمت لگائی اور ساتھ ہی دھمکی دی کہ نہ بیچنے کی صورت میں مکان ہاتھ سے جائے گا اور یہ قیمت بھی نہیں ملے گی۔ کچھ لوگوں نے ڈر کر مکان بیچ دیئے اور ایم پی اے کے آدمی فوراً بلڈوزر لے آئے اور مکانات توڑ کر ان کا ملبہ راستوں میں ڈال دیا۔

اس کے بعد خالی ہو جانے والے پلاٹوں پر بدمعاش اور اس کے ساتھی اپنی محفلیں سجانے لگے۔ وہاں پینا پلانا ہوتا تھا اور وہ لوگ نشے میں دھت ہو کر ہوائی فائرنگ کرتے تھے۔ کبھی لوگوں کو ڈرانے کے لیے ان کے مکانات پر فائر کرتے تھے۔ اچانک ہی رہزنی کی وارداتیں شروع ہو گئیں۔ لوگ بے چارے اپنے کاموں سے یا کہیں سے آ رہے ہوتے تھے اور بائیکوں پر سوار ہیلمٹ پوش انہیں روک کر لوٹ لیتے تھے۔ ذرا سی مزاحمت پر یا بغیر کسی مزاحمت کے بھی لوگوں پر تشدد کرتے تھے اور ایک نوجوان کو گولی مار کر ہمیشہ کے لیے معذور بھی کر دیا۔ گولی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں لگی تھی۔ پھر محلے کا ماحول خراب ہونے لگا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے اوباش جمع ہونے لگے اور انہوں نے عورتوں لڑکیوں کا گھروں سے نکلنا دوبھر کر دیا۔ مجھ جیسی عورت مشکل میں پڑ گئی تھی کیونکہ مجھے نکلنا ہی ہوتا تھا۔ چھتیس برس کی عمر میں بھی خوش شکل اور جسمانی لحاظ سے اسمارٹ تھی کیونکہ صبح سے شام تک لگی رہتی تھی اس لیے جسم اپنی حد میں تھا۔

جو پہلے نہیں ڈرے تھے وہ اب ڈر گئے اور اپنے مکانات اونے پونے اس مافیا کو بیچنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے دیر کی تو شاید میں کچھ نہ پانے والوں میں شامل ہوں۔ یہ تو اب طے تھا کہ ہمیں محلہ خالی کرنا ہی تھا۔ جو ابھی نہیں جائیں گے وہ بعد میں یہاں سے خالی ہاتھ نکلیں گے۔ میرا چھوٹے بچوں کا ساتھ تھا اور میں خالی ہاتھ نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر میں اس بدمعاش کے بجائے ایم پی اے

سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے ایک دن ہمت کر کے پارٹی کے دفتر چلی گئی اور وہاں ایم پی اے سے مل کر اپنی حالت اس کے سامنے رکھ کر درخواست کی کہ مجھے میرے مکان کی اتنی قیمت ضرور دی جائے کہ میں اپنے بچوں کے سر چھپانے کا کوئی بندوبست کرسکوں۔ ایم پی اے شاید متاثر ہوا تھا اس نے مجھے چھ لاکھ کی پیشکش کی۔ اگرچہ چھ لاکھ کچھ بھی نہیں تھے۔ قبضہ مافیا کے آنے سے پہلے یہاں مکانوں کی قیمت بارہ تیرہ لاکھ تک چلی گئی تھی مگر بھاگتے بھوت کی لنگوٹی مل رہی تھی۔

میں مان گئی اور ساتھ ہی درخواست کی کہ جب تک مجھے کسی دوسری جگہ ٹھکانہ نہ مل جائے مجھے اسی مکان میں رہنے دیا جائے۔ ایم پی اے نے کمال فراغ دلی سے میری یہ درخواست بھی قبول کرلی۔ وہ ایسے لوگ تھے جنہیں لکھا پڑھی کی ضرورت بھی نہیں تھی ہاں مجھ سے ایک پکے کاغذ پر سائن لے لیے کہ میں نے چھ لاکھ روپے کے عوض یہ جگہ فروخت کر دی ہے۔ کس نے لی ہے اس کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ محلہ رفتہ رفتہ اجڑ رہا تھا۔ جو مکان بکتا فوری طور پر اس پر بلڈوزر چل جاتا تھا۔ صرف میرا مکان بکنے کے باوجود کھڑا تھا مگر میں یہاں زیادہ عرصے نہیں رہ سکتی تھی۔ چھ لاکھ اس شہر میں کوئی ڈھنگ کی جگہ لینے کے لیے کتنے ناکافی ہیں اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے دوسری جگہ کی تلاش شروع کی۔ شہر کے نواحی اور کونے کھدروں میں دو کمروں کا فلیٹ بھی اس سے زیادہ قیمت کا تھا۔ زمین خریدنا تو میرے بس سے باہر ہو چکا تھا۔ اس لیے میں فلیٹ کی تلاش میں تھی جہاں میں اس کھٹکے کے بغیر رہ سکوں کہ کوئی مجھے یہاں سے نکال نہیں سکے گا۔

میں اخبار بھی دیکھتی تھی اور اسی سے مجھے قیمتوں کا اندازہ ہوا تھا اس لیے جب مجھے شہر کے مرکز میں اور ایک اچھے علاقے میں دو کمروں اور لاؤنج کا فلیٹ ساڑھے پانچ لاکھ میں فروخت کے لیے دکھائی دیا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ نئے فلیٹ تھے۔ اشتہار کے ساتھ فون نمبر تھا۔ میں نے کال کی تو مجھے فلیٹ کی لوکیشن بتائی گئی اور یہ بھی بتایا کہ فلیٹ کے نیچے ہی دکانوں میں وہ اسٹیٹ ایجنسی تھی جو فلیٹ فروخت کر رہی تھی۔ دو دن بعد اتوار تھا اور میں صبح کام نمٹا کر گوہر کے ساتھ نکلی۔ دور جاتے ہوئے میں اسے ساتھ لے کر جاتی تھی ایک تو مجھے اس سے سہارا ہوتا تھا دوسرے میں چاہتی تھی کہ اسے دور دراز علاقوں اور وہاں آنے جانے کے طریقوں کا پتا چلے۔ چند سال بعد اسی نے یہ سب دیکھنا اور کرنا تھا۔ جب میں نے فلیٹ دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اس کے باہر دیواروں پر چھوٹی اینٹوں سے ڈیزائن بنائے گئے تھے اور سیڑھیاں ماربل کی تھیں اس کے بعد گراؤنڈ فلور اور میزنائن فلور پر اعلیٰ درجے کی ٹائلز لگی تھیں۔ گراؤنڈ اور میزنائن پر دکانیں تھیں اور فلیٹ فرسٹ فلور سے شروع ہو رہے تھے۔ ایجنسی خاصی بڑی ثابت ہوئی کیونکہ اس میں کوئی دس بارہ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے جس سے بات کی تھی اس نے اپنا نام کریم حیدر بتایا تھا۔ میں نے کریم حیدر کا پوچھا تو ایک ادھیڑ عمر اور صورت سے معقول نظر آنے والا شخص آگے آیا۔ اس نے گرم جوشی سے پوچھا۔

"آپ ہما جوہر ہیں؟"

"جی۔" میں نے کسی قدر نروس لہجے میں کہا۔

"میرے ساتھ آیئے یہاں تو بہت ہجوم ہے۔ پھر آپ کو فلیٹ بھی دکھانا ہے۔" وہ کہہ کر پلٹا اور اس نے ایک میز کی دراز سے ایک فائل اور چابی نکالی اور واپس آیا۔ "میرے ساتھ آئیں۔"

ہم باہر آئے تو وہ مجھے اور گوہر کو لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ "ابھی لفٹ لگنی ہے۔ اصل میں پہلے یہاں قبضہ ہو گیا تھا مگر اب بلڈر نے قبضہ چھڑوالیا ہے۔"

"تب وہ خود کیوں نہیں سیل کر رہا؟"

وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہنسا۔ "وہ ڈرا ہوا ہے اصل میں اس کی یہاں دشمنی بھی تھی اس لیے اس نے اپنا آفس بند کر دیا ہے فلیٹ ہماری ایجنسی کے توسط سے بکوا رہا ہے۔ ورنہ فائل اور سارے کام بالکل اوریجنل ہیں۔"

میں فلیٹ دیکھ رہی تھی یہ بہت اچھے والے فلیٹ تھے اگرچہ بلڈنگ زیادہ بڑی نہیں تھی اور ایک ہی تھی مگر فلیٹوں کی حالت ہی بتا رہی تھی۔ سوائے سیڑھیوں کو چھوڑ کر ہر جگہ ٹائلز تھی اور دیواروں پر چھوٹی ٹائلز لگی تھیں۔ وہ ہمیں دوسرے فلور پر لایا اور چابی سے ایک فلیٹ کا دروازہ کھولا۔ "فلیٹ مکمل ہے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ پانی کی ٹنکی تک لگی ہے۔ بجلی کے میٹرز لگ گئے ہیں گیس کے لگنے والے ہیں۔ مگر نزدیک سے گیس لی ہوئی ہے۔ پانی ہر دوسرے دن آتا ہے۔"

میں نے فلیٹ دیکھا تو ایک بار پھر مجھے یقین نہیں آیا کہ ایسا فلیٹ اس قیمت میں مل رہا ہے۔ بارہ بائی بارہ فٹ کے دو بیڈ روم تھے جن کے ساتھ اعلیٰ درجے کی ٹائلز اور

سینٹری سے آراستہ دو واش روم تھے۔ ان کے بیچ میں خاصی بڑی بالکونی تھی۔ کمروں کے سامنے آٹھ فٹ چوڑا اور دونوں کمروں کی لمبائی کے برابر کا لاؤنج تھا۔ اس کے آخری حصے میں کیبنٹ والا کچن تھا۔ اس میں صرف چولہا اور سامان لانے کی ضرورت تھی۔ دروازے کھڑکیاں نئے اور بہت اچھے والے تھے۔ اگرچہ وہ فون پر بتا چکا تھا کہ کل قیمت ساڑھے پانچ لاکھ ہے۔ اس کے علاوہ نہ کوئی قرض ہے اور نہ ہی کسی مد میں ایک روپیا دینا ہے۔ ڈاکومینٹیشن اور لیز کے اخراجات بھی اس میں شامل تھے۔ مگر میں نے ایک بار پھر تصدیق چاہی۔ ''بھائی اس فلیٹ کی کل قیمت ساڑھے پانچ لاکھ روپے ہے؟''

''جی بہن کل قیمت اتنی ہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ شاید سمجھ رہی ہیں کہ کوئی چکر ہے جو قیمت اتنی کم ہے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی چکر نہیں ہے اور قیمت یوں کم ہے کہ ایک بار یہاں قبضہ ہو گیا تھا اس لیے اب لوگ یہاں فلیٹ لیتے ہوئے ڈر رہے ہیں۔ بلڈر مجبور ہو کر کم قیمت میں دے رہا ہے ورنہ آس پاس اس سے ہلکے پروجیکٹس میں اتنے بڑے فلیٹ کی قیمت پندرہ لاکھ سے کم نہیں ہے اور ایک بار یہ بک گئے۔ خریدار کے نام لیز ہو گئے تو پھر ان کی قیمت کہاں جاتی ہے یہ آپ خود دیکھ لیجیے گا۔ ساری بات ایک بار بکنے کی ہے۔''

میں اس کی باتوں میں آ گئی مگر ڈر بھی لگ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''بھائی میں ایک غریب بیوہ عورت ہوں۔ میرے چھوٹے بچے ہیں اور میرے پاس کل یہی جمع پونجی ہے جس سے میں اپنے سر چھپانے کے لیے چھت کر سکتی ہوں۔''

''آپ بالکل بے فکر رہیں بہن۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کو بہن کہا ہے تو اب یہ فلیٹ آپ کو ہی دلاؤں گا۔''

''طریقہ کیا ہوگا؟''

''ایسا کریں آپ کل ڈیڑھ لاکھ روپے لے آئیں، ساتھ میں اپنی شناختی کارڈ کی کاپی اور چار پاسپورٹ سائز تصویریں بھی۔ یہاں معاہدہ کریں گے۔ آپ کے نام کی فائل بلڈر کے پاس بننے جائے گی جب فائل بن کر آئے گی تو آپ باقی چار لاکھ ادائیگی کریں گی اور آپ کو ٹرانسفر کے ساتھ فلیٹ کا قبضہ دے دیا جائے گا۔''

''اس میں کتنا وقت لگے گا؟''

''اگر آپ کل معاہدہ کر لیتی ہیں تو ایک ہفتے کے اندر آپ کی فائل آ جائے گی۔ یوں سمجھ لیں کہ آج سے آٹھ دن بعد آپ یہاں اپنے فلیٹ میں بیٹھی ہوں گی۔''

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔''

''بس بہن آپ کی دعائیں چاہئیں۔ یقین کریں اس میں اپنا کمیشن بھی نہیں رکھ رہا۔ ورنہ پچیس ہزار الگ سے لیتا ہوں۔''

میں سچ مچ اسے دعائیں دینے لگی۔ اگلے روز میں نے بینک سے ڈیڑھ لاکھ روپے نکالے اور گوہر کے ساتھ اسٹیٹ ایجنسی آئی۔ اس بار بھی کریم حیدر نامی یہ اسٹیٹ ایجنسی والا مجھے دیکھتے ہی باہر آیا اور بولا۔ ''بہن اوپر فلیٹ میں چل کر کاغذی کارروائی کرتے ہیں۔ یہاں دس دیکھنے والے ہیں۔ نظر بھی لگ جاتی ہے۔''

میں اس کے ساتھ اوپر فلیٹ میں آ گئی۔ وہ فائل لایا تھا اس نے مجھے فائل دکھائی۔ پھر سیل ایگریمنٹ دکھایا۔ میں نے اسے این آئی سی نمبر کل ہی دے دیا تھا وہ اس نے معاہدے میں شامل کرا لیا تھا۔ فلیٹ میرے نام پر ہوتا۔ اس نے ضروری جگہوں پر سائن کرائے اور مجھ سے ڈیڑھ لاکھ روپے وصول کر کے بلڈر والی فائل بھی میرے حوالے کر دی۔ ''جب آپ کی فائل آ جائے گی تو یہ واپس کر دیجیے گا۔''

پیسے دیتے ہوئے میرے دل میں کھٹکا ہوا تھا۔ ''بھائی اب میں کب آؤں؟''

''آپ پانچویں دن مجھے کال کر لیجیے گا میں آپ کو بتا دوں گا مگر آٹھ دن والی بات پکی ہے ہو سکتا ہے اس سے پہلے ہو جائے۔''

جاتے ہوئے میں جتنی خوش تھی آتے ہوئے میرا دل اتنا ہی خدشوں سے بھرا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے عجلت میں غلط فیصلہ کر لیا ہے۔ کسی سے پوچھا نہیں۔ اپنے بہنوئیوں کو درمیان میں نہیں ڈالا اور نہ ہی کسی سمجھدار آدمی سے مشورہ کیا۔ مگر اب تو میں ڈیڑھ لاکھ روپے دے چکی تھی اور صبر سے انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ آنے والے پانچ دن میں نے بہت مشکل سے ایک ایک لمحہ گنتے ہوئے گزارے تھے۔ پانچویں دن میں نے صبح سے اسے کریم حیدر کو کال کرنا شروع کر دی۔ مگر اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ صبح کا وقت ہے ہو سکتا ہے وہ موبائل آف کر کے سو رہا ہو۔ مگر دوپہر میں بھی نمبر بند

جا رہا تھا۔ اس روز میرا دھیان کام پر نہیں تھا۔ سہ پہر تک میرے دل کو کچھ ہونے لگا کہ گڑبڑ ہے۔ اس کے باوجود میں رات تک کال کرتی رہی اور مسلسل ایک ہی جواب مل رہا تھا کہ آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے۔

رات تک پریشانی سے میرا سر درد سے پھٹنے لگا تھا اور میں بہ مشکل پین کلر لے کر سوئی تھی۔ صبح میں پہلے فیکٹری گئی اور وہاں سے نصف دن کی چھٹی لی۔ دوپہر میں وہاں سے نکل کر گھر آئی۔ بچے اسکول سے آئے تو انہیں کھانا کھلا کر گوہر کے ساتھ نکلی۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ آج ہمیں فلیٹ مل جائے گا اور میرے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ہم اسٹیٹ ایجنسی پہنچے تو وہاں مجھے کریم حیدر نظر نہیں آیا۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو جس آدمی سے پوچھا تھا اس نے کہا۔ ''یہاں کریم حیدر نامی کوئی شخص نہیں کام کرتا ہے۔''

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ ''کیا کہہ رہے ہو بھائی میں دوبار اس سے یہیں ملی ہوں۔ وہ اندر میز کی دراز سے میرے سامنے فلیٹ کی فائل اور چابیاں لے کر آیا تھا اور تم کہہ رہے ہو کہ وہ یہاں کام ہی نہیں کرتا ہے۔''

''کیسی فائل اور کون سے فلیٹ کی؟''

میں نے اسے فائل اور سیل ایگری منٹ دکھایا تو اس نے کہا۔ ''یہ ہماری فائل نہیں ہے۔''

اس دوران میں دوسرے بھی ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور وہ یقین دلا رہے تھے کہ کریم حیدر نامی شخص کا اس اسٹیٹ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے اسی نمبر کے فلیٹ کی فائل دکھائی اور کہا۔ ''یہ اصل فائل ہے۔''

اتنی دیر میں، میں سمجھ چکی تھی کہ یہ کھیل کیا تھا وہ سب ملے ہوئے تھے۔ ایک ہی فلیٹ کی کئی فائلیں تھیں اور وہ ان کی مدد سے نہ جانے کتنے لوگوں کو بے وقوف بنا چکے تھے۔ میں نے فائل پھینک دی اور چلا کر کہا۔ ''مجھے بے وقوف مت بناؤ، مجھے میرے پیسے واپس چاہئیں۔''

میرے شور شرابے پر وہ لوگ قطعی ہراساں نہیں ہوئے تھے کیونکہ وہ اس کے عادی تھے۔ الٹا وہ مجھ پر غرانے لگے کہ شرافت سے یہاں سے چلی جاؤں ورنہ وہ دھکے دے کر نکال دیں گے۔ میں ڈٹ گئی کہ اپنے پیسے لیے بغیر نہیں جاؤں گی تو وہ سچ مچ دھکے دینے پر آمادہ ہو گئے۔ اسی اثنا میں ایک لمبا اور وجیہہ شخص اندر آیا۔ وہ شکل سے بہت مہذب اور سلجھا ہوا انسان لگ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی پہلے کسی ضمیر الدین کا پوچھا اور پھر میری طرف دیکھا۔ ''ان خاتون کا کیا مسئلہ ہے؟''

''کوئی مسئلہ نہیں ڈاکٹر صاحب۔'' ایک آدمی جلدی سے بولا۔ ''ضمیر صاحب اندر ہیں۔''

وہ شخص اسٹیٹ ایجنسی کے اندر والے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔ نہ جانے میرے دل میں کیسے بات آئی کہ یہی شخص میرا مسئلہ حل کروا سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں گوہر کا ہاتھ تھام کر باہر آ گئی اور فلیٹ کے سامنے موجود پارک میں بیٹھ گئی۔ مجھے اس شخص کی واپسی کا انتظار تھا جس کا نام نہیں جانتی تھی۔ ایجنسی والے نے اسے ڈاکٹر صاحب کہا تھا۔ وہ دس منٹ بعد واپس آیا اور ایک شاندار سی کار کی طرف بڑھا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔ ''بھائی میری ایک بات سن لیں۔''

وہ رک گیا اور نرمی سے بولا۔ ''کہیے بہن۔''

میں نے مختصر الفاظ میں اسے اپنے ساتھ ہونے والے فراڈ کا بتایا۔ اسے فائل اور سیل ایگریمنٹ دکھایا اور پھر اپنی حالت بھی واضح کی۔ ''بھائی میرا اور میرے بچوں کا سہارا کل یہی ہے۔ اگر آپ میری مدد کر سکتے ہیں اور ان لوگوں سے میری رقم دلوا سکتے ہیں تو......''

''سہارا اللہ کی ذات ہوتی ہے۔'' انہوں نے کہا ان کی فراغ پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ ''میرے ساتھ آیئے۔''

وہ مجھے لے کر دوبارہ ایجنسی کے دفتر میں آئے اور سیدھا اندر موجود فرد کے پاس پہنچے۔ انہوں نے وہاں بیٹھے آدمی سے کہا۔ ''ضمیر صاحب، آپ لوگوں نے شاید مرنا نہیں ہے۔ خیر یہ آپ کا اپنا معاملہ ہے۔'' انہوں نے اپنے بریف کیس سے ایک چیک بک نکالی اور میرا نام پوچھ کر میرے نام سے ڈیڑھ لاکھ کا چیک کاٹا اور مجھے تھما دیا۔ ''بہن آپ کا یہ مسئلہ حل ہو گیا۔'' وہ بولے اور ضمیر الدین کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''میں ان خاتون کو نہیں جانتا مگر انہوں نے مجھے بھائی کہا ہے اور اب یہ میری بہن ہیں۔ مجھے آج شام تک ڈیڑھ لاکھ روپے مل جانے چاہئیں۔ ورنہ آپ یہیں ہیں اور میں تو ہوتا ہی یہیں ہوں۔''

وہ کہہ کر مجھے لے کر باہر نکل آئے۔ ضمیر الدین پیچھے سے اسے روکتا رہ گیا۔ باہر آ کر انہوں نے مجھے ایک وزیٹنگ کارڈ دیا۔ ''بہن جب آپ کے اکاؤنٹ میں رقم آ جائے تو مجھے اس نمبر پر کال کر کے بتا دیجئے گا۔'' یہ کہہ کر وہ

اپنی گاڑی میں بیٹھے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں گنگ سی حالت میں کارڈ ہاتھ میں تھامے کھڑی رہ گئی۔ مجھے لگا کہ جیسے اللہ نے کوئی فرشتہ بھیج دیا ہو اور اس نے آن واحد میں میری پریشانی ختم کر دی تھی۔ واپسی میں میں چیک بینک میں جمع کرانی آئی اور تیسرے دن رقم میرے اکاؤنٹ میں واپس آ چکی تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے کارڈ پر موجود ان کا موبائل نمبر ملایا۔ کارڈ پر ان کا نام بھی تھا مگر میں وہ نام نہیں بتاؤں گی۔ مگر کراچی کے ایک بڑے حلقے میں پراپرٹی کا کام کرنے والے جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے نام سے کون مشہور ہیں؟ انہوں نے کال ریسیو کی اور جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو بولے۔

''بہن اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی ایک پریشانی دور ہوئی۔''

''مگر ڈاکٹر صاحب دوسری پریشانی باقی ہے۔''

''اللہ وہ بھی حل کرے گا۔ یہ بتایئے کہ یہ آپ کا ہی نمبر ہے نا؟''

''جی بھائی یہ میرا ہی نمبر ہے۔''

''تب میں جلد آپ کو کال کروں گا۔'' انہوں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے ان کا شکریہ تو ادا کیا ہی نہیں۔ اللہ اپنے نیک بندوں کو انسانوں کے شکریے سے بھی بچاتا ہے اور اس کی صلہ بھی انہیں اپنے پاس سے ہی دیتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس وقت میں شکریہ نہ کہہ سکی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرا دوسرا مسئلہ بھی حل کرا دیں گے۔ مگر یہاں رہنا اب بہت بڑا مسئلہ ہوتا جا رہا تھا۔ میرے برابر والا مکان پکا تھا اور اسے توڑا گیا تو میرے مکان میں بھی دراڑیں آ گئیں اور پھر یہاں ماحول خراب سے خراب تر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک غریب عورت کے گھر رات کے وقت کچھ لوگ گھسے اور اس کی دو نوجوان لڑکیوں سے اجتماعی زیادتی کی۔ وہ بے چاری اگلے دن ہی گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ معاملہ نہ پولیس کے علم میں آیا اور نہ ہی میڈیا پر آیا۔ کیونکہ وہ لٹ جانے والی عزت کی تشہیر نہیں چاہتی تھی۔ مجھے دھڑکا تھا کہ کوئی میرے گھر میں بھی نہ گھس آئے۔

میں شام ہوتے ہی گھر کے دروازے بند کر لیتی تھی اور بچوں کو بھی باہر نہیں جانے دیتی تھی۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ بند دروازے ان لوگوں کو نہیں روک سکتے۔ مگر آدمی اپنے طور پر تو احتیاط کرتا ہے۔ میں اللہ سے یہی دعا کرتی تھی کہ مجھے اس جگہ سے عزت آبرو کے ساتھ نکالنا۔ ایک ہفتے بعد میرے موبائل کی بیل بجی اور اس پر ڈاکٹر صاحب کا نام آیا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے ایک مشہور سڑک پر ایک اپارٹمنٹ کمپلکس کا پتا بتایا اور بولے۔ ''آپ کل صبح گیارہ بجے وہاں آ سکتی ہیں؟''

اگلے دن اتوار تھا میں نے کہا۔ ''بالکل آ سکتی ہوں۔''

''میں وہاں گیارہ بجے آپ کو...... اسٹیٹ پر ملوں گا۔ اپارٹمنٹس کے فرنٹ پر ہے۔''

میں گوہر کے ساتھ گیارہ بجے وہاں پہنچی تو ڈاکٹر صاحب وہاں اسٹیٹ ایجنسی پر موجود تھے۔ وہ مجھے اندر لے گئے اور دوسرے فلور کا ایک فلیٹ دکھایا۔ یہ صاف ستھرا اور تقریباً اتنا ہی بڑا تھا جتنا کہ فراڈ والا فلیٹ تھا۔ دکھانے کے بعد انہوں نے پوچھا۔ ''آپ کو پسند آیا ہے؟''

''بھائی یہ تو میری توقع سے بڑھ کر ہے اور مجھے معلوم ہے یہ میرے وارے میں نہیں آئے گا۔''

''اسے چھوڑیں آپ کو مناسب لگا تو ٹھیک ہے آپ کل آ جائیے۔ لکھا پڑھی ہو جائے گی۔ جب آپ یہاں آ جائیں گے تو ساڑھے پانچ لاکھ دے دیجئے گا۔''

''لیکن یہ ساڑھے پانچ سے زیادہ......''

''اسے چھوڑیئے، بس آپ یہاں آنے کی تیاری کریں۔''

یہ اچھے فلیٹس تھے اور یہاں اچھی فیملیز رہتی تھیں دو دن بعد میں یہاں شفٹ ہو گئی اور اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فلیٹ میرے نام کرایا اور میں نے ان کو ساڑھے پانچ لاکھ دیئے۔ باقی انہوں نے اپنی جیب سے ڈالے۔ مجھے پتا چلا کہ یہاں اتنا بڑا فلیٹ دس لاکھ سے کم نہیں ہے۔ آج میں سکون سے اپنے بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں بیٹھی ہوں۔ اس کے لیے ڈاکٹر صاحب کو دعائیں دیتے نہیں تھکتی ہوں۔ جب نماز کے بعد اللہ کے حضور ہاتھ بلند کرتی ہوں تو پہلی دعا ان کے لیے نکلتی ہے۔ حالانکہ اس کے بعد نہ تو میں ان سے ملی اور نہ ہی کبھی کال پر بات کی۔ رابطے کے لیے کبھی کبھی ان کو میسج میں سلام دعا کہہ لیتی ہوں۔ بے شک ابھی مشکلات کم نہیں ہوئی ہیں لیکن ان سے مقابلہ کرنے کے لیے میرے پیروں تلے اپنی زمین موجود ہے۔

محترمہ عذرا رسول
سلام تہنیت

یہ سرگزشت میرے ایک اسٹوڈنٹ شرجیل کی ہے۔ اس کے ساتھ ایک مذاق ہوا۔ گائوں گوٹھ میں لڑکیاں اکثر ہونے والے دولہا سے شرارتیں کرلیتی ہیں لیکن اس کا اثر خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ شرجیل کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نتیجہ کچھ اور نکلتا۔ اس وقت سچویشن بالکل افسانے کہانی والی بن گئی تھی۔ آپ کو بھی لطف آئے گا۔ قارئین بھی پسند کریں گے۔

آصفہ ضیاء احمد
(حیدرآباد)

استاد کو وہ طلبا یاد رہ جاتے ہیں جو یا تو بہت زیادہ ذہین ہوں یا کند ذہن۔ دورانِ ملازمت میرا سابقہ بے شمار اسٹوڈنٹس سے پڑا۔ کچھ طلبا آج بھی یادداشت سے محو نہیں ہو پائے ہیں۔ شرجیل خان کا شمار بھی انہی طلبا میں تھا۔ شرجیل نہایت ہی محنتی، باصلاحیت اور ہونہار لڑکا تھا۔ گھر کے معاشی مسائل کی بنا پر والدین کا خیال تھا کہ وہ اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کردے لیکن اسکول کی پرنسپل مسز نورانی نے سختی سے اس کی مخالفت کی اور اسے آگے تعلیم جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ اس کے لیے انہوں نے ذاتی طور پر اس کی مالی معاونت کی اور اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے مسز نورانی کے انتقال پر شرجیل بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔ مسز نورانی کی وجہ سے ہی وہ سخت اور نامساعد حالات میں بھی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ ہسٹری میں ایم اے کرنے کے بعد اس نے Ph.D کی تیاری شروع کردی۔ اس کی تھیسس کا موضوع تھا ”سندھ کی قدیم تہذیب و ثقافت“ اپنی ریسرچ کے سلسلے میں اس نے صوبہ

سندھ کے ان مقامات کا دورہ کیا جہاں قدیم اور تاریخی عمارات ہیں۔ شرجیل چونکہ اکثر و بیشتر مجھ سے ملنے آیا کرتا تھا۔ دورانِ ملاقات اس نے ہی مجھے بتایا کہ "میڈم یہ قدیم اور ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہمارا قومی اثاثہ ہیں لیکن ہماری گورنمنٹ ان کی حفاظت میں جس غفلت کا مظاہرہ کررہی ہے اس سے تو یہی لگتا ہے کہ آئندہ نسلیں اس سرزمین پر نہیں بلکہ صرف تاریخ کی کتابوں میں ہی ان کے بھولے بسرے نشانات تلاش کرسکے گی۔ شرجیل کا تبصرہ حقیقت سے قریب تھا اس لیے میں نے ایک سرد آہ بھری اور خاموش ہوگئی۔ اس نے مجھے مزید بتایا کہ اپنے مقالے کی تیاری کے لیے اس نے لاڑکانہ سے کچھ کلومیٹر پر واقع ایسی بستی کا انتخاب کیا ہے جہاں یکسوئی سے وہ اپنا کام کرسکے گا۔ اس مقام سے تاریخی کھنڈر بھی قریب تھے۔ اس لیے اس نے وہیں قیام کا ارادہ کیا لیکن اس اجنبی جگہ پر قیام اور طعام اس کے لیے مسئلہ بنا ہوا تھا۔ آج اس سلسلے میں وہ میرے شوہر سے ملنے کے لیے آیا تھا کیوں کہ میرے شوہر بھی اپنی ملازمت کے دوران اس مقام پر چند سال رہے تھے اور وہاں کے رہائشی انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔ بلکہ کچھ لوگوں سے ان کی ٹھیک ٹھاک صاحب سلامت تھی۔ جب شرجیل نے اپنا مسئلہ ان سے بیان کیا تو انہوں نے گاؤں کے ایک معزز اور صاحب حیثیت کے نام ایک خط تحریر کر کے شرجیل کے حوالے کیا اور اسے تاکید کی کہ وہ بذاتِ خود ملاقات ہونے پر حاجی شفاعت اللہ کو یہ خط پیش کرے وہ ضرور اس کا مسئلہ حل کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔ چند روز بعد اس نے مجھے فون پر بتایا کہ "حاجی صاحب سے بالمشافہ ملاقات میں اس نے وہ لفافہ پیش کیا۔ حاجی صاحب نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے اور انہوں نے پلک جھپکتے اس کا مسئلہ حل کردیا۔" اپنے ہر ٹیلی فونک رابطے میں وہ حاجی صاحب اور ان کے خاندان کا ذکر بڑے خوب صورت پیرائے میں کرتا۔ ہمیشہ ان کی خوش اخلاقی اور ملنساری کے گن گاتا۔ پھر ایک دن اس نے مجھے ایک دھماکا خیز لیکن بڑی دل خوش کن خبر سنائی کہ اسے حاجی صاحب کی صاحبزادی مینا پسند آگئی ہے اور وہ اس سے شادی کا خواہش مند ہے۔ میں نے اور میرے شوہر نے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے اسے مبارک باد دی۔ چند مہینوں بعد جب اس کی شادی کا کارڈ ملا تو ہم دونوں نے اپنی معروفیت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کی شادی میں شرکت کی۔

وہاں جاکر میں نے ایک عجیب و غریب بات نوٹ کی۔ اس پُرمسرت گھڑی پر شرجیل کے چہرے پر بلا کی اداسی تھی بلکہ کسی حد تک وہ کافی مغموم، متفکر اور پریشان لگ رہا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور موقع ملتے ہی میں نے کریدنے کی کوشش کی۔ اس نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ سے میں چھپاؤں گا کچھ نہیں۔ لیکن ابھی فی الفور کچھ نہیں بتا سکتا۔ موقع محل دیکھ کر سارا واقعہ آپ کے گوش گزار کروں گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں ایک ایسے بھنور میں پھنس گیا ہوں جہاں لاکھ ہاتھ پیر مارنے کے باوجود میں دھنستا ہی جارہا ہوں۔" بولتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

میں فوراً وہاں سے ہٹ گئی۔ کیونکہ وہ کافی جذباتی ہو گیا تھا۔ اس کے اس جواب سے میں نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا کہ معاملہ کافی سنجیدہ اور پُراسرار ہے۔ وہاں سے آنے کے بعد بھی میں کافی عرصے تک شرجیل کے بارے میں سوچتی رہی۔ قیاس آرائیوں سے الجھتی رہی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں اخذ کرسکی۔ میں اس کی آمد کی منتظر تھی۔ بالآخر وہ ایک نہایت ضروری کام سے میرے شوہر کے پاس آیا تو میں نے اس کی اور اس کی بیوی کی خیریت پوچھنے کے بعد فوراً سوال داغ دیا کہ شرجیل نکاح والے دن تم اتنے پریشان اور حواس باختہ کیوں تھے؟"

میرے اس استفسار پر وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ اب اس کا چہرہ خوشی اور مسرت سے کھلا ہوا تھا۔ پہلے پہل تو وہ ٹال مٹول کرتا رہا لیکن پھر ہم دونوں کے اصرار پر اس نے جو داستان سنائی وہ کافی دلچسپ اور پُرلطف ہے۔ اس لیے سرگزشت کے قارئین کے لیے میں نے من وعن اسے الفاظ کا جامہ پہنایا۔ زبان شرجیل کی ہے اور الفاظ میرے ہیں۔ مجھے اُمید ہے ہم دونوں میاں بیوی کی طرح آپ بھی اس سے لطف اندوز ہوں گے۔ اس نے اپنی کہانی اپنی زبانی کچھ اس طرح سنائی۔

☆......☆

شفاعت اللہ صاحب سے میری تو کوئی واقفیت نہیں تھی لیکن ان تک پہنچنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لاڑکانہ تک میرا اسفر ٹرین کا رہا۔ اس کے بعد میں بائی بس اس چھوٹے سے گاؤں میں پہنچا رکشے والے کو جیسے ہی پتا بتایا اس نے بغیر کسی تامل کے مجھے حاجی صاحب کی حویلی تک پہنچا دیا۔ اب میں ان کے انتظار میں ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ آپ لوگوں کی وساطت سے پہنچا تھا اس

لیے دل کو اطمینان تھا کہ میرا کام ضرور ہو جائے گا۔ میں اپنی سوچوں میں غرق تھا۔ طویل سفر کر کے آرہا تھا اس لیے تھکان بھی تھی لیکن آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں کہ حاجی صاحب کب شرف باریابی کا موقع عنایت فرماتے ہیں۔ معاً میں اپنی تصوراتی دنیا سے نکل آیا کیونکہ اچانک دروازے کے اطلسی اور دبیز پردے کی اوٹ سے ایک چار سالہ گول مٹول اور خوب صورت بچہ بھاگتا ہوا آیا اور میرے پیروں سے لپٹ گیا اور اپنی توتلی زبان میں ملتجی لہجے میں بولا۔ ”انکل مجھے آپ جلدی سے اپنی گود میں چھپا لیجیے ورنہ آج مینا پھوپو میری پٹائی کر دیں گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ میری آغوش میں منہ چھپا کر بیٹھ گیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے اس کی خوب صورت پیشانی کو بوسہ دیا اور اس کی طفلانہ شرارت پر مسکرانے لگا۔ اچانک پھر پردے کو جنبش ہوئی اور پھر ایسا محسوس ہوا جیسے پردے کی اوٹ سے کوئی چاند نکل آیا ہو۔ ہر طرف اجالا ہی اجالا بکھر گیا۔ اتنا مکمل اور بھرپور حسن میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں زندگی بھر اسے دیکھتا ہی رہوں۔ اس حسینہ نازنین کو دیکھتے ہی بچے کی گرفت اور مضبوط ہو گئی اور ہاتھوں کا گھیرا بھی تنگ ہو گیا۔ اس ماہ جبیں کی نگاہیں جیسے ہی میری نظروں سے ٹکرائیں۔ وہ گھبرا کر واپسی کے لیے پلٹی اور لڑکھڑا کر پردے سے الجھ گئی۔ پھر فوراً سنبھل کر اپنا دوپٹا ٹھیک کیا اور اتنی تیزی سے غائب ہوئی کہ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ جیسے ہی وہ حسنِ مجسم نگاہوں سے اوجھل ہوا میں بھی اپنے ہوش و حواس میں آ گیا۔ اسی وقت حاجی شفاعت اللہ صاحب تشریف لے آئے۔ انتہائی تپاک سے میرا خیر مقدم کیا اور جب میں نے آپ کا تحریر کردہ خط ان کے حوالے کیا تو اپنی نشست سے اٹھ کر بغل گیر ہوئے۔ خط پڑھنے کے بعد انہوں نے اپنی رہائش گاہ پر قیام کی دعوت دی لیکن میں نے بغیر کسی جھجک اور تامل کے ان کی پیش کش ٹھکرا دی۔ کیونکہ مجھے اسٹڈی کے لیے مکمل یکسوئی اور تنہائی کی ضرورت تھی۔ حالانکہ پاگل دل مسلسل تکرار کر رہا تھا کہ یہاں رہنے میں بڑے فائدے ہیں۔ گاہے بگاہے رخِ یار کا دیدار ہو سکتا ہے لیکن میں نے دل ہی دل میں لاحول پڑھتے ہوئے شیطان مردود کو دور بھگایا اور حاجی صاحب سے محوِ گفتگو ہو گیا۔ اس دوران وہ شریر اور نٹ کھٹ بچہ بھی وہاں سے نو دو گیارہ ہو چکا تھا۔ ایک دن اور ایک رات مجھے حاجی صاحب کے گھر ہی قیام کرنا پڑا، کیوں کہ میرے کام کو مدِنظر

رکھتے ہوئے وہ میرے لیے ایسا گوشۂ عافیت کی تلاش میں تھے جہاں کسی قسم کی کوئی مداخلت یا شور و غل نہ ہوا۔ ان کے دونوں صاحبزادے نعمان اور سفیان بھی مجھ سے نہایت اخلاق سے پیش آئے اور دونوں نے میرا مسئلہ چٹکی بجاتے حل کر دیا۔ گاؤں کے کچے پکے گھروں سے پرے کھیت کھلیانوں کے قریب ایک عمارت میں میری رہائش کا انتظام کیا گیا۔ عمارت قدیم طرزِ تعمیر کا شاہکار تھی۔ اس کی منڈیریں اور مخروطی چھتیں بتا رہی تھیں کہ یقیناً کسی باذوق اور باحیثیت شخص نے اسے تعمیر کروایا ہو گا۔ بہرحال مجھے صرف دو کمروں کی ضرورت تھی۔ میری ایما پر حاجی صاحب نے مالکان سے بات کی جو کہ فی الحال لندن میں رہائش پذیر تھی۔ جیسے ہی انہوں نے اپنی رضامندی ظاہر کی میں فوراً حاجی صاحب کے گھر سے اس بلند و بالا حویلی میں چلا آیا۔ میرے لیے ایک خانساماں کا بھی انتظام کر دیا گیا تھا۔ صفائی ستھرائی بھی وہی کر دیتا تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں ایک کمرے میں اپنی لائبریری ترتیب دی۔ میرا کک آغا محمد میرا ہیلپر بنا ہوا تھا۔ آغا محمد نہایت تیز و طرار اور محنتی شخص تھا۔ میں اسے آغا جی کہہ کر پکارتا اور وہ تیر کی طرح چلا آتا۔ کھانا بھی لذیذ اور چٹ پٹ بناتا۔ میں حاجی صاحب اور ان کے دونوں بیٹوں کا بہت مشکور تھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے میرے کام میں بڑی آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ آغا جی فجر کی نماز کے بعد ہی اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جاتا تھا۔ وہ میرے لیے ناشتا تیار کر رہا ہوتا اور میں گاؤں کی سیر کے لیے نکل پڑتا۔ ٹیڑھے میڑھے راستے پھلانگتے ہوئے گاؤں کی سب سے بڑی گزرگاہ پر بھی ہو لیا کرتا۔ جو شاید چند مہینے پہلے ہی پختہ بنائی گئی تھی ورنہ یہ بھی پگڈنڈی ہی ہو گی۔ گاؤں کی عطر بیز اور ٹھنڈی ہواؤں سے نہ صرف دل و دماغ معطر ہو جاتے بلکہ روح کے تار بھی جھنجھنا اٹھے۔ حدِ نگاہ تک ہریالی ہی ہریالی نظر آتی۔ گاؤں کی واحد چھوٹی سی جھیل پر نوعمر لڑکے غوطہ خوری کی مشق کر رہے ہوتے۔

گاؤں میں چونکہ میں نو وارد تھا۔ اس لیے ان میں سرگوشیانہ بھنبھناہٹ شروع ہو گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ان کا موضوعِ سخن میں ہی ہوں۔ میں سبک خرامی کے ساتھ آگے بڑھ جاتا۔ کبھی کبھی میں گاؤں کے تجارتی مرکز سے بھی گزرتا۔ یہ حصہ دکانوں ہوٹلوں اور بس اسٹینڈ پر مشتمل تھا۔ یہاں گہما گہمی اور رونق ہوتی۔ یہاں سے میں واپسی کے لیے مڑ جاتا۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچتا تو آغا جی گرما گرم ناشتا

اور لسی کا گلاس سامنے رکھ دیتا۔

میں نے اسی روز سے اپنے کام کا آغاز کردیا تھا۔ کام کے دوران اکثر وہ حسین سراپا میری نظروں کے سامنے آجاتا۔ میں اپنے چشمِ تصور سے دیکھتے ہوئے اسے اتنے قریب محسوس کرتا کہ اس کی اور میری سانسیں ہم آہنگ ہو جاتیں۔ آغا جی چونکہ حاجی صاحب کے مقرب اور بھروسے کے آدمی تھے۔ کچھ عرصہ ان کے گھر میں بطور خانساماں کام بھی کر چکے تھے۔ اس لیے ان کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ مینا، حاجی صاحب کی بیٹی ہے اور لقمان اور سفیان سے چھوٹی ہے اور وہ بچہ نعمان کا بیٹا ہے۔ بہوؤں اور بیٹیوں کو مردانہ حصے میں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ آغا جی کی باتوں سے میں نے اندازہ لگالیا کہ اس روز بھتیجے کے تعاقب میں مینا آ تو گئی تھی لیکن اس لیے وہ بری طرح گھبرا گئی تھی کہ خواتین کے لیے وہ ناگوار یا تھا۔ آغا جی نے باتوں باتوں میں یہ بھی بتادیا کہ حاجی صاحب بیٹی کے لیے ایسے لڑکے کی تلاش میں ہیں جو نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو بلکہ اگر حصولِ علم کے لیے باہر جانا چاہتا ہو تو وہ مالی معاونت کے لیے بھی تیار ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ علم کا دلدادہ ہو کیونکہ حاجی صاحب نے مینا بٹیا کو بھی خوب پڑھایا ہے۔ مینا کی کیا کوالیفکیشن ہے۔ وہ کہاں تک پڑھی ہے۔ یہ سب باتیں آغا جی کی عقل سے نابلد تھیں۔ بس انہوں نے یہی بتایا کہ شہر سے وہ بہت پڑھ لکھ کر آئی ہیں۔

آغا جی کی باتیں سن کر سازِ دل پر نغمے مچلنے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے قدرت نے اس لڑکی کو میرے لیے ہی تخلیق کیا ہے۔ کچھ دنوں کے لیے میں نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو بریک دیا۔ اپنا عارضی ٹھکانا آغا جی کے حوالے کیا اور والدین سے ملنے کے لیے عازمِ سفر ہوا جب میں نے والدین کے سامنے یہ بات رکھی اور اپنی پسند کا اظہار کیا تو جیسے گھر میں بھونچال آگیا۔ کیوں کہ ہمارے خاندان میں شادیاں عموماً برادری اور خاندان میں ہوتی تھیں بلکہ اماں بابا میرے لیے دور دراز کی رشتے داروں میں ایک لڑکی پسند بھی کر چکے تھے جب کہ اس لڑکی کو آج تک دیکھنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اماں بابا میری پسند کے یکدم خلاف تھے۔ میں نے فی الفور خاموشی اختیار کی لیکن ہمت حوصلے کے ساتھ ڈٹا رہا۔ مینا کے علاوہ میں کسی اور لڑکی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ گھر آئے ہوئے مجھے تقریباً تین روز گزر چکے تھے۔ میرے کام کا کافی حرج ہو رہا تھا اس لیے میں نے واپسی کی تیاری شروع کردی۔ اپنی مہم کی باگ ڈور چھوٹی بہن کے حوالے کی کہ کسی طرح اماں بابا کو منا سمجھا کر مینا کے لیے راضی کرو۔ میں بطور انعام تمہیں بہترین کوالٹی کا موبائل دوں گا۔ میری چھوٹی بہن علینہ خوشی سے۔۔۔۔ اچھل پڑی اور اس نے فوراً وعدہ کیا۔ ”بس بھائی اللہ تعالیٰ کے بعد سارا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں بہت جلد آپ کو خوش خبری سناؤں گی۔“

میرے دل و دماغ پر سے ایک بھاری بوجھ ہٹ گیا اور میں نے اپنی تیاری شروع کردی۔ میں اپنے کپڑے سمیٹ رہا تھا کہ موبائل کے ننھے منے اسکرین پر ایک نیا نمبر دیکھ کر میں چونک گیا۔ موبائل مسلسل چیخ رہا تھا اس لیے اٹھا کر کانوں سے لگایا اور دہاڑا۔ ”ہیلو کون ہے۔“ جواب میں ایک شیریں آواز سماعت سے ٹکرائی۔ ”جی میں فائزہ بول رہی ہوں۔“ میں نے ہڑ بڑا کر کہا۔ ”کون فائزہ محترمہ میں آپ کو بالکل نہیں جانتا۔ یقیناً رانگ نمبر لگ گیا ہے۔“

اس نے گھبراہٹ آمیز لہجے میں ترنت کہا۔ خدا کے لیے فون بند نہ کریں۔ میں اپنا تعارف کروا رہی ہوں۔ کچھ لمحوں تک مکمل خاموشی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا میرا مخاطب گہری سوچ میں غرق ہے۔ میں نے چند سیکنڈ انتظار کے بعد دوبارہ ہیلو کہا اور کھنکھار کر احساس دلایا کہ اب وہ اپنا نام پتا بتا ہی دے۔ فوراً ہی مواصلاتی رابطے میں جان پڑ گئی اور لڑکی نے کہنا شروع کیا۔ ”شرجیل صاحب آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں بلکہ میرے گھر میں روزانہ آپ کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ میرا نام فائزہ ہے۔ بی ایس سی کی اسٹوڈنٹ ہوں اور رشتے میں آپ کی کزن لگتی ہوں لیکن کچھ روز قبل میری امی نے مجھے بتایا کہ عنقریب ہم دونوں کا یہ رشتہ ختم ہو جائے گا اور ہم دونوں ایک نئے رشتے میں منسلک کردیے جائیں گے۔“

میں نے ایک ہنکارا ابھرا۔ اب ساری بات کھل کر سامنے آگئی تھی۔ مجھے یقین کامل تھا۔ اب یہ محترمہ فوراً ایسی گفتگو کی شروعات کریں گی جسے سن کر میرے دل۔۔۔ میں لاکھوں دیئے جل اٹھیں گے اور پھر جواب میں، میں بھی مدھ بھری شہد جیسی میٹھی میٹھی باتیں اس کے کانوں میں ٹپکاؤں گا اور پھر یہ سلسلہ چل پڑے گا اور نئی لو اسٹوری جنم لے گی لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس نہ اس نے عشقیہ شعر سنائے اور نہ میں نے محبت کے نغمے الاپے۔ اس نے نہایت ٹھوس اور مستحکم لہجے میں کہا۔ ”شرجیل صاحب آپ کو میرا ایک کام

کرنا ہوگا اُمید ہے آپ انکار نہیں کریں گے۔" میرا دل زور سے دھڑکا۔ اعصاب میں تناؤ سا پیدا ہوگیا۔ لیکن اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے میں نے استفسار کیا۔
"جو بھی کام ہے آپ حکم کریں اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور کروں گا۔"
فائزہ کی چہکتی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ "وعدہ"
میں نے نہایت پختہ لہجے میں کہا۔ "پکا وعدہ، آپ کہیے تو سہی میں سر کے بل کروں گا۔"
وہ بلا کسی تمہید کے فوراً بولی۔ "آپ اس شادی سے انکار کردیجیے۔"
اس کے اس جملے پر میں اچھل پڑا۔ بات تو میرے حق میں جارہی تھی لیکن پھر بھی میں سوال کیے بنا نہیں رہ سکا۔ میں نے استعجاب انگیز لہجے میں کہا۔ "شادی سے انکار لیکن کیوں...... آخر کیا خرابی ہے مجھ میں۔"
فائزہ فوراً گھبرا کر بولی۔ "یہی تو ایک خرابی ہے کہ آپ میں کوئی خامی یا خرابی نہیں ہے اسی لیے تو میرے والدین آپ پر فدا ہیں کہ ان کے ہونے والا داماد بے شمار خوبیوں کا مالک ہے لیکن میں برادری سسٹم کے تحت ہونے والی شادیوں کے سخت خلاف ہوں۔ آج سے چودہ سو سال پہلے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس قسم کی شادیوں کو پسند نہیں فرمایا۔ آج میڈیکل سائنس بھی اس طرح کی شادیوں کی مخالفت کررہی ہے۔ آپ خود بھی ایک تعلیم یافتہ انسان ہیں اور میں نے بھی چار لفظ پڑھنے کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ میں خاندان میں شادی نہیں کروں گی۔ آپ میرے انکار سے یہ نتیجہ نہ اخذ کیجیے گا کہ اللہ نہ کرے میرا کوئی لو افیئر چل رہا ہے۔ بخدا نہ میں اس قسم کی باتوں کو پسند کرتی ہوں اور نہ میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ ہے۔ اگر آپ ایسا سوچ رہے ہیں تو یہ آپ کی خام خیالی ہے۔ میں تو اپنے والدین کے سامنے انکار کرچکی ہوں لیکن وہ آپ لوگوں سے اور برادری والوں سے خوف زدہ ہیں اگر آپ کا جواب بھی انکار میں رہا تو پھر یہ معاملہ ضرور نمٹ جائے گا۔"
میں نے اپنی الجھی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے استفسار کیا۔ "محترمہ اگر میرے والدین اور خاندان والے اس سلسلے میں باز پرس کریں گے تو تب میں کیا جواز پیش کروں گا۔"
اس بار فائزہ نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ "سوکا ایک جواب دیجیے کہ یہ سویوں کی طرح الجھے رشتوں کو اب آپ مزید الجھانا نہیں چاہتے اور پھر آپ غور فرمائیے اب ہمارے خاندان میں جو نئی پود جنم لے رہی ہے کیا وہ نارمل نسل ہے۔ فہیم چچا کے گھر دو بچے گونگے ہیں، شاکرہ پھوپو کے سارے بچے غبی، کند ذہن اور سست ہیں۔ یہ تو میں بطور مثال صرف چند نام گنوا رہی ہوں اور بھی ہمارے عزیزوں میں آپ کو اس طرح کے بچے نظر آئیں گے۔ کیا ابھی بھی ہم احتجاج نہیں کریں گے۔" میں نے ایک پُرسکون سانس لی اور تشکرانہ لہجے میں اسے اللہ حافظ کہا۔
فائزہ سے گفتگو کرنے کے بعد دل کو اطمینان اور تقویت نصیب ہوئی کہ میں جو کچھ کررہا ہوں ٹھیک کررہا ہوں۔ بلکہ اپنے ساتھ ساتھ میں نے علینہ کے لیے بھی فیصلہ کرلیا کہ اس کی شادی کسی کزن سے نہیں ہونے دوں گا۔ بہت زیادہ آپسی شادیاں کتنی خطرناک اور ہولناک ہوتی ہیں اس سے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں فائزہ کا مشکور تھا اس نے بروقت میری آنکھیں کھول دیں۔
گھر سے رخصت وقت جب اماں بابا کی خدمت میں سلام عرض کیا تو دونوں نے انتہائی بے نیازی اور روکھے پن سے میرے سلام کا جواب دیا۔ نہ اپنا دستِ شفقت میرے سر پر رکھا اور نہ اپنی دعاؤں سے نوازا۔ دل کا بوجھل پن اور اداسی اور بڑھ گئی۔ میں نے نہایت پامردی سے کام لیتے ہوئے سب کو الوداع کہا۔ تنکے کا سہارا علینہ تھی۔ اس نے رقت آمیز لہجے میں مجھے سلام کیا اور سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ "بھائی گھبراؤ نہیں۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔"
طویل سفر طے کرکے جب میں اپنے آشیانے میں داخل ہوا تو موڈ یکدم خوشگوار ہوگیا۔ طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ میری عدم موجودگی میں آغا جی نے نہ صرف گھر کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا تھا بلکہ صاف و شفاف آئینے کی طرح چمکا دیا تھا۔ بلکہ تازہ رنگ و روغن بھی کردیا تھا جس سے گھر کے در و دیوار چمک اٹھے تھے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں نے پھر اپنا کام شروع کردیا اور رات گئے تک اپنے کام میں مصروف رہا۔ صبح دیر تک سوتا رہا۔ نیند سے جاگنے کے بعد جب فریش ہوا ناشتے کی میز پر آیا تو آغا جی نے ایک دھماکا خیز خبر سنائی کہ مینا بی بی کے رشتے کے سلسلے میں حاجی صاحب کے دولت کدے پر کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ یہ سنتے ہی دل کی نیا ہچکولے کھانے لگی۔ تصور میں مینا کی جھیل جیسی آنکھوں اور تراشیدہ لبوں نے ہلچل مچا رکھی تھی۔ فطری طور پر حسن پرستی میری سرشت میں لکھی ہوئی تھی۔ میں اس بت طناز کو

کھونا نہیں چاہتا تھا۔ آغا جی مسلسل اپنی ہانکے جارہا تھا اور میں خالی الذہنی کے ساتھ انہیں سن رہا تھا۔ میرے خواب مجھے ٹوٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

آغا جی کے جانے کے بعد میں گہرے تفکرات میں گم اپنی نشست پر بیٹھا رہا۔ آغا جی میرا کھانا پکا کر رکھ گیا تھا لیکن اس روز مجھ سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ کافی غور و فکر کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ علینہ سے گفت و شنید کی جائے کہ اس نے معاملہ کہاں تک پہنچایا ہے۔ علینہ سے رابطہ کرنے پر اس نے مجھے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میرے آنے کے بعد اماں بابا کا مشترکہ فیصلہ یہ تھا کہ مینا کو کڑوی گولی سمجھ کر نگل تو لیں گے لیکن ایک بہو کو جو مان سمان دیا جاتا ہے۔ وہ اسے نہیں دیا جائے گا۔ نکاح کے بعد رخصت کروا کر تو لے آئیں گے لیکن پھر مجھے فوراً اسے لے کر علیحدہ ہونا پڑے گا۔ اماں اور بابا ایک پل بھی اپنے گھر میں اپنے ساتھ اسے رکھنے کے لیے رضامند نہیں تھے۔ دنیا دکھاوے کے لیے عید تہوار پر ہم دونوں وہاں جا تو سکتے تھے لیکن ٹھہرنے کے مجاز نہیں تھے۔ اتنی کڑی شرائط میری تو جان ہی نکل گئی۔ مجھ میں اب مزید کچھ اور سننے کی سکت نہیں تھی۔ بدقت تمام میں نے کہا۔ ”علینہ اماں بابا کے بغیر تو میں جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ میں اپنی پسند کو ان کی خواہش پر قربان کرتا ہوں۔“

علینہ نے گھبرا کر کہا۔ ”ارے ارے بھائی یہ آپ کیا کررہے ہیں۔ کہیں لکڑی مارنے سے پانی جدا ہوتا ہے یہ غصہ یہ ہٹ دھرمی سب وقتی اور عارضی ہے۔ آپ ان کے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ساری رنجشیں ختم ہوجائیں گی۔ آپ اس طرح کی مایوسی کی باتیں آئندہ نہ کیجیے گا۔ بابا عنقریب حاجی صاحب سے ملاقات کرنے والے ہیں۔“

علینہ سے بات کرنے کے بعد موڈ نہایت خوشگوار اور شگفتہ ہوگیا۔ مینا میری ہم قدم بن کر ساری زندگی میرے ساتھ چلے گی یہ تصور اتنا خوش کن تھا کہ دل میں اُمیدوں اور آرزوؤں کی جھانجریں بج اٹھیں۔

اماں اور بابا کے ساتھ ایک مشاورت ہوئی اور میں نے ان کی ہر شرط پر لبیک کہا۔ دونوں کو یہ اُمید تھی کہ مجھے ان کی جدائی گوارا نہ ہوگی اور میں فوراً اس شادی کے لیے ناں کردوں گا لیکن میرا ریموٹ علینہ کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے میں اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا۔ اماں بابا کے اداس چہرے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو میرے قدم لڑکھڑائے لیکن پھر مجھے فوراً فائزہ کا خیال آیا۔ میں اس سے بھی وعدہ کرچکا تھا کہ میں برادری میں شادی نہیں کروں گا۔ بہرحال محض میری ضد اور خوشی کی خاطر میرے والدین نے سنگِ گراں اپنے دلوں پر رکھ لیا۔ اماں نہ خود آئیں اور نہ علینہ کو آنے کی اجازت دی۔ تن تنہا بابا میرے کمرے پر تشریف لائے اور میں نے آغا جی کے ذریعے بابا کی ملاقات حاجی صاحب سے کروادی۔ حاجی صاحب بابا کی متاثر کن شخصیت سے بے حد مرعوب ہوئے۔ بہت زیادہ اصرار کرکے بابا کو اپنے گھر قیام کرنے پر مجبور کیا تاکہ حقِ مہمانداری ادا کرسکیں لیکن بابا جس مقصد کے تحت آئے تھے وہ کام کرکے انہوں نے فوری واپسی کا قصد کیا۔ میں بھی اپنی جگہ بہت زیادہ مجبور اور بے بس تھا کیونکہ میرے ساتھ بابا کا رویہ اب یکسر مختلف تھا۔ اب وہ مجھ سے اسی وقت بولتے جب میں ان سے کوئی سوال کرتا ورنہ ہمہ وقت ہم دونوں کے درمیان ایک تناؤ اور کشیدگی کی فضا قائم رہتی۔ یہ چیز میرے لیے نہایت تکلیف دہ تھی۔ بارہا دل چاہا کہ اپنا سر بابا کے قدموں میں رکھ کر ان سے معافی طلب کروں اور اپنا فیصلہ تبدیل کرلوں لیکن علینہ وقتاً فوقتاً مجھے فون پر ہدایت کرتی کہ گزرتا وقت خود بخود سارے مسئلے حل کردے گا۔ اس کی تسلی آمیز باتوں سے دل کو ڈھارس بندھی ہوئی تھی۔ حاجی صاحب کے گھرانے نے میرا رشتہ بغیر کسی رد و کد کے قبول کرلیا۔ ہاں البتہ شادی کی تیاری کے لیے کچھ دنوں کی مہلت ضرور مانگی۔ جو میرے والدین نے بخوشی دے دی۔ دونوں جانب شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں لیکن میرے گھر میں وہ خوشی وہ رونق نہیں تھی جو عموماً ایسے موقعوں پر ہوتی ہے۔ نہ اماں، بابا کے چہروں پر کوئی خوشی اور مسرت تھی۔ بس خوش تھے تو میں اور علینہ۔ بری کے جوڑوں کی تیاری اور شادی کی دوسری تمام شاپنگ علینہ نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ وہ اپنی تمام ذمہ داری بڑی خوب صورتی سے نبھا رہی تھی۔ مجھے اپنی اس ننھی منی بہن پر ٹوٹ کر پیار آرہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنا سب کچھ اس پر وار دوں۔ اماں بابا کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر وہ ہر کام میں پیش پیش تھی۔ اپنی سہیلیوں کو اکٹھا کرکے وہ ڈھولکی پر فلمی غیر فلمی گیت الاپتی تو پتا چلتا کہ اس گھر میں عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ علینہ کے دم سے ہی گھر میں گہما گہمی اور ہنگامہ تھا۔ مینا کو دیکھنے اور ملنے کی اسے بڑی آرزو تھی لیکن بابا کے خوف سے وہ دم سادھے ہوئے تھی۔

کیونکہ بابا نے انتہائی سخت الفاظ میں اپنا حکم صادر کردیا تھا کہ دلہن کو رخصتی کے بعد یہاں لاکر رونمائی کی رسم ادا کی جائے گی تب ہی سب چہرہ دیکھیں گے اور پھر کچھ عرصہ بعد دونوں کو علیحدہ گھر میں شفٹ کردیا جائے گا۔ بابا کے سامنے کسی کو دم مارنے کی ہمت نہیں تھی۔ مجھے برادری اور خاندان والوں کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ لوگ بھی شاید میری شادی میں شرکت نہ کریں لیکن میری برادری کے لوگ امن پسند اور سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ رشتہ ختم ہونے پر فائزہ اور اس کے والدین نے ہی کوئی اثر نہیں لیا تو پھر کسی اور کو روٹھنے کی کیا ضرورت۔ انہوں نے راہ میں روڑے اٹکانے کی بجائے بخوشی شادی کی اجازت دے دی۔ اس سے دل کو کافی تقویت اور اطمینان ہوا کہ میرے خاندان والے مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔

میں اپنا مقالہ جلد سے جلد مکمل کرنا چاہتا تھا تاکہ شادی کے بعد زیادہ سے زیادہ وقت مینا کو دے سکوں۔ پچھلے چند دنوں سے میری مصروفیت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ حیدرآباد، کراچی سے اچانک دوستوں کا ایک گروپ وارد ہوگیا تھا۔ ان لوگوں کا پروگرام ہڑپہ، موہن جو دڑو کی سیر کا تھا۔ یہ وزٹ میرے لیے بھی نہایت اہمیت کا حامل تھا۔ اس لیے میں بھی اپنی تمام مصروفیات ترک کرکے اس گروپ کے ساتھ ہولیا۔ واپسی میں ان لوگوں نے اپنی اپنی راہ لی اور میں بھی تھکا ہارا اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ تکان سے سارا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ فریش ہونے کے لیے میں فوراً باتھ روم میں جا گھسا۔ آغاجی نے برق رفتاری سے میرے لیے کھانا تیار کیا جیسے ہی کھانا معدے میں اترا۔ آنکھوں میں ٹوٹ کر نیند آئی۔ آغاجی کی چھٹی میں نے وقت سے پہلے ہی کردی۔ دروازہ اندر سے بند کرکے میں ایسی غفلت کی نیند سویا کہ مجھے کچھ ہوش نہیں۔ رات کا پتا نہیں کون سا پہر تھا کہ میں اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نیند کا خمار کچھ کم ہوا تو احساس ہوا کہ کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ آنکھیں ملتے ہوئے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا تو پتا چلا کہ اس کے تو سیل ہی ختم ہو چکے ہیں۔ گھڑی کی ساکت اور جامد سوئیاں مجھے منہ چڑا رہی تھیں۔ اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالی تو پتا چلا کہ رات کے پونے بارہ بج رہے ہیں۔ دروازے پر دستک مسلسل ہورہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آنے والا اندر آنے کے لیے بہت بے چین اور بے قرار ہے۔ ایک طویل انگڑائی لے کر میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن اچانک میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا کہ اس اجنبی جگہ پر میری نہ کسی سے شناسائی ہے اور نہ دوستی پھر اس سونی رات میں یہ اچانک کون نازل ہوگیا۔ آغاجی کا خیال آیا۔ لیکن اپنے اس خیال کو میں نے فوراً مسترد کردیا کیونکہ آغاجی کبھی دروازے پر دستک نہیں دیتے تھے بلکہ زور سے دروازہ دھڑ دھڑاتے تھے اور ان کی آمد نماز فجر کے بعد ہوتی تھی۔ پھر آخر دروازے پر ہے کون؟ میں اسی ادھیڑ بن، شش و پنج میں مبتلا تھا اور ادھر دستک کی آواز شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔ میں نے جمائی لیتے ہوئے بھاری آواز میں استفسار کیا ”کون ہے؟“

جواب ندارد۔ مکمل خاموشی، دستک کی آواز بھی تھم گئی۔ میں نے اس بار ٹھوس لہجے میں قدرے تیز آواز میں کہا۔ ”کون ہے؟ اپنا نام اور اتا پتا بتائیں تب میں دروازہ کھولوں گا۔“

جواب میں ایک نسوانی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ”جی میں حاجی صاحب کی بیٹی ہوں اور آپ کے پاس ایک بہت اشد ضروری کام سے آئی ہوں۔ برائے مہربانی دروازہ کھولیے، میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔“

میں اپنی جگہ حیران ششدر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ پیر جیسے زمین نے پکڑ لیے۔ مینا اتنی رات میں میرے دروازے پر......! آخر ایسی کون سی افتاد آن پڑی جو وہ گھر سے تن تنہا اس وقت نکل پڑی۔ شہروں میں بسنے والوں کے لیے رات کا یہ عمل کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن گاؤں گوٹھ دیہاتوں میں اس وقت لوگوں کی آدھی نیند ہو جاتی ہے۔ ہر طرف سناٹا اور ہو کا عالم ہوتا ہے۔ خواتین اور لڑکیاں دن کی روشنی میں بھی وقتِ ضرورت باہر نکلتی ہیں تو ڈھکی چھپی اور باپردہ۔ حاجی صاحب کا گھرانا تو اس معاملے میں انتہائی سخت اور بااصول تھا۔ مینا کا اتنی رات میں ٹھیک ٹھاک فاصلہ طے کرکے میرے گھر تک آنا میرے لیے انتہائی حیرت ناک اور تعجب خیز تھا۔ وہ لاکھ میری منگیتر سہی لیکن فی الحال تو میرے لیے غیر تھی۔

دل و دماغ میں شور برپا تھا۔ بہرحال اپنے حواسوں کو قابو کرکے میں نے لرزیدہ ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا لیکن جیسے ہی اس لڑکی پر میری نگاہیں پڑیں میں اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ وہ لڑکی مینا نہیں بلکہ میرے لیے ایک انجان اور اجنبی لڑکی تھی۔ میں پہلی بار اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ بڑی سی چادر

میں لپٹی لپٹائی معمولی اور دبے دبے نقش و نگار کی حامل وہ محترمہ نظریں جھکائے کھڑی تھیں۔ میں تو سمجھ رہا تھا میرے سامنے وہ پری پیکر کھڑی ہوگی، جسے دیکھ کر میرے دل نے گنگنانا شروع کیا تھا لیکن یہاں تو معاملہ ہی اس کے برعکس تھا۔ میرے دماغ میں شک کے ناگ نے پھن اٹھایا کہ مجھے کسی سازش کا شکار تو نہیں بنایا جا رہا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں چوکنا ہوگیا۔ گرد و پیش میں نظر ڈالی تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ لڑکی کے چہرے سے بھی گھبراہٹ اور بدحواسی مترشح تھی۔ وہ متوحش آنکھوں سے مجھے تک رہی تھی۔ میں دروازے میں کھڑا تھا اس لیے اندر اُس کا داخلہ ناممکن تھا۔ جب کہ وہ لڑکی انٹری کے لیے بے چین اور بے قرار تھی۔

میں نے تلخ اور طیش آمیز لہجے میں کہا۔ ''محترمہ میں آپ کو بالکل نہیں جانتا۔ آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ حاجی صاحب کی بیٹی قطعاً نہیں ہیں۔ ان کی صاحبزادی مینا میری منگیتر ہے اور میں اسے دیکھ چکا ہوں۔''

لڑکی نے اداس اور مغموم نظروں سے مجھے نگاہ بھر کر دیکھا اور متنفر ہوئی۔ ''آپ شرجیل صاحب ہی ہیں ناں جس سے مینا کا رشتہ طے پایا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جی بالکل ٹھیک پہچانا آپ نے۔ اب آگے فرمائیے کیا مسئلہ ہے آپ کا۔''

لڑکی نے ایک دبی ہوئی سانس خارج کی اور اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کب تک مجھے یوں ایستادہ رکھیں گے۔ اگر آپ دروازے سے ہٹ کر مجھے راستہ دیں تو میں ایک ایسا انکشاف کروں گی جسے سن کر آپ اچھل پڑیں گے۔''

''ہوں۔'' میں نے ایک لمبا ہنکارا بھرا اور پُرتجسس نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پرے سرک گیا۔

کمرے میں داخل ہو کر وہ طائرانہ نظروں سے بیٹھنے کے لیے نشست تلاش کرنے لگی۔ میں نے اپنی اکلوتی کرسی اسے پیش کردی اور خود اپنے بیڈ پر براجمان ہوگیا۔ دل کی دھڑکنیں ابھی بھی زیر و زبر تھیں کہ اس وقت ہم دونوں کو کوئی دیکھ نہ لے۔ لڑکی بھی اپنے چہرے سے بار بار پسینا پونچھ رہی تھی۔ کمرے میں موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے کھنکار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ وہ چونک پڑی جیسے ہی اس کی محویت ٹوٹی میں نے فوراً تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''ہاں تو محترمہ بلا کسی حیل و حجت کے آپ فوراً اصل مقصد کی جانب آجائیے۔ آپ اس وقت مجھ غریب کے پاس کیوں تشریف لائی ہیں۔''

اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور میری نظروں کی تاب نہ لا کر فوراً اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ پھر انتہائی عاجزانہ انداز میں گویا ہوئی۔ ''شرجیل صاحب آپ کے ساتھ بہت بڑی دھوکا دہی کی واردات ہونے والی ہے۔ آپ نے جس لڑکی کو پسند کیا ہے وہ میری چھوٹی بہن مینا ہے۔ وہ اس بستی کی سب سے حسین دوشیزہ ہے۔ اس کے لیے رشتے یوں برستے ہیں جیسے ساون کی پھوار۔ میں اس کی بڑی بہن ارینا ہوں۔ حاجی صاحب کی بڑی بیٹی ہوں لیکن نصیب کی کھوٹی ہوں۔ میری شادی میرے والدین اور بھائیوں کے لیے ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے جو بھی رشتہ آتا ہے وہ مینا کو پسند کر کے چلے جاتے ہیں اور مجھے ٹھکرا دیا جاتا ہے جیسے میں گوشت پوست کی جیتی جاگتی لڑکی نہیں بلکہ بے جان سنگی مورتی ہوں۔ ہر ایک کی آنکھوں میں مینا کے لیے پسندیدگی کا جذبہ ہوتا ہے۔ جب کہ میرے لیے سب کی آنکھوں میں حسرت اور ہمدردی ہوتی ہے۔ بلکہ کچھ لوگ تو مجھے نفرت سے دیکھ کر منہ پھیرتے ہیں۔ خالقِ کائنات نے جب ہم دونوں بہنوں کو تخلیق کیا تو میرے حصے کا حسن بھی نہایت فیاضی کے ساتھ مینا کی جھولی میں ڈال دیا اور کشکول خوب صورتی و خوشیوں سے خالی رکھا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے مجھ نصیبوں جلی نے خود ہی سپر ڈال دی اور اماں بابا کے سامنے جا کر صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے اب شادی ہی نہیں کرنی ہے تا زندگی آپ دونوں کی خدمت کروں گی اور آپ کے قدموں میں پڑی رہوں گی لیکن شرجیل صاحب ماں باپ کی محبت تو دیکھیے۔ وہ دونوں مجھے دلہن کے روپ میں دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں۔ میرے دونوں بھائی نعمان اور سفیان ایک نمبر کے چلتا پرزہ انسان ہیں۔ ان دونوں نے آپ کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کے اردگرد ایک منظم اور مضبوط سازش کا جال بننا شروع کردیا ہے۔ شادی کا اقرار مینا کے لیے کیا گیا ہے لیکن آپ کا نکاح میرے ساتھ ہوگا۔ آپ کے والد کی شرط یہ ہے کہ دلہن کا چہرہ رخصتی کے بعد ہی دیکھا جائے گا۔ اس بات کا بھی سب کو علم ہے۔ بس اس وجہ سے میرے بھائیوں نے سوچا کہ دلہن بنا کر مجھے رخصت کیا جائے اور پھر بعد میں جو بھی

ہوگا دیکھا جائے گا لیکن آپ یقین کیجیے مجھے ان کی یہ منصوبہ بندی اور پلاننگ ایک آنکھ نہیں بھائی۔ بعد میں آپ اور آپ کے خاندان والے میری جو تذلیل کرتے وہ مجھے کسی صورت قبول نہیں۔ میں ایک بچی، صاف اور سیدھی لڑکی ہوں اس قسم کی جعلسازی مجھے قطعی پسند نہیں۔ محض میری وجہ سے کسی کی زندگی عذاب بن جائے، مجھے یہ گوارا نہیں۔ بھائیوں کی یہ رکیک حرکت سے میرے پاک طینت والدین بھی نالاں ہیں لیکن بھائیوں نے اپنے دلائل سے انہیں شیشے میں اتار لیا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ بعد میں دونوں خاندانوں کے درمیان خون خرابہ نہ ہو جائے اس لیے میں آپ کے پاس آئی ہوں۔ میرے بھائی پانی پر محل تعمیر کر رہے ہیں لیکن میرے چہرے سے گھونگھٹ ہٹتے ہی وہ اڑا اڑا دھم کر کے غرق ہو جائے گا۔"

اریبنا نے جو انکشاف کیا تھا اس نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ حاجی صاحب کا خاندان اس حد تک جا سکتا ہے یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں تو اب تک اس خوش فہمی میں جتلا تھا کہ میرا رشتہ ایک باعزت اور معزز گھرانے میں طے پایا ہے اور میرے سسرال والے نہایت شریف النفس، نیک نام اور باکردار لوگ ہیں۔ وہ اس درجے شر پسند ہوں گے میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ یہ سب جان کر مجھے جو اعصابی دھچکا لگا تھا اور جو روحانی کوفت ہوئی تھی اس کا ازالہ اسی طرح ممکن تھا کہ میں عین وقت پر انکار کر دیتا اور سارا کچا چٹھا کھول دیتا تو حاجی صاحب اور ان کے خاندان کے لیے یہ زمین تنگ ہو جاتی۔

لڑکی خوف اور تذبذب کے عالم میں بیٹھی مجھے تکے جا رہی تھی۔ وہ میرے چہرے کے بدلتے رنگوں کا بغور مشاہدہ کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی حزن و ملال کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔ طویل خاموشی کو توڑتے ہوئے اس نے آہستگی سے کہا۔ "شرجیل صاحب! میں نے آپ کو حقیقت حال سے باخبر کر دیا ہے۔ میں اب چلوں گی۔"

میں نے فوراً کہا۔ "اگر آپ چند لمحے مجھے دے سکتی ہیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

اریبنا اپنی نشست پر مزید تنک گئی اور استفسارانہ انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے اپنی نوزائیدہ آرزوؤں اور تمناؤں کا گلا گھونٹتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا۔ "اس جھوٹے فریبی کنبے میں آپ کا وجود مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ٹھنڈا اجلا چاند، آپ کی سچائی اور راست بازی سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ سارے زمانے نے بھلے ہی آپ کو ٹھکرا دیا ہے لیکن میں آپ کو سہارا دوں گا۔ میں آپ کو اپنا جیون ساتھی بناؤں گا لیکن بس میری ایک شرط ہوگی۔ شادی کے بعد کبھی آپ کو آپ کے والدین اور بہن بھائیوں سے نہیں ملنے دوں گا۔ یہی ان کی سزا ہوگی۔ وہ آپ کے لیے تڑپیں گے لیکن میں آپ کو میکے میں جھانکنے نہیں دوں گا۔"

میری بات سن کر اریبنا یوں اچھلی جیسے اسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ وہ ناقابلِ یقین نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگی۔ اس کے ہونٹ آہستہ سے تھرتھرائے۔ "کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں۔"

میں نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "سچ بولنے والے مجھے بے حد پسند ہیں۔ آپ کی سچائی ہی نے تو مجھے متاثر کیا ہے، جو لوگ سچ بولتے ہیں وہ کبھی دھوکا نہیں دیتے۔ یہ میرا ایمان ہے۔"

اریبنا نے اپنا تھرتھراتا ہوا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میں نے ہلکے سے اس کے ہاتھ کو تھپتھپا کر اسے یقین دلایا کہ ہم بنے ہیں ایک دوجے کے لیے۔ میرے ہاتھ کا لمس پاتے ہی وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ بہت خوش ہے۔ بلکہ ہواؤں کے دوش پر اڑ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں تشکر اور ممنونیت کی لہریں موجزن تھیں۔ اس نے آہستہ سے سرگوشی کی اور بولی۔ "شرجیل صاحب اب تک من کا گھر تھا خالی سوکھی پڑی تھی ڈالی۔"

میں نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اور اب کیا محسوس کر رہی ہیں۔"

اس نے محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے شرمیلے لہجے میں کہا۔ "رم جھم برس پڑے ہو تم تو پھوار بن کے۔" یہ کہتے ہوئے وہ بجلی سی سرعت کے ساتھ کمرے سے یہ جا وہ جا۔

میں دروازے میں کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اریبنا محتاط انداز میں چلتی ہوئی اپنی گرد و پیش پر نظریں دوڑاتی ہوئی مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ بہت جلد وہ بھی تاریکی کا حصہ بن گئی اور میں دروازہ بند کر کے تھکے ہوئے شکست خوردہ کھلاڑی کی طرح بستر پر گر گیا۔ اب میں تھا میرے ٹوٹے ہوئے خواب تھے اور سسکتی تنہائیاں۔

اریبنا کی سچائی اور صاف گوئی نے مجھے خرید لیا تھا اور

اس کے لیے دل میں ہمدردی کے سوتے پھوٹ پڑے تھے اور اسی جذباتی رو میں بہہ کر شدید اشتعال کے عالم میں، میں یہ فیصلہ کر بیٹھا تھا لیکن جب اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی تو ہوش آیا کہ میں یہ کر بیٹھا ہوں۔ ارمینا کے ساتھ ساری زندگی گزارنے کے تصور سے ہی دل بیٹھنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے میرے اندر جو جنگ برپا تھی وہ بھی ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ جذباتی ابال بھی دودھ کے ابال کی طرح لمحوں میں ختم ہو چکا تھا۔ ارمینا اتنی سخت شرط کے باوجود میرے ساتھ فوراً شادی کے لیے اس لیے رضامند ہو گئی تھی کہ اس سے پہلے دنیا کے کسی مرد نے اسے شادی کی پیشکش نہیں کی تھی۔ میں سوچوں کے تعاقب میں رتجگا مناتا رہا لیکن کوئی خاطر خواہ حل سامنے نہیں آیا۔ ارمینا سے کیا ہوا شادی کا وعدہ میرے لیے سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گیا تھا۔ نہ اُگلے چین نہ نگلے چین۔

قریب کی مسجد سے اذان فجر بلند ہوئی اور پھر تھوڑی دیر بعد آغا جی نے دروازہ تھپتھپایا۔ میں اپنی سوچوں سے پیچھا چھڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ رات میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ اس کا میں نے نہ کسی سے تذکرہ کیا اور نہ کسی کو رات کی بات کی ہوا لگنے دی لیکن میرا چہرہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ میں اس وقت کسی طوفان سے دوچار ہوں۔ آغا جی ناشتا بناتے ہوئے بار بار باز پرس کرتے رہے لیکن میں نے نہایت خوب صورتی سے انہیں ٹال دیا۔ اپنے والدین اور علینہ کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔ سوچوں کا سمندر تھا اور میں اس میں غلطاں و پیچاں تھا۔ اس بستی میں بحیثیت ریسرچ اسکالر آیا تھا لیکن جب سے آیا تھا پے در پے ایسے واقعات رونما ہو رہے تھے جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں اپنے کام پر بھی مکمل طور پر دھیان نہیں دے پا رہا تھا۔ ذہنی یکسوئی اور سکون غارت ہو گیا تھا اور یہ میرے لیے لمحہ فکریہ تھا۔ دن اور رات تیزی سے ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑ رہے تھے۔ شادی کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی اور میری پریشانیوں میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کیونکہ علینہ سے جب بھی میری بات ہوتی وہ کرید کرید کر اپنی ہونے والی بھابی کے بارے میں مجھ سے سوال کرتی۔ میں اسے تھپکیاں دیتا رہتا کہ تمہاری ہونے والی بھابی بہت حسین و جمیل ہے اور جواب میں وہ خوش ہو کر کہتی۔ ”بھائی میں نے اپنی تمام سہیلیوں سے کہہ رکھا ہے کہ میری بھابی زمین کا چاند ہے۔ انہیں دیکھتے ہی سب کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔“ اس کی زبان سے یہ جملے سن کر میرا دل اچھل کر حلق میں آجاتا کہ جب حقیقت پر سے پردہ اٹھے گا اس وقت کیا ہو گا۔ اس گھڑی کا تصور کر کے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ جلد بازی میں کیا ہوا فیصلہ میرے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ ایک کمزور اور زمانے کی ستائی ہوئی لڑکی سے کیا ہوا وعدہ توڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اگر میں اپنے عہد سے مکرتا تو وہ دکھی لڑکی خودکشی جیسا جرم بھی کر سکتی ہے کیونکہ لڑکیاں اس معاملے میں بہت حساس ہوتی ہیں۔ اگر دل برداشتہ ہو کر اس نے کوئی ایسا قدم اٹھا لیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا اور نہ مجھے میرا رب معاف کرے گا۔ اب تو ہر حال میں مجھے ارمینا کو اپنانا ہی پڑے گا۔ مجھے اس بات کا بھی سو فیصد یقین تھا کہ ارمینا کا گھونگھٹ ہٹتے ہی علینہ بھی مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ میری پیاری سی اکلوتی بہن کی سب کے سامنے جو سبکی ہوگی اس کا مجھے اچھی طرح احساس تھا لیکن میں بہت مجبور اور بے بس تھا۔ اماں بابا پہلے ہی اس شادی کے حق میں نہیں تھے۔ اب علینہ بھی روٹھ جائے گی۔ اف خدایا کون سی گھڑی تھی جو میں اس بستی میں چلا آیا۔ آنے والے وقت میں حالات کون سا رخ اختیار کریں گے۔ سوچ سوچ کر میرے دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں۔

نکاح کا دن آ پہنچا۔ تمام کام بحسن و خوبی انجام پائے۔ حاجی شفاعت اللہ اور ان کے دونوں بیٹوں نے برات کا استقبال نہایت شان و شوکت سے کیا۔ بہت جوش و خروش کے ساتھ مہمانوں کو خوش آمدید کہا گیا۔ میں اپنے ہونے والے خسر محترم اور سالوں کے چہروں کو بغور دیکھ رہا تھا لیکن انہیں اپنے کیے پر نہ کوئی شرمندگی تھی اور نہ کسی قسم کی ندامت اور پشیمانی محسوس کر رہے تھے جب کہ پورا خاندان اس گھناؤنے منصوبے میں شامل تھا لیکن سب کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔ ہر شخص مسرور اور شاداں تھا۔ حاجی صاحب ویسے تو صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے لیکن یہاں ان کی دینداری ختم ہو گئی تھی۔ میرے ساتھ جو عیاری اور مکاری کا کھیل کھیل رہے تھے اس کا انہیں رتی برابر احساس نہیں تھا۔ میرے دل میں ان کے لیے نفرت اور کراہیت کی ایک لہر سی اٹھی۔ دل چاہا ابھی اسی وقت قاضی صاحب کے سامنے نکاح سے انکار کر دوں لیکن تصور میں اس مظلوم، بے کس اور زخم خوردہ لڑکی کا چہرہ ابھر آیا۔ آج قیمتی لباس زیب تن کیے ہوئے تھا لیکن اس کے باوجود اپنے چہرے کے تاثرات چھپا نہیں پا رہا تھا۔ میرے ملنے والے مجھ سے بھی

سوال پوچھ رہے تھے کہ اپنی پسند کی شادی کرنے پر بھی میں اتنا اداس اور غمگین کیوں ہوں۔ اس نے چند لمحوں کے لیے وقف کیا اور پھر میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شاید آپ نے بھی مجھ سے یہ سوال کیا تھا۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں۔“ وہ تصدیق طلب نگاہوں سے ہم دونوں میاں بیوی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

میں نے فوراً اپنے سر کو اثباتی انداز میں جنبش دی اور کہا۔ ”ہاں ہاں بھئی اچھی طرح یاد ہے۔ تم اپنی یہ داستان جاری رکھو۔ ہم انتہائی دلچسپی اور رغبت سے تمہاری کہانی سن رہے ہیں اور حقیقت بھی یہی تھی۔ کہانی کا کلائمکس اپنے ٹرننگ پوائنٹ پر تھا۔“

ہم دونوں عالم تجسس میں بیٹھے ہوئے اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک جملہ بغور سن رہے تھے۔ شرجیل نے ایک گہری اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پھر بولنا شروع کیا۔ ”اپنے ارمانوں کا لاشہ اٹھائے میں دولہا کی مسند پر بیٹھ تو گیا تھا لیکن تخیل میں بار بار مینا کا چہرہ آرہا تھا۔ وقت کی ستم ظریفی تو دیکھیے کیا مانگا تھا کیا ملا۔ وہ لعل بے بہا میرے نصیب میں ہی نہیں تھا۔ میں اپنے چہرے کا حزن و ملال چھپانے میں ناکام ہو چکا تھا۔ میرے سسرالی عزیز و اقارب بھی مجھے حیران کن نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مجھ پر اس وقت ایک ایک سانس بھاری ہو رہی تھی۔ نکاح کے بعد دودھ پلائی اور سلامی کی رسم کے لیے مجھے اندر گھر میں بلایا گیا تو دل کی دھڑکنیں اتنی تیز ہوگئیں کہ اس کی دھمک مجھے اپنے کانوں میں محسوس ہونے لگی۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور شہ بالا کے ہمراہ گھر میں داخل ہوا۔ یہاں پہنچتے ہی مجھے مینا سے اپنی پہلی ملاقات یاد آگئی۔ دل میں جیسے کسی نے خنجر اتار دیا۔ اب وہ پری پیکر میرے سامنے آئے گی بھی تو کسی اور رشتے اور تعلق سے۔ اب میں اس کا بہنوئی تھا اور وہ میری سالی۔“

میرے اردگرد خواتین و لڑکیوں کی موج ظفر موج تھی۔ رنگ برنگی آنچلوں کی بہار تھی۔ خوشبوؤں کا سیلاب تھا۔ نقرئی قہقہے تھے لیکن پھر بھی میں تنہا تھا۔ خالی خالی نگاہوں سے اس ماہ رو کو تلاش کر رہا تھا جو کبھی میرا خواب تھی لیکن یہاں بھی ناکامی اور بدقسمتی کا دور دورہ تھا اس نازنین کا دیدار نہ ہوسکا۔ میں اس وجہ سے اور بھی دکھی ہوگیا کہ اس گھر سے میں ہمیشہ کے لیے تمام تعلقات ختم کرنے والا تھا۔ نہ یہاں دوبارہ خود قدم رکھوں گا اور نہ اپنی بیوی کو اس گھر میں جھانکنے دوں گا۔ یہ میرا عزم مصمم تھا۔ اس لیے مینا کو آخری بار دیکھنے کا خواب بھی ادھورا ہی رہا۔ میں بھاری دل لے کر خواتین کے ہجوم سے نکل آیا۔ وقت رخصت ارمینا بابل کے در و دیوار سے مل کر خوب روئی۔ اس وقت میں یہی سمجھا کہ میری شرط پر اس نے اپنے تمام رشتے قربان کردیے ہیں اس لیے اشکوں کے دریا بہا رہی ہے۔

میرے اپنے گھر میں ارمینا کا استقبال بہت شاندار طریقے سے کیا گیا۔ رشتے دار خواتین، علینہ اور اس کی سہیلیوں نے گلابوں کی بارش کردی۔ قرآن پاک کے سائے میں دلہن کو اس کی زرق برق مسند پر لا کر بٹھا دیا گیا۔ میں نے علینہ کے ساتھ اپنی تمام کزنز اور علینہ کی دوستوں کو بھی نیگ دیا۔ سب بہت خوش تھے۔ بس اداس اور ملول تھا تو صرف میں۔ میرے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ تھی اور دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ سب سے دامن چھڑا کر میں وہاں سے کھسکنا چاہ رہا تھا۔ بلی کے قدموں سے چلتا ہوا میں زینے کی طرف بڑھا۔ زینے پر پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ عقب سے کسی خاتون کی آواز سنائی دی۔ ”ارے بھئی اب اس چاند چہرے کا دیدار تو کرواؤ۔“

اسی اثناء میں علینہ کی کوئی سہیلی چہکی۔ ”بالکل بالکل میں آپ کی بات کی تائید کرتی ہوں۔ شرجیل بھائی تو ساری زندگی اس رخ زیبا کا دیدار کرتے رہیں گے۔ چند لمحے ہمیں بھی تو اپنی آنکھوں کی پیاس بجھانے دو۔“ اس شور اور ہنگامے کے دوران علینہ اپنی نشست سے اٹھی اور پھر دلہن کا گھونگھٹ اٹھانے کے لیے اس کے ہاتھ بڑھے۔ میرے لیے یہ گھڑی قیامت سے کم نہ تھی۔ دل کی دھڑکن رکتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں لرزیدہ قدموں سے اور تیزی سے زینہ چڑھنے لگا۔ اچانک ملی جلی کئی آوازیں سماعت سے ٹکرائی۔ ”سبحان اللہ چشم بددور“ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھ پر طنز کے تیر برسائے جارہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا تو پتھر کا بت بن گیا۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ دلہن کے روپ میں کوئی اور نہیں بلکہ مینا تھی۔ میری اپنی مینا، میرے خوابوں میں تراشا ہوا وہ حسین شاہکار جس کی جدائی مجھے پاگل کیے دے رہی تھی۔ میرے اٹھتے قدموں کو بریک لگ گیا تھا۔ علینہ دلہن کا گھونگھٹ اٹھائے کھڑی تھی اور حاضرینِ محفل کی نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ اماں اور بابا تو باقاعدہ بہو کی بلائیں لے رہے تھے۔ سارا روٹھنا پھولنا ختم ہو چکا تھا۔ چہروں پر دور دور تک

ناراضی کا شائبہ نہیں تھا۔ میرے اپنے جذبات اور احساسات کیا تھے، اسے بیان کرنا چنداں ضروری نہیں۔ بس خوشی مسرت اور انبساط کا ایک سیلاب تھا جس میں، میں غوطہ زن تھا۔ مجھے مکمل شکست کے بعد مکمل فتح حاصل ہوئی تھی۔ جاں بلب اور تشنہ ہونٹوں سے کسی نے آبِ حیات کا پیالہ لگا دیا تھا۔ مر کر جی اٹھا تھا۔ قدرت کی طرف سے مجھے دوبارہ زندگی اور سانسیں ودیعت کردی گئی تھیں۔ خاندان کا ہر فرد مینا کو دیکھنے کے بعد خوشی سے نہال اور سرشار تھا۔ خصوصاً اماں، بابا اور علینہ کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ سب سے مبارک بادیاں وصول کررہے تھے۔ گھر کا ماحول گلِ گلزار اور زعفران زار ہورہا تھا اور میرا تو جیسے نیا جنم ہوا تھا۔

حجلۂ عروسی میں مینا دبی چپکی اور سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ میری مصنوعی خفگی دیکھ کر اس کا پتا پانی ہوگیا اور اس نے بغیر کسی ردوکد کے فوراً اس راز پر سے پردہ اٹھا دیا۔ اس نے اپنی مترنم آواز میں آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔ ”جی میرا اصل نام ارینا ہے۔ گھر میں سب پیار سے مینا کہتے ہیں۔ شرارت اور شوخی میری فطرت میں شامل ہے۔ آپ سے بات طے ہونے کے بعد ایک دن بابا امی سے کہہ رہے تھے کہ ہمارا ہونے والا داماد کھرا سونا ہے۔ بس بابا کی یہ بات سننے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ آپ کو پرکھا جائے کہ حقیقت میں آپ کھرا سونا ہیں یا کھوٹا سکہ۔ بس یہ سب سوچ کر میں نے اور میری خادمہ شبو جو میرے ساتھ ہمیشہ سے رہی ہے میری بہت اچھی دوست اور ہجولی ہے۔ میں نے اسے تیار کیا اور آپ کے پاس سکھا پڑھا کر روانہ کیا۔ شبو بذاتِ خود بھی بہت ذہین، باصلاحیت اور حاضر دماغ ہے۔ کچھ ڈائیلاگ میں نے اسے یاد کروائے تھے اور کچھ اس نے صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اپنی طرف سے ایڈ کردیئے تھے۔ گھر آکر جب شبو نے مجھے سب کچھ سنایا تو ہم دونوں نے خوب لطف لیا۔ دل بھر کر انجوائے کیا۔ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ حقیقتاً آپ کھرا سونا نکلے۔ آپ ایک انسان دوست شخص ہیں اور آپ کے پاس ایک دردمند دل ہے میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزار تھی کہ اس نے آپ کو میرا شریکِ زندگی بنایا۔“

میں نے قطع کلامی کے لیے معذرت چاہتے ہوئے ایک چبھتا ہوا سا سوال داغ دیا۔ ”اس سارے ڈرامے میں تمہاری شبو رانی کا بہت اہم کردار تھا۔ وہ اچانک کہاں روپوش ہوگئی؟“ میرے استفسار پر ارینا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اپنی جھلمل شرارتی آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے کہا۔ ”شادی والے دن وہ ہر جگہ اپنے آپ کو آپ کی نظروں سے چھپاتی رہی۔ آپ کو پریشان اور ملول دیکھ کر خوب مزے لے لے کر مجھے پل پل کی خبر دے رہی تھی۔“

”ہوں......!“ میں نے ایک لمبا ہنکارا بھرا اور قدرے تیز آواز میں بولا۔ ”محترمہ آپ کا اور آپ کی شبو کا سارا ناٹک کامیاب اور ہٹ رہا لیکن اشتعال اور غصے میں آکر میں اگر کوئی سخت قدم اٹھا لیتا تو سارا کھوٹا کھرا ادھرا رہ جاتا۔“

ارینا پھر ہنس پڑی اور اپنی مدھر مسکان کے درمیان اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اس کے لیے ہم دونوں نے ایک اور پلے تیار کر رکھا تھا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔“

شرجیل کی زبانی یہ ساری روداد سننے کے بعد میں اور میرے شوہر بری طرح ہنسنے لگے۔ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے شرجیل میز پر رکھے ہوئے رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ گاؤں کی دو لڑکیوں نے مل کر اسے ”ماموں“ بنا دیا تھا۔ خجالت اور شرمندگی کی وجہ سے چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ اس لیے میں نے استفسار کیا۔ ”اچھا یہ بتاؤ اب بھی سسرال جاتے ہو تو شبو رانی سے ملاقات ہوتی ہے۔“

شرجیل نے ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں میرے آنے کی خبر سن کر ہی وہ لمبی چھٹی پر چلی جاتی ہے۔ ہاں البتہ خاموشی سے ارینا سے ضرور ملاقات کرتی ہے۔ میں نے سوچ رکھا ہے جس روز بھی مجھ سے سامنا ہوگا تو اس سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ کب آؤں بارات لے کر۔“

شرجیل کی بات سن کر مجھ پر دوبارہ ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ میں نے شرجیل کی پشت تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”شرجیل تمہاری بیوی تو چھپی رستم نکلیں۔“

شرجیل نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”یہ تو آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ وہ واقعی چھپی رستم ہے۔ اس کی نشوونما اور پرورش نہایت ناز و نعم میں ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود نہایت خدمت گزار، سلیقہ شعار اور خوش مزاج لڑکی ہے۔ میرے اماں بابا کا دل جیت کر سارے گھر پر بلکہ سارے خاندان پر راج کررہی ہے۔ سب کے دلوں میں گھر بنا لیا ہے۔ علینہ اور وہ تو شیر و شکر بنی ہوئی ہیں۔ میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں ارینا کو پاکر میں بہت خوش ہوں۔“

اسے خوش دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوئی اور میں نے خوش ہوکر اسے بے شمار دعاؤں سے نوازا۔ رخصت ہوتے وقت اسے تاکید کی وہ اگلی مرتبہ آئے تو اپنے ساتھ ارینا کو ضرور لے کر آئے۔

کہاں جاؤں؟

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
اپنی سرگزشت ارسال کررہا ہوں گو کہ اسے پُرمزاح بنانے کی کوشش کی ہے لیکن کس حد تک کامیاب ہوا ہوں یہ فیصلہ قارئین کریں گے۔ ہم سب ایک دوسرے کو دھوکا دیتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ ابھی باقی ہے۔ میں جو اپنے وقت کا شاطر ترین بندہ کہلاتا تھا آج کس کسمپرسی میں زندگی گزار رہاہوں میری آپ بیتی بہت سوں کی آنکھیں کھول دے گی۔

صفدر علی
(سرگودھا)

میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتا پھر رہا ہوں اور کچھ لوگ میرا پیچھا کیے جا رہے ہیں۔ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ ان کے لیے کسی کو مار دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی مچھر کو مار دیا جائے۔ میں نے اپنے اس فرار کے دوران میں اپنے کئی نام بدلے ہیں۔

پہلے میں افضل حسین ہوا کرتا تھا۔ پھر افضل قادری چشتی ہوگیا۔ پھر سکندر شاہ بن گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خطرناک لوگ سکندر شاہ تک نہیں پہنچ پائیں گے جو ایک کارخانے میں معمولی مزدور تھا لیکن یہ کم بخت تو وہاں بھی پہنچ گئے اور مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ پھر میں اپنا گیٹ اپ بدل کر گاما بن گیا اور سبزیوں کا ٹھیلا لگالیا لیکن یہ وہاں بھی جا پہنچے اور مجھے پھر فرار ہونا پڑا۔

ایک بار میں امداد حسین بن گیا۔ میں نے ایک ہوٹل میں بیرہ گری شروع کردی تھی لیکن یہ بھی اس ہوٹل میں کھانا کھانے پہنچ گئے اور میں نے وہاں سے بھی دوڑ لگادی۔

اور جس وقت میں یہ تحریر کرر ہاہوں اس وقت میرا نام

صفدر علی ہے اور اب مجھ سے بھاگ دوڑ نہیں ہوتی۔ میں بہت بری طرح تھک چکا ہوں۔

ہوسکتا ہے کہ آپ کی سمجھ میں یہ نہیں آیا ہو کہ میں نے اتنی بھاگ دوڑ کیوں کی۔ کیا پرابلم ہے میرے ساتھ۔ تو چلیں میں آپ کو یہ کہانی اس وقت سے سناتا ہوں جب ساتویں بار انٹرویو میں مجھے فیل کر دیا گیا۔

آپ نے وہ تو سنا ہی ہوگا کہ دو جگہیں تھیں اور تین آدمی انٹرویو کے لیے ایک فرم میں پہنچ گئے تھے۔ جس کو جاب پر رکھنا تھا اس سے پوچھا گیا۔ ''بتاؤ دنیا کا وہ سب سے بڑا کون سا مسافر بردار بحری جہاز تھا جو اپنے پہلے ہی سفر میں ڈوب گیا تھا۔''

اس نے جواب دے دیا۔ ''جناب ٹائی ٹینک۔''

''ٹھیک ہے تم کل سے ڈیوٹی پر آجانا۔'' پھر دوسرے سے پوچھا گیا۔ ''اب تم بتاؤ اس حادثے میں کتنے افراد ڈوب گئے تھے۔''

''جناب پندرہ سو۔''

''درست، تم بھی کل سے ڈیوٹی پر آجانا۔'' پھر جس کو جاب نہیں دینی تھی اس سے پوچھا۔ ''اب تم ان پندرہ سو کے نام بتاؤ۔''

ظاہر ہے کہ اس بے چارے کا باپ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ اس لیے وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خود مجھ سے بھی انٹرویو میں کچھ اسی قسم کے سوالات کیے جاتے تھے۔

جیسے سکندر اعظم کے پھپا کا کیا نام تھا۔

اب ظاہر ہے میں سکندر اعظم کے پھپا کا نام کہاں سے بتاتا۔ ایک بار سوال کیا گیا۔ ''تمہارے خالو کا انتقال کس بیماری سے ہوا تھا۔''

''جناب انہیں کینسر ہو گیا تھا۔''

''اوہو، پھر تو بہت مشکل ہے۔ جس کے خالو کا انتقال کینسر میں ہوا ہو ہم اسے جاب نہیں دے سکتے۔''

''جناب میرے خالو کے کینسر سے میری جاب کا کیا تعلق۔''

''یہ ہماری پالیسی ہے۔ ویسے تم ہر لحاظ سے اس جاب کے لیے مناسب ہو تم ایک باصلاحیت نوجوان ہو۔ محنتی، فرض شناس اور ایماندار بھی معلوم ہوتے ہو لیکن افسوس کہ تمہارے خالو کا انتقال کینسر میں ہوا تھا۔''

اب بتائیں ایسی باتوں کا کیا جواب ہوسکتا ہے یہ جاب نہ دینے کے بہانے ہیں۔

ایک جگہ اور یہی سوال کیا گیا۔ ''تمہارے خالو کا انتقال کس بیماری میں ہوا تھا۔''

''جناب والا میرا کوئی خالو ہی نہیں تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہو پھر تو یہ جاب تمہیں نہیں مل سکتی۔''

''وہ کیوں؟'' میں نے بھنا کر پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ جس کا کوئی فیملی بیک گراؤنڈ ہی نہ ہو ہم اس پر بھروسا نہیں کر سکتے۔''

''جناب فیملی بیک گراؤنڈ بتانے کے لیے میرے ماں باپ، بھائی بہن، چاچا چاچی سب موجود ہیں۔''

''ہوسکتا ہے۔ لیکن ہماری پالیسی کے مطابق خالو کا وجود ضروری ہے۔''

غرض یہ کہ میرے ساتھ اس قسم کی احمقانہ مجبوریاں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے جاب نہ ملنی تھی اور نہ ملی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔

اسی مایوسی میں ایک دن استاد بین سے ملاقات ہو گئی۔ استاد بین میرے حالات سن کر بہت دیر تک افسوس کرتے رہے۔ پھر بولے۔ ''چلو کوئی بات نہیں۔ اب میں تمہیں ایک ایسا راستہ بتاؤں گا کہ تمہارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

''وہ کون سا راستہ ہے استاد۔''

''سامنے کا راستہ ہے۔ افسوس کہ تم جیسے نوجوان اس پر دھیان نہیں دیتے۔'' استاد نے کہا۔ ''ماشاء اللہ تمہارا رنگ گورا ہے۔ تمہاری آواز خوب صورت ہے۔ تمہارے چہرے میں کشش بھی ہے۔''

''یعنی میں ڈراموں یا فلموں میں کام کرنے لگوں؟''

''لاحول ولا۔ اس میں کیا ملتا ہے۔'' استاد نے برا سا منہ بنایا۔ ''میں تو تمہیں اس سے بڑا مشورہ دے رہا ہوں۔ تمہاری زندگی بن جائے گی۔ صرف داڑھی رکھ لو باقی سب میں سنبھال لوں گا۔''

''پھر بھی کچھ تو پتا چلے استاد مجھے کیا کرنا ہوگا۔''

''میاں میں تمہیں کچھ کتابیں لا کر دوں گا ان کو پڑھ لینا۔'' استاد نے کہا۔ ''بہت پرانی کتابیں ہیں۔ میرے باپ دادا کے زمانے کی۔ ان کتابوں سے تمہیں زندگی گزارنے کا راستہ مل جائے گا۔ تم خود سوچو گے کہ تم نے اب تک کہاں اپنا وقت برباد کیا تم خود بھی عیش کرو گے اور اپنے

گھر والوں کو بھی کرواؤ گے۔''

☆......☆

خدا بھلا کرے استاد بین کا۔

انہوں نے مجھے زندگی گزارنے کا کیا طریقہ بتایا تھا۔ میں نے ان کے کہنے پر داڑھی رکھ لی تھی۔ ان کی لائی ہوئی کتابیں بیس بیس بار پڑھ چکا تھا اور اب میں الحاج بادل شاہ بابا تھا۔

میرا ایک آستانہ تھا۔ شہر سے کچھ فاصلے پر۔ سامنے والے حجرے میں ایک معمولی سا قالین اور کتابوں کی الماریاں تھیں۔ جب کہ اس حجرے کے عقب میں جو کمرے تھے وہ ویل فرنشڈ تھے۔ پورے شہر کی دیواروں پر الحاج بادل شاہ بابا کی پبلسٹی لکھی ہوئی تھی۔

صرف ایک ہی تعویذ میں محبوب آپ کے قدموں میں۔ دو تعویذ کے بعد قتل کا مجرم بھی باعزت رہا ہو جائے وغیرہ وغیرہ۔

الحاج بادل شاہ بابا کی پورے شہر میں دھوم تھی۔ کام ہو یا نہ ہو عقیدت مندوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔

میں نے اپنی آمدنی میں سے استاد بین شاہ کا وظیفہ باندھ دیا تھا۔ کیوں کہ یہ سب ان ہی کی وجہ سے تھا۔ یہ راستہ انہوں نے ہی دکھایا تھا۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ ایک دن ایک آدمی میرے حجرے میں داخل ہوا۔ بہت گھنی مونچھیں تھیں اس کی۔ لمبا قد، کسرتی بدن، دیکھنے سے کبرو جوان معلوم ہوتا تھا۔

اس نے حجرے میں آکر بہت عقیدت سے سلام کیا تھا۔ مجھے اس کے لباس اور اس کے رکھ رکھاؤ سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک موٹی آسامی ہے۔

''ہاں نوجوان، ایسی کون سی ضرورت تمہیں مجھ فقیر کے آستانے تک کھینچ کر لائی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بابا! میں نے سنا ہے کہ تمہارے ایک تعویذ سے کام بن جاتا ہے۔'' اس نے انکسارانہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں، اس میں کیا شک ہے۔ میری برسوں کی ریاضت نے مجھ فقیر عاجز کو یہ کمال دیا ہے۔''

''بابا! ایک لڑکی کو میں موم کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اسے مجبور کردیں کہ وہ مجھ سے محبت کرے۔ میری طرف توجہ دے۔''

''میں نہیں میرا تعویذ مجبور کرے گا۔''

''سنا ہے کہ ایک ہی تعویذ میں کام ہو جاتا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''مجھ پر شک کررہا ہے نادان۔''

''نہیں بابا کوئی شک نہیں کررہا۔ صرف اپنے اطمینان کے لیے پوچھ رہا ہوں۔''

میں محبت کے لیے صرف ایک تعویذ دیا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کسی کا کام وام تو ہوتا نہیں تھا۔ اب جب وہ شکایت لے کر آتا تو میں اپنے سر کو پیٹتے ہوئے کہتا۔ ''بدقسمت انسان سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی موم ہونے والی تھی کہ کم بخت ستاروں نے دھوکا دیا۔ مریخ اپنے برج سے نکل کر زہرہ کے مدار میں چلا گیا۔ حالانکہ ایسا ہوتا نہیں ہے لیکن تمہارے کیس میں ایسا ہی ہوا ہے۔ اب میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتا۔ میں مجبور ہوں۔ میرے ہاتھ بندھ گئے ہیں۔''

ظاہر ہے۔ اب وہ بے چارہ ستاروں وغیرہ کے چکر میں کہاں سے پڑتا۔ یا ستاروں سے کیا جھگڑا کرتا۔ اس لیے آنسو بہاتا ہوا واپس چلا جاتا تھا۔

میری ایک تکنیک یہ بھی تھی کہ میں ضرورت مندوں سے بہت کم پیسے لیتا۔ پانچ سو سے زیادہ کبھی نہیں لیا۔ اس لیے کام نہ بننے پر کوئی زیادہ واویلا بھی نہیں کرتا تھا۔ پانچ سو پر لعنت بھیج کر خاموش ہو جاتا۔

''بابا اگر میرا کام بن گیا تو میں آپ کو مالا مال کردوں گا۔'' اس شخص نے کہا۔

''مجھے لالچ دے رہا ہے نوجوان۔'' میں نے غصہ ظاہر کیا۔ ''کیا تو یہ نہیں جانتا کہ میرا نذرانہ صرف پانچ سو روپے ہے۔ اس سے زیادہ لینا میرے لیے حرام ہے۔''

''معاف کیجیے گا بابا۔'' اس نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ''بہت آسرے پر آپ کے پاس آیا ہوں۔ جگہ جگہ دیواروں پر لکھا ہوا ہے کہ ایک ہی تعویذ پر کام ہو جاتا ہے۔''

''اس میں کیا شک ہے بے وقوف۔ بتا کون ہے وہ لڑکی۔ کہاں رہتی ہے۔ یہ سب جاننا بہت ضروری ہے۔ سارے جنتر نام اور پتے سے بنائے جاتے ہیں۔''

''ہاں بابا۔'' وہ خوش ہو گیا تھا۔ ''میں ابھی بتائے دیتا ہوں۔''

اس نے مجھ سے ایک کاغذ مانگ کر اس پر لڑکی کا نام اور پتا لکھنے کے ساتھ ہی پانچ سو کا ایک نوٹ بھی میری طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لیں بابا اپنا نذرانہ۔''

میں نے دونوں چیزیں اپنی جیب میں رکھ لیں۔

''جا یہ سمجھ لے کہ تیرا کام شروع ہو چکا ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے مجھے کوئی جواب دینے کی بجائے باہر کی طرف دیکھ کر آواز لگائی۔ ''آجاؤ۔''

اچانک دو آدمی کمرے میں گھس آئے۔ وہ دونوں صورت ہی سے خطرناک اور جرائم پیشہ معلوم ہوتے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں پستول بھی تھے۔

اس نے ایک آدمی سے کہا۔ ''اس گلدان کو اڑادو۔''

گولی چلی اور گلدان کے پرخچے اڑ گئے۔ اس طرح اس کے دوسرے آدمی نے دیوار پر لگا ہوا ایک فریم اڑا دیا۔

میں تو جیسے سکتے میں آگیا تھا۔ کیا کر رہا تھا یہ سب۔ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا ہوگا۔

''دیکھ لیا بابا۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''ایک تعویذ میں کام ہو جانا چاہیے۔ ورنہ میرے یہ آدمی تمہارے بدن میں اتنی گولیاں اتار دیں گے کہ گنتی بھی نہیں ہو سکے گی اور ہاں ایک اور بات کان کھول کے سن لو میں یہ نہیں سنوں کہ فلاں ستارہ اس وقت کہیں جھک مارنے گیا ہوا تھا یا فلاں ستارہ اپنے برج سے باہر چلا گیا تھا۔ مجھے ان ستاروں کی کہانی نہیں سنانا۔ میں بس اپنا کام چاہتا ہوں۔ پہلے تعویذ میں محبوب کو قدموں پر ہونا چاہیے۔''

میرا یہ حال تھا جیسے بدن سے خون نچوڑ لیا گیا۔ پسینے سے بھیگا جا رہا تھا۔ وہ تینوں مجھے گھور رہے تھے اور میں شاید بے ہوش ہونے والا تھا۔

''چلو اب جلدی تعویذ لکھ کر دے دو۔'' اس نے کہا۔

خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے کس قسم کا تعویذ بنایا ہوگا۔ اس پر کیا لکھا ہوگا۔ مجھ سے قلم ہی نہیں پکڑا جا رہا تھا۔ بدن پر لرزا طاری تھا۔

تعویذ لے کر اس نے پھر کہا۔ ''بہت بہت شکریہ بابا لیکن اس کا اثر صرف پرسوں تک دیکھوں گا۔ اس کے بعد تم جانو اور یہ دونوں بندے جانیں۔''

وہ چلے بھی گئے۔ لیکن میں بت بنا بیٹھا رہا۔ ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ایسا کلائنٹ زندگی میں پہلی بار میرے پاس آیا تھا۔

بہت دیر بعد میرا خادم خاص اطہر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بھی بہت خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ''بابا آپ زندہ تو ہیں ناں؟''

''نالائق، اتنی دیر کے بعد دیکھنے آرہا ہے کہ میں زندہ ہوں یا نہیں۔''

''سرکار! جس وقت گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں تو میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آپ کو اس نے ٹھنڈا کر دیا۔ فخرو ایسا ہی آدمی ہے سرکار۔''

''کیا تو اس کو جانتا ہے؟''

''اس کو کون نہیں جانتا سرکار۔ بہت خطرناک آدمی ہے۔ درجنوں قتل کر چکا ہے۔ کئی دفعہ جیل سے فرار ہو چکا ہے۔ اس کا اگر کوئی کام اٹک گیا ہے سرکار تو ضرور کر دیں ورنہ وہ آپ کو ٹھنڈا کر دے گا۔''

''ہائے۔'' میں کراہ کر رہ گیا۔ ''یہ تو اچھی زبردستی ہے۔ چلو تم ایسا کرو۔ استاد ببن کو بلا لو، شاید ان کے پاس کوئی ترکیب ہو۔''

''کچھ لوگ باہر بیٹھے ہوئے ہیں سرکار۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' اطہر نے بتایا۔

''لعنت بھیجو ان پر۔ بھگا دو ان کو۔ کہہ دینا بابا نے تعویذ دینا بند کر دیا ہے۔ کہیں اور جائیں۔''

استاد ببن آدھے گھنٹے بعد تشریف لے آئے تھے۔ یہ داستان سن کر ان کی بھی سٹی گم ہو گئی تھی۔ ''یہ تو بہت خطرناک چویشن ہے بھائی۔''

''اس چویشن میں تم نے ہی ڈالا ہے استاد۔''

''میں نے تو بھلائی کی تھی۔'' استاد نے کہا۔ ''تم خود دیکھ لو۔ تمہارے حالات کتنے بدل گئے ہیں۔ اب کون جانتا تھا کہ ایسا اوندھا آدمی تمہارے پاس آجائے گا۔''

''استاد کیا تم فخرو کو جانتے ہو۔''

''اس کو کون نہیں جانتا۔'' استاد نے کہا۔ ''اس کے ساتھ دو بندے ہوتے ہیں وہ بہت خطرناک ہیں۔''

''ہاں ان ہی دونوں نے تو گولیاں چلائی تھیں۔''

''بس تو تم مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ کیوں کہ تعویذ کا اثر وثر تو ہونا نہیں ہے۔''

''خدا کے لیے کوئی راستہ نکالو استاد۔''

''اب صرف ایک ہی راستہ ہے۔''

''وہ کون سا، جلدی بتاؤ۔''

''تم اب لڑکی سے جا کر ملو، جس سے وہ محبت کرنی چاہتا ہے۔''

''میں اس سے جا کر ملوں، وہ کیوں۔''

''بات تو سنو۔ اس کے پاؤں پکڑ لو۔ اس سے درخواست کرو کہ خدا کے لیے وہ فخرو سے محبت شروع

کردے۔ ورنہ فخرو تمہاری جان لے لے گا۔"
"یہ کیسی درخواست ہوئی۔" میں بھڑک اٹھا۔ "یعنی میں کسی لڑکی کے پاس جا کر اس سے یہ کہوں کہ وہ خدا کے لیے کسی اور سے محبت شروع کردے۔"
"اپنی جان بچانے کے لیے یہ تو کرنا ہی ہوگا۔" استاد بین نے کہا۔
"وہ مجھے اس لڑکی کا نام اور پتا بھی دے کر گیا ہے۔" میں نے بتایا۔
"تو بس دیر مت کرو۔ پہنچ جاؤ اس کے پاس۔" استاد نے کہا۔ "ورنہ تمہارے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔" اور یہ کچھ بھی ہوسکنے کا خوف ایسا تھا کہ میں اس لڑکی کے پتے پر پہنچ گیا۔ اس مردِ خونخوار نے اس کا نام اور پتا تو لکھ کر دے ہی دیا تھا۔

اس کا نام راشدہ تھا۔

دو منزلہ مکان تھا اس کا۔ میں مکان کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ ابھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں آگے کیا کروں۔

میں ایک عجیب مخمصے میں تھا۔ شاید آج تک کسی نے ایسی بے تکی درخواست کسی سے نہیں کی ہوگی۔ اس لڑکی کا نام تو معلوم ہوگیا تھا راشدہ لیکن وہ کیسی تھی، یہ میں نہیں جانتا تھا۔ وہ سامنے بھی آجاتی تو اس کو کیسے پہچانتا۔

اس مکان کے برابر والے گیٹ کے پاس ایک بچہ کھڑا ہوا تھا۔ شاید وہ اس مکان میں رہتا تھا۔ میں نے اس بچے کو اشارے سے بلایا۔ لیکن وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ میں نے دوبارہ اشارہ کیا۔ پھر آواز دی اور جب وہ نہیں آیا تو میں خود اس کے پاس پہنچ گیا۔ میں اس بچے سے جھنجلا بھی گیا تھا۔
"کیا بات ہے بیٹے۔ اتنی دیر سے بلائے جارہا ہوں کم از کم بات تو سن لیتے۔"
"انکل امی نے منع کیا ہے۔" اس نے بتایا۔
"کیا منع کیا ہے امی نے۔"
"یہی کہ چوروں، ڈاکوؤں کی باتیں نہ سنا کرو۔" اس نے کہا۔ "اگر وہ بلائیں تو ان کے پاس مت جاؤ۔"
میں بھنا کر رہ گیا۔ کم بخت مجھے کیا سمجھ رہا تھا۔ میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ "بیٹے کیا میں تمہیں چور ڈاکو دکھائی دے رہا ہوں۔"
"ہاں انکل۔ آپ کی صورت ہی ایسی ہے۔"
"اچھا اچھا یہ بتاؤ۔ راشدہ کو جانتے ہو۔"
"کیوں نہیں انکل، یہ برابر والا مکان ان ہی کا ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور وہ دیکھیں وہ سامنے سے چلی آرہی ہیں۔"
میں نے دیکھا تو ایک لڑکی لڑھکتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ وہ اتنی موٹی اور وحشت ناک تھی کہ اس کو لڑکی کہنا لڑکیوں کی توہین تھی۔
پتا نہیں اس کم بخت فخرو کو اس میں ایسی کون سی خوبی نظر آگئی تھی۔ بہرحال مجھے اس سے کیا۔ مجھے تو اپنی جان بچانی تھی۔
وہ گیند نما چیز جیسے ہی قریب آئی میں نے لپک کر اس کا پیر تھام لیا۔ "خدا کے لیے مجھے مایوس نہ کرو۔ ورنہ میرا جنازہ اٹھ جائے گا۔"
وہ اس آفت ناگہانی سے بری طرح بوکھلا گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سبزیوں سے بھرا ہوا جو شاپر تھا وہ گر گیا اور اس نے واویلا مچانا شروع کردیا۔ "ارے ارے کیا ہوا ہے تجھے، کون ہے تو؟ کم بخت میرا پیر کیوں پکڑ لیا ہے۔"
"وعدہ کرو کہ تم مجھ غریب پر رحم کرو گی۔ ورنہ ایک زندگی کا گناہ تمہارے سر جائے گا۔ تم قیامت کے دن جہنم میں داخل ہوجاؤ گی۔"
"ارے مردار کیا بکواس کررہا ہے۔ کم بخت میرا پیر چھوڑ۔"
"نہیں راشدہ۔ جب تک میری مراد نہیں پوری ہو گی۔ میں پیر نہیں چھوڑوں گا۔"
"ارے کم بخت میں راشدہ نہیں ماجدہ ہوں۔" اس نے کہا۔ "اس کی بہن، پیر پکڑنا ہے تو راشدہ کا پکڑ۔" میں گڑبڑا کر کھڑا ہوگیا۔ وہ کم بخت بچہ بھی مجھے دھوکا دے کر بھاگ چکا تھا۔
"اچھا بہن جی سوری، مجھ سے غلطی ہوگئی۔ پلیز مجھے راشدہ سے ملوادیں۔ یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ورنہ بے موت مارا جاؤں گا۔"
"آخر چکر کیا ہے۔ کون ہے تو؟"
"بس بہن جی، کچھ نہ پوچھیں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "مجھے محترمہ راشدہ سے محبت کروانی ہے۔"
"محبت کرنی ہے یا محبت کروانی ہے۔"
"محبت کروانی ہے ہمشیرہ۔" میں نے کہا۔ "یہ بہت الجھا ہوا کیس ہے۔ پلیز آپ ہی سفارش کردیں۔ میں کسی اور کے لیے محبت کی بھیک مانگنے آیا ہوں۔"

"اب راشدہ کیا محبت کرے گی۔" اس نے کہا۔

"کل تو اس کی شادی ہونے والی ہے۔"

"کیا!" میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ "اس کی شادی ہو رہی ہے؟ کیا یہ اس کی مرضی سے ہو رہی ہے؟"

"تو کیا سمجھتا ہے کہ زبردستی ہو رہی ہے۔" اس نے کہا۔ "اس نے لڑکا خود پسند کیا ہے۔"

"کیا نام ہے اس لڑکے کا۔" میں نے ایک موہوم سی اُمید پر پوچھا۔

"صفدر۔" اس نے بتایا۔ "بینک میں مینیجر ہے۔"

ظاہر ہے وہ فخرو تو نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کوئی اور ہی تھا۔ جس سے راشدہ شادی کرنے والی تھی اگر ایسا ہو جاتا تو پھر فخرو اور اس کے بندے مجھے تو جان سے مار دیتے۔

"سسٹر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمہاری راشدہ اس بینک مینیجر سے رشتہ ختم کر دے۔" میں نے بھیک مانگنے والے انداز میں کہا۔

"اس سے ختم کر دے تو پھر کس سے شادی کرے۔"

"اس شہر میں ایک بہت ایماندار، لائق اور فرمانبردار قسم کا شخص ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تو اس کا رشتہ لے کر آیا تھا۔"

"کیا نام ہے اس کا۔"

"فخرو۔" میں نے بتایا۔ "تم لوگ بھی اس رشتے کے بعد خود پر فخر کرو گی۔"

"فخرو! کون وہی غنڈہ۔"

"خدا کے لیے ہمشیرہ اس کو غنڈہ نہ کہو۔ وہ تو فرشتہ ہے فرشتہ۔"

اتنا سننا تھا کہ اس نے مجھے دوہتڑ مارنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مغلظات سنانی شروع کر دیں اور ساتھ ہی محلے والے بھی جمع ہونے لگے۔

کیا بے عزتی ہو رہی تھی۔ یہ حال ہو رہا تھا بابا پیر افضل قادری چشتی صابری وغیرہ وغیرہ کا۔ جس کے سامنے لوگ ہاتھ باندھے بیٹھے رہتے تھے اور جو کم بخت فخرو کے چکر میں ایک عورت سے پٹ رہا تھا۔

محلے والے آئے تو انہوں نے بھی حسب توفیق میری ٹھکائی شروع کر دی۔ بڑی مشکلوں سے وہاں سے جان چھڑا کر بھاگنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

اپنے آپ کو سنبھالتا اور اپنی قسمت کو برا بھلا کہتا ہوا جب اپنے آستانے کے پاس پہنچا تو مجھے دور ہی سے فخرو کے وہی دونوں خطرناک بندے دکھائی دے گئے جو یقیناً میرے ہی انتظار میں تھے۔

اور ظاہر ہے کہ فخرو کا کام تو کسی صورت ہونا ہی نہیں تھا۔ اس لیے میں آستانے کی طرف جانے کی بجائے دونوں میں سے کسی اور طرف بھاگ لیا۔

اپنی زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی۔ میں افضل شاہ بابا سے سکندر شاہ بن گیا۔ میں نے ایک کارخانے میں ایک معمولی سی ملازمت کر لی اور اپنے ایک رشتے دار کے یہاں رہنے لگا۔ میں نے اپنا گیٹ اپ ہی تبدیل کر لیا تھا لیکن ایک دن وہی دونوں بندے مجھے فیکٹری کے گیٹ کے پاس دکھائی دے گئے۔

یعنی میرا سکندر شاہ بن جانا بھی کسی کام نہیں آیا تھا۔

میں نے وہاں سے بھی دوڑ لگا دی۔ اس کے بعد میں فیکٹری کی طرف گیا ہی نہیں۔ پیٹ بھرنے کے لیے میں نے سبزیوں کا ٹھیلا لگا لیا اور سکندر شاہ سے گاما بن گیا۔

لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ کم بخت مجھے سونگھتے پھر رہے ہوں۔ وہ ایک دن ٹھیلے کے پاس منڈلاتے ہوئے دکھائی دے گئے۔ میں نے وہاں سے بھی راہ فرار اختیار کیا اور ایک ہوٹل میں ویٹر بن گیا لیکن وہ کم بخت وہاں بھی چائے پینے چلے آئے۔

یعنی ان سے بچنا میرے لیے ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ ہر جگہ پہنچ رہے تھے۔

آخر تھک ہار کر میں نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا اور اب میرا نام صفدر علی ہے۔ میں نے ایک چھوٹی سی کینٹین کھول لی ہے اور تعویذ گنڈے وغیرہ پر لعنت بھیج دی ہے۔

میں یہ کہانی صفدر علی بن کر لکھ رہا ہوں اور اپنی اس کہانی کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ نے بھی اگر اس قسم کا دھندا شروع کر رکھا ہے تو اچھی طرح سوچ لیں ہو سکتا ہے کہ آپ بے شمار لوگوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گئے ہوں لیکن یاد رکھیں جس دن فخرو جیسا کوئی سر پھرا آپ کے پاس پہنچ گیا تو اس دن آپ کی چھٹی ہو جائے گی اور آپ کو میری طرح بھاگتے رہنا ہوگا۔

اس لیے میرا برادرانہ مشورہ ہے کہ خدا کے لیے شہر کی دیواروں سے اپنا یہ دعویٰ مٹوا دیں کہ ایک تعویذ میں محبوب آپ کے قدموں پر ڈھیر ہو جائے گا۔

سوچ لیں۔ محبوب تو ڈھیر ہونے سے رہا کسی دن آپ خود ڈھیر ہو جائیں گے میری طرح۔

نفرتوں میں پھول

جناب مدیراعلیٰ
سلام مسنون
اگر آپ ہماری روایتوں سے واقف ہیں تو جانتے ہوں گے کہ ہم اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ اس کی اولادوں سے بھی بدلہ لیتے ہیں لیکن میری قسمت کہ حالات نے مجھے میرے خاندانی دشمن کے در پر پہنچا دیا تھا۔ میں اسی کی بیٹی کو دل دے بیٹھا تھا لیکن رگوں میں وہی خون دوڑ رہا تھا اس لیے کسی ایک فیصلے پر پہنچنا ضروری تھا اس لیے میں نے ایسا فیصلہ کیا۔ کیا یہ فیصلہ غلط تھا، قارئین خود بتائیں۔

حبیب محسود
(لوئر دیر)

میں نے اپنی آنکھوں میں ایک خواب سجا رکھا تھا اور ایک دھن تھی مجھ پر۔
لیکن شہر کے ہنگاموں نے مجھے اپنے آپ سے بھی بے خبر کر کے رکھا تھا۔ میں مزید تعلیم کے لیے آیا تھا۔ ہمارے علاقے میں بی اے یا بی کام سے زیادہ تعلیم دینے کا کوئی ادارہ نہیں ہے۔ اس لیے مجھے شہر کی طرف آنا پڑا تھا۔

میرے دو ارادے تھے۔ بی کام سے آگے کی پڑھائی، اس کے علاوہ اپنے خواب کی تکمیل۔ یہ خواب کیا تھا۔ اس کے بارے میں آگے بتاؤں گا۔
روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ میں شہر اور پڑھائی کے اخراجات آسانی سے برداشت کر سکتا تھا۔ گاؤں میں میری زمینیں تھیں جن سے اچھی خاصی آمدنی ہو جایا کرتی۔ میں

نے اپنے چھوٹے بھائی کو نگراں بنا دیا تھا جو بہت خوبی کے ساتھ سارے معاملات کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔

شہر آنے کے کئی دنوں تک میں یوں ہی در بدر رہا۔ رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ہوٹلنگ کرتا رہا اور اس دوران میں مکان کی تلاش بھی جاری رکھی۔

کراچی میں ایک پرابلم یہی ہے کہ اگر کوئی اکیلا ہو تو اس کو مکان یا فلیٹ کرائے پر نہیں دیتے۔ بڑی مشکلوں سے ملتے ہیں۔ تو میرے ساتھ بھی یہی پرابلم رہی تھی۔

خدا خدا کر کے گلستان جوہر میں ایک فلیٹ مل گیا۔ فلیٹ کے مالک کو شاید مجھ پر بھروسا ہو گیا تھا۔ اسی لیے اس نے فلیٹ کرائے پر دے دیا۔ جس کا کرایہ پندرہ ہزار تھا۔ خیر یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ اصل بات تو یہ تھی کہ سر چھپانے کی جگہ مل گئی تھی۔

میں نے اپنا سامان ہوٹل سے اٹھایا اور فلیٹ میں شفٹ ہو گیا۔ تھوڑا بہت فرنیچر بھی خرید لیا تھا۔ اس کے بعد داخلہ اور پڑھائی کا مسئلہ تھا۔

میں نے سروے کیا تو پتا چلا کہ کراچی میں بے شمار تعلیمی ادارے ہیں جو بی کام سے آگے کی تعلیم اور ڈگریاں دیتے ہیں۔ میں نے ایک معتبر ادارے میں داخلہ بھی لے لیا۔

اس طرح ایک بڑا مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ میں نے گاؤں فون کر کے بتا دیا کہ یہاں سب ٹھیک ہے۔ تم لوگ اپنا خیال رکھو۔

یہ تعلیمی ادارہ ایک بڑے احاطے میں تھا۔ بہت مختلف ماحول تھا اس کا۔ ہمارے ماحول سے بالکل الگ۔ ایک ایسی آزادی کے احساس کے ساتھ جہاں خوشی محسوس ہوتی تھی کہ یہاں کی فضاؤں میں گھٹن نہیں ہے۔

لڑکے لڑکیاں گروپ بنا کر بیٹھے رہتے۔ ایک دوسرے سے گپ شپ کرتے، کینٹین میں چائے پی جاتی، سموسے کھائے جاتے، فضاؤں میں قہقہے گونجتے رہتے۔ یہ ایک مختلف دنیا تھی۔

میرا خیال ہے کہ وقت کو اس انداز اور اس رفتار سے سفر کرتے رہنا چاہیے۔ اس قسم کے احساسات یہیں آ کر ہو رہے تھے۔ ورنہ گاؤں میں تو ایسا نہیں تھا۔ وہاں تو ایک ایسی زندگی تھی جیسی زندگی کسی قید و بند کے اندر گزرتی ہو۔ ایسا کوئی روزن نہیں تھا جس سے جھانک کر باہر دیکھا جائے۔

یونیورسٹی میں کئی دن گزر گئے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ یہاں کے جو مقامی طالب علم تھے، وہ ذہین تو تھے لیکن بے پرواہ بھی تھے۔ اپنی ایجوکیشن پر دھیان دینے سے زیادہ وہ لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارنے میں لگے رہتے۔ جب کہ باہر سے آنے والے دل لگا کر پڑھتے تھے۔

شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ باہر کے طالب علموں کو اس معاشرے میں اپنی اہلیت کا ثبوت دینا ہوتا تھا، اپنے وجود کا احساس دلانا ہوتا تھا۔ انہیں آگے بڑھنا تھا۔

میری کلاس میں ایک لڑکی تھی۔ درِشہوار، وہ مجھے پہلے ہی دن سے پسند آ گئی تھی۔ بہت خوب صورت، گوری رنگت، بڑے بڑے بال......! لیکن اس کی خوب صورتی سے زیادہ مجھے اس کے رویے اور اس کے انداز نے متاثر کیا تھا۔

وہ دوسری لڑکیوں کی طرح بے دھڑک اور بے باک نہیں تھی بلکہ اپنے آپ کو لیے دیے رہتی۔ وہ اسکارف بھی باندھتی تھی جو اس کے چہرے پر بہت بھلا لگتا تھا۔

اس نے ایک دو بار میری طرف دیکھا۔ پھر ہمارے درمیان مسکراہٹوں کے تبادلے ہونے لگے۔ جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتا ہے۔ مسکراہٹیں، پھر باتیں، کینٹین میں چائے کے دوران میں ہلکی پھلکی گپ شپ۔ اس کے بعد تھوڑی بے تکلفی۔ پھر بات پسندیدگی کی حد کراس کر کے کہیں اور نکل جاتی ہے۔

یہ پورے مراحل چھ مہینوں میں مکمل ہوئے تھے۔ چھ مہینے، پھر ہم دونوں کے درمیان ایک گہری، بہت ہی گہری اور خاموش محبت کا رشتہ استوار ہوتا چلا گیا۔

وہ بہت اچھی تھی۔ میرے ذوق اور میرے مزاج کے عین مطابق۔ میں نے شہر آ کر اپنا ایک مقصد تو حاصل کر لیا تھا۔ یعنی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اب دوسرا مقصد حاصل کرنا تھا۔

اس شام میں اور درِشہوار بہت دیر تک ایک پارک میں بیٹھے آنے والے خوش گوار دنوں کی باتیں کر رہے تھے۔ لیکن اس رات میں نے خواب میں اپنی بڑی بہن کو دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک ویران سڑک ہے۔ بہت عجیب سی۔ عجیب اس لیے کہ اس سڑک کی ایک طرف اونچے اونچے درخت تھے اور دور تک سبزہ تھا اور دوسری طرف بالکل ویرانی۔

دور دور تک بنجر میدان، میں بہت خوف زدہ سا اس سڑک پر چلا جا رہا ہوں۔ اچانک کسی درخت کے پیچھے سے

میری بڑی بہن نکل کر سڑک پر آجاتی ہے۔ وہ چیخ رہی ہے۔ بچاؤ بچاؤ کی صدائیں دے رہی ہے۔ میں اسے پکارتا ہوں۔ ''آپا، گل جاناں، رک جاؤ...... رک جاؤ۔'' لیکن وہ میری آواز نہیں سنتی۔ دوڑتی چلی جارہی ہے۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دیتا ہوں اور اس وقت میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

میں یہ خواب کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ گل جانا میری بڑی بہن تھی۔ جب میں صرف چار سال کا تھا تو اس کا انتقال ہو گیا تھا۔

''مجھ سے بہت پیار کیا کرتی۔ بلکہ اسی نے میری دیکھ بھال کی تھی۔ اس کا چہرہ ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہا کرتا تھا۔''

مجھے تھوڑا تھوڑا یاد ہے کہ جب اس کا انتقال ہوا تو اس دن میرے گھر میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ میرا باپ رو رہا تھا، میری ماں رو رہی تھی اور خود میں بھی روئے جارہا تھا۔ اتنا احساس ہو رہا تھا کہ گل جاناں کے ساتھ کچھ ہو گیا ہے۔ وہ شاید اب میرے ساتھ نہیں کھیلے گی۔ مجھ سے باتیں نہیں کرے گی۔

وہ ساری رات اسی خواب کے اثر میں گزر گئی تھی۔ دوسری صبح جب میں یونیورسٹی پہنچا تو درشہوار کلاس روم کے باہر ہی کھڑی تھی۔ وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

''ارے کیا ہو گیا؟'' میں نے پوچھا۔ ''تمہارا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے۔''

''چلو کینٹین چل کر بیٹھتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''آج میں کلاس نہیں لے سکوں گی۔ کچھ الجھی ہوئی ہوں۔''

ہم کینٹین آ گئے۔ چائے کا آرڈر دینے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ''ہاں بتاؤ کیا بات ہے۔''

''حبیب یہ بتاؤ اگر میں تمہاری زندگی سے نکل گئی تو تم پر کتنا اثر ہوگا۔''

''لیکن تمہیں نکلنے کون دے گا۔'' میں نے کہا۔

''ہو رہی ہیں کچھ ایسی سازشیں۔'' اس نے بتایا۔ ''میرے گھر میں میرے رشتے کی باتیں چل رہی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ والدین کو کوئی پسند آجائے اور تم روتے رہ جاؤ۔''

میں یہ سن کر واقعی پریشان ہو گیا تھا۔ ''درشہوار یہ تو بہت بری صورت حال ہے۔ تم بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''تم کوئی راستہ نکالو اور کیا ہو سکتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''راستہ تو بس ایک ہی ہے کہ میں اپنا رشتہ لے کر تمہارے گھر پہنچ جاؤں۔ کیونکہ ہمارے یہاں یہی ایک طریقہ ہوتا ہے۔''

''بہت مشکل ہے۔'' اس نے گردن ہلائی۔ ''میرے بابا نہیں مانیں گے۔''

''کیوں نہیں مانیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ میری شادی اس لڑکے سے کرنا چاہتے ہیں جس کے گھر والے کل میرے گھر آئے تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''لڑکے کا باپ بابا کا پرانا دوست ہے اور لڑکا انگلینڈ میں رہتا ہے۔ وہیں اس کا بزنس ہے۔''

''کیا تم اپنے گھر والوں پر میرے لیے زور نہیں دے سکتیں؟''

''یہ ہماری روایات کے خلاف ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم تو اچھی طرح جانتے ہو۔''

''پہلے مجھے ایک بار ان سے مل کر اپنی کوشش تو کر لینے دو۔ اگر کوئی رکاوٹ ہوئی تو اس کے بعد سوچوں گا کیا کرنا ہے۔''

درشہوار نے اپنے مکان کا ایڈریس سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''کل شام ضرور آجانا۔ ہو سکتا ہے اس کے بعد پھر موقع نہ ملے۔''

میں درشہوار کو کھو دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ میں بہت اچھے لمحات گزار رہا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہم نے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ رشتوں کی استواری کے لیے ایک دوسرے کو سمجھ لینا بہت ضروری ہوتا ہے۔ باقی لوازمات کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی۔

دوسری شام کو میں درشہوار کے مکان پہنچ گیا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ اس کا باپ ایک دولت مند شخص ہے۔ اس کا گھر بہت شاندار ہے لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کا گھر واقعی اتنا شاندار ہوگا۔

لوہے کے بڑے سے گیٹ پر دو باوردی محافظ یا چوکیدار کھڑے ہوئے تھے۔ شاید انہیں میرے بارے میں بتا دیا گیا تھا۔ اس لیے ان میں سے ایک مجھے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

ڈرائنگ روم بھی مکان ہی کی طرح شاندار تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس وقت مجھے کمتری کا احساس ہونے لگا تھا۔ میرے

پاس تھا کیا کہ درشہوار کا باپ اپنی بیٹی کا رشتہ مجھ سے طے کرتا۔ بہرحال کوشش کرنے پہنچ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد درشہوار آ گئی۔ اس نے بتایا کہ بابا آنے والے ہیں۔ وہ مجھے ہدایات دیتی رہی کہ بابا سے کس طرح بات کرنی ہے۔ ان کا مزاج کیا ہے۔

کچھ دیر بعد اس کا باپ بھی کمرے میں آ گیا اور اس کو دیکھتے ہی میں نے سمجھ لیا کہ یہ رشتہ ہو نہیں سکے گا۔ میں یہاں سے ناکام واپس جاؤں گا۔

اس کے باپ نے بھی میری توہین میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اسے جب بتایا کہ میں ابھی تعلیم حاصل کر رہا ہوں اور میرے اخراجات ابھی میرے بابا اٹھاتے ہیں تو اس کے تیور اور بدل گئے۔

"نوجوان ابھی تم اپنی زندگی بناؤ، ابھی تمہارے پاس ہے کیا۔ تم نے دیکھ لیا کہ میری بیٹی کس گھر میں رہتی ہے۔ اس کے پاس سب کچھ ہے تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔"

اس شخص نے اس کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہیں کی۔ رعونت بھرے انداز میں اٹھ کر چلا گیا۔ میری بہت بے عزتی ہوئی تھی۔

میں نے درشہوار کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ میں اس پر دھیان دیئے بغیر اس کمرے سے نکلا اور اس مکان سے باہر آ گیا۔

وہ رات پھر عذاب کی تھی۔

پھر وہی خواب۔ میری بڑی بہن جان بچانے کے لیے دوڑتی چلی جا رہی ہے۔ ایک سیدھی سڑک ایک طرف دور دور تک ہریالی اور دوسری طرف دور تک پھیلا ہوا بنجر میدان اور چاروں طرف گونجتی ہوئی چیخ۔ میری بہن کی چیخ۔

میں ایک وحشت کے عالم میں اٹھ بیٹھا۔

میں جب بھی یہ خواب دیکھتا ہوں دل کی کیفیت بہت مختلف ہو جاتی ہے۔ اس کا دھندلا سا چہرہ بہت واضح ہو کر نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ اس کی موت کے بعد میرا باپ ایک دم سے بیٹھ گیا تھا۔ جیسے ریت کی کوئی دیوار بیٹھ جاتی ہو۔ میرے بابا کو اس سے بہت محبت تھی۔ وہ اسے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کہا کرتا۔

میں اس وقت چھوٹا سا تھا۔ صرف چار برس کا لیکن اتنا ضرور احساس ہو گیا تھا کہ آپا جہاں جا رہی ہے۔ وہاں سے اب کبھی واپس نہیں آئے گی اور میں اکیلا ہی رہوں گا۔

بابا بیمار رہنے لگا تھا۔ اس نے زمینوں کی دیکھ بھال کا کام ہم دونوں بھائیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ پہلے تو وہ بہت ہنستا بولتا رہتا تھا لیکن اس.... سانحے کے بعد بالکل خاموش ہو کر رہ گیا تھا۔

بہن بار بار خواب میں آیا کرتی تھی۔

پہلے تو ہفتے میں کئی بار دکھائی دیتی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے خواب آنے کم ہو گئے۔ اب وہ کبھی کبھی آیا کرتی اور جب بھی آتی میرا وہی حال ہو جاتا۔

وہ رات میں نے جاگ کر گزار دی۔ میں اپنے اور درشہوار کے حوالے سے بھی سوچتا رہا۔ کیا کرنا تھا مجھے۔ کیا اسے بھول جاؤں، چھوڑ دوں اس کو؟

لیکن کیسے چھوڑ دیتا۔ یہ کہانی تو بہت آگے جا چکی تھی۔ بہت آگے اور اس کے باپ سے ملاقات کے بعد تو اس کہانی نے ایک اور کروٹ لے لی تھی۔

اس شخص نے توہین کی تھی میری۔

میں سوچتا رہا، سوچتا رہا پھر ایک راستہ سمجھ میں آنے لگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے ایک دن کے بعد درشہوار کو فون کیا۔ "کیا تم مجھ سے ملنا پسند کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

"کیسی بات کر رہے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ بابا کے رویے کے بعد میری محبت کم ہو گئی ہے۔"

"تو پھر کل کسی طرح آ جاؤ میرے پاس۔ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ کیا تم آ سکو گی؟"

"کیوں نہیں۔" اس نے کہا۔ "حالانکہ پابندیاں لگا دی گئی ہیں پھر بھی آ جاؤں گی۔"

دوسرے دن جب وہ آئی تو میں نے سوال کیا۔ "اب یہ بتاؤ کہ تم میری محبت میں کس حد تک جا سکو گی۔"

"جہاں تک تم کہو۔"

"تو کل صبح ہی ہم کورٹ چل کر شادی کر لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب ذرا سوچ کر جواب دینا۔"

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "ٹھیک ہے میں اس کے لیے تیار ہوں۔ حالانکہ ہماری روایت کے مطابق کسی لڑکی کے لیے ایسا کرنا مناسب نہیں ہے لیکن مجھے بابا پر غصہ ہے۔ کیوں کہ انہوں نے تمہاری توہین کی تھی۔ اس نے انسان کی توہین کی تھی۔ اس کے لہجے میں فرعونیت تھی اور میں اس فرعونیت کو ختم کرنا چاہتی ہوں اس لیے میں یہ قدم اٹھانے کو تیار ہوں۔"

"تو پھر کل صبح آجانا۔" میں نے کہا۔ "اور اپنے ساتھ گھر سے کچھ بھی لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ سوچ کر آنا کہ اب تم کو واپس نہیں جانا ہے۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے بابا کو فون کیا۔

"بابا میں کل ایک قدم اٹھانے جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے۔"

"کیا کرنے لگا ہے تو؟"

"بابا میں شادی کر رہا ہوں۔" میں نے بتا دیا۔

بابا یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔ "یہ کیا کہہ رہا ہے تو۔"

"ہاں بابا زندگی میں پہلی بار شاید تمہاری مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور وہ بھی اس لیے کہ اس کے باپ نے میری توہین کی تھی اور میں اس توہین کا بدلہ لینے کے لیے اس کی بیٹی سے شادی کروں گا۔ کیوں کہ یہی ہماری روایت رہی ہے۔ ہم اپنے دشمن کو معاف نہیں کرتے۔"

بابا چند لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر پُرجوش لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے میری طرف سے اجازت ہے۔"

"شکریہ بابا۔"

دوسری صبح درشہوار اپنے وعدے کے مطابق آ گئی تھی۔

اس کے بعد کے مرحلے کچھ زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوئے۔ رجسٹرار آفس اور کورٹ میں کچھ رقم خرچ کرنی پڑی اور ہم دونوں کا نکاح پڑھوا دیا گیا۔ ہم ایک ہو گئے تھے۔

درشہوار بہت پریشان بھی تھی اور بہت پُرجوش بھی ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "حبیب میں تم سے شادی کر کے کسی قسم کا پچھتاوا محسوس نہیں کر رہی ہوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں نے اپنے بابا کی زندگی کے تالاب میں ایک بہت بڑا پتھر پھینک دیا ہے۔ وہ تڑپ کر رہ جائیں گے۔"

"کیا تم انہیں خبر کرو گی۔"

"وہ تو کرنا ہی ہو گا۔ ورنہ میرے غائب ہونے کی پولیس میں رپورٹ لکھوا دی جائے گی۔"

درشہوار نے فون کر کے اپنے بابا کو خبر دے دی کہ اس نے شادی کر لی ہے اور وہ بھی اس کے ساتھ جس کو تم نے بے عزت کر کے گھر سے نکالا تھا۔

پھر جو کچھ ہوا اس کے باپ کا کیا ردِعمل تھا، کتنی خوفناک دھمکیاں دی گئی ہوں گی۔ اس کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں اور در شہوار (خاص طور پر در شہوار) سہم کر رہ گئے تھے۔ میں در شہوار کی طرف سے فکر مند تھا۔ اس کے باپ کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ وہ پیسے والا آدمی تھا، وہ اپنی ضد میں آکر کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ہمیں نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔

ہم اپنے فلیٹ میں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں رہے۔ پھر میں نے در شہوار سے کہا۔ ”دیکھو مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ تمہاری فکر ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔“

”کہاں؟“

”اپنے گھر۔“ میں نے بتایا۔ ”اپنے آبائی گاؤں۔“

”لیکن تمہارے بابا۔“

”وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ میں نے ان سے بات کر لی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ کچھ بیمار رہنے لگے ہیں۔ تم بس یہ کرنا کہ ان کا دل اپنی مٹھی میں کر لینا۔ ان کی خدمت کرنا۔ ان سے باتیں کرنا۔ وہ ایک نرم دل انسان ہیں۔ وہ تم کو دل و جان سے قبول کر لیں تو ہماری زندگی آرام سے گزر جائے گی۔ اس کے علاوہ میرے بابا اتنے طاقت ور اور بارسوخ انسان ہیں کہ تمہارے بابا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

”تو پھر چلو۔ یہاں کیا رکھا ہے فوراً چلو۔“

ہم دوسرے دن اپنے گاؤں کے لیے روانہ ہو گئے۔ فلیٹ میں سامان یوں ہی رہنے دیا تھا۔ صرف تالا لگا دیا تھا۔ مختصر سا سامان لے کر روانہ ہوئے تھے۔

تیسرے دن جب میں در شہوار کو لے کر گاؤں پہنچا تو پہلے تو گاؤں والوں نے استقبال کیا۔ پھر حویلی سے باہر ہی مجھے اپنا چھوٹا بھائی حفیظ بھی مل گیا تھا۔ جو مجھے دیکھتے ہی دوڑ کر مجھ سے لپٹ پڑا تھا۔ ہم دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے کو لپٹائے کھڑے رہے تھے۔

پھر حفیظ نے مجھ سے الگ ہونے کے بعد در شہوار کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”تم میری بھابی ہو نا۔“

”ہاں۔“ در شہوار نے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں تمہاری بھابی در شہوار ہوں۔“

”حفیظ یہ بتاؤ بابا کا کیا حال ہے۔“

”بالکل نارمل، انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم شہر میں شادی کر رہے ہو اور وہ بھی بہت ایمرجنسی میں۔“

”ہاں یہ شادی ایمرجنسی میں ہوئی ہے۔“

”اندر چلو بابا اچانک تم دونوں کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔“

ہم سب حویلی کی طرف چل دیئے۔ حویلی کے اندر پہنچ کر در شہوار نے کہا۔ ”تمہاری حویلی تو واقعی شاندار ہے۔“

”یہ سب میرے بزرگوں کی مہربانی ہے۔“

بابا اپنے خاص کمرے میں تھے۔ میں نے در شہوار کو لے جا کر ان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ ”بابا یہ ہے آپ کی بہو در شہوار۔“

در شہوار نے بہت جھک کر بہت ادب کے ساتھ بابا کو سلام کیا۔ بابا چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر بابا نے بڑے پیار سے اس کو سینے سے لگا لیا۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں آنسو بھی آگئے تھے۔

ایک بہت بڑا مرحلہ طے ہو چکا تھا۔

دوسرے دن بابا نے حویلی میں زبردست دعوت کا اہتمام کیا۔ یہ ایک طرح سے ہماری دعوت ولیمہ تھی۔ میں نے بابا کو ساری سچویشن سے آگاہ کر دیا تھا۔

”کوئی بات نہیں بیٹے۔ اب کوئی بات نہیں اب تم دونوں یہاں آگئے ہو میں دیکھ لوں گا سب کو۔“

در شہوار نے بھی اچھی بیوی اور بہو ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔ اس نے بابا کی اتنی خدمت کی کہ بابا کی آنکھوں کا نور بن گئی۔

بابا اس کی ذرا سی تکلیف سے تڑپ اٹھتے تھے۔ خود اس کی خاطر کئی بار مجھے ڈانٹ سننی پڑتی تھی۔ یعنی لوہا آہستہ آہستہ گرم ہوتا جا رہا تھا اور میں اپنے مقصد کی طرف بڑھ رہا تھا۔

در شہوار بھی یہاں آکر بہت خوش تھی۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس نے کس انداز کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے۔

شاید اس کی زندگی کے اب دو ہی مقصد رہ گئے تھے۔ میری محبت اور بابا کی خدمت۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ میرا بھائی حفیظ بھی اس کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ میری ماں کا چونکہ بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ در شہوار اس کا اس طرح خیال رکھتی جیسے ماں اپنی اولاد کا رکھتی ہے۔ وہ بھی ہر وقت بھابی بھابی ہی کہتا رہتا تھا۔

پھر ایک صبح ناشتے کے بعد میں نے اپنے کمرے میں آکر اپنی ایک قمیص اٹھائی جس کا ایک بٹن میں نے خود ہی رات کو توڑ دیا تھا۔

میں وہ قمیص لہرا کر شور کرنے لگا۔ ”کیا تم اندھی ہو تمہیں نظر نہیں آتا کہ اس قمیص میں بٹن نہیں ہے۔“

درشہوار سہم کر رہ گئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اتنی بلند آواز میں اس کو کچھ کہا ہوگا۔ وہ یہ دیکھ کر سکتے میں رہ گئی تھی کہ اس وقت میں غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

''حبیب کیا ہو گیا ہے تمہیں۔'' اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''ایک بٹن کے لیے اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''خاموش، اوپر سے زبان چلاتی ہے۔'' میں نے ایک تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا۔

وہ بالکل سناٹے میں رہ گئی تھی۔ میں نے کبھی اسے سختی سے چھوا بھی نہیں ہوگا اور اس وقت اسے تھپڑ مار دیا تھا۔ چیخ و پکار سن کر بابا دستک دیئے بغیر کمرے میں آ گئے تھے۔ اس وقت درشہوار بری طرح روئے جا رہی تھی۔

''کیا بات ہو گئی، کیا کر دیا اس کے ساتھ۔ کیوں شور کر رہے ہو۔'' بابا نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

''اچھا ہوا بابا کہ آپ بھی آ گئے۔'' میں نے کہا۔ ''اب بہت برسوں پرانی ایک کہانی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کہانی کا انجام سامنے آنے والا ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو کون سی کہانی؟''

''بابا چند لمحوں کے لیے میری بات ذرا دھیان سے سنیے گا؟''

''کون سی بات؟''

''بابا مجھے اپنا فرض ادا کرنے سے نہ روکیں۔ یہ دنیا کا دستور ہے کہ باپ اپنی اولاد کو اپنی زمین اور اپنی جائیداد وغیرہ دے کر جاتا ہے لیکن ہمارے یہاں باپ اپنی اولاد کو وراثت میں قتل دیتا ہے، انتقام دیتا ہے، دشمنی دیتا ہے، نفرتیں دیتا ہے، بابا یاد کریں آپ نے بھی مجھے دشمنی دی ہے۔ نفرت دی ہے اب سے برسوں پہلے میری بڑی بہن ایک حادثے کا شکار ہو کر مر گئی تھی۔ یہ اتفاق ہے کہ اس کی موت کچھ اس انداز سے ہوئی کہ آپ نے یہ سمجھا کہ اس کی موت آپ کے ایک دوست کی وجہ سے ہوئی ہے کیوں ایسا ہی ہے نا؟''

''ہاں ایسا ہی ہے لیکن ان باتوں کو تو کیوں دہرا رہا ہے۔''

''سنتے رہو بابا۔ آپ نے کیا ایک لمحے کے لیے یہ نہیں سوچا کہ میری بہن اور آپ کی بیٹی کی موت سے اس آدمی کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ بہرحال آپ نے مجھ سے جو کہا تھا وہ یاد ہے آپ کو۔''

بابا خاموشی سے میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔ جب کہ درشہوار بھی خاموش ہو گئی تھی۔

''بابا آپ نے یہ کہا تھا کہ جس طرح اس آدمی نے میری بیٹی کو مارا ہے، خون کیا ہے اس کا اسی طرح تو میں اس کی بیٹی کو موت دینا، مار دینا اس کو یاد ہے کہا تھا نا۔''

''ہاں ہاں یاد ہے کہا تھا میں نے۔'' بابا نے گردن ہلائی۔ ''لیکن اس وقت تو یہ سب کیوں کہہ رہا ہے۔''

''اس لیے کہ مجھے اپنا فرض ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ درشہوار اسی شخص کی بیٹی ہے۔'' میں نے درشہوار کی طرف اشارہ کیا۔ ''جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کون ہے۔ پھر جب میں اس کے گھر گیا تو میں نے اس کے باپ کو پہچان لیا۔ کیوں کہ میں آپ کے پاس اس کی تصویر دیکھ چکا ہوں۔ اس کے بعد میں نے سوچ لیا کہ ہر حال میں اس کی لڑکی سے شادی کر کے اس کو یہاں آپ کے سامنے لا کر ماروں گا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں بابا۔ اب اس کہانی کا انجام ہونے والا ہے۔'' میں نے اپنی جیب سے پستول نکال کر اس کا رخ درشہوار کی طرف کر دیا۔ ''بابا میں مار رہا ہوں اس کو۔''

بابا کو جیسے اچانک ہوش آ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخ اٹھا۔ ''یہ کیا کر رہا ہے بے وقوف۔ پھینک دے پستول۔''

''بابا میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔''

''نہیں رہنے دے اپنا فرض۔ درشہوار اس آدمی کی نہیں۔ بلکہ یہ میری بیٹی ہے کیا تو میری بیٹی کو مارے گا۔''

درشہوار بابا کہتی ہوئی بابا کے سینے سے جا کر لگ گئی تھی۔ وہ دونوں رو رہے تھے۔ خود میری بھی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ میں پہلی مرتبہ درشہوار کو لے کر شہر کی طرف گیا تھا۔ دشمنی اور نفرت میں اضافہ کرنے نہیں بلکہ دشمنی اور نفرت کو کسی طرح ختم کرنے، کیوں کہ میں یہ معلوم کر چکا تھا کہ میری بہن کی موت میں درشہوار کے باپ کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ وہ حادثاتی موت تھی جو اس کے نام لکھ دی گئی تھی۔

میں نے اپنے بابا کی دشمنی تو ختم کرا دی تھی اب مجھے درشہوار کے باپ کو راستے پر لانا تھا اور ہاں ایک بات اور میرے پستول میں گولیاں نہیں تھیں۔ میں جانتا تھا کہ بابا، درشہوار کی موت برداشت نہیں کر سکیں گے۔

عقلمندی

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
یہ روداد کافی عرصے سے قلمبند کرنے پر غور کررہی تھی جب جب فائزہ کی عقلمندی یاد آتی ہے تو ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے۔ اس کی جگہ کوئی کم عقل عورت ہوتی تو اپنا گھر برباد کر چکی ہوتی۔ کس طرح اس نے اپنے بھٹکتے ہوئے شوہر کو بچایا یہ ہر عورت کو گرہ میں باندھ رکھنا چاہیے۔ آپ بھی اس کی عقل کی تعریف کریں گی۔
شہناز احمد
(لاہور)

میں باڑ میں پھنسے ہوئے ٹینس بال کو نکالنے کی کوشش کررہی تھی کہ مجھے کسی نسوانی قہقہے کی آواز آئی۔ دبا دبا جذبات سے پُر۔

میں سمجھ گئی کہ یہ میری نئی پڑوسن کا قہقہہ ہے، نتاشا علی کا۔ سنا تھا کہ اس کی تین مرتبہ طلاق ہو چکی ہے اور اب ہمارے برابر والا گھر اس نے خریدا تھا۔

''سنو دوبارہ ضرور چکر لگانا۔ مجھے تو آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ یقین ہے کہ آپ بھی بور نہیں ہوئے ہوں گے۔'' عجیب سے جذباتی لہجے میں وہ کسی کو دبی دبی آواز میں کہہ رہی تھی۔

میں نے تصور میں کوئی نیا شکار دیکھا جو وہ اب پھانسنے والی تھی۔

''مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں ضرور دوبارہ آؤں گا۔'' کسی مرد کی آواز آئی۔

لیکن یہ کیا؟ میں دہل سی گئی۔

یہ آواز تو عادل کی تھی۔ میرے عادل، میرے شوہر کی۔

جلدی جلدی میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تاکہ باڑ کے دوسری طرف دیکھ سکوں۔ لیکن باڑ میں لگے کانٹوں نے میرا راستہ روک لیا۔

''مجھے آپ کا انتظار رہے گا۔'' اس کے الفاظ جیسے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ساتھ ہی خوشگوار سی خوشبو بھی۔

پھر مجھے ہائی ہیل کی ٹک ٹک کی آواز دور جاتی سنائی دی اور مردانہ بوٹوں کی آواز اپنے گیٹ کی طرف۔

جلدی سے میں نے کھڑے ہوکر بال کتے کی طرف پھینکی جو اس نے اچھل کر کیچ کرلی۔

اپنا سانس برابر کیا۔ کپڑے جھاڑے۔

عادل گیٹ سے اندر داخل ہورہا تھا۔ میری طرف ایک نظر ڈالی۔

مسلے ہوئے کپڑے بال بنا بنائے۔ کپڑوں پر گھاس اور کیچڑ کے نشان۔ کچھ کہے بغیر وہ گھوما اور گھر کے اندر داخل ہوگیا۔ مجھے کچھ کہے بغیر۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

پانچ سال ہماری شادی کو گزر چکے تھے۔ شروع کے دنوں میں ہم کس قدر خوش تھے۔ اچھی معروف یونیورسٹی سے ایم بی اے کرنے کے بعد مجھے ایک مشہور بینک میں نوکری مل گئی تھی۔

میری عادل سے پہلی ملاقات بھی بینک کے کسی فنکشن میں ہوئی تھی۔ بے حد ہینڈسم، لمبا، اونچا، خوش مزاج عادل احمد کسی ملٹی نیشنل میں کام کررہا تھا۔ ہم دونوں میں ہم آہنگی فوراً ہی ہوگئی اور صرف چھ ماہ کے اندر ہماری شادی بھی ہو گئی۔

پلان یہ تھا کہ دو تین سال نوکری کرنے کے بعد میں اتنے پیسے بنالوں کہ ہم دونوں مل کر شہر سے باہر کسی بڑے پلاٹ پر گھر بنالیں۔ مجھے بینک سے باآسانی لون مل سکتا تھا۔ اس کے بعد بچوں کا سوچیں گے۔

لیکن ہم جو چاہتے ہیں وہ ہمیشہ ہوتا نہیں ہے۔ شادی کے ایک ماہ کے بعد ہی میں پریگننٹ ہو گئی۔ طبیعت اتنی خراب ہو گئی کہ تقریباً تمام دن ہی بیڈ پر لیٹ کر گزارنا پڑتا اور پھر آٹھ ماہ میں ہی ایک سرپرائز۔

میرے یہاں جڑواں بچیاں پیدا ہو گئیں۔ جن کا نام ہم نے آمنہ اور عائشہ رکھا۔ خوشی تو بے پناہ تھی لیکن کام کا بے تحاشا بوجھ بڑھ گیا۔

میری امی، ابا میری شادی کے بعد میرے بڑے بھائی اویس کے پاس امریکا شفٹ ہو گئے تھے۔ عادل کی والدہ حیات نہ تھیں۔ والد بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ وہ اپنے پرانے محلے میں دونوں بیٹوں کے پاس چلے گئے۔ وہاں اور بھی کافی رشتے دار رہتے تھے۔ ہم ان دنوں عادل کے آبائی چھوٹے سے گھر کے اوپری منزل پر رہتے تھے۔ نچلا پورشن کرائے پر دے رکھا تھا۔ میں تمام دن بہت تھک جاتی۔ دو چھوٹی چھوٹی بچیاں، گھر کا کام کاج اور پھر سیڑھیاں بہت مشکل ہو رہی تھیں۔

اس دن عادل گھر آیا تو خوشی اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے باس جمال فیملی سمیت انگلینڈ شفٹ ہو رہے ہیں۔ ان کی ٹرانسفر ہو گئی ہے۔ وہ اب ویسے بھی پاکستان واپس نہیں آنا چاہتے۔ انہوں نے کچھ عرصہ قبل شہر سے باہر نئی اسکیم میں ایک بہت بڑے پلاٹ پر گھر بنایا تھا جو ابھی پوری طرح سے مکمل تو نہیں ہوا ہے لیکن رہنے کے قابل ہے۔

"میں نے سر جمال سے بات کی ہے۔ وہ اپنا گھر مجھے بیچنے کے لیے تیار ہیں۔ کچھ رقم ہم ان کو اب دے دیں گے۔ پھر تین سال میں بقیہ رقم میں ان کو ادا کرتا رہوں گا۔ وہ مان گئے ہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ میں ان کی رقم ان کے اکاؤنٹ میں جمع کراتا رہوں گا۔ ان کے کام آ جائے گی۔" اس کی ایکسائٹمنٹ دیدنی تھی۔

میں بھی بے پناہ خوش ہو گئی۔

مجھے ہمیشہ سے بڑے لان، پھول پودے بہت پسند تھے۔

خیر چند دنوں کے اندر ہم نئے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ یہاں تمام پلاٹ ہی ہمارے پلاٹ کے سائز کے تھے۔ کچھ گھر تعمیر ہو چکے تھے۔ کچھ بن رہے تھے۔ تھوڑے سے پڑوسی آ چکے تھے لیکن ان میں سے بیشتر ریٹائرڈ لوگ تھے۔

بہت کم لوگ، ہم لوگوں کے عمر کے تھے جن سے دوستی ہو سکتی۔

☆......☆

نئے گھر آ کر احساس ہوا کہ بڑے پلاٹ کی دیکھ بھال کس قدر مشکل ہے۔ آپ کے پاس فل ٹائم مالی کا ہونا بہت ضروری ہے، جو ہم ابھی افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ عادل نے بہت خوب صورت اعلیٰ نسل کا کتا بھی پال لیا تھا۔ یہ اس کا خواب تھا بچپن سے اسے کتوں سے بہت محبت تھی۔ اس کی دیکھ بھال بھی زیادہ تر مجھے کرنی پڑتی۔

بچیاں تین سال کی ہو گئی تھیں۔ وہ بھی یہاں آ کر بہت خوش تھیں۔ زندگی بہت ...... مزے میں گزر رہی تھی۔

عادل کو گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانا بہت پسند تھا۔ وہ چھٹی والے دن گھاس کاٹتا، نئے پودے لگاتا۔ اس نے تو بچیوں کے لیے ایک جھولا بھی لگا دیا تھا۔ گھر کے اندر بھی اس کو ہر فن مولا کہہ سکتے تھے۔ کبھی باہر سے پلمبر، الیکٹریشن کو بلانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

ہمیں نئے گھر میں آئے ایک سال ہو گیا تھا۔ کچھ نئے لوگوں نے گھر بنا لیے تھے جن میں دو تین ینگ کپلز بھی تھے۔ ہمارے برابر والا گھر خالی تھا۔ شاید کسی نے انویسٹمنٹ کے لیے بنایا تھا اور اب شاید سیل پر تھا۔

اس دن میں نے کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔

ایک بہت بڑا ٹرک گیٹ کے اندر کھڑا تھا۔ اس میں سے فرنیچر اور گھر کا سامان اتارا جا رہا تھا۔

اس کے بعد نئے ماڈل کی ہونڈا گیٹ میں سے داخل ہوئی۔ ایک بے حد اسٹائلش قسم کی خاتون نکلی۔ جینز، ٹی شرٹ، آنکھوں پر یہ بڑے بڑے سن گلاسز، خوب صورت سے۔

اس نے آگے بڑھ کر گھر کا دروازہ کھولا۔ کچھ لمحے اندر گزارنے کے بعد باہر آ کر لڑکوں کو سامان اندر لانے کو کہا۔

کیا سامان تھا۔ بے حد خوب صورت، نفیس صوفے، قالین۔ کرسیاں، گلاس ٹیبلز اور فانوس، بہت بڑی اسکرین والا جدید ٹی وی۔ لاشعوری طور پر میں نے اپنے فرنیچر پر نظر ڈالی۔

پانچ چھ سال پرانا جہیز کا سامان، جس میں ہم صرف ٹی وی اور وی سی آر کا اضافہ کر سکے تھے۔ صوفوں کی گدیوں پر بچیوں نے گندے ہاتھ لگا کر انہیں بھی میلا کچیلا کر دیا تھا۔

میں نے ایک سرد آہ بھری۔

''کوئی بہت امیر لوگ لگتے ہیں۔'' میں نے سوچا۔

لیکن حیرت یہ تھی کہ آدمی مجھے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔

شام کو عادل کے گھر آتے ہی میں نے اسے نئی پڑوسیوں کی خبر دی۔ وہ بھی خوش ہو گیا۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ یہ گھر کسی خاتون نے خریدا ہے۔ نام نتاشا شاہ ہے۔

''بے چاری کی سنا ہے تین مرتبہ طلاق ہو چکی ہے۔ اس لیے یہاں اکیلی ہی رہے گی۔'' عادل کے لہجے میں افسوس اور ہمدردی تھی۔

عادل کو میں نے کچھ نئے پودے لگانے کے لیے کہا۔ خود اندر آ کر کھانا بنانے لگی۔ باہر نظر ڈالی بچیاں خوش خوش جھولا جھول رہی تھیں۔ کتا جیک بھی لان میں مزے میں گھوم رہا تھا۔ عادل اب باڑ کے پاس کچھ پودے چیک کر رہا تھا کہ میں نے نتاشا کو دیکھا۔ وہ باڑ کے پاس آ کر عادل سے بات کر رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں عادل کے لیے پسندیدگی تھی۔ ستائش تھی۔ چہرے پر فلرٹ قسم کی مسکراہٹ۔ دونوں میں تھوڑی دیر بات چیت رہی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ خاصی اسمارٹ، خوش شکل تھی۔ مجھ سے عمر میں تھوڑی سی بڑی۔

میں باہر نکل آئی تو وہ فوراً دوسری طرف سے غائب ہو گئی۔

میں جانتی تھی کہ عادل میں وہ سب خوبیاں تھیں جو کسی بھی نوجوان خاتون کو پسند آ سکتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں، میں ایک عام سی شکل کی لڑکی تھی جسے ایک دفعہ دیکھنے کے بعد دوبارہ نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

☆......☆

میں کھانے کے برتن لگا کر باہر آئی تو عادل وہاں نہیں تھا اور پھر وہ دو گھنٹے واپس نہیں آیا۔

''یار، مائرہ تمہیں نتاشا کا گھر اندر سے جا کر دیکھنا چاہیے۔'' بچوں کی سی ایکسائٹمنٹ سے وہ بولا۔

''سفید صوفے، قالین، اینٹک الماریاں، اٹالین فانوس، واہ یار، جیسے ہم تصویروں میں دیکھتے ہیں اور وہ خود بھی دیکھنے میں بری نہیں ہے۔'' ہلکی سی مسکراہٹ سے مجھے چھیڑتے ہوئے وہ بولا۔

''ہونہہ، سفید صوفے، قالین اور شیشے کا سامان اس گھر میں رکھے جا سکتے ہیں جہاں بچے نہ ہوں۔'' میرے

لہجے میں ہلکا سا طنز اور غصہ چھپا ہوا تھا۔
میں دو تین دنوں سے بچیوں کے کمرے کے لیے گھر پر ہی خوب صورت پردے سی رہی تھی۔ تھکاوٹ بھی تھی۔ بے زاری بھی۔
''میں نے تو نتاشا سے کہہ دیا ہے کہ ہم کسی روز اسے کھانے کے لیے بلائیں گے۔ بے چاری، اس کی زندگی بہت پریشانیوں میں گزری ہے۔ پچھلا سال تو خاص طور پر۔ جب اس کے آخری شوہر نے حق مہر وغیرہ ادا کرنے سے انکار کر دیا تو اس کو کورٹ کچہریوں کے چکر کاٹنے پڑے۔ وہ بتا رہی تھی کہ اس نے بہت ٹف ٹائم گزارا ہے۔'' عادل ذرا افسردہ تھا۔ نئی پڑوسن کی بات سن کر۔
''بے چاری، میں اندازہ کر سکتی ہوں۔ ویسے وہ اس کا کون سا نمبر کا شوہر تھا، چوتھا یا پانچواں؟'' طنز میرے لہجے سے ٹپک رہا تھا۔
''تیسرا۔'' عادل جلدی سے بولا۔
''وہ کہہ رہی تھی کہ اب میں کبھی کسی آدمی پر ٹرسٹ نہیں کروں گی تمام عمر۔''
''مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنا مائنڈ چینج کر لے گی۔'' میں نے دل میں سوچا، صرف تین چار ہفتوں میں ہی وہ چوتھا شوہر ڈھونڈ لے گی۔ اس ٹائپ کی لڑکیاں زیادہ دیر مرد کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔
جس طریقے سے وہ مجھ سے اور بچیوں سے کتراتی تھی۔ اس طرح محلے میں کسی بھی خاتون سے علیک سلیک نہ تھی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اگر کسی کا شوہر اس کے ساتھ ہو تو اپنی مصنوعی نرم، بھولی بھالی آواز میں بتاتی کہ اس کی زندگی کتنی مشکل سے گزر رہی ہے۔ پوری ایکٹریس تھی۔ اسے تو ڈراما کوئین ہونا چاہیے تھا۔

☆......☆

اس شام جب عادل گھر آیا اور وی سی آر کی ایک بڑی رومانٹک فلم لے کر آیا۔ اس کے قریبی دوست نے دی تھی۔ نئی امریکن۔
رات وہ بہت رومانٹک موڈ میں تھا۔
''بستر پر لیٹ کر فلم دیکھیں گے۔ سنا ہے بہت اچھی ہے۔'' وہ شوق سے بولا۔
میں مان گئی لیکن پندرہ منٹ کے اندر میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئیں اور پھر ایسی سوئی کہ صبح چھ بجے آنکھ کھلی۔
صبح ناشتے پر اس کا موڈ بہت خراب تھا۔ میں سمجھ گئی کہ رات والی بات سے ناراض ہے۔ سوچا کسی دن پڑوس میں مسز بیگ کی بیس سالہ لڑکی کو بلا کر دو تین گھنٹوں کے لیے کہیں باہر جا سکتے ہیں۔
میں کپڑے دھو کر رسی پر ڈال رہی تھی۔ میں نے باڑ کی دوسری طرف دیکھا۔ نتاشا مجھے دیکھ رہی تھی۔ خوب صورت اسٹائلش فٹنگ والا سوٹ رنگے ہوئے براؤن بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ کافی اچھی لگ رہی تھی۔
میں نے اپنے پرانے پچھلے سال والے پرنٹڈ کپڑے پہن رکھے تھے۔ مجھے عادل کی بات یاد آ گئی کہ اس کو کسی دن کھانے کی دعوت دینی ہے۔ دل پر جبر کر کے آگے بڑھی کہ بات کر سکوں لیکن وہ اچانک مڑی اور اندر چلی گئی۔ میں نے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی جیسے مجھے دیکھ کر اطمینان ہو گیا ہو کہ مجھ میں کچھ خاص نہیں ہے۔

☆......☆

میرے اور عادل کے درمیان مسائل شاید اسی رات سے ہی شروع ہو گئے۔ وہ نتاشا کے بلانے پر اس کے گھر گیا تھا۔ مجھے اس کے یوں جانے پر اعتراض نہ تھا۔ وہ ہماری پڑوسن تھی لیکن ایسا تقریباً روزانہ ہی ہونے لگا۔ وہ پانچ منٹوں کا کہہ کر کم از کم دو گھنٹے لگا کر آتا۔ مجھے بے پناہ غصہ آنے لگا۔ اس سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ وہ میری سنتا کب تھا۔ اگر میں کچھ کہتی تو کہتا کہ بے چاری اکیلی گھر چلا رہی ہے۔ جب کچھ خراب ہو جاتا ہے تو بلا لیتی ہے۔
اس دن میرے غصے کی انتہا ہو گئی۔ نئے نئے منی سنیما کھل رہے تھے۔ بہت اصرار کر کے میں نے نئی فلم کی دو ٹکٹیں منگوائی تھیں۔ شو شام چھ بجے شروع ہونا تھا۔ نورین کو میں نے بچیوں کو سنبھالنے کے لیے کہہ دیا۔ خود جلدی جلدی نہانے کے لیے چلی گئی۔ عادل تیار ہو چکا تھا۔ وہ نیلی قمیص اور جینز میں بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ ایک آسودہ سی مسکراہٹ میرے چہرے پر آ گئی۔
ابھی مجھے غسل خانے میں گئے پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی، تولیہ لپیٹ کر میں نے دروازہ کھولا۔ عادل نے اندر جھانکا۔
''ہاں جی کیا بات ہے؟'' مسکراتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ''بڑے ہینڈسم لگ رہے ہو؟'' میں نے اس کو غور سے دیکھتے ہوئے محبت سے کہا۔
''میں جانتا ہوں بس یہ کہنے آیا تھا کہ ذرا دیر کے لیے

برابر والے گھر جارہا ہوں کل نتاشا کا ایک کام کیا تھا وہی چیک کرنا ہے۔ اور اسے دکھانے کہ میں کتنا ہینڈسم لگ رہا ہوں۔'' شرارت سے مسکراتے اس نے کہا۔

میری ساری خوشی ہوا ہوگئی۔ بیشتر اس کے کہ میں اسے روکتی وہ جاچکا تھا۔

میں ٹب میں ڈھے سی گئی۔ میرا موڈ بری طرح سے خراب ہوگیا۔

جس کام کی وہ بات کررہا تھا۔ وہ پانچ منٹ کی بجائے پانچ گھنٹے لگا کر آیا تھا۔ بقول اس کے پڑوسن کا ٹب پوری طرح سے فٹ نہیں ہورہا تھا۔ جانے کتنی مشکلوں سے اس نے اسے فٹ کیا تھا اور اب وہی اس کو یاد آگیا تھا چیک کرنا۔

میں تنگ آگئی اس عورت سے جو جانے کہاں کہاں سے کام نکال کر عادل کو بلالیتی اور اب تو وہ اسے تقریباً ہر رات ہی فون کرکے آنے کو کہتی۔ کبھی دیوار پر پیچر لگانے کے لیے، کبھی کچن کے نلکے کا لیک ٹھیک کرنے کے لیے اور یہ صاحب یوں حکم کی تعمیل کرتے جیسے کوئی طوفان آگیا ہو۔

اتوار والے دن میں اور بچیاں Pizza کھانے کے لیے جانا چاہتی تھیں۔ ہم بالکل تیار تھے کہ نتاشا کا فون آیا کہ ایمرجنسی ہوگئی ہے۔ ذرا جلدی آجائیے۔ حسبِ معمول ''میں ابھی آیا'' کہہ کر وہ گیا اور تین گھنٹے واپس نہیں آیا۔ مارے غصے کے میرا برا حال تھا۔ مجھے بچیوں کو گھر میں برگر بنا کر دینا پڑے۔

دوسری رات کھانے کے وقت اسے بلاوا آیا۔ نتاشا نے کیک بنایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ کھا کر بتائے کیسا بنا ہے۔

اس رات بھی کھانا میں نے اکیلے ہی کھایا۔

اب تو مجھے اس عورت کے ساتھ ساتھ اپنے عزیز شوہر سے بھی کوفت ہونے لگی۔ اسے نظر نہیں آرہا تھا کہ وہ عورت اسے پاگل بنا رہی ہے۔ اپنی بیوی اور بچیوں سے دور کرکے اپنی طرف بلا رہی ہے اسے اپنے جال میں پھنسا رہی ہے۔ میں جانتی تھی کہ عادل دل کا بہت اچھا ہے۔ ہر شخص کی مدد کرنا چاہتا ہے اور شاید وہ اس سارے معاملے کو سمجھ ہی نہ سکا ہو۔ وہ اس کو پڑوسن ہونے کی وجہ سے مدد کرتا ہو۔

لیکن اب مجھے غصہ آنے لگا اگر اس کے پاس اتنا ہی فالتو وقت ہے تو وہ گھر کے چھوٹے موٹے کام میں ہاتھ بٹائے۔

میں مسلسل اسی کے بارے میں سوچنے لگی تھی کہ اس شام جب عادل نے مجھ سے باہر لے جانے کا وعدہ کیا۔

میں نے اچھا سا لباس نکالا۔ شاور لیا۔ خوشبو لگائی اور باہر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ نورین کو بتایا کہ شاید ہمیں دیر لگ جائے۔ وہ مان گئی مگر دو گھنٹے گزر گئے اور عادل کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

میں نے بھی غصے میں سوچا کہ میں برابر والے گھر جا کر اسے بلا کر نہیں لاؤں گی۔ نورین کو گھر بھیجا۔ بچیوں کو بستروں میں لٹایا اور خود ڈرائنگ روم میں آکر صوفے پر ٹانگیں اونچی کرکے بیٹھ گئی۔ جانے کس پہر مجھے نیند آگئی۔

باہر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ بھاری قدموں اور اونچی آواز سے بولنے اور ہنسنے کی آواز آئی۔

''میرا سہارا لے لو بے بی۔ تم اس پوزیشن میں ہو کہ سیدھا چل سکو؟'' دبی دبی ہنسی کے ساتھ نتاشا کی آواز آئی۔

''پیچھے ہٹ جاؤ۔ دیکھ نہیں رہی کہ میری چال کتنی سیدھی ہے؟'' یہ عادل کی آواز تھی۔ اس کی آواز کی کپکپاہٹ سے میں کانپ گئی کہ اس نے شراب پی لی ہے۔

''چلو پھر ٹھیک ہے۔ اچھا آرام کرو کل ملتے ہیں۔'' نتاشا کی آواز جذبات سے پُر تھی۔ وہ کیا کررہی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی۔

پھر ایک آواز سے دروازہ کھلا۔ عادل لڑکھڑاتے قدموں سے اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کرلیا۔ میں نے باورچی خانہ کی لائٹ آن کی۔ تو وہ مجھے دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ تیز روشنی اس کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ اس کے کپڑے مسلے ہوئے تھے۔ بالوں اور کپڑوں پر مٹی اور سوکھا ہوا پینٹ لگا تھا۔

''یہ کچھ نہیں ہے میرے کپڑوں پر اور بالوں پر مٹی لگ گئی ہے۔ وہ ڈرل مشین چلانے سے۔'' ہچکی لیتے ہوئے وہ بولا۔

''مجھے لگتا ہے کہ تم وہاں مٹی کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی لے کر آئے ہو۔ تم نے ڈرنک کی ہے؟'' غصے کے مارے میری آواز اونچی ہوگئی۔

''اوہ تو کیا ہوا؟ ہنگامہ ہے کیوں برپا۔ تھوڑی سی جو پی لی ہے۔'' وہ بھونڈی آواز میں گانا گانے کی کوشش کررہا تھا۔

''بس کرو خدا کے لیے بند کرو یہ سب کچھ۔'' میں نے غصے میں چلاتے ہوئے کہا۔

''یو نو؟ نتاشا بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی کہ تم بہت بک بک کروگی میرے ساتھ۔'' میرے بالکل نزدیک آکر وہ بولا۔

"بک بک......؟" میں پاگل سی ہو گئی۔ اپنے کمرے میں بھاگ کر گئی۔ اس کا تکیہ اور کمبل اٹھا کر اس کے منہ پر مارا۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ پیچھے گرتے گرتے بچا۔

"جاؤ اسی عورت کے پاس یہاں رہنے کی ضرورت نہیں۔ میری جوتی کو بھی پرواہ نہیں ہے تمہاری۔" تقریباً چیختے ہوئے میں نے کہا۔ اپنے کمرے میں آئی۔ دروازہ اندر سے لاک کرلیا اور بستر پر گرسی گئی۔ روتی ہوئی دکھ سے، غصے سے۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو طبیعت بہت بوجھل تھی۔ بیڈ کی دوسری طرف دیکھا وہ خالی تھا۔

رات کا واقعہ ذہن میں آ گیا یہ کیا حرکت کی تھی عادل نے؟ یہ میں جانتی تھی کہ وہ کبھی کبھار اپنے آفس کے ڈنرز میں ایک آدھ مرتبہ ڈرنک لے لیتا تھا دوستوں کے اصرار پر لیکن اس کو اس طرح نشے کی حالت میں تو میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔

کچن میں بچیوں کے لیے ناشتا بناتے ہوئے میں نے ڈرائنگ روم کے صوفے پر نظر ڈالی۔ عادل سو رہا تھا۔ آدھا جسم زمین پر آدھا صوفے پر۔

چلو کم از کم یہ گھر پر تو ہے۔ میں نے سوچا۔ ایک نفرت کی لہر میرے بدن میں چھا سی گئی۔

"اب یہ سلسلہ شروع ہونے والا ہے؟" میں نے سوچا۔

بچیوں کو نہلا کر کپڑے پہنا کر میں نے ان کو لان میں چھوڑا اور خود اندر آ گئی کہ فریج ڈی فراسٹ کرلوں۔ یورنگ کام مگر کرنا ضروری تھا۔ مجھے کافی دیر لگ گئی۔ سامان سمیٹ رہی تھی کہ عادل اندر داخل ہوا۔ اس کا برا حشر تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئیں چہرے پر ندامت۔

"آئی ایم ویری سوری مائرہ۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں برابر والے گھر میں سنک کے نیچے ٹپکتے ہوئے پانی کو چیک کر رہا تھا کہ نتاشا میرے لیے ڈرنک بنالائی اور وہیں اسٹول پر بیٹھ کر میرے ساتھ پینے لگی۔ مجھے بہت لطف آیا۔ بہت عرصے بعد پی تھی مجھے اس ڈرنک میں مزہ آیا۔ پھر تو جیسے ایک کے بعد ایک وہ بھرتی گئی۔ میں انکار کرتے کرتے بھی پیتا رہا۔ ٹائم کا اندازہ ہی نہ ہوا۔" وہ ہاتھوں کو مسلتے ہوئے ندامت سے کہہ رہا تھا۔

"نتاشا تمہیں اللہ غارت کرے۔" میں نے کھولتے ہوئے غصے سے سوچا۔ "تم جانتی تھیں کہ اس کو کتنا پلانا ہے کہ وہ ہوش میں نہ رہے۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں مائرہ میرا دماغ بھی ماؤف ہو گیا تھا اور اب تمام بدن ٹوٹ رہا ہے مجھے یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انکار کردینا چاہیے تھا۔" اپنے لیے کالی کافی بناتے ہوئے وہ بول رہا تھا۔ میں چپ تھی۔

"سنو آج باہر جا کر کھانے کا موڈ ہے۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"میں نے کھانا بنا کر رکھا ہوا ہے۔ وہی گرم کرلوں گی۔" میں نے اپنی آواز کو کنٹرول کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"باہر جانے کی ضرورت نہیں گھر پر ہی کھالینا۔"

اس کے بار بار معافی مانگنے پر میں نرم پڑ گئی۔ مجھے عادل سے بے انتہا پیار تھا۔ وہ میری زندگی، میری جان اور میرا سب کچھ تھا۔

ہم دونوں نے شام کو صوفے پر بیٹھ کر پرانی فلمیں دیکھیں۔ گرما گرم چائے بنائی اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت بھری باتیں کیں وعدے کیے۔

میرا عادل مجھے بہت چاہتا ہے۔ میں نے آسودگی سے سوچا۔ اسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

بچیاں سو چکی تھیں۔ ہم نے سوچا ہم بھی جلدی سو جائیں۔ ہم دونوں کا موڈ رومانٹک ہو رہا تھا۔

میں بیڈروم میں داخل ہو رہی تھی۔

عادل دروازہ لاک کر کے اندر آ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

میں تو جیسے برف ہو گئی۔

عادل کے چہرے پر ندامت سی تھی۔ وہ باہر پڑے ہوئے فون کو اٹھانے گیا۔

"اگر یہ نتاشا ہی ہے تو بہت کمینی اور ڈھیٹ عورت ہے۔" غصے سے میں نے سوچا۔

"ماہی میں پانچ منٹ میں واپس آ رہا ہوں۔ نتاشا نے بتایا ہے کہ اسے لگا ہے جیسے کوئی چور اندر داخل ہوا ہے۔ وہ ڈر رہی ہے۔ بس ابھی آتا ہوں۔" وہ جلدی سے باہر نکلا۔ دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز نے مجھے جیسے پاگل کردیا۔ سارا رومانس ہوا ہو گیا۔ تنگ آ کر بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔

پانچ منٹ کے بعد وہ آیا ضرور لیکن فلیش لائٹ

لینے۔

ایک گھنٹے کے بعد جب وہ آیا تو میں بستر کے ایک کنارے پر چپ چاپ لیٹی تھی۔ وہ بھی کچھ کہے بغیر دوسرے کنارے پر لیٹ گیا۔ میں تو پوری رات نہ سو سکی اس کا مجھے پتا نہیں۔

☆......☆

میں اپنے حالات سے حیران اور پریشان تھی کہ میرا اتنا چاہنے والا شوہر اس طرح اس عورت کے ہاتھوں کھلونا بن رہا ہے۔ دماغ نے مشورہ دیا۔ مجھے غصہ وغیرہ چھوڑ کر نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس طرح میں اسے کھو نہ دوں۔

اگلی مرتبہ جب وہ پڑوسن کو ملنے گیا تو میں نے بہت اچھے اسٹائلش کپڑے پہنے، خوشبو لگائی۔ بالوں کو اسٹائلش سا بنایا۔ دو گھنٹے لگانے کے بعد جب وہ اندر آیا تو میں نے بہت نرمی سے پوچھا کہ دیر کیوں ہوگئی؟

''تمہیں بتایا تو تھا اس کا نلکا لیک کر رہا تھا۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''دو گھنٹے؟'' میں جانتی تھی اتنی دیر نہیں لگ سکتی تھی۔

''اوہ بھئی بس کرو سوال جواب۔ تنگ آ گیا ہوں میں جاؤ جا کر سو جاؤ۔'' اس کے لہجے میں عجیب سی نفرت تھی جو پہلے نہ ہوتی تھی۔

میں دھک رہ گئی۔ اس نے میری طرف نظر بھر کر دیکھا بھی نہ تھا۔

غسل خانے میں جا کر میں کتنی دیر روتی رہی۔ باہر آئی تو وہ سو چکا تھا۔ میں جانے کتنی دیر جاگتی رہی۔

پھر تو جیسے اس کی روٹین بن گئی۔ وہ آفس سے گھر آنے کے ساتھ ہی برابر والے گھر چلا جاتا۔ کبھی اس کا لان کاٹتا، پودے ٹھیک کرتا اور کئی مرتبہ اندر سے باہر ہی نہ آتا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ نتاشا نے ایک مرتبہ بھی مجھ سے دوستی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارے اپنے لان کا گھاس بڑھ گیا۔ پودے مرنا شروع ہو گئے۔ میں اور بچیاں اس کی کمپنی کو ترس سے گئے۔ جس وقت فون کی گھنٹی بجتی میں تھرا سی جاتی۔ وہ جھٹ دروازے سے باہر نکل جاتا۔

جب میں نے ایک دن شکایت کی کہ وہ زیادہ ٹائم پڑوسن کے ساتھ گزار رہا ہے تو گویا پھٹ پڑا۔

''صرف یہ کہ بے چاری نتاشا مجھے کبھی کبھی کسی کام کے لیے بلا لیتی ہے، تمہیں کیوں آگ لگ رہی ہے؟'' اس نے اتنی نفرت اور غصے سے مجھے کہا کہ میں حیران رہ گئی۔

''کبھی کبھی؟ عادل یہ کبھی کبھی والی بات نہیں ہے۔ تقریباً ہر رات تم وہاں جاتے ہو۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

''وہ بے چاری گھر کو اکیلے نہیں سنبھال سکتی۔ کئی کام مردوں کے کرنے کے ہوتے ہیں جنہیں ان کو کرنا اس کو مشکل لگتا ہے۔ وہ بے چاری کتنی تنہا ہے تم اندازہ ہی نہیں لگا سکتیں۔'' ترس اور جانے کیا کیا میرے شوہر کے لہجے میں اس دوسری عورت کے لیے تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ کئی کام مردوں کے لیے ہوتے ہیں جیسے ہمارے لان اور پودوں کا کام جنہیں میں اکیلی کر رہی ہوں۔ اس سے کہو کہ اپنے تین شوہروں میں سے کسی کو بلا لے اپنی مدد کے لیے۔''

بڑی نفرت سے اس نے مجھے دیکھا۔ ''تم میں انسانیت ہے ہی نہیں۔ کسی کی تکلیف کا احساس نہیں اور میں تمہیں بتا دوں کہ میں تمہاری روز روز کی بک بک سے تنگ آ گیا ہوں۔ ہاں مجھے خوشی ہے کہ میں وہاں زیادہ وقت گزارتا ہوں۔''

وہ تمام دن آفس میں گزارنے کے بعد باقی ٹائم وہاں گزار رہا تھا۔ مجھے تو بات شکایت کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔

''نتاشا صحیح کہہ رہی تھی کہ تم اپنی زندگی میں ڈسپلن لاؤ تو تمام کام آسانی سے ہو سکتے ہیں۔ مجھے وہاں جا کر سکون ملتا ہے۔ خاموشی، آرام دہ ماحول اور اچھی کمپنی۔''

''ہاں ہاں وہاں خاموشی نہ ہو گی تو اور کیا ہو گا اس کے پاس دو چھوٹے بچے اور ایک بڑا کتا نہیں ہیں۔'' میں نے غصے سے جواب دیا۔

اس نے غصے سے مجھے دیکھا۔

''اسے کس نے اجازت دی ہے میرے متعلق رائے دینے کی۔ نہ بچے نہ گھر کا کام کاج۔ اس کو اندازہ بھی نہ ہو گا کہ بچوں کی وجہ سے کام کتنا بڑھ جاتا ہے۔''

''یہی تو مسئلہ ہے، تم لڑکیوں کی اچھی تربیت کرو تو وہ تمیز سے گھر میں رہ سکیں۔ گھر ہے کہ چڑیا گھر۔ شور، ہنگامہ، ایک منٹ کا چین نہیں۔'' وہ یہ کیا کہہ رہا تھا وہ تو شاید اس عورت کی زبان بول رہا تھا۔

میں سن سی رہ گئی۔

بچیوں میں تو اس کی جان تھی۔ آفس سے آنے کے ساتھ وہ ان کے ساتھ کھیلتا، جھوٹ موٹ کی کشتی لڑتا اور ان تینوں کے قہقہے سارے گھر میں گونجتے اور آج کہہ رہا ہے کہ میں ڈسپلن کر کے زندگی گزاروں۔ میں جو بچیوں کے کپڑے

بھی خود سیتی تھی کہ عادل پر فالتو خرچ کا بوجھ نہ پڑے۔
یہ وہ عورت کہہ رہی تھی جو تین تین شوہروں کو بھگتا کر حق مہر اور نہ جانے کیا کیا ہتھیا رہی تھی۔
غصہ تو مجھے اتنا آرہا تھا کہ بے پناہ الٹا سیدھا بکنے کو جی چاہا۔ میں نے دس تک گنا غصہ کو کنٹرول کیا۔
''میں پوری کوشش کرتی ہوں کہ اچھی ہاؤس وائف بنوں۔'' میں نے دھیمے سے کہا۔
''ہاں اب سمجھ آئی بات تمہیں؟ تم ہاؤس کی وائف ہو میری نہیں۔'' اس نے ذرا بلند آواز میں کہا۔
''تو یہ بات ہے؟''
کہیں عادل کو یہ بات بری تو نہیں لگتی کہ میں تمام وقت بچیوں، گھرداری میں لگا لیتی ہوں۔
اگلے دن میں نے اپنے لیے وقت نکالنا شروع کردیا۔ صبح صبح نہا کر تیار، اچھے کپڑے، خوشبو، بالوں کا اسٹائل بدلا لیکن وہ تو مڑ کر دیکھتا بھی نہ تھا۔ اب تو یہ حال تھا کہ وہ گھر لیٹ آتا تھا۔ کھانا کہیں باہر سے کھاتا اور باہر صوفے پر ہی سو جاتا۔
مجھے غصے سے زیادہ پریشانی شروع ہوگئی۔ میں اس کا کیا حل نکالوں کہاں جاؤں کس سے بات کروں؟
میری شہر میں بس ایک بہن ہی تھی جو سسرال میں رہتی تھی۔ اس کو بتانے کا مطلب تھا کہ سب کو پتا چل جاتا یوں بھی وہ آج کل اُمید سے تھی۔
ایک شام میں نے کپ کیک بنائے۔ تازہ چائے بنائی اور جب وہ اندر داخل ہوا تو مسکرا کر استقبال کیا۔
وہ ذرا حیران ہوا۔
''تم فریش ہو جاؤ اور کپ کیک ٹرائی کرو دیکھو کیسے بنیں ہیں؟''
وہ ہاتھ دھو کر میز پر بیٹھ گیا۔
''عادل کیا بات ہے۔ تم مجھ سے شیئر کر سکتے ہو۔'' میں نے نرمی سے ذرا نزدیک ہو کر کہا۔ ''کوئی چیز تم کو Bother کر رہی ہے؟''
''ہاں میں بھی تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔'' ابھی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ فون جیسے چیخ اٹھا۔
وہ لپک کر اٹھا۔ کچھ لمحے بات کی۔ ''اچھا اچھا آرہا ہوں۔'' کہہ کر وہ کیک، چائے اور مجھے جیسے حیران سا چھوڑ گیا۔
''نتاشا کو پردے کی راڈ لگوانی ہے۔'' بس یہی کہا اور دروازے سے نکل گیا۔

''پھر جا رہے ہو؟ میرا خیال تھا ہم دونوں بیٹھ کر کچھ بات کریں گے۔'' میں یہی کہہ سکی۔ پھر غصے میں آکر برتن کچن میں جیسے پھینک سے دیئے۔
میں ہار رہی تھی اس عورت سے جو شاید اب چوتھے شوہر کی تلاش میں تھی۔

☆......☆

مجھے کچھ کرنا ہوگا جلد از جلد۔ میری کوئی اسکیم بھی کام نہیں کر رہی تھی۔
اس رات جب وہ دیر تک نہ آیا تو تنگ آکر میں سونے چلی گئی۔
صبح آنکھ کھلی تو سر اس قدر بھاری تھا کہ تکیہ سے اٹھایا نہیں جارہا تھا۔ تمام دن طبیعت بہت خراب رہی۔ متلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسپرین سے بھی فرق نہیں پڑا۔
عادل جلدی آگیا تھا۔ جب مجھے دیکھا تو بچیوں کو خود ہی کھانا نکال کر دیا۔ برتن بھی دھو کر رکھ دیئے۔ بچیوں کو بستر پر لٹا کر میرے پاس آیا۔
مجھے اچھا لگ رہا تھا کہ وہ میرے پرانے عادل کی طرح کام کر رہا تھا۔ فریج میں سے آئس پیک لا کر میرے ماتھے پر رکھا۔ آہستہ آہستہ سر دباتا رہا۔ میں بات کرنا چاہتی تھی لیکن سر کا درد شدید تھا۔ یا تو فلو تھا یا مائیگرین سر درد تھا۔
جانے کتنی دیر میں مجھے نیند آئی۔ پھر جانے رات کے کس پہر میری آنکھ کھلی۔ طبیعت بہتر لگ رہی تھی۔ بیڈ کی طرف دیکھا عادل نہیں تھا۔ میں گھبرا کر اٹھی۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ ٹی وی آف تھا۔ بچوں کے کمرے میں جھانکا وہ سو رہی تھیں لیکن عادل گھر میں کہیں نظر نہیں آیا۔
کہاں جا سکتا ہے؟ یہ بات مجھے بھی معلوم تھی۔ اپنی اسی

پڑوسن کے پاس اس کو یہ احساس بھی نہ ہوا کہ میں بیمار ہوں۔

بچیاں اکیلی ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے لگا میری طبیعت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ فریج سے ایک اور پیک نکالا۔ بستر کی طرف لڑکھڑاتی آئی اور جیسے ڈھے سی گئی۔

صبح آنکھ کھلی تو وہ کام پر جا چکا تھا۔

بس اب بہت ہوگیا۔ آج سے ہی معاملہ کو ہاتھ میں لینا پڑے گا۔ حسبِ معمول وہ واپس دفتر سے آیا۔ آتے ہی باتھ روم جا کر پرانی ٹی شرٹ اور جینز پہن کر باہر نکلا۔

''ننا شا کا کچھ کام رہ گیا ہے وہ مکمل کرنے جا رہا ہوں۔'' نظریں ملائے بغیر اس نے کہا اور باہر نکلنے لگا۔

''کھانا میں سات بجے لگا دوں گی۔'' میرے لہجے کی شگفتگی سے وہ حیران ہو کر پلٹا۔ میں مسکرائی۔

جب اسے گئے ہوئے دس پندرہ منٹ گزر گئے تو میں باہر آئی۔ بچیاں باہر لان میں جھولے کے پاس کھیل رہی تھیں۔ لان میں پانی کی وجہ سے دونوں کے کپڑے بہت گندے ہو رہے تھے۔ کیچڑ کے داغ اور جانے کیا کیا۔

''چلو بچوں چل کر دیکھتے ہیں بابا کیا کر رہے ہیں۔'' میں نے دونوں کی انگلیاں پکڑیں، کپڑوں کی پرواہ کیے بغیر۔ ہمیں جاتا دیکھ کر ہمارا کتا بھی ساتھ ہولیا۔ وہ بھی کیچڑ میں لپٹا ہوا تھا اور اس سے بُو بھی کتوں والی آ رہی تھی۔ جیسے کوئی چوہا کھایا ہو۔ میں نے اسے نہیں روکا۔

پڑوس کا گیٹ کھولا۔ اس کے دروازے پر جا کر ہلکی سی دستک دی۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ میں بے دھڑک اندر چلی گئی۔

واہ کیا فرنیچر تھا۔ سفید اجلا اجلا صوفے، قالین بھی سفید، دبیز، انٹیک سامان۔'' میں نے نظر دوڑائی۔

عادل صحیح کہتا تھا کہ اس کا اور ہمارا کوئی مقابلہ نہ تھا۔

میں نے دونوں بچیوں کو ان صوفوں پر بیٹھنے اور انتظار کرنے کو کہا۔

''عادل۔'' میں نے ذرا زور سے پکارا۔

اندر ایک کمرے سے ہتھوڑے کی ٹھاہ ٹھاہ کی آواز آ رہی تھی۔ شاید کچن تھا۔ میں اسی طرف چلی گئی۔

عادل سنک کے نیچے لگی الماری کے نیچے لیٹا ہوا تھا اور ہتھوڑی سے پائپ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ننا شا اس کے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ گہرے گلے والی شیفون ٹائپ قمیص پہنے۔ پرفیکٹ میک اپ اور بالوں کے اسٹائل کے ساتھ۔ اس کے ایک ہاتھ میں بیئر کا کین تھا دوسرے میں سگریٹ۔ کاؤنٹر پر ایک اور بیئر کین کھلا پڑا تھا۔ شاید عادل کے لیے۔

وہ دبے دبے لہجے میں اس کو کچھ کہہ رہی تھی۔ ہنس رہی تھی۔ اس کے قریب سے قریب تر ہو رہی تھی اچانک اس نے اوپر دیکھا۔ مجھے کھڑے دیکھ کر اس کا رنگ فق ہوگیا۔ ہاتھ سے سگریٹ گرتے گرتے بچا۔

''میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا لیکن کسی نے جواب نہیں دیا اس لیے اندر آ گئی۔ اُمید ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گی۔'' لہجے میں شہد گھول کر میں نے کہا۔

میں نے ارد گرد دیکھا۔ واہ کیا شاندار کچن تھا۔ ماربل، تمام اپلائز، جدید فکسچرز۔

''عادل وہ میں ذرا ڈرگ اسٹور سے دوائی لینے جا رہی تھی اور تم چونکہ گھر نہیں تھے میں بچیوں کو یہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ زیادہ دیر نہیں ہوگی۔'' ننا شا کی حالت دیدنی تھی۔

عادل سنک کے نیچے سے کھسک کر باہر آ گیا۔

''ضرور ضرور جاؤ۔ ننا شا انہیں دیکھ لے گی۔'' اس نے ننا شا کی پریشان صورت کو شاید نوٹ نہیں کیا۔ اس نے جلدی جلدی سر ہاں میں ہلا دیا۔

''یا پھر تم بچیوں کو گھر لے جاؤ اور یہ کسی پلمبر کو بلا کر اپنا کام ختم کروالیں۔''

''نہیں، نہیں۔'' اس نے فوراً کہا۔

میں دروازے سے باہر نکل رہی تھی کہ اچانک پلٹی

''بائے دی وے میرے پاس آپ کے لیے ایک گفٹ ہے۔'' اپنی جیب میں سے میں نے ایک بڑا سا اورنج رنگ کا اندھیرے میں چمکنے والا اسٹیکر نکالا۔

''15 نمبر پولیس آپ کی مدد کے لیے فوراً حاضر۔ یہ مجھے کسی نے راہ چلتے دیا تھا۔''

وہ نکال کر میں نے اس کو پیچھے سے کاغذ اتار کر اس کی ایک بہت قیمتی انٹیک گھڑی پر چپکا دیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے خوب دبایا۔ تا کہ پوری طرح سے لگ جائے۔

''یہ ہماری پولیس کا ایمرجنسی نمبر ہے اگر رات بہ رات میں کسی چور کا خدشہ ہو تو کال کریں فوراً پولیس اسکواڈ آپ کی مدد کو آ جائے گی۔''

بہت اطمینان سے میں نے بدصورت قسم کے چمکتے ہوئے اسٹیکر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو فون تو ڈائل کرنا آتا ہے نا؟'' پھر باہر

میم صاحب

شوکت تھانوی یورپ کے سفر کا پروگرام ترتیب دے رہے تھے، ان کا ایک دوست گھر آیا اور ان سے استفسار کیا۔
''بھیا! کب روانہ ہو رہے ہو؟''
شوکت تھانوی بولے۔''بھیا! کیا پوچھتے ہو، تمہاری بھاوج کی وجہ سے بڑا پریشان ہوں جو روانگی کے پروگرام میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ یہ کہتی ہے کہ تم ولایت گئے تو وہاں سے مجھ پر میم سوکن لے آؤ گے، حالاں کہ میں انہیں قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ اگر اپنے لیے میم لایا تو تمہارے لیے ایک صاحب بھی ضرور لے آؤں گا، لیکن یہ مانتی ہی نہیں۔ اس نے رٹ لگا رکھی ہے کہ تم میم ضرور لاؤ گے۔ اب تم انہیں یقین دلاؤ کہ میں اپنے لیے میم لایا تو ان کے لیے صاحب ضرور لاؤں گا۔''

عذر گناہ

ویسے بہت عرصے سے سن رہے ہیں کہ مغرب میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں مگر سوئٹزر لینڈ میں ہم نے اور ہی منظر دیکھا۔ ایک سنہرے بالوں والی سراپا غزل، کرسی اور شانہ چھوڑ، چوراہے کے بیچوں بیچ ایک اسٹینڈ پر یوں کھڑی تھی کہ وردی نہایت آسمانی اور دستانے نہایت سفید اور سبک، یکایک ہماری کوچ میں بھگدڑ سی مچ گئی اور سارے مسافر ایک طرف ہو گئے۔ کوچ کے کوزیئر نے مائیک میں منہ ڈال کر مسکراتے ہوئے مذاق کیا کہ تمام حضرات اپنی اپنی جگہ جا کر بیٹھیں بس کا بیلنس بگڑ رہا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کوچ میں سارے ایشیائی ہی نہیں تھے انگریز اور یورپی بھی تھے جو اقرار کر رہے تھے کہ پورے سوئٹزر لینڈ میں ایسا دل خوش کن منظر ایک بھی نہیں تھا اور ڈرائیور بڑبڑا رہا تھا کہ خاتون حادثے سے بچانے کے لیے ہیں یا حادثے کروانے کے لیے۔

ڈرائنگ روم میں آئی۔
بچیوں نے اپنے مٹی والے ہاتھ سفید گدیوں پر لگا کر ان پر نشان ڈال دیئے تھے۔ بڑے فخر سے میں مسکرائی۔
''بہت اچھے! تم دونوں بہت اچھی بچیاں ہو۔''
کتا بھی کمرے میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔
میں نے بہت آہستگی سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی تینوں کو اندر چھوڑ کر۔

☆......☆

ڈرگ اسٹور کا کام تو پانچ منٹ میں ہو گیا تھا۔ میں برابر والی بوتیکس میں گھس گئی۔ کپڑے چیک کرتی رہی۔ تسلی سے اطمینان سے بس یونہی ایویں ٹائم پاس کرنے کے لیے۔ دو گھنٹے لگا کر جب میں گھر پہنچی۔ عادل نے دونوں بچیوں کو ٹب میں ڈالا ہوا تھا۔ مجھے دیکھا تو پھٹ پڑا۔
''تم سوچ نہیں سکتیں کہ کیا ہوا۔ نتاشا بے پناہ غصے میں تھی۔ کتے نے اس کے قالین پر گندے پاؤں لگائے اور پھر پورے کمرے میں گھوم گھوم کر صوفوں پر بھی نشان چھوڑ دیئے۔ وہ بے تحاشا چیخ رہی تھی۔ میرے پالتو عزیز کتے کو گالیاں دے رہی تھی۔ جاہل وحشی جنگلی جانے کیا کیا۔ پھر بچیوں نے بھی گندے ہاتھ اس کے فرنیچر پر لگا دیئے تھے۔ وہ تو بہت بدتمیزی کر رہی تھیں۔ میں نے اس کو بتایا کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ذرا سے سرف اور پانی سے وہ داغ اتر سکتے ہیں۔ میں نے بتایا تم تو اتنا مائنڈ کبھی نہیں کرتیں۔'' عادل بہت اپ سیٹ تھا۔ اپنا سر اِدھر اُدھر ہلا رہا تھا۔
''اتنے غصے میں، میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں تو حیران ہوں اتنا ہنگامہ؟'' میں نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کتے کا بھی شکریہ ادا کیا اور بچیوں کا بھی۔
''اوہ میرے خدا۔'' میں نے سرد آہ بھری۔
''جلدی میں، میں نے بچیوں کو تیار بھی نہیں کیا تھا اور پھر جیک کیسے میرے ساتھ ہی اندر چلا گیا۔ پتا بھی نہ چلا۔'' میں نے جھوٹ بولا۔
''اب کے اگر میری ملاقات نتاشا سے ہوئی تو میں معذرت کر لوں گی۔''
ایک اور بڑا جھوٹ۔ معذرت کرتی ہے میری جوتی۔
مگر عادل کو یقین آ گیا کہ میں کتنی سمجھدار لڑکی ہوں۔
''اس کو اس طرح بی ہیو نہیں کرنا چاہیے تھا تم نے بلکہ اس پر احسان بھی کیا تھا اسے شکر کرنا چاہیے۔'' وہ بے دھیانی میں اونچا اونچا کہہ رہا تھا۔
''گڈ۔'' میں نے سکون سے سوچا۔
بچیوں کو بستر پر ڈال کر اس نے ٹی وی لگا لیا۔
''شکر ہے اب وہ اسے نہیں بلائے گی۔'' میں نے سوچا۔
دوسری رات جب فون پھر بجا عادل نے بہت آہستگی سے ایک منٹ بات کی۔ میں اپنے کمرے میں رات کے لیے کپڑے پہن رہی تھی۔ وہ اندر داخل ہوا۔ مجھے غور سے دیکھا میں اپنی باریک نائٹی پہن رہی تھی۔
''وہ......وہ۔'' ذرا ہچکچا کر بولا۔ ہاتھ میں سوئیٹر پکڑی ہوئی تھی۔
گلا صاف کیا اور بولا۔''شکر ہے کہ نتاشا کی ناراضی دور ہو گئی ہے۔ ورنہ رات تو بہت ناراض تھی۔ اس نے مجھے بلایا ہے اس کا خیال ہے کہ اس کے بیڈ روم میں لگا اسموک

الارم عجیب سی آوازیں نکال رہا ہے کہیں بڑا پرابلم نہ ہو گیا ہو۔ وہ یہ اسموک الارم امریکا سے لائی تھی جو کسی بھی جگہ پر دھواں ہونے سے زور زور سے بج جاتا اور کافی شور کرتا تھا۔

”ہاں بھئی یہ اسی کا بڑا پن ہے کہ اس نے تمہیں معاف کر دیا۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

ہوں، بیڈ روم میں اسموک الارم ہلکی لائٹ خوب صورت بیڈ کور، رومانٹک ماحول سب کچھ میرے دماغ میں ایک دھماکے کی طرح گونجا۔

میں فون کی طرف بھاگی۔ کچھ ہی منٹوں میں عادل واپس آگیا۔

”ارے بہت جلد ٹھیک ہو گیا؟“

”وہ مجھے کچھ بھی کرنا نہیں پڑا۔ لگتا ہے کسی نے 1122 ایمرجنسی پر فون کر دیا تھا وہ فوراً آگئے۔ وہ تو نتاشا پر غصہ کر رہے تھے کہ اس کو صحیح طریقے سے الارم نہ لگانے سے شور ہو رہا تھا۔ بلکہ ایک نوٹس بھی دیا اس کو کہ کسی اچھے ماہر الیکٹریشن سے لگوائے۔ وہ بہت ناراض تھی۔“

”ہو سکتا ہے اس نے تمہیں بلانے سے پہلے وہ نمبر ڈائل کر دیا ہو۔ بڑی جلدی آجاتے ہیں وہ لوگ۔“ میں نے کہا۔

”تم صحیح کہہ رہی ہو لیکن اب وہ بہت غصے میں تھی کہ اس کو الیکٹریشن کو بلانا پڑے گا۔“

فتح کے نشے سے میرا جی خوش ہو گیا۔

☆......☆

کئی ہفتے گزر گئے۔ نتاشا نے عادل کو نہیں بلایا اور جب بلایا بھی تو میں فوراً بچیوں کو لے کر چلی گئی۔ ایک دفعہ انہیں پینٹ باکس دے کر اور ایک مرتبہ Cragom دے کر۔ اس کی کالز آنا بند ہو گئیں مگر ہفتے کی صبح اس کا فون آیا کہ دو تین کمروں میں بجلی کا کنکشن نہیں آ رہا۔ ذرا فیوز باکس چیک کر لے۔

اب آخری موقع تھا۔ میرے لیے اس فتح کو مکمل طور پر اپنا بنانے کو۔ اپنی الماری کے اوپر حصے پر رکھا ہوا چاکلیٹ کا بڑا ڈبہ میں نے نکالا جو میری بہن نے مجھے سالگرہ پر دیا تھا۔

دونوں کو پڑوسن کے گھر کے ڈرائنگ روم میں سفید صوفے پر بٹھا کر ڈبہ ان دونوں کے درمیان رکھ دیا۔

”جتنی مرضی چاہو کھا لو۔“ میں نے ہولے سے دونوں سے کہا۔

نتاشا کے بیس منٹ کی سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے میں نے پکارا۔

”سوری، عادل تمہیں تکلیف تو ہو گی لیکن مجھے ابھی صائمہ کا فون آیا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اب بچے کی پیدائش کا ٹائم آگیا ہے مجھے ذرا ایمرجنسی میں جانا ہو گا بچیاں یہیں ہیں۔“

”ہاں ہاں جاؤ بچیوں کی فکر نہ کرو۔ لگتا ہے۔ بے بی جلدی ہو جائے گا۔“ عادل نے نیچے سے پکارا۔

میری بہن مجھے یوں اچانک دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ ہم نے خوب باتیں کیں، گپ شپ ماری، جب میں اٹھی بھی تو بادل نخواستہ کیوں کہ کافی دیر ہو گئی تھی۔ گھر پہنچی تو میرا شوہر مین دروازے پر ہی اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح۔

”شکر ہے تم آگئیں۔“ وہ زور سے بولا۔ مجھے جلدی سے اندر دھکیلا۔

”نتاشا کو تو جیسے تمہارے جانے کے بعد پاگل پن کا اٹیک ہو گیا۔ لگتا ہے آمنہ عائشہ کو کہیں سے چاکلیٹ کا ڈبہ مل گیا تھا۔ انہوں نے کھانے کے ساتھ ساتھ کچھ چیزوں پر داغ بھی ڈال دیئے۔ صوفوں کے علاوہ دیواروں پر اور اپنے کپڑوں پر بھی۔“

”اوہ تو، لگتا ہے انہوں نے نتاشا کا کوئی ڈبہ ڈھونڈ کر کھانا شروع کیا۔ ہم تو ان کو میٹھا کھانے نہیں دیتے ایک دو سے زیادہ۔“ میں نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

عادل نے سر ہلا دیا۔ ”وہ چیزیں صاف کرتی کرتی مسلسل ان پر غصہ ہو رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔ برا بھلا کہہ رہی تھی ہماری بچیوں کو، شکر ہے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کس قدر بدتمیز اور بے ہودہ عورت ہے۔ میں نے اس کو بری طرح سے ڈانٹ دیا۔ میری بچیوں کو ڈرانے پر۔“

”یہ تو بری بات ہے وہ تو بے چاری چار چار سال کی نا سمجھ بچیاں ہیں۔ ان پر چیخنا چلانا تو نہیں چاہیے تھا۔“ میں نے بہت معصوم صورت بنا کر کہا۔

وہ دن اور آج کا۔ نتاشا، عادل کو اس طرح Avoid کرتی ہے جس طرح وہ مجھے اور بچیوں کو کرتی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں اس نے ایک اور نیا شکار قابو کیا ہے۔ جو اس کے گھر کی چیزیں مرمت کر سکے گا۔ بلکہ سنا تو یہ ہے کہ وہ چوتھی شادی کر رہی ہے۔ مجھے خوشی ہے اللہ اس کو ہدایت دے۔ مجھے تو سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ میرا عادل میرے پاس واپس آگیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس نے بھی ایک بڑا امتحان پاس کیا ہے۔ اس عورت کے چنگل سے نکل کر لیکن وہ ہمیشہ سے میرا تھا۔ میرا ہی رہے گا انشاء اللہ۔